تاریخ تدوینِ سُنت

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب

مترجم: مولانا حکیم عزیز الرحمٰن

نشریات

تاریخ تدوین سنت

تاریخ تدوین سنت

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب

مترجم: مولانا حکیم عزیز الرحمٰن

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔فون: ۰۳۲۱-۴۵۸۹۴۱۹

۲۰۱۰ء

نام کتاب : تاریخ تدوین سنت
مصنف : ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب
مترجم : مولانا حکیم عزیز الرحمٰن
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ترتیب

دوسرا باب

فصل اول

فصل ثانی

تیسرا باب

فصل اول

فصل رابع

چوتھا باب

فصل اول

فصل ثانی

پانچواں باب

فصل اول

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی آخری آسمانی کتاب قرآن حکیم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ تمام عالم انسانیت کو مخاطب کر کے اپنا تعارف ہمارے الفاظ میں اس طرح کرایئے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

(الاعراف: ۱۵۸)

''آپ بتا دیجیے (اپنے بارے میں) کہ اے انسانو! میں اللہ کا رسول ہوں، تم سارے انسانوں کی طرف، جس کا اقتدار تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس اے لوگو! تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے احکام وارشادات پر اور پیروی کرتے رہو اس کی تا کہ تم ہدایت پر رہو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تعارف جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں اپنے الفاظ میں کرایا ہے نہایت ہی جامع، مانع اور انتہائی اطمینان بخش ہے۔ ایک طالب ہدایت کی حیثیت سے اس پر غور کیا جائے تو ہر طرح کے شکوک وشبہات سے انسانی ذہن وفکر محفوظ ہو جاتا ہے۔

پہلی بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ کا دورِ رسالت قیامت تک ہے، پچھلے انبیاء کی طرح آپ کسی خاص بستی، خاص قوم اور کسی خاص دور کے لئے نہیں بھیجے گئے، بلکہ آپ تمام کرۂ ارض کے انسانوں کے لئے رسول ہیں۔ اب قیامت تک کے لئے آپ ہی کا دورِ رسالت ہے اب رہتی دنیا تک فلاح وہدایت صرف اسلام کو اپنانے اور نبی امی پر ایمان لا کر ان کی اتباع اور پیروی میں ہے، ان کی پیروی اور اتباع سے بے نیاز ہو کر کوئی ہدایت ونجات نہیں پا سکتا۔

دوسری بات آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ آپ نبی امی ہیں، آپ نے کسی انسان سے کچھ نہیں پڑھا ہے، آپ ناخواندہ ہیں، اللہ نے براہ راست آپ کو پڑھایا سکھایا ہے آپ کے علم ومعرفت کا سرچشمہ اللہ کی وحی ہے۔ جو سراسر حق ہے اور جس میں کسی غلطی اور کمی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ وحی الٰہی ہوتی ہے آپ صرف وہی کہتے ہیں جو اللہ آپ سے کہلواتا ہے۔ آپ کی زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے وہ آپ کی خواہش اور انسانی مرضی کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی القا کردہ تعلیم اور وحی ہوتی ہے، جو سراسر ہدایت ہے۔ اس تعلیم وہدایت سے بے نیازی اور انکار کرنا اور اس پر اعتماد نہ کر کے اس سے سرتابی کرنا، اور اس کی پیروی سے محروم رہنا اللہ کی ہدایت سے محروم رہنا ہے۔ اب قیامت تک ہدایت پر قائم رہنے اور آخرت میں نجات پانے کے لئے ناگزیر ہے کہ رسول خاتم النبیین اور نبی امی پر ایمان لا کر ان کی اتباع اور پیروی میں زندگی گزاری جائے۔ آپ نے قرآن کو جس طرح سمجھا ہے اور جس طرح سمجھایا ہے اسی طرح سمجھا جائے، اور آپ نے قرآن پر جس طرح عمل کیا ہے اور عمل کرایا ہے، اور لاکھوں انسانوں کے مثالی معاشرے کو عمل کرایا ہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ حیات رسول، سیرت رسول اور صحابہ کرام کی مثالی زندگی سے محرومی نہایت بدقسمتی ہے۔ قرآن پاک کا یہ فقرہ "وَاتَّبِعُوا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" اور اتباع کرو رسول اکرم کی تاکہ تم ہدایت پر رہو، خاص طور پر بار بار غور کرنے اور سنجیدگی سے اس کی روشنی میں اپنے فکر وعمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصور کہ آپ ایک پیغام رساں قاصد ہیں اور بس، سراسر گمراہی، شانِ رسالت کی توہین اور شریعت مطہرہ سے سرتابی ہے۔ اللہ سے ہمارا تعارف، تعلق قرب رسولؐ کے واسطے سے ہے۔ اللہ سے قرب اور محبت کا دعویٰ اسی وقت ثابت ہوگا جب رسول کی اتباع سے اس کا ثبوت فراہم کیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ(آل عمران: ۳۱)

ان سے فرما دیجیے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔

اللہ سے محبت ہی ایمان اور دین کی روح ہے اور اللہ کے نزدیک اللہ سے محبت کا دعویٰ اسی وقت قابل قبول ہے جب بندہ اس کے بھیجے ہوئے رسول کی پیروی کرتا ہوا نظر آئے۔ اور پیروی رسول کا صلہ اور انعام اس قدر عظیم ہے کہ اس سے عظیم تر صلہ کا انسان تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یعنی یہ کہ ایسے انسان کو اللہ اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ آل عمران کی مذکورہ آیت کے بعد دوسری آیت میں صاف صاف واشگاف انداز میں کہا گیا ہے کہ اے رسول ان سے یہ بھی کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر یہ روگردانی کریں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ

(آل عمران: ۳۲)

"کہہ دیجیے کہ لوگو! اللہ کی اطاعت کرو، اور اس رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ تعالیٰ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا"

بات تو اس طرح بھی کہی جا سکتی تھی کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، مگر یہاں اطیعوا کا لفظ رسول کے ساتھ یہ بتانے کے لئے دہرایا گیا ہے کہ رسول کی اطاعت ایک مستقل حکم ہے اور اللہ کی اطاعت کی شکل بھی تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رسول کی اطاعت کی جائے۔ رسول کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا:

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اسی نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔ سورہ آل عمران کی ان دونوں آیتوں سے ایک اور حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جو انتہائی چشم کشا ہے وہ یہ کہ متبعین رسولؐ کے محبوب ہیں اور رسولؐ سے سرتابی کرنے والے اللہ کی نظر میں کافر ہیں اور کافروں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

رسول کی اتباع اور پیروی کے معنیٰ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ اس نظام تہذیب وتمدن کی اتباع کی جائے جو اللہ کے رسول نے قرآن کے محکم اور مجمل احکام اور اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا تھا، مجمل اور محکم آیات کی آپ نے تشریح وضاحت فرمائی، مجمل کو آپ نے کھولا، اصولی احکام پر آپ نے تفریعات کیں، اور زندگی کے تمام عائلی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی شعبوں کے لئے قاعدے اور ضابطے بتائے اور عملاً انہی احکام اور قوانین پر اس وقت کے معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنایا، فضائل اخلاق اور انسانی قدروں سے انسانی زندگی کو آراستہ کیا، عبادت کے ایک منظم پروگرام سے زندگی کو ایسی رعنائی بخشی جس پر فرشتے بھی رشک کریں۔ یہی شریعت مقدسہ کا وہ نظام ہے جس کی اتباع اور پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، اور اس سے بے نیازی اور سرتابی کی قطعاً مسلمان کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ بالکل واضح حقیقت ہے کہ اس شریعت کی اساس قرآن بھی ہے اور سنت رسول بھی۔ شریعت محمدی سے سرتابی کرنے والوں کی پہچان اور شناخت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ رسول کی اطاعت سے کتراتے ہیں:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء آیت: ۶۱)

"اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کلام کی طرف جو اللہ نے نازل فرمایا اور اس رسولؐ کی طرف تو آپ دیکھتے ہیں ان منافقوں کو کہ وہ آپ سے کتراتے ہیں"

یعنی بلانے تو جاتے ہیں وہ اللہ کے نازل کردہ کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لیکن ان کے کترانے اور نہ ماننے کا ذکر جب کیا تو صرف رسول سے کترانے کی بات کہی، کلام

الٰہی سے کترانے کی بات نہیں کہی۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم سے کترانا اور آپ کی اطاعت سے سرتابی کرنا ہی کلام اللہ اور دین حق سے سرتابی ہے، اس لئے کہ کلام اللہ کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی شکل تو صرف یہی ہے کہ آدمی شریعت اسلامی کی اتباع کرے۔

رسالت کے نظام کا مقصود یہ نہیں کہ رسول آپ تک کتاب اللہ پہنچا دے اور بس، بلکہ رسالت کا مقصود یہ ہے کہ رسول آپ کو تعلیم بھی دے۔ کتاب اللہ کے معانی اور مفہوم بھی سمجھائے، اس کا منشا اور مراد بھی بتائے اور عملاً ایک نظام شریعت بنا کر آپ کو زندگی گزارنے کا طریقہ بتائے اور خود اس کا بہترین نمونہ پیش کرے جوامت کے لئے مکمل اسوۂ حسنہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اس کی آئینہ دار ہے۔ ''وَخَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ''

بحیثیت رسول، حضورؐ کے چار کام:

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول چار کاموں پر مامور فرمایا تھا، یہ چار کام قرآن نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے، اور یہ آیت جس میں رسالت کے یہ چار کام بیان کئے ہیں قرآن حکیم میں چار مقامات پر آئی ہے۔ اس لئے بھی کہ ان چار کاموں کی اہمیت واضح ہو اور اس لئے بھی کہ ان چار کاموں کو انجام دئے بغیر فریضۂ رسالت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

سورۂ بقرہ میں دو جگہ یہ مضمون بیان ہوا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (البقرہ: ۱۲۹)

''اے ہمارے رب ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب کی تعلیم دے انہیں حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے بے شک تو سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔''

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۱۵۱)

"جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہی میں سے رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کرسناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (العمران: ۱۶۴)

"درحقیقت ایمان والوں پر اللہ کا یہ بہت زبردست احسان ہے کہ اس نے انہی میں سے ان کے درمیان ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت سکھاتا ہے، جب کہ یہی لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہیوں میں مبتلا تھے"

پھر یہی آیت لفظوں کے قدرے فرق سے سورہ جمعہ میں آئی ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعه: ۲)

وہی ہے جس نے ان امیوں میں ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ چار کام جو قرآن حکیم نے چار مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں، نہایت ہی سنجیدگی اور جذبہ صادق کے ساتھ غور وفکر کے طالب ہیں، اگر رسول برحق کا کام ایک پیغام رساں کی حیثیت سے صرف کتاب پہنچا دینا ہوتا اور کتاب کا سمجھنا سمجھانا امت کا کام ہوتا تو رسول اللہ کے یہ چار کام اس اہمیت کے ساتھ بار بار دہرانے

کی ضرورت نہ تھی۔ دراصل یہ چاروں کام رسول اللہؐ کے فرائض میں داخل ہیں اوران کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ ان کو انجام دیئے بغیر رسول کی بعثت کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا، انہیں چار کاموں کی بدولت آپ نے نبوت کے بعد وہ مثالی انسانی معاشرہ قائم کیا جس میں اسلامی اقدار کی جلوہ فرمائی تھی۔ اور جس میں قرآن وسنت کے احکام جاری وساری تھے، جس میں ہر طرف رحمتیں اور برکتیں تھیں، روئے زمین پر ایسا معاشرہ آسمان کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

رسولؐ کا پہلا کام تلاوت آیات:

قرآن حکیم کی چاروں آیتوں میں آپ کا پہلا کام تلاوت آیات ہے۔ قرآن بلاغت وفصاحت کا شاہکار اور فلاح وہدایت کا صحیفہ ہے۔ آج کوئی عام انسان بھی دلبستگی کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو قلب لرزنے لگتے ہیں، روح عجب سرور محسوس کرتی ہے، آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں، تو اس ہستی کی تلاوت آیات کی کیا شان اور کیفیت ہوگی، جس کے قلب پر قرآن نازل ہوا اور جو اس کے معارف ورموز کا اصل رازداں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ : ب صاحب قرآن نے زبان دانی کے دعوے کرنے والے عربوں کے سامنے قرآن کی آیات پیش کیں تو ان کی زبانیں بند ہوگئیں، جب ان کے ممتاز استاد شاعر نے کعبہ پر آویزاں قرآن کی یہ آیت پڑھی "اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" تو پڑھتا رہ گیا اور اسے کہنا پڑا "لَیْسَ مِنْ کَلَامِ الْبَشَرِ" زمانۂ جاہلیت کے ایک مانے ہوئے شاعر جن کے اشعار پر لوگ سر دھنتے تھے، اور سجدے میں گر جایا کرتے تھے، جب ان کو قرآن پانے اور پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی تو انہوں نے شعر گوئی ترک کردی، لوگوں نے ان سے پوچھا آپ نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا تو جواب دیا۔ " اَفَبَعْدَ الْقُرْآن " کیا قرآن کے بعد بھی شعر کہنے کی گنجائش ہے۔

تلاوت آیات یا تلاوت قرآن ایک مستقل عبادت ہے، امت کے لئے بھی تلاوت آیات اہم ترین عبادت ہے۔ آیت دراصل دلیل کو کہتے ہیں جس سے کسی حقیقت کی طرف رہنمائی ملے۔ قرآن حکیم کی ہر آیت کی حیثیت دراصل ایک دلیل وبرہان کی ہے،

جس نے پڑھنے اور سننے والے کا ذہن خدا کی صفات وکمالات، اقتدار واختیار قدرت وحکمت، رحمت ورافت، احکام وفرامین اور شہنشاہ کائنات کی مرضیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم جو اللہ کی مرضیات کا ترجمان، اس کے فرامین وارشادات کا پہنچانے والا رسول ہے اور جس کے قلب پر قرآن کا نزول ہوا ہے جب وہ امت کے سامنے قرآن کی آیات کی تلاوت کرتا ہے تو وہ محض ایک خوش الحان قاری کی تلاوت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اللہ کے ترجمان اور سفیر کی حیثیت سے اس شاہانہ کلام کی بے پناہ تاثیر سے خود بھی متاثر ہوتا ہے اور سننے والوں پر بھی بے پناہ اثر چھوڑتا ہے، وہ شہنشاہ کائنات اور زمین وآسمان کے خالق ومالک کا کلام اس کے بندوں کو پیغمبرانہ جوش اور سوز کے ساتھ سناتا ہے کہ وہ اس کی ہدایات وفرمودات کو دل کے کانوں سے سنیں، انہیں جذب کریں اور ان سے اپنی زندگیوں کو روشن اور آراستہ کریں۔

تلاوت کے اصل لغوی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ قرآن حکیم اور دوسری آسمانی کتابوں کے پڑھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ پڑھنے والے پر لازم ہوتا ہے کہ وہ کلام الٰہی کا کامل اتباع کرے، ٹھیک اسی طرح پڑھے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، اپنی طرف سے جان بوجھ کر کسی ایک حرف اور حرکت کی کمی بیشی نہ کرے اور اسی زبان کے لحن ومخارج میں تلاوت کرے جس زبان میں اللہ نے اپنا کلام نازل کیا ہے۔ امام راغب اصفہانی اپنی معروف کتاب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ کلام الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا تھا: "يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" اے رسول پہنچایئے وہ پیغام جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا۔ اور اللہ کے رسول تلاوت آیات کر کے اس فریضے کو انجام دیتے تھے اس لئے کہ سننے والے عرب تھے اور زبان کی لطافتوں سے واقف تھے، ہمارے مخاطب چونکہ غیر عرب بھی ہیں اس لئے ہمیں تشریح وتوضیح کے لئے رسول کی وہ حدیثیں بھی حسب موقع سنانی ہوں گی جو حضورؐ نے تشریح وتوضیح کے طور پر ارشاد فرمائی ہیں۔

رسولؐ کا دوسرا کام تزکیہ:

حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں تزکیہ کا ذکر سب سے آخر میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین وشریعت کی اصل غایت قلوب ونفوس کا تزکیہ ہے۔ اس ایک آیت کے علاوہ باقی تینوں آیتوں میں رسول اکرمؐ کا یہ فریضہ دوسرے نمبر پر تلاوت آیت کے بعد ہے اور یہی اس کا موزوں ترین مقام ہے اس لئے کہ تزکیہ کا ایک مؤثر ترین ذریعہ تلاوت قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ ہے۔

نبوت کے ابتدائی ایام میں تقریباً ۱۸ ماہ تک صحابہ کرام کے تزکیہ کے تربیتی کورس میں اہم ترین عمل یہ تھا کہ وہ شب میں اللہ کے حضور قیام کرکے قرآن کی ترتیل کے ساتھ تلاوت کریں، نصف شب یا کم وبیش اور یہ عمل ان پر فرض تھا۔ بعد کے ایام میں یہ فرض تو نہ رہا لیکن صحابہ کرام اس کا اہتمام کرتے رہے، البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ لازم تھا اور زندگی بھر اس کے پابند رہے۔ انعام واکرام اور رحمت کی آیات پر آپ خوش ہوتے اور رحمت کی دعائیں مانگتے، غضب وعتاب کی آیات پر ڈرتے اور لرزتے اور اللہ کی پناہ مانگتے یوں نماز، تلاوت قرآن اور پُر سوز دعاؤں سے تزکیہ قلوب اور تطہیر نفوس کی نہایت پاکیزہ اور مؤثر ترین کیفیت پیدا ہوتی۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلاً نِّصْفَهٗٓ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلاً اَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلاً (المزمل: ۱۔۴)

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے رات کو نماز میں قیام کیا کرو، مگر تھوڑی سی رات، آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر (وابستگی) کے ساتھ پڑھو"

تزکیہ میں دراصل دو مفہوم شامل ہیں، ایک پاک وصاف کرنا اور دوسرے نشو ونما دینا اور بڑھانا۔ گندے خیالات، رکیک جذبات، بُرے رجحانات، ناپسندیدہ عادات واخلاق، بے حیائی اور عریانی کے رسوم ورواج، اور دکھاوے کے معاشرتی اعمال، ریا کاری اور مکاری کی حرکات اور قلب ونفس کی تمام بیماریوں اور مفاسد سے خود کو پاک کرنا، تطہیر نفوس کے ان تمام اعمال کے ساتھ ساتھ فضائل اخلاق کی نشو ونما کرنا، اخلاق

کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبے پر آگے بڑھتے رہنا، اور زندگی اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے سنوار کر قابل رشک بنانا تزکیہ کے عمل میں یہ ساری باتیں شامل ہیں، حضورؐ کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" اور بلاشبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں، مگر صحابہ کرام کی تربیت وتزکیہ بھی حضور نے ایسا فرمایا کہ روئے زمین پر ایسے پاکیزہ نفوس کا معاشرہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ دراصل قرآن کی تلاوت اور رسول اکرم کی تربیت نے ان کے قلوب ونفوس سے ہر طرح کی بیماری اور کمزوری کھرچ کر نکال دی، یہی وجہ ہے کہ امت میں صحابہؓ کرام کا جو مقام شرف وعظمت ہے وہ کسی کا نہیں ہوسکتا اور حضورؐ نے ان کی شان میں فرمایا "اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ" میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پر رہوگے۔

رسولؐ کا تیسرا کام 'تعلیم کتاب'

زیر غور چاروں آیتوں میں اللہ تعالی نے "یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی الکتاب کہا ہے۔ الکتاب معرفہ ہے اور اس سے مراد کسی شبہ کے بغیر یقینی طور پر قرآن حکیم ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رسول اس فریضہ پر مامور تھے کہ آپ اپنے مدعوئین کو قرآن حکیم کی تعلیم دیں اور اس کی تفہیم فرمائیں، اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپ نے ہر سطح اور ہر ذہن وفکر کے حاملین کے سامنے قرآن حکیم نہایت رحمت وشفقت اور کامل شوق وتوجہ اور پیغمبرانہ سوز وجذبے کے ساتھ پیش کیا، مشکلات قرآن کی وضاحت کی، اس کے مجمل احکام کی تفصیل وتشریح فرمائی، اصولی احکام کی تفریقات کیں، محکم کی تفصیلات پیش کیں، آیات کی توضیح وتبیین کے بعد جو سوالات ابھرے ان کے اطمینان بخش جوابات دے کر ذہنوں کو مطمئن کیا، خود بھی سوالات اٹھائے اور ان گوشوں کی طرف رہنمائی کی جن کی طرف ذہن متوجہ نہ

ہو پا رہے تھے، ان آیات کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جن سے آپ نے مختلف مسائل اور ہدایات کا استنباط کیا، مختلف سورتوں اور آیتوں کی عظمت و برکت اور ان کے فیوض واثرات کی طرف متوجہ کیا۔ ایک مشفق معلم اور مخلص استاد جو اپنے طالب علم کے تابناک مستقبل کا دل و جان سے خواہاں ہو اس سے ہم جس جاں سوزی، محنت اور ذوق وشوق کی توقع رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ آپؐ نے وہ کچھ کر دکھایا، جس کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے نبوت بھی آپ پر ختم ہے اور تعلیم کتاب بھی آپ پر ختم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ مبارک زندگی اور صحابہ کرام کی تعلیم وتربیت میں آپ کا بے مثالی شوق اور جانفشانی کا معمول شاہد ہے کہ آپ نے حق ادا کر دیا۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد جان نثاروں سے بے تابی کے ساتھ آپ نے پوچھا کیا میں نے حق ادا کیا؟ صحابہ کرام کے عظیم مجمع سے یہ آواز آئی "اَدَّيْتَ وَنَصِحْتَ يَا رَسُوْلَ اللهِ" پھر آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور شہادت کی انگلی تین بار گراتے ہوئے آپ نے کہا۔ "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اے اللہ تو بھی گواہ ہو، اے اللہ تو بھی گواہ ہو، اے اللہ تو بھی گواہ ہو۔

رسولؐ کا چوتھا کام "تعلیم حکمت"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام بحیثیت رسول تعلیم حکمت ہے، حکمت کے معنی ہیں زندگی میں دانائی کا استعمال اور دانشمندانہ فیصلے، حکمت و دانائی دراصل انسان کی اس قوت وصلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے معاملات میں حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، حکیم مطلق اللہ تعالیٰ ہے اس نے اپنی کائنات اور مخلوقات کے بارے میں جو فیصلے فرمائے ہیں وہ حق کے عین مطابق ہیں، قرآن نے اللہ تعالیٰ کے جو احکام وقوانین اور رشد وہدایت کے جو حتمی فیصلے بیان فرمائے ہیں وہ سر تا سر حق کے مطابق ہیں اور قرآن صحیفہ حکمت ہے۔ اس صحیفہ حکمت کی حکمتوں اور حکیمانہ فیصلوں کے سب سے بڑے واقف کار رسول خاتم

ہیں جن پر یہ نازل ہوا ہے۔آپ کی حیات مبارکہ حکمت کا مرقع ہے۔آپ نے زندگی اور زندگی کے گوناگوں شعبوں میں حق کے مطابق فیصلے کئے۔صحابہ کرام کے معاملات ومسائل میں حق کے مطابق حکیمانہ فیصلے دیئے۔کبھی آپ نے زبان مبارک سے رشد وہدایت کی کوئی بات کہی،کبھی آپ نے خود بنفس نفیس کوئی حسن عمل کر کے دکھایا،کبھی صحابہ کرام کے کسی عمل کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا اور خاموش رہے یہ تینوں باتیں یعنی

۱۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک

۲۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک

۳۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی معاملہ میں خاموشی جسے اصطلاح محدثین میں تقریر کہتے ہیں اسلامی اصطلاح میں ''سنت'' کہلاتا ہے۔

امام نسفیؒ نے حکمہ کی تشریح دولفظوں سے کی: سنت اور فہم قرآن ،دراصل اللہ کے رسول نے قرآن پاک کی روشنی میں جو ۲۳ سالہ زندگی گزار کر دکھائی کہ صحیفہ حکمت کی روشنی میں حکیمانہ اور دانشمندانہ مطلوب زندگی یہ ہے اسی کو سنت کہتے ہیں۔

امام ابن جریرؒ اور امام ابن کثیرؒ نے بھی حضرت قتادہؓ سے حکمت کی تفسیر یہی ''سنت'' نقل کی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں لاتعداد فیصلے فرمائے ،معمول کی زندگی میں بھی فیصلے فرمائے اور حالات جنگ میں بھی فیصلے فرمائے ،صحابہ کرام کے مختلف مالی،معاشرتی زندگی اور کاروباری زندگی کے متنازع معاملات میں بھی فیصلے فرمائے۔امت کی خوش نصیبی یہ ہے کہ رسول اکرم کی حیات طیبہ کا لمحہ لمحہ محفوظ ہے،اور ہمارے اسلاف نے دل وجان سے سنت کی حفاظت کی ہے،یہ معاملات جو دور رسالت میں صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں پیش آئے،آج بھی پیش آتے ہیں اور آئندہ بھی پیش آئیں گے۔قرآن حکیم نے ان حکیمانہ فیصلوں کی رو سے کچھ لوگوں کو مومن تسلیم کیا ہے اور کچھ لوگوں کے ایمان کو تسلیم نہیں کیا ہے۔اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ سر جھٹک کر آگے بڑھ جائیں بلکہ اسی پر نجات کا دارومدار ہے،دانائی کا تقاضہ یہ ہے کہ سنت کے محفوظ ذخیرے میں موجود فیصلوں کو

سر بسر تسلیم کریں، اور قرآن حکیم کی رو سے خود کو صاحب ایمان تسلیم کرائیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم قرآن کے ذخیرہ سنت پر کامل اعتبار کر کے اپنے ایمان کی حفاظت کریں، قرآن کا ارشاد ہے:

فَلاَ وَرَبِّکَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

(النساء آیت ٦٥)

"اے محمد آپ کے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی تنازعات میں یہ آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ فیصلہ آپ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی اور کڑھن نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں"

یہ آیت واشگاف انداز میں بتاتی ہے کہ ایمان صرف اسی کا معتبر ہے جو رسول کے فیصلوں کو دل کی گہرائی سے اس طرح مانے کہ ذرا بھی کوئی الجھن اور تنگی محسوس نہ ہو، بلکہ آپ کے فیصلے کو سر بسر تسلیم کرے۔

قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول خاتم النبین کو مبعوث فرما کر فریضہ رسالت ادا کرنے کے لئے ان چار کاموں پر مامور فرمایا، تلاوت آیات، تزکیہ قلب و تطہیر نفس، تعلیم قرآن اور تعلیم حکمت۔ اللہ گواہ ہے، امت گواہ ہے، تاریخ شاہد ہے، اسلامی لٹریچر کا وقیع ذخیرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اللہ کے رسول نے یہ چاروں کام اس خوبی کمال، دلی لگن اور جاں سوزی کے ساتھ انجام دیئے کہ حق ادا کر دیا ہے، میدان عرفات میں اُمت کے بے مثال نمائندوں نے بآواز بلند گواہی دی "اَدَّيْتَ وَنَصِحْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" کہ اے اللہ کے رسول آپ نے دین پہنچانے اور خیر خواہی کرنے کا حق ادا کر دیا۔

اسی میدان میں آپ نے امت سے کہا، ہو سکتا ہے کہ آئندہ میری اور تمہاری ملاقات نہ ہو سکے اور یہ آخری ملاقات ہو دل کی گہرائی سے تمہیں آخری نصیحت کرتا ہوں اسی کو وصیت کہتے ہیں، اور پھر آپ نے فرمایا:

تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ (مشکوۃ بحوالہ موطا امام مالک)

"تمہارے درمیان میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، تم ہرگز راہ حق سے نہ بھٹکو گے جب تک ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت"

ان واضح حقائق کے باوجود دین سے کدر کھنے والوں نے دین کو کنڈم کرنے کے لئے ہمیشہ سنت رسول کو نشانہ بنایا اور سنت کو بے اعتبار بنانے کی ناکام کوشش کر کے شریعت اسلامی کو منہدم کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے کہ قرآن اور سنت ہی شریعت محمدی کی دو حتمی بنیادیں ہیں، مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ اس قدر زوردار اور ہمہ جہتی ہے کہ مسلم نوجوان جو غیر اسلامی ثقافت کے پروردہ جدید علوم کے اداروں سے فراغت پائے ہوئے ہیں، علوم اسلامیہ کے گہرے مطالعے سے محروم اور دین کی روح سے ناواقف ہیں۔ اسلام کا سرسری مطالعہ کر لینے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، ان مخالفین اسلام کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ یہ مخالفین شریعت محمدی یا سنت کے بارے میں نوع بنوع کے اعتراضات گھڑتے ہیں اور خام ذہنوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش میں ہم لگے رہتے ہیں، ان کا بڑا اعتراض جس کو یہ بڑا وزن دیتے ہیں یہ ہے کہ دو صدیوں کے بعد حدیث کی تدوین عمل میں آئی ہے۔ اس لئے اس ذخیرے کا کیا اعتبار۔

زیر نظر کتاب جس کو امت کا ورثہ اور وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے ہم شائع کر رہے اسی اعتراض کا مدلل اور مسکت جواب ہے، مصنف نے تاریخی حقائق اور مستند شواہد کے ساتھ بتایا ہے کہ بے شک رسمی تدوین کا سہرا تو خلیفہ برحق حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے سر ہے، لیکن تدوین حدیث کا کام تو دور رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا، مصنف نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ واقعی اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے السنة قبل التدوين دراصل یہ ڈاکٹر عجاج الخطیب کا پی ایچ ڈی کا وقیع مقالہ ہے جو ایک محققانہ علمی کوشش وکاوش ہے، آپ

نے کلیۃ العلوم الشرعیۃ قاہرہ سے اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔اس کا رواں ترجمہ حکیم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے کیا ہے جو چند ماہ پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے، اللہ ان کو اپنے مقربین میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی مغفرت فرمائے ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔اور سنت رسول کی اس خدمت کے لئے ذریعہ مغفرت اور وسیلہ نجات بنائے۔اور سنت رسول ﷺ کی اس عظیم خدمت میں شرکت کو ہمارے لئے بھی ذخیرہ مغفرت ونجات بنائے آمین۔◆◆

۳۰ر دسمبر ۲۰۰۹ء
۱۲ر محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
بروز بدھ

محمد یوسف اصلاحی
گھیر سیف الدین خان، دو محلہ روڈ
رامپور، یوپی

پیشِ نظر

الحمدللّٰہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ.....امابعد!

نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت، یعنی احادیث، قرآن کریم کے بعد اسلام کی دوسری بنیاد ہے، جو قرآن کریم کے احکام کی تشریح وتفصیل کرتی ہے۔

قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو نازل کرنے کا سبب ہی یہ ہے کہ آپؐ انسانوں کے لیے اللہ کے نازل کردہ احکام کو واضح طور پر بیان فرمائیں، سورۂ نحل میں فرمایا گیا:

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیھم (سورۃ النحل، آیت:۴۴)

''اور ہم نے قرآن آپ پر اس لیے نازل کیا کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ چیز کھول کر بیان کردیں جو اُن کے لیے نازل کی گئی ہے''

چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر قرآنِ کریم کے معانی کی تشریح کی، اس کے اصول پر تفریعات کیں اور اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں کے لیے اصولِ قرآن کی عملی تطبیق اس طرح کرائی کہ اس کا کوئی گوشہ خفا میں نہیں ہے۔

اسی لیے قرآن کریم کی وہ تفسیر معتبر ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اور ہمیشہ سے مسلمانوں کے درمیان قرآن کریم کے ساتھ، احادیث کو شریعت کے احکام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں

چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں چیزوں کو مضبوطی کے ساتھ سنبھالے رہو گے، اس وقت تک گمراہی سے محفوظ رہو گے۔

بالکل اسی طرح دشمنانِ اسلام ہمیشہ سے اسلام کی بنیاد کو منہدم کرنے اور مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں تشکیک میں مبتلا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ان کے لیے قرآنِ کریم کو نشانہ بنانا دشوار ہے اس لیے کہ قرآن کریم کا تواتر اور محفوظ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔اس لیے ان کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ احادیث اور سنت نبوی کو نشانہ بنائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لیے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔

کبھی یہ حضرات احادیث کے ثقہ اور عادل یعنی قابل صد اعتماد راویوں کو متہم کرتے ہیں، کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد احادیث کی جمع و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی اور تیسری صدی میں اس کی طرف توجہ کی گئی، اس لیے احادیث قرآن کریم کی طرح روز اول سے محفوظ نہیں ہیں، جس کی وجہ سے صحیح اور موضوع حدیث کے درمیان تمیز کرنا دشوار ہے۔

کبھی دعویٰ کرتے ہیں کہ فقہاء نے اپنے اپنے فقہی مذہب کی تقویت اور ترویج کے لیے احادیث کو وضع کرلیا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ سنت کے احکام وقتی اور ہنگامی تھے، اب وہ احکام از کاررفتہ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے تمام غلط دعاوی کا مقصد صرف ایک ہے کہ سنت اور احادیث نبویہ کے بارے میں یہ ثابت کردیا جائے کہ اس میں احکام شرعیہ کے مصدر اور ماخذ بننے کی صلاحیت نہیں ہے، اور فہم اسلام کے لیے صرف قرآن کریم کافی ہے اور ہماری عقل میں وہ صلاحیت ہے کہ ہم اس کے ذریعہ خدا کے احکام کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں، جیسا کہ رسول پاکؐ نے قرآن کریم کو سمجھا ہے۔

دشمنانِ اسلام کے ان تمام دعووں کا مقصد صرف یہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے دور کردیا جائے اور اس کا موثر طریقہ ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ احادیث سے اعتماد ختم

ہو جائے تو وہ قرآن کریم کی ایسی تفسیر کر ڈالیں جو اُن کے ذہن اور منشا کے مطابق ہو۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم کے الفاظ محفوظ ہیں، اور انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کے وعدۂ خداوندی کو تاریخ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، بالکل اسی طرح اس کے صحیح معانی کی حفاظت بھی اس وعدۂ خداوندی کا جز ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ سنت نبوی اور احادیث سے استغناء کسی حال میں ممکن نہیں، اور قرآن کریم کی صحیح اور معتبر تفسیر وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یا آپ کے تلقین کردہ طریقے کے مطابق کی جائے۔

چنانچہ علمائے اسلام نے اس مقصد کے لیے ہر طرح کی بحثوں کو منقح کر دیا ہے، کچھ لوگوں نے سنت کی تشریعی حیثیت کو بیان کرنے کے لیے کتابیں لکھی ہیں، کچھ لوگوں نے ان شکوک وشبہات کو رفع کرنے کے لیے قلم اٹھایا ہے کہ سنت کی تدوین دو سو سال کے بعد ہوئی ہے، اس لیے صحیح اور غیر صحیح کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح کی ایک کامیاب کوشش یہ کتاب ہے، مصنف نے جامع قاہرہ کے کلیۃ العلوم الشرعیہ میں پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے السنة قبل التدوین کا موضوع منتخب کیا۔

مصنف کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح سنت اور احادیث عہدِ تدوین کے بعد سے محفوظ اور قابلِ اعتماد طریقہ پر نقل ہوتی آ رہی ہیں، اسی طرح اس اصطلاحی عہد تدوین سے پہلے کا پوری دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا جائے، چنانچہ مصنف نے تاریخ کی روشنی میں اسی بات کو پوری طرح واضح اور ثابت کیا ہے کہ تدوینِ اصطلاحی سے پہلے بھی احادیث کی حفاظت کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے اُن کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ اور زمانہ تابعین میں بھی جس طرح اہتمام کے ساتھ احادیث یاد کرنے کا رواج تھا، اسی طرح صحیفوں میں نقل اور مدوّن کرنے کا بھی ہر زمانہ میں پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

مصنف کی کتاب ایک تمہید، پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ تمہید میں مصنف نے سنت کی تعریف کی ہے، اور اس کے درجہ ومقام کو واضح کیا ہے، اور قرآن کی روشنی میں اپنے مضامین کو مدلل کیا ہے۔

باب اول میں عہد نبوی میں حدیث کے موضوع پر گفتگو ہے، جس میں آپؐ کے معلم ومربی ہونے کی حجت، پھر آپؐ کے تعلیم دینے کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، نیز یہ کہ صحابۂ کرامؓ نے اس نعمت کو کس طرح حاصل کیا، اور اس کے نتیجہ میں عہد رسالت ہی میں احادیث کس طرح عام اور شائع ہوگئیں۔

باب ثانی میں دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں بتایا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کس اہتمام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اتباع کرتے تھے، اور ان حضرات کے نزدیک حدیث کی روایت میں کس درجہ احتیاط ملحوظ رہتی تھی، قبولِ حدیث میں تثبت کا کیا معیار تھا اور یہ کہ اس دور میں حدیث کی روایت باللفظ تھی یا روایت بالمعنی وغیرہ...... پھر دوسری فصل میں دور صحابہ اور دورِ تابعین کے علمی نشاطات، اس دور میں حدیث کی اشاعت اور طلب حدیث کے سفر وغیرہ کی تفصیلی بحثیں ہیں۔

باب ثالث میں وضع حدیث کی ابتداء اور اس کے اسباب کو بیان کیا گیا ہے، پھر اس فتنہ کے مقابلہ کے لیے صحابہ وتابعین کی مساعی جمیلہ کا ذکر ہے، پھر رجال حدیث اور موضوع احادیث کے سلسلے میں مشہور تصانیف کا تذکرہ ہے، اور اس کے بعد مستشرقین اور مستغربین کے آراء کی تردید ہے۔

باب رابع میں حدیث کی تدوین پر گفتگو ہے۔ پہلے عہدِ رسالت اور اسلام کے ابتدائی دور میں حدیث کی تدوین پر بحث ہے، پھر صحابہ وتابعین میں مشہور راویانِ حدیث کا تذکرہ ہے۔ صحابہ کرامؓ میں جو مکثرین فی الحدیث ہیں یعنی حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابو سعید خدری ان کا ذکر ہے۔ اسی طرح تابعین میں جو مشہور رواۃ ہیں جیسے

سعید بن المسیب ،عروہ بن زبیر، محمد بن مسلمہ، ابن شہاب زہری، نافع مولی، ابن عمر، عبید اللہ بن عبداللہ، سالم بن عبداللہ بن عمر، ابراہیم نخعی، عامر شعبی ، علقمہ نخعی اور محمد بن سیرین وغیرہ کے بارے میں اپنے موضوع کی رعایت سے قابل قدر معلومات دی گئی ہیں۔

اس کے بعد پانچویں باب اور خاتمہ میں اپنے مقصد اور موضوع کو سامنے رکھ کر نہایت مفید اور گرانقدر معلومات دی ہیں۔ مصنف نے اپنے موضوع سے متعلق تمام مراجع کو اکٹھا کر دیا ہے اور جس بحث کو انھوں نے اپنے موضوع اور مقصد کے لیے مناسب سمجھا ہے اس کو پوری طرح مدلل اور مبرہن کر دیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مصنف اپنے موضوع کا حق ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس بیش قیمت اور نایاب مضامین پر مشتمل عربی کتاب کو محترم القام حکیم عزیز الرحمن صاحب دامت برکاتہم نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اردو زبان میں اس طرح کی کتاب کی شدید ضرورت تھی، اس لیے موصوف محترم اس قابلِ قدر خدمت کے لیے مبارکباد اور اہلِ علم کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

بندہ بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہے کہ وہ مصنف اور مترجم کی خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا کرے، اور اوساط علمیہ میں ان کی کوشش کو قبولِ عام حاصل ہو۔

والحمد للہ اولہ واٰخرہ

نعمت اللہ اعظمی غفرلہ

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین وسید المرسلین و علیٰ آلہ و صحبہ ومن تبعہ باحسان الی یوم الدین۔

یہ بات متعین ہے کہ قرآن کریم اسلام میں شریعت کا اساسی و بنیادی اصول ہے اور سنت نبی کریمؐ مصدر ثانی کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے کہ قرآن کی وضاحت اس کے احکام کی تفصیل احادیث ہی میں ہوتی ہے، جناب نبی کریم کے ہاتھوں اس کی عملی مطابقت کا سامان پیدا ہوا، مسلمانوں نے آغاز اسلام سے آج تک رسول کریمؐ کی جانب سے صادر ہونے والے احکام کی پوری پابندی کی، قرآن کے سہارے ہی احکام اسلامی کی بنا اخلاق و آداب کے سرچشمے باقی رہ سکتے ہیں، اسی سے روئے زمین پر اور اس میں پائی جانے والی چیزوں پر پوری طرح دسترس ممکن ہے۔ اس طرح ان دونوں اصول شریعت اسلامی پر عمل پیرا ہو کر ہی امت مسلمہ کامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے، چنانچہ صحابہ نے حضور کے اس فرمان پر پورے طور سے عمل کر کے دکھلا دیا: ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما کتاب اللہ وسنّتی "میں نے تم لوگوں کے لیے دو چیزیں کتاب وسنت چھوڑ دی ہے کہ اس کی روشنی میں تم بے راہ نہیں ہو سکتے۔"

لیکن دشمنان اسلام نے ماضی حال کسی زمانے میں امت اسلامیہ کی ترقی اور شادابی کو پسند نہیں کیا بلکہ اس کی جڑ کھودنے میں لگے رہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی جانب سے شک پیدا کرنا ان کا پیشہ رہا، قرآن کریم میں کتر بیونت پر ان کو قابو نہ مل سکا تو انھوں نے

اپنے تیر کا رخ سنت کی جانب کر دیا۔ اس کی صورت بگاڑنے کی کوشش کرتے رہے، اس کے لیے حدیثیں گھڑنے اور صحیح احادیث میں کیڑے نکالنے، سچے اور پائدار راویوں پر کیچڑ اُچھالنے میں لگ گئے۔ مگر ان کا یہ پینترا بھی کارگر نہ ہو سکا اس لیے کہ سنت کی حفاظت میں علمائے امت غیر معمولی طور سے چوکنے اور بیدار تھے، سنت نبوی پر ان کی چوکسی سے کبھی حرف نہ آسکا اور سدا اس کی حفاظت ہوتی رہی۔

دشمنان اسلام نے سنت کے انکار کے لیے بہت سے پینترے بدلے تاکہ اس میں شک و شبہہ کی بنیاد کو مضبوط کر سکیں، چنانچہ ان دشمنان اسلام میں سے بہتوں نے کہنا شروع کیا کہ سنت رسول کا کوئی پتہ دو صدی تک نہ تھا، بلکہ تیسری صدی میں کتاب السنن میں بعض مصنفین نے احادیث کو اکٹھا کیا اور قرآن کریم کی طرح احادیث نبوی کی حفاظت و جتن کے لیے ظہور اسلام سے دوسری صدی کے آخر تک کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کے گھڑنے کی چھوٹ مل گئی اور اس کے نتیجہ میں جھوٹی حدیثوں کا صحیح حدیثوں سے الگ کرنا ایک دشوار امر بن گیا۔ بعض مستشرقین نے تو یہاں تک غلط بیانی کر ڈالی کہ حدیث کا بہت سا حصہ فقہاء نے اپنے اپنے مذہب فقہی کی تائید میں وضع کر لیا۔ کسی نے یہ کہنا شروع کیا کہ سنت تو ایک وقتی بات تھی جو پیغمبر کے زمانے تک کے لیے تھی اب اس کا کوئی مقام اور موقع نہیں ہے۔ یہ خیالات اور مظنات فاسدہ بعض اسلامی ممالک میں بھی پھیل گئے اور ایک منظم گروہ کی شکل میں منکرینِ حدیث کی ایک ٹولی بن گئی چنانچہ ہندوستان میں ایک جماعت ہی اس خیال کو لے کر آگے بڑھی کہ احادیث نبوی کا حجیت دین خداوندی میں کوئی مقام نہیں۔ یہ ہندوستان میں اہل قرآن کے نام سے پکارے جانے لگے، انھوں نے قابل ذکر لٹریچر، کتابیں، رسالے، اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے تیار کیے۔

ان کے خیال میں سنت میں مصدر شریعت بننے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن نے جو کچھ بیان کیا کافی ہے، خصوصاً جو لوگ دین میں وسعت نظر رکھتے ہیں وہ اپنی عقل کے مطابق اس کو اسی انداز میں سمجھنے پر قادر ہیں، جس طرح اسے رسول خدا صلی اللہ علیہ

وسلم نے سمجھا اور عمل فرمایا۔

یہ دشمنان اسلام کے مزعومات ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو دین سے دور کرنے اور ان کے عقیدہ میں کمزوری لانے کی سعی بلیغ کی تاکہ وہ بلاد اسلامیہ میں اپنے آئیڈیالوجی (نظریات فاسدہ) کی تبلیغ کرسکیں اور فکری تسلط کے بعد مادی تسلط قائم کرسکیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان جو اسلامی ثقافت کے پروردہ نہیں ہیں انھوں نے ان افکار کے سامنے سپر ڈال دی ہے جس سے ہمارے دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ہماری صف میں انتشار پیدا ہوگیا۔ حالانکہ یہی اہم ترین موقع تھا کہ ہم سنت نبوی کو دل و جان سے پکڑتے، پیغمبرانہ اخلاق و آداب اور توجیہہ وارشاد کو حرز جان بناتے۔ دنیا کی دوسری قوموں کا افتخار اپنی موروثی چیزوں کی حفاظت اور ان پر جمے رہنا بن چکا ہے۔ دوسری قوموں کے انصاف پسند علماء ہماری تشریعی میراث کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں مگر تعجب ہے کہ جو لوگ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اس کا انکار کررہے ہیں۔ ایسے موقع پر ہمیں تو اور بھی اپنے دین کی گرفت مضبوط کرنی چاہیے اس لیے کہ مسلمانوں نے استبداد اور استعمار کے دھکے ایک عرصہ تک کھائے اور پستی وانتشار کی تلخی کے مزے چکھے، حالانکہ کبھی سیادت و جہانداری اور جہاں بانی ان کے در کا غلام رہ چکی ہے۔

ہمیں آج پھر ایک انقلاب کی ضرورت ہے، ہم کو پھر شریعت کا دامن پکڑنے کی ضرورت ہے، قرآن پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور سنت رسول اکرم کو دانتوں سے پکڑنے اس کو نئی زندگی بخشنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے ضروری بندشوں اور پابندیوں سے خود کو آزاد کرلیا اور نادانی وہٹ دھرمی کی آلودگی سے خود کو گندہ کرلیا، اور آنکھوں کو بند کرنے والی پٹیوں کو چاک کردیا، ایسی صورت میں ہماری حقیقی آزادی کا تصور اسی وقت تکمیل کو پہنچے گا جب کہ ہم ان فاسد خیالات کو جو ہماری سوسائٹی میں ناسور کی طرح جڑ پکڑ گئے ہیں نکال پھینکیں، وہ گندگی جس میں ہمارے ہی اپنوں نے خود کو لت پت کرلیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ نیک نیتی سے ہوا یا بدنیتی سے، بہرحال اس سے ہمارے دشمنوں (جو ہمارے باہمی اتحاد کو کسی طرح

برداشت نہیں کرسکتے ہماری خوش بختیوں کو ہمیشہ کے لئے دریا برد کردینا چاہتے ہیں) کی اعانت ضرور ہوتی ہے۔

سنت نبوی قرآن کی شارح ہے ہم اس سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتے، سنت کی حفاظت کا عزم ہمارے مخالفین کو ایک آنکھ نہیں بھاتا، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم سنت نبوی کی پوری تاریخ اور اس کی تدوین سے بحث کریں، علمائے اصول حدیث و محدثین نے شریعت اسلامی میں سنت کے مقام کا تعین کردیا ہے، البتہ سنت کی تاریخی حیثیت ابھی تک اُجاگر نہیں ہو سکی ہے۔ سلف صالحین نے سنت کے ساتھ کس درجہ جگر کاوی کا ثبوت دیا، اس کی حفاظت اور اس کے نقل کرنے کا جتن کیا، حتیٰ کہ اب یہ حدیثیں حدیث کی مشہور کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔

اس لیے میرا خیال ہوا کہ ہم کو اس دور کی طرف توجہ کرنی چاہیے جس میں احادیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی، یعنی دوسری صدی ہجری کے ابتدائی دنوں سے پہلے کے زمانہ کا ذکر کریں اس لیے کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں علمائے حدیث کی تگ و دو بڑھ گئی تھی اس تگ و دو اور جدو جہد کا سہرا خلیفۂ برحق عمر بن عبدالعزیز کے سر ہے جس کو تدوین رسمی کا نام دینا مناسب ہے ورنہ سنت کی تدوین تو خود عہد نبوی ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

انہی اسباب کی بنا پر میں نے اس موضوع کو اپنایا۔ دوسری بات اس موضوع کو اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اس کی ہمت نہیں کی کہ وہ ان باتوں کو باریک بینی سے دریافت کرکے سامنے لائے کہ حدیث کو یہ مدت کیسے گزارنی پڑی، اس کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، اس سلسلہ میں اسلاف کے بحث کا محور اس مدت کے چند لمحات کے ذکر سے زیادہ نہیں، کیونکہ وہ بھی راضی و مطمئن تھے اور اہل اسلام بھی مطمئن تھے کہ سنت کی حفاظت عمدہ طریقہ سے ہو رہی ہے۔ حافظین حدیث اور علمائے حدیث کی عالی رتبگی نے اس کی ہمیشہ ہی حفاظت کی ہے اس لیے بحث کا مواد مختلف مقامات میں منتشر تھا، مراجع کتب احادیث و شروح حدیث اور اصطلاحات حدیث سے متعلق کتابوں، علوم حدیث سے متعلق مآخذ، راویوں کے تذکروں، رجال کی وفات تاریخ اور اصول حدیث وغیرہ میں محفوظ

تھے، گو یہ پراگندہ ومنتشر کتابیں موضوع کے مواد کی شکل اختیار کر چکی ہیں مگر آج جس صورت میں ہے کل اس انداز میں نہ تھی اس لئے سنت کی صورت پوری طرح نکھر کر سامنے اب آئی ہے۔

اس طرح میں نے اس مدت میں تحقیق حدیث کے کام کی طرف اقدام کیا اور اس کے لئے مخطوطات ومطبوعات قدیم وجدید اہم کتابوں کا مراجعہ کیا۔ جیسے دمشق، حلب اور قاہرہ کے عام وخاص اہم کتب خانوں سے حاصل کیا، اس سلسلے میں نادر مخطوطات بھی دیکھنے کا اتفاق پڑا، بہت سے مخطوطات کے فوٹو ان ممالک سے منگانے پڑے جہاں پہنچنا میرے بس کی بات نہ تھی۔اس طرح یہ مضمون ترتیب دینا ایک حیثیت سے بڑے بوتے کا کام تھا تو دوسری طرف بڑی دیدہ ریزی کا بھی طالب تھا، اس کی گتھی کبھی بڑی آسانی سے سلجھ جاتی کبھی بڑی دقتوں سے حل ہوتی۔ پھر میں نے خالص علمی مذاق اور اسپرٹ کو سامنے رکھ کر ان مباحث کا اتمام کیا جو بڑے بتے کا کام تھا، بارہا امیدوں کے چراغ جھلملاتے نظر آئے، خدا کا شکر ہے کہ استاذ محترم علی حسب اللہ کی بیش بہا رہنمائی اور ان کی دلداری نے میری ڈھارس بندھائی اور میں اس مضمون کو نیا لباس پہنانے میں کامیاب ہوگیا، جو اس دور میں حدیث کی سچی تصویر کشی کرسکے۔علمائے امت کی جانفشانی اس کی حفاظت کی لگن، اس کے نقل کرنے کا اہتمام اور احادیث کی روایت کو قواعد پر پرکھنا اس کی کتابت اور علماء کی اس سے تبلیغی دلچسپیاں اور اس کی حفاظت کا دل سے چاہنا پھر اس کے دیار وامصار میں پھیلانے والے عوامل اور ایسے اسباب جو ان عوامل کی ہمت شکنی کرتے، پوری طرح قلع قمع کرنا، علماء کا اس کی اشاعت میں تن من دھن کی بازی لگا دینا، پورے دور اشاعت احادیث میں جاری رہا۔

چنانچہ اس راہ میں بہت سی پیچیدگیاں میرے سامنے آئیں، شبہات نے جن پیچیدگیوں کو ابھارا ان کا مناقشہ کرنا پڑا، ان کی تردید کرنی پڑی، میں نے سچائی کو دلائل سے واضح کیا، براہین سے ان کی قلعہ بندی کی، اس طرح اس موضوع کو ایک تمہید، پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر ترتیب دیا۔

تمہید میں دو باتیں ہیں:

☆ اول: سنت کی لغوی و شرعی تعریف،

☆ دوم: سنت کا موضوع اور اس کی قرآن کے مقابلہ میں حیثیت،

پہلا باب:
سنت عہد نبوی میں

اس میں حدیثوں کو رسولؐ خدا کے معلم و مربی ہونے کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور رسول خدا کا موقف علم کیا تھا اور آپؐ کا انداز تبلیغ اور اپنے اصحاب کو تعلیم دینے کا طریقہ پھر صحابہ رسول خدا سے آپ کی سنتیں کس انداز سے لیتے تھے اور یہ کہ احادیث نبوی خود رسول خدا کے زمانہ میں کس حد تک پھیل گئی تھیں۔

دوسرا باب:
سنت، صحابہ اور تابعین کے زمانے میں، اس میں دو فصلیں ہیں:

پہلی فصل جس میں چار مباحث ہیں:

پہلی بحث صحابہ اور تابعین کی رسول خدا کی اقتدا اور سنت کی پیروی،

دوسری بحث صحابہ اور تابعین کی روایت حدیث میں احتیاط و بیدار مغزی،

تیسری بحث قبول حدیث میں صحابہ و تابعین کی حق شناسی و ثابت قدمی،

چوتھی بحث اس دور میں روایت حدیث کا کیا انداز تھا باللفظ یا بالمعنیٰ؟

دوسری فصل اس میں تین مباحث ہیں:

پہلی بحث صحابہ و تابعین کے دور میں علمی جدوجہد،

دوسری بحث صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں حدیث کی اشاعت،

تیسری بحث طلب حدیث کے لیے اسفار،

تیسرا باب:
وضع حدیث، اس میں چار فصلیں ہیں:

فصل اول	حدیث گھڑنے کی ابتدا اور اس کے اسباب،
فصل ثانی	صحابہ وتابعین کی وضع حدیث کا مقابلہ کرنے کی انتھک کوشش اور حفاظت حدیث،
فصل ثالث	سنت کے سلسلہ میں بعض مستشرقین اور ان کے ہم مثل کی آراء اور ان پر نقد وتبصرہ،
فصل رابع	رجال اور موضوعات کے سلسلے میں لکھی جانے والی مشہور کتابیں اور علماء کی حفظ حدیث میں انتھک کوششوں کے ثمرات ونتائج،

چوتھا باب:
تدوین حدیث کس زمانہ میں ہوئی؟ اس میں تین فصلیں ہیں:

پہلی فصل	تدوین حدیث پر گفتگو، سنت کی کتابت کی باتیں، کتابت کی ناپسندیدگی کے اقوال، اس سلسلے میں وضاحت اور ان مناقشات کے خلاصے،
دوسری فصل	حضورؐ کے زمانہ میں تدوین حدیث کس منزل میں تھی یا آغاز اسلام میں اس کا کیا حال تھا،
تیسری فصل	تدوین کے بارے میں خیالات ونظریات،

پانچواں باب:
مشہور راویان حدیث میں سے بعض صحابہ اور تابعین،
اس میں دو فصلیں ہیں:

فصل اول — صحابہ میں سے بعض نام آور رواۃ حدیث، صحابی کی تعریف،

صحابی کی عدالت، مکثرین حدیث کا ذکر جو حسب ذیل ہیں:

(۱) ابو ہریرہ (۲) عبداللہ بن عمر (۳) انس بن مالک (۴) عائشہ ام المومنین

(۵) عبداللہ بن عباس (۶) جابر بن عبداللہ (۷) ابو سعید خدری،

فصل ثانی — تابعین میں سے بعض مشہور رواۃ حدیث،

(۱) سعید بن المسیب (۲) عروۃ بن الزبیر (۳) محمد بن مسلم بن شہاب الزہری

(۴) نافع مولی ابن عمر (۵) عبید اللہ بن عبداللہ (۶) سالم بن عبداللہ بن عمر

(۷) ابراہیم نخعی (۸) عامر الشعبی (۹) علقمہ النخعی (۱۰) محمد بن سیرین،

کوئی کہہ سکتا ہے کہ پانچویں باب کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ کتب تراجم میں ان کا ذکر پوری طرح موجود ہے۔ لیکن مجھے یہ خیال گزرا کہ اگر میں صحابہ میں سے بعض رجال حدیث کو ترک کردوں تو ایک ایسی بات ہوگی کہ معیاری افراد جنھوں نے سنت کے بقا میں انتھک سعی کی، پوری جگر کاوی کا ثبوت دیا، صحیح وغلط کی چھان بین کر کے سنت صحیح ہم تک پہنچایا ہو، انہی کا ذکر چھوڑ دیا جائے مناسب نہیں معلوم ہوتا، بالخصوص ایسے حالات میں کہ بعض ہوا پرست مستشرقین نے رواۃ حدیث کے بلند پایہ لوگوں پر زبان طعن دراز کی ہے۔ اس لیے میں نے بحث کو آخری مرحلہ تک پہنچانے میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ ان طعنوں اور افترا ات کا تار و پود بکھیر دوں اور بغیر ان کے حالاتِ زندگی کے ذکر کے یہ چیز حاصل نہ ہوتی اور پوری طرح سچ اور جھوٹ کی قلعی نہ کھلتی، پھر اُمہات کتب اس زمانہ میں نایاب ہیں، طالبین علم کو ان تک پہنچنا مشکل ہے، اس لیے میں نے اس باب کا اضافہ کر دیا اس طرح میں نے اس دور میں سنت کی ترقی و تنزل کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے، حدیث کے مشہور حفاظ اور ناقلین حدیث کو اجاگر کر دیا ہے۔

خاتمہ: بحث کا ایک عمومی خلاصہ ہو گا،

مجھے اپنے خدا سے اس کی پوری امید ہے کہ اس موضوع کو اس انداز میں پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا جس سے مقصود نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ میں نے اپنی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے سکت بھر جدو جہد کر لی ہے پھر بھی مجھے اس بحث کو کمال تک پہنچانے کا دعویٰ نہیں ہے اتنا ضرور ہے کہ طالبین جب اس بحث کی طرف رجوع کریں گے تو سنت کی تفہیم و تعلیم کی تگ و دو میں انھیں میری جانب سے کسی کمی کا احساس نہ ہو گا۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ شریعت اسلامی کی سدا رہنے والی تعلیمات کی تعلیم و تدریس کی ایک بڑی جماعت کو توفیق عطا فرمائے اور شریعت کو سمجھنے اور اس میں مطابقت و یکسانیت پیدا کرنے کی کامیاب سعی سے نوازے۔ عرب اور دُنیا کے ہر حصہ کے مسلمانوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے اوپر مجتمع فرما دے تا کہ ہم سیدھی راہ چلتے رہیں اور دنیا میں سنت کی شادابی و ترو تازگی کا دور واپس لائیں اور اس کی سعادتوں کو اسی انداز سے حقیقت بنائیں جیسا کہ ہمارے اسلاف نے کیا۔

اب ہم اپنے استاذ نگراں و مشیر کے مشکور ہیں جنھوں نے اپنی مشغولیتوں کے باوجود اپنے کرم و عنایات سے نوازا، اسی طرح دوسرے اور رفقاء کا بھی مشکور و ممنون ہوں جنھوں نے ہر قدم پر مدد فرمائی۔

آخر میں جو لوگ مطالعہ فرمائیں گے ان سے درخواست ہے کہ اگر کسی تبدیلی یا استواری مضامین کی ضرورت سمجھ میں آئے تو اپنے مفید مشورہ اور علم سے باخبر فرمائیں گے، اللہ سے ہدایت اور درستگی کی دعا ہے۔

۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ — محمد عجاج الخطیب

۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۲ء

تمہید
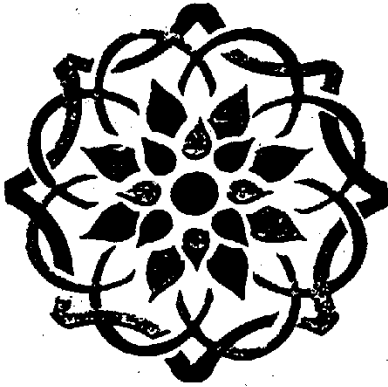
سنت کی لغوی و شرعی تعریف

سنت کا مقام اور اس کا قرآن کریم کی زبانی اثبات:

آسمانوں سے پیام رسانی کا سلسلہ خدا نے اسلام کے پیام کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی، بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا۔ خدا کی طرف پکارنے والا چمکتا سورج بنایا (احزاب)

آپؐ کو نبوت سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ۶۱۰ سال بعد نوازا جب آپؐ اپنی عمر کے ۴۰ سال میں آگئے تھے، آپ کو ہمیشہ ہمیش رہنے والے عہدۂ نبوت اور بلند مرتبہ رسالت کا بوجھ برداشت کرنے کے لائق بنایا، آپ کو تمام انسانوں تک مکمل حق رسانی کے لیے مامور فرمایا اور یہ اعلانیہ اپنی طرف سے قرآن میں جاری فرمایا کہ آپؐ پوری انسانی برادری کو مخاطب فرما کر اعلان کر دیں ''میں خدا کا پیغمبر ہوں تم سب لوگوں کے لیے وہ خدا جس کی حکومت میں آسمان اور زمین کے سارے طبقات ہیں، وہ خدا بزرگ ہے، ایک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، پس تم لوگ اپنے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا جو رسول کہ نبی بھی ہے اور امی بھی اور وہ رسول جو خدا پر کلی یقین رکھتا ہے، اس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔'' خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ کریں، اس کے لیے قرآن نے یہ حکم دیا ''اے رسول آپ کو جو کچھ خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، پہنچا دیجئے اگر آپ نے ان نازل کردہ باتوں کو نہیں پہنچایا

تو گویا آپ نے خدا کی پیغام رسانی کا حق نہیں ادا کیا، اور آپ کا خدا آپ کو لوگوں سے بچانے کا وعدہ کرتا ہے خدا ایسی قوم کو جو کفر پر تلی ہو راہ یاب نہیں بناتا۔" (الاعراف)

پھر تبلیغ دین اسلام کے مدارج کا تعین فرمایا کہ ابتدا اپنے گھر و خاندان سے کیجئے، اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے اور اپنا دامنِ کرم پھیلا دیجئے ان کے لیے جو آپ کے پیرو ہوں مومنین میں سے۔ (الشعراء)

یہ اعلانیہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی قوم کی رہنمائی رشد و ہدایت کی طرف کرسکیں تاکہ وہ تبلیغ رسالت کی ذمہ داریوں کو لیکر دوسری قوموں تک پہنچ سکیں، اس طرح انھیں دین کی تبلیغ کا شرف حاصل ہو کر مبلغ و ہادی ہونے کی نیک نامی نصیب ہو اور ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے۔ یہی رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کو ہادی بنا کر بھیجنے میں خدائے پاک کا ارادہ تھا، اسی طرح امت عربی جس نے پوری دنیا کو ظلم و سرکشی سے آزاد کرانے کا بیڑا اُٹھایا، اسے بھی یہ شرف نصیب ہو۔ یہی امت عربی ہے جس نے انسانیت کے بیڑے کا رخ امن و عافیت کے ساحل کی طرف موڑ دیا۔ انسانیت کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی راہ پر لائی جس سے حق و ہدایت کی راہ طے کرنا آسان ہوگئی۔ انسان جو صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور ضلالت و گمراہی کی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں، اُنھیں خواہش نفسانی کے تیز جھوکے جدھر چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں، اور سرکشی کے تیز جھوکے اُنھیں اڑتے ہوئے ذرات بنائے پھرتے ہیں۔

عربوں کو سیدھی راہ پر لگا دینا کچھ آسان نہ تھا۔ خدا کے رسول نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے، غیر معمولی اذیتیں اٹھائیں۔ یہ تکلیفیں صرف جسمانی نہ تھیں بلکہ اس کے لیے مال و متاع، اہل و عیال، احباب و وطن سبھی کچھ تج دینا پڑا۔ پیغمبر نے رات دن کی محنت سے یہ مہم سر کی۔ کھلے چھپے ہر صورت میں تبلیغ دین کرتے رہے اور اللہ سے ثابت قدمی اور رشد کی دعا مانگتے اس امید کے ساتھ کہ ان کی قوم ہدایت پا کر اس رسالت کا بوجھ اٹھائے گی اور حق امانت ادا کرے گی۔

پیغمبر خدا وحی سے نوازے جا رہے ہیں اور آپ کی قوم اپنے آباء کے طریق پر ہے بتوں

سے تعلق، مورتیوں کی پوجا، ان کا قبیلہ والا نظم سب سے بلند خون اور رشتہ ایک دوسرے کو ملانے والا تھا، کوئی خدائی طاقت ان پر حکمراں نہ تھی بلکہ وہ اپنی عادتوں اور مراسم کے پرستار تھے ان کا کام ایک دوسرے پر فخر کرنا، ڈینگیں مارنا، نسب کی بڑائی، شیخی کی حد تک ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے کو بلند کرنے پر لگے رہتے۔ جزیرۃ العرب کی چہار دیواری میں قبیلہ اور خاندان تک ان کا دائرہ پھیلا ہوا تھا، اسی محدود دائرے میں یہ گھرے ہوئے تھے۔

اپنی ذات، قبیلہ اور اپنے پرکھوں کی عادتوں کی نگہداشت اور اپنے کو اعلیٰ معیار پر ثابت کرنے میں وہ اپنی جان تک کھپا دیتے، ان چیزوں نے ان کے دلوں میں وہ جذبہ پیدا کر دیا تھا جس کے لیے وہ اسراف سے کام لینے میں بڑے داتا تھے، ممکن حد تک مہمان نوازی میں خرچ کرتے اس کے لیے اسراف کی سرحد بھی پار کر جاتے۔

عار سے سخت نفرت تھی حتیٰ کہ اس کے لیے جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہ تھی، اسی عار کے پیش نظر اپنی جگر گوشہ بچیوں کو زندہ درگور کرتے کہ کہیں دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے نہ کسی کو اپنی عصمت حوالہ کرنی پڑے، وہ مجد و بہادری کو دل سے پسند کرتے مگر سچ یہ ہے کہ انھوں نے اپنا راستہ کھو دیا تھا اور ایسے عقیدہ سے بے نیاز ہو گئے تھے جو انھیں جادۂ راہ تک پہنچا دے، پاکیزگی اور عزت نفس ان کا اخلاق تھا اور بلند حوصلگی بہادری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ حمیت اور بدلہ لینا ان کی رگوں میں پیوست تھا۔ پیش روی اور تیز قدمی کے ساتھ وہ بیدار ہوتے، معمولی معمولی باتوں پر ابھر جاتے، اگر کسی قبیلہ کے کسی فرد کے ساتھ کوئی اہانت آمیز سلوک کیا جاتا تو اس قبیلہ کا ہر چھوٹا بڑا اس کا بدلہ لینے کے لیے مستعد ہو جاتا، اس لیے کہ کسی ایک کی آبرو سارے قبیلہ کی آبرو ہے، اس پر ان کی جنگیں شاہد عدل ہیں، ان جنگوں کا تاریخی مطالعہ بڑی حد تک اس کے سمجھنے میں مددگار ہوگا۔

ان کا غیر معمولی حافظہ اشعار اور نسب دونوں ہی کو یادداشت میں محفوظ رکھتا، ان کی حفاظت میں ان کی یادداشت تاریخی ریکارڈ کا کام کرتی، یہ وہ چیزیں تھیں جو اسلام کے احکام کو قبول کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

وہ بتوں کی پوجا ضرور کرتے تھے مگر ان بتوں کو خالق اور کونین کا مدبر اور شئون کا مدیر نہیں جانتے تھے بلکہ محض قربت الٰہی کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے (مانعبدھم إلالیقربونا الی اللہ زلفا) "ہم محض قرب خداوندی کے لیے ان کی پوجا کرتے ہیں۔" ہندوستان اور فارس کے باشندوں کی طرح ان کے عقائد الجھے ہوئے اور کسی خاص ترکیب سے گرہ بند نہ تھے، بلکہ وہ بے غبار طبیعت کے تھے، بلکہ یہ کہنا ممکن ہے کہ ان کو عقیدہ کی ایسی وسعت حاصل تھی جس پر ان کے پرانے اعتقادات وعبادات نے ستر پوشی کر رکھی تھی اور جو اسلام کے مکمل اور مربوط عقیدہ کے سامنے ٹک نہ سکے، یہی وہ بات ہے جو عرب کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں ممتاز کرتی اور ان کی انہیں صفات نے بعد میں انھیں اسلامی فوج اور خدا کے دین کا ہراول (پیش رودستہ) بنادیا۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ سب کچھ آسان نہ تھا کہ عرب اول دن سے ہی رسول خدا کی دعوت قبول کرتے، اس لیے کہ گلے میں پڑا دام گھٹتے گھٹتے گھٹتا ہے، باپ دادا کے طریق کو چھوڑ کر اسلام کی راہ پر آجانا کچھ کھیل نہ تھا، چنانچہ جب آپؐ نے انھیں ایک خدا کی طرف بلایا تو ان کا قریب ترین آدمی چیخ پڑا، بُرا ہو کیا تم نے ہمیں ان ہی کاموں کے لیے جمع کیا تھا، خدا کے رسول کو اس دعوت کی راہ میں بڑی اذیت اُٹھانی پڑی، آپؐ پر ایمان لانے والے بہت مختصر تھے، آپؐ کی اہلیہ، ان کے کچھ لوگ، خود اپنے گھر کے چند افراد، مگر آپؐ دعوت میں لگے رہے اور اس سے بیزار نہ ہوئے۔ کفار آپؐ کا مذاق اُڑاتے، اس سے آپ اپنے کام میں اور چوکس ہو جاتے اور آپ کی امید اور بندھ جاتی، قرآن کریم نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو کچھ اُتارا ہے اس کی اتباع کرو تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اتباع اسی کی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے پرکھوں کو دیکھا ہے، چاہے ان کے آباء کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت کی راہ پر ہوں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آجاؤ خدا کی اتاری ہوئی چیز اور رسول کی جانب، تو کہتے بس ہمیں یہی

بس ہے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، بھلے ہی ان کے پر کھے نہ کچھ جانتے ہوں نہ ہدایت کے راستہ پر ہوں۔"

یہ الگ بات ہے کہ باطل سچائی کے سامنے نہیں ٹھیرتا، بڑی تیزی سے ڈھل جاتا ہے اور اس کی کمزوری کھل جاتی ہے، جیسے وہ تاریکی جس کے پیچھے جگمگاتی روشنی ہو جلد ہی ناپید ہو جاتی ہے۔

اسلام دھیرے دھیرے مکہ میں دلوں پر غالب آنے لگا، اس کی روشنی یثرب کے کچھ باشندوں تک بھی پھیل گئی، اب مسلمانوں کو مشرکین ستانے لگے، ان کا ستم بڑھتا گیا اور ان کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا، اپنے دین کی حفاظت کے لیے رسول خدا کی سربراہی میں مدینہ میں اسلامی سلطنت کا آغاز ہوا، اسلام کی بات جزیرۃ العرب میں پھیل گئی، مشرکین کی گمراہیاں عربوں کو خدا کے دین میں داخل ہونے سے نہ روک سکیں، وہ دین جس میں مساوات و انصاف تھا، آسان اور خالص عقیدہ تھا، ایک خدا پر ایمان، اس کے رسول کی فرمانبرداری اور ایسی عبادتیں جو دلوں میں خوش بختی اور اطمینان کی لہر دوڑا دیتی ہیں، اسلام ایک ایسا نظام ہے جس میں جماعتی نظم وضبط کے ساتھ افراد و اشخاص کے حقوق بھی محفوظ تھے، یہ وہ خوبی تھی جس نے ہر جانب سے عرب قبائل کو مدینہ کے رخ پر مارچ کرنے اور اپنا اسلام ظاہر کرنے کا موقع دے دیا اور فتح مکہ کے بعد تو اسلام سارے عرب میں عام ہو چکا تھا، خدا کے دین میں لوگ گروہ درگروہ داخل ہونے لگے، اب مکہ مدینہ ہی نہیں سارا جزیرۃ العرب ایک اسلامی اسٹیٹ بن گیا جہاں ہدایت کا نور پھیل کر ساری دنیا کو روشن کر رہا تھا۔

دین کی ایسی تیز رو اشاعت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیس سال کچھ مہینوں میں مکمل فرمائی، اس دین حنیف کو اپنی گردن کا ہار بنا کر قبیلہ کی قید و بندشوں کو نکال پھینکا اور انسانیت کے وسیع میدان میں آگئے اور ریگستانی حلقوں سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیل گئے، خون اور رشتے کے تعلقات دینی اخوت میں تبدیل ہو گئے، قبیلہ کا محدود نظام ختم ہوا، زندگی کے مختلف و متنوع مراحل میں نظام دولت اسلامی کا چلن ہو گیا، قبیلہ پرستی کا

جذبہ درست وحق کہنے میں استعمال ہونے لگا اور نسب کی بڑائی اور شیخی کے بجائے قربانی و خدمت اسلام پر فخر کرنے کے جذبہ میں بدل گیا، ہیرو پرستی، بُت پرستی کے بجائے رضائے الٰہی اور خوشنودی رسول کا مقام حاصل کرلیا۔ ان کا دائرۂ شجاعت و جرأت جو قبائل کے گھروندوں تک محدود تھا، اب وہی شجاعت دین کی نشر و اشاعت میں لگ گئی اور دامن کرم جو اسراف تک پھیلا ہوا تھا اسے ضرورت مندوں، بے نواؤں کی اعانت میں بدل دیا، ان کا مال اب ان معتقدات کے دفاع میں خرچ ہونے لگا، دین شریک بھائیوں کی مدد میں صرف ہونے لگا، لوگوں کو غلامی کے عار سے نکال کر دنیا کی ساری قوتوں کو صرف ایک خدا کی عبادت اور آزادی کی راہ پر لگادیا، اس طرح اب اسلام ان کے لیے بڑے مرتبہ کی چیز تھا، جیسا کہ قرآن نے فرمایا:

"وانه لذكرلك و لقومك و لسوف تسألون"۔ "تمہارے لیے یادگار ہے اور تمہاری قوم کے لیے فہمائش اس خیر عظیم سے" (زخرف)

عرب واقعی میں اس آیت کے مصداق تھے، جیسا کہ قرآن نے اعلان فرمایا:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (آل عمران)

"تم بہترین امت ہو جو مثالی طور پر دنیا کے سامنے ہے جو پسندیدہ امور کا حکم کرتی اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتی اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتی ہے"۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا، اس سے یہ بات کھلے طور پر معلوم ہوگئی کہ یہ عرب ہی تھے جن کے نفوس پر عمدہ صفات کا غلبہ تھا اور اچھی عادتوں نے جڑ پکڑ لی تھی جس کی پشت پر مضبوط جذبات وعلو ہمتی کارفرما تھی، لیکن ان کے اندر صالح عقیدہ اور عمدہ نظام زندگی کی کمی تھی۔ جب انھوں نے اسلام میں ان دونوں باتوں کو پالیا تو ان کو اس دین کے صحیح رخ پر ہونے کا یقین ہوگیا، وہ اس دین کے اعلیٰ درجہ کے محافظ اور سب سے پہلے داعی بن گئے اور اسی وجہ سے انھوں نے دلوں کے پٹ رسول کریمؐ کے لیے کھول دیئے اور ان کی باتوں پر پورا

دھیان لگایا اور اس دریا میں غوطہ لگانے لگے جو کبھی خشک ہونے والا نہ تھا، تعلیم اسلامی خود اس کے رہنما سے حاصل کرنے لگے تا کہ وہ سارے انسانوں کو صحیح راہ دکھانے میں کامیاب ہو جائیں، اس طرح عربوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کا فطری رجحان جس کے لیے عرب تمام دنیا میں ممتاز تھے، نئے پیدا شدہ روحانی عوامل نے مل کر وہ شاخیں نکالیں جس نے نور کی قندیلوں کو زندگی بخشی اور سچائی کا پوری دنیا میں ڈنکا بجا دیا، قرآن کریم پاکیزہ سنت دونوں ہی پوری اخلاص و امانت کے ساتھ نقل کر کے دوسروں تک پہنچانے لگے، چونکہ ہمیں یہاں سنت ہی کا بیان کرنا ہے، اس لیے ہم اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

تعریف سنت

ا۔ سنت کے لغوی معنی

سنت بمعنی سیرت، اچھی بُری دونوں ہی پر لفظ سنت کا اطلاق ہوتا ہے، خالد بن عتبہ ہذلی کا شعر ہے:

فلا تجزع من سيرة أنت سرتها   فأول راض سنة من يسيرها

کسی ایسی سیرت سے جس پہ تم خود چلے ہو اظہار بیزاری نہ کرو، اس لیے کہ کسی سیرت پر راضی ہونے والا وہی ہے جو خود اس پر چل چکا ہے۔

اسی طرح لغوی معنوں میں ہے کہ سننتها سنا (میں نے ایک طریقہ وضع کیا)، سننت لكم سنة فاتبعوها (میں نے تمھارے لیے ایک طریقہ ایجاد کیا اسے اختیار کرو) استننت بسيرة فلان (میں نے فلاں کی سیرت اختیار کی)، اور حدیث میں ہے: من سن سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها ومن سن سنة سيئة فله مثلها، (جس نے کسی اچھی روش کی ایجاد کی تو اس کا عمدہ بدلہ ملے گا اور

جو بھی اس روش پہ چلے گا اس کا بھی اجر اسے ملے گا) کسی نے بری سیرت اختیار کی تو اسے اسی جیسا اجر ملے گا، یا کسی نے کسی کام کو شروع کیا اس پر اس کے بعد ایک قوم نے عمل کیا تو اسے کہتے ہیں ھو الذی سنہ (یہ اس کی سنت ہے۔)

نُصیب کا کہنا ہے:

كأني سننت الحب أول عاشق   من الناس اذ أحببت من بينهم وحدي

(محبت کرنے کی داغ بیل میں نے ہی پہلے عاشق کی حیثیت سے ڈالی جبکہ میں نے ہی اکیلے محبت کی سنت جاری کی)

سنت کا ذکر حدیث میں بار بار آیا ہے اور اس کی گردانیں بھی آئی ہیں اور اصل اس میں راہ اور روش ہی ہے، شریعت میں مطلقاً اس کا معنی یہ ہے کہ جس چیز کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، یا آپؐ نے اس کے لیے کہا، یا آپؐ نے بھلا جانا قولاً و فعلاً۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں شریعت کے دلائل کتاب اور سنت ہیں، مراد قرآن اور حدیث ہے۔

۲۔ سنت کے شرعی معنی

سنت کے معنی اصطلاح اہل شریعت میں ان کے فنون و اغراض کے پیش نظر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سنت کے معنی اہل اصول کے یہاں الگ ہے اور محدثین و فقہاء کے یہاں کچھ اور معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس کے معنیٰ کا تعین ان علوم کے مطابق کئے جاتے ہیں۔

(۱) علمائے حدیث کے زیر بحث رسول کریمؐ کی ذات مبارکہ ہوتی ہے جو امام اور ہادی کی حیثیت رکھتے ہیں، خدا نے پیغمبر کے بارے میں خود ہی فرمایا کہ وہ ہمارے لیے معیار اور راہنما ہیں، اس لیے محدثین نے پیغمبر سے ہر اس بات کو نقل کیا جس کا تعلق سیرت، اخلاق، شمائل، اخبار، اقوال، افعال رسول کریم سے ہے، اس سے بحث نہیں کہ ان منقولات سے کوئی حکم شرعی اخذ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

(۲) علمائے اصول رسول خدا کی ذات گرامی کو بس اس حیثیت سے زیر بحث لاتے ہیں جس سے ان مجتہدین کے لیے جو حضورؐ کے بعد دنیا میں آئے، قواعد وضع کیے جائیں، اور انسانوں کے لیے دستور حیات کی وضاحت کی جا سکے۔ اس وجہ سے انھوں نے رسولؐ کے اقوال وافعال وتقریر کے ان پہلوؤں کا اہتمام کیا جن سے احکام کا اثبات ہو سکے۔

(۳) علمائے فقہ نے رسول خدا کی ذات گرامی کو اس حیثیت سے اپنا موضوع بنایا کہ آپؐ کے افعال سے حکم شرعی کے لیے دلیل نکال سکیں، فقہاء حکم شریعت بندوں کے افعال میں اس حیثیت سے زیر بحث لاتے ہیں کہ اس سے وجوب، حرمت اور اباحت وغیرہ کا حکم اور علم ہو سکے۔

خلاصۂ کلام

سنت: محدثین کے نزدیک

سنت اصطلاح محدثین میں ہر اس چیز کو کہیں گے جو رسول خداؐ سے منقول ہے، آپ کا قول ہو، فعل ہو، سکوت ہو، آپؐ کی شکل وصورت اور عادات سے متعلق ہو یا آپؐ کے عادات مبارکہ سے اس کا تعلق ہو یا آپ کی سیرت پاک سے اس کا لگاؤ ہو، سیرت، قول، فعل، تقریر، آپ کی بعثت سے پہلے مثلاً غار حرا کی خلوت گزینی یا بعثت کے بعد کی بات ہو، سب سنت کی تعریف میں داخل ہے۔

اس معنی میں سنت حدیث نبوی کے مرادف لفظ ہے۔

سنت: علمائے اصول فقہ کے نزدیک

ہر وہ چیز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئی اور قرآن کریم کے علاوہ صادر ہونے والی شے ہو مثلاً آپ کا قول، فعل، تقریر جس میں کسی حکم شرعی کے دلیل ہونے کی صلاحیت ہو۔

قول:

ان احادیث کو کہیں گے جسے آپ نے مختلف اغراض اور مناسبات کے پیش نظر زبان سے کہا ہو اور اس سے کسی حکم شرعی کا پتا چلتا ہو، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا لا وصية لوارث یا آپ کا فرمانا لا ضرر ولا ضرار یاز کوٰۃ زروع کے سلسلے میں فیماسَقَتِ السماؤ والعیونُ أو کَانَ عَشَرِیاً العُشر وماسقی بالنضح نصف العشر یا سمندر کے بارے میں آپ کا فرمانا ھو الطھور ماؤہ الحل میتته۔ آپؐ کے فعل سے مراد وہ افعال ہیں جو آپ کے صحابہ نے ہم تک نقل کیا ہو، مثلاً نماز پنج گانہ کی ادائیگی انہیں طریقوں اور اندازوں میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مناسک ادا کر کے ہمیں بتانا یا آپ کے فیصلے گواہی لے کر ہوں یا قسم لے کر یہ آپ کے فعل کی مثال ہے۔

تقریر:

ہر وہ چیز جس کا جناب نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم سے اقرار ثابت ہو یعنی صحابہ کے کسی قول کسی فعل کو سن کر یا دیکھ کر آپؐ نے خاموشی اختیار کی ہو یا اس کا انکار اور منع آپ سے ثابت نہ ہو یا آپ نے اس کی موافقت کی ہو یا اس کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہو یا تائید کی ہو قولا یا فعلا۔ اسی طرح جو بات کبھی صحابہ سے صادر ہوئی اور اس کو موافقت یا اقرار نبی حاصل رہا تو گویا وہ خود پیغمبر خدا سے صادر ہوئی۔ اسی تقریر کے قبیل سے وہ روایت ہے جو حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ دو آدمی سفر پہ نکلے ان کے پاس پانی نہ تھا نماز کا وقت آ گیا، دونوں نے تیمم کر لیا پھر نماز ادا کر لی، نماز پڑھنے کے بعد ان کو پانی میسر آیا اور وقت نماز بھی باقی تھا، ان میں سے ایک نے وضو کیا اور نماز کا اعادہ کیا، دوسرے نے اعادۂ نماز نہیں کیا، دونوں سرکار میں حاضر ہوئے اور اس بات کا ذکر کیا، آپؐ نے اس شخص سے جس نے اعادۂ صلوٰۃ نہیں کیا تھا، فرمایا تم نے ٹھیک طریقہ اختیار کیا اور جس نے اعادہ کیا اس سے آپ نے فرمایا تم کو دہرا بدلا ملا۔

اس تقریر کے قبیل سے وہ بات بھی ہے جس میں صحابہ نے اجتہاد کیا تھا غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر نماز عصر کے معاملے میں جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم نماز عصر بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کرو گے۔ اس سے جن صحابہ نے یہ سمجھا کہ یہ حکم حقیقت پر مبنی ہے، ان لوگوں نے عصر کو بعد مغرب ادا کیا اور جن لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ آپ کا فرمان تیز رفتاری سے منزل تک پہنچنا ہے، انھوں نے عصر وقت پر ادا کی۔ ان دونوں گروہوں کے عمل کی اطلاع حضور کو پہنچی، تو آپؐ نے دونوں کو درست فرمایا، کسی فعل کے پر انکار نہیں کیا۔ اسی تقریر کے ثبوت میں وہ واقعہ ہے جس میں حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ معاذ تم یمن میں فیصلے کیسے صادر کرو گے۔ تو اس کا جواب حضرت معاذ نے دیا کہ میں قرآن کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ آپ نے دریافت کیا کہ اگر کتاب اللہ میں وہ بات نہ ملے، تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا کہ سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو؟ حضرت معاذ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ آپ نے مسرت سے میرے سینے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے، اس نے اپنے رسول کے ایلچی کو اسی کی توفیق دی جو خدا کا رسول پسند کرتا ہے۔

سنت: فقہاء کی اصطلاح میں

رسول خدا سے جو بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے اور وہ نہ فرض ہو نہ واجب، دین کا یہ طریق قابل اتباع ہوگا مگر یہ اتباع نہ فرض نہ واجب۔

سنت: فقہاء کی اصطلاح میں بدعت کے مقابل بھی بولی جاتی ہے اور بدعت دین میں نوزاد چیز کو کہتے ہیں، پھر شریعت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو لوگوں نے ایجاد کیا ہو، گفتار ہو کہ کردار، دین بنا کر یا شعائر دین بنا کر امت کے سامنے پیش کیا اور اس سلسلے میں کوئی اثر آنحضرت کا موجود نہ ہو، نہ آپ کے اصحاب ہی سے منقول ہو۔ رسول خدا نے فرمایا کہ ہماری شریعت میں کسی نے اگر ایسی بات ایجاد کی جو شریعت میں نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔

اسی بنیاد پر کہتے ہیں کہ فلاں سنت پر ہے، یعنی اس کا عمل بالکل اسی انداز کا ہے جو رسول خدا کا رہا ہے، یا آپ کے اصحاب کا عمل رہا یا اور بولتے ہیں فلاں بدعت پر ہے جب کہ وہ رسول خدا اور ان کے اصحاب کے خلاف عمل کرے یا دین میں ایسی بات ایجاد کرے، جس پر سلف صالحین کا عمل نہ رہا ہو۔

کبھی سنت کا اطلاق محدثین اور علمائے فقہ کے نزدیک اس پر بھی ہوتا ہے جس پر اصحاب رسول اکرم کا عمل رہا ہو، خواہ قرآن میں ہو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اثر ہو یا صرف عمل صحابہ ہی ہو، اس کی مثال خود آنحضرت کا فرمان ہے کہ تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل ضروری جانو، اس کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھو، دوسرے موقع پر فرمایا کہ میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، مگر ایک کے علاوہ سبھی جہنمی ہوں گے، صحابہ نے پوچھا کہ وہ کون ہوں گے، آپ نے فرمایا کہ جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں۔

سنت صحابہ کے سلسلے میں جو باتیں ہمارے سامنے ہیں، اس میں سب سے زیادہ مہتم بالشان حد شراب خوری ہے اور کاریگر کی ضمانت اور عہد ابوبکر میں حضرت فاروق کی رائے پر مصاحف کا جمع کرنا اور قرأت میں صرف ایک قرأت کی پابندی، دفاتر کی ترتیب وغیرہ یا وہ قول وفعل جن کا صحابۂ کرام نے کسی مصلحت کے پیش نظر اہتمام کیا ہو یا فیصلہ نافذ کیا ہو۔

اپنی اس بحث میں سنت سے میری مراد وہی ہے جو محدثین کے نزدیک ہے، اور یہ جمہور محدثین کے نزدیک حدیث کے مترادف ہے۔ اگرچہ بعض ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حدیث وہ ہے جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہو اور سنت عہد اول میں پائے جانے والے عمل ماثور کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی احادیث بھی وارد ہوتی ہیں جو عمل شدہ سنت کے خلاف ہیں۔ ایسی صورت میں علماء کو موافقت و ترجیحات کا دامن اختیار کرنا پڑا۔ اسی چیز پر عبدالرحمٰن بن مہدی کے قول کو محمول کیا جاتا ہے کہ "میں نے سنت اور حدیث کے سلسلہ میں حماد بن زید سے بڑا عالم نہیں دیکھا"

اسی کے قبیل سے یہ بھی ہے جو سفیان ثوری، اوزاعی اور مالک کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ سفیان ثوری امام حدیث ہیں، امام سنت نہیں، اور اوزاعی امام فی السنۃ ہیں امام حدیث نہیں، اور مالک دونوں میں امام ہیں۔

سنت عہد اوّل میں قابل اتباع عمل تھا، اس پر حضرت علی کا یہ قول دال ہے جو انھوں نے عبداللہ بن جعفر سے شراب خور کو چالیس کوڑے لگائے جانے کے موقع پر فرمایا، بس کرو حضرت نبی کریمؐ نے چالیس کوڑے لگائے، اس طرح ابوبکر نے چالیس، عمر نے اسّی درے لگانے کا حکم دیا ہے اور یہ تمام عمل سنت ہے، ذیل میں ہم سنت کے لغوی وشرعی معنی بیان کرنے کے بعد ان الفاظ کی تشریح کریں گے جو اس فن کے متعلقین استعمال کرتے ہیں۔

۳: حدیث، خبر اور اثر کے معنیٰ

حدیث لغت میں نئی چیز اور حدیث خبر کو بھی کہتے ہیں، خواہ کم ہو خواہ بیش، جمع احادیث، خلاف قیاس جیسے قطیع کی جمع اقاطیع شاذ ہے۔

قرآن کا کہنا ہے:

إن لم یؤمنوا بهذا الحدیث أسفا، دوسری جگہ وأما بنعمة ربك فحدث، پہلے میں حدیث بمعنی قرآن دوسرے میں مرسل بہ کی تبلیغ کے معنی میں۔ اس طرح حدیث و خبر من وجہ مترادف لفظ ہوئے۔

مگر اس لفظ کے استعمال میں ترقی ہوئی اور اس طرح اس کا اطلاق دینی حلقوں میں ایک خاص قسم کے اخبار پر ہونے لگا، مگر اپنے اصلی معنی سے بھی الگ نہیں رہا، ابن مسعود کا فرمان، ان أصدق الحدیث كتاب الله و خیر الهدی هدی محمد صلی الله علیه وسلم "اسی طرح احسن الحدیث قرآن کریم کو کہنے لگے پھر اس کو خبر رسول کے لیے استعمال کرنے لگے چنانچہ ابو ہریرہ نے رسول خدا سے سوال کیا کہ اے خدا کے رسول قیامت کے دن آپ کی شفاعت کی سعادت کس کو ابتداء حاصل ہوگی، آپ نے فرمایا، میرا

خیال ہے اس قسم کا سوال تم سے پہلے اب تک کسی نے نہیں کیا، حدیث کے سلسلے میں تم غیر معمولی حریص ہو۔

ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ محدثین کے نزدیک سنت حدیث کے معنی میں مستعمل ہے، حدیث وہ خبر ہے جو پیغمبر سے ملی ہو، اور خبر کسی سے بھی ملی ہوئی بات کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے مشتغلین حدیث کو محدث اور تاریخی یا دوسری چیز کے حصول میں مشغولین کو اخباری کہتے ہیں۔

ابن حجر نے شرح نخبۃ الفکر میں لکھا ہے کہ خبر کو علمائے فن نے حدیث کے مرادف قرار دیا ہے، اس لیے یہ مرفوع، موقوف، مقطوع ہر قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے، اس طرح پیغمبر کی بات، صحابہ اور تابعین سے منقولات کو بھی خبر کہتے ہیں، اس طرح ان میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، ہر حدیث خبر ہے، البتہ ہر خبر حدیث نہیں ہے۔

محدثین مرفوع، موقوف، سبھی کو اثر کہتے ہیں، مگر فقہائے خراسان موقوف کو اثر اور مرفوع کو خبر کہتے ہیں۔

حاصل کلام

جب لفظ حدیث مطلقا بولا جائے تو اس سے مراد رسول خدا کی طرف جس چیز کی اضافت کی جائے، وہ عمل ہو، قول ہو، یا تقریر ہو یا آپ کی شکل وصورت یا عادت سے متعلق کوئی چیز ہو، تب لفظ حدیث بولا جاتا ہے یا کسی صحابی وتابعی کی طرف کسی بات کی نسبت کی جائے تو اس پر بھی لفظ حدیث بولا جاتا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ جب غیر نبی کی طرف اس کی اضافت ہو تو اس کو مقید کر دیا جائے۔

خبر اور اثر کا اطلاق بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق چیزوں پر ہوتا ہے، جب اسے صحابی یا تابعی کی جانب نسبت کرتے ہیں تو اسے بھی خبر واثر ہی کہتے ہیں، یہی جمہور کی رائے ہے، البتہ فقہائے خراسان موقوف کو اثر اور مرفوع کو خبر کہتے ہیں۔

حدیث قدسی

ہر وہ حدیث جس کی نسبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم باری تعالیٰ کی طرف فرماتے ہیں اسے حدیث قدسی یا حدیث الٰہی کہتے ہیں، حدیث قدسی تعداد میں سو سے کچھ زائد ہیں، بعض نے تمام احادیث کو اکٹھا کر دیا ہے، اور حدیث کی نسبت قدس کی جانب بمعنی طہارت وپاکیزگی ہے اور خدا اور پروردگار کی جانب بھی اس لیے کہ اس کا صدور باری تعالیٰ سے ہوا ہے، اس کا متکلم اول باری تعالیٰ ہے یا منشی اول خدائے پاک ہے، اور حدیث کہنے کی وجہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حکایت باری تعالیٰ کی جانب سے کرتے ہیں، اس میں اور دوسری احادیث میں فرق یہ ہے کہ اس کی نسبت خدا کی جانب ہے اور اس کی حکایت بھی اس کی طرف سے کی جارہی ہے گویا وہ خود قائل اور حاکی ہے اور دوسری احادیث میں یہ بات نہیں ہے۔ اب سنت کا مقام قرآن سے بیان کریں گے۔

سنت کا موضوع اور اس کی قرآن کے مقابلہ میں حیثیت

رسول خدا کے زمانے میں احکام کا مصدر قرآن اور سنت کے سوا کچھ نہ تھا، قرآن کریم میں احکام کے اصول عالیہ ہیں، اس میں تفصیل سے کوئی بحث نہیں ہے، نہ تفریع مسائل قرآن سے ممکن ہے۔ ہاں وہ احکام جو اصول ثابتہ سے ثابت ہیں اور ان پر سب کا اتفاق ہے اس میں زمانے کے تغیرات کوئی ردوبدل نہیں کر سکتے نہ اس میں لوگوں کے اختلاف معاشرہ وممیزات کی بنا پر کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ قرآن کریم ہر زمانے کے لیے یکساں ہے اور پوری امت مسلمہ کے لیے ہمیشہ اس کی بقا نفع بخش رہے گی، ان کا معاشرہ، ان کی عادات، طرز زندگی کچھ بھی ہو، وہ امت کی تمام تشریعی ضرورتوں کی کفالت کی ضمانت ترقی وتنزل کے ہر منزل میں دیتا ہے، لیکن اصول کتاب اللہ کی بنا پر ہم کو قرآن کریم میں عقائد، عبادات، امم سابقہ کی کہانیاں، اور آداب اور اخلاقیات، انفرادی واجتماعی کے اسباق ملتے ہیں۔

حاصل کلام قرآن کریم اور سنت میں توافق موجود ہے، سنت قرآن کے مبہم آیات کی

تفسیر کرتی ہے مجملات کتاب اللہ کی وضاحت کرتی ہے، قرآن کے مطلق احکام میں قیود لگاتی، اس کے عموم کو خصوص میں بدلتی، اور اس کے احکام کی تشریح کرتی، اور جن احکام میں قرآن کی نصوص وارد نہیں ہیں، ان کی صحیح نشاندہی کرتی ہے، اس طرح قرآن کریم کی عملی مطابقت سنت ہی سے پیدا ہوتی ہے اور تطبیق بھی ایسی عمدہ جو مختلف مظاہر پر مشتمل ہے، کبھی یہ سنت رسول خدا سے صادر ہونے والے عمل کی صورت میں ہوتی ہے، کبھی حضور کا ایسا قول جو کسی خاص موقع کے لیے آپ نے فرمایا تھا، کہیں یہ آپ کے صحابہ کا قول یا ان کا تصرف بن جاتی ہے، اس میں ان کا عمل سامنے ہوتا ہے یا ان کا قول قابل شنوائی و پذیرائی ہوتا ہے، کبھی اسے لیا جاتا ہے کبھی اسے اختیار کیا جاتا ہے، نہ تو اس پر اعتراض ہوسکتا ہے، نہ انکار ہی سامنے آتا ہے، بلکہ اس پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے یا اُس کا استحسان بیان کرتے ہیں، اس طرح آپ کی تقریر بن جاتی ہے۔

اس انداز خاص سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان ساری چیزوں کی وضاحت فرماتے ہیں جو قرآن کریم میں وارد ہیں اور صحابہ آپ کی وضاحت کو قبول کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ آپ کی اطاعت واتباع کے لیے مامور ہیں، ان میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ خطرہ نہیں گزرا کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی گفتار پس پشت ڈال دیں یا آپ کا کوئی عمل چھوڑ دیں، یہ ساری باتیں ان کو قرآن کریم سے ہی معلوم ہوئیں۔

ان الذين يبايعونك انما يبا يعون الله، يد الله فوق أيديهم فمن نكث فانما ينكث على نفسه، ومن أوفى بما عاهد عليه الله فيؤتيه أجرا عظيماً (سورۃ الفتح)

"سچ تو یوں ہے کہ جو لوگ بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے پھر جو پھرتا ہے اپنے قول توڑتا ہے، اور جو اقرار و عہد کو پورا کرتا ہے تو خدا اسے بڑا اجر دیگا"

"وأطيعوا الله وأطيعوا الرسول و احذروا" (المائدۃ)

"اطاعت خدا کرو اور رسول کی اطاعت بھی اور بچتے رہو"

من يطع الرسول فقد أطاع الله (سورۃ النساء)

''جو رسول کی فرمانبرداری کرتا ہے اس نے خدا کی فرمانبرداری کی''

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا (سورۃ الحشر)

''اور جو دے تم کو رسول لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ''

''فلا و ربك لایؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی أنفسھم حرجًا مما قضیت ویسلموا تسلیما'' (سورۃ النساء)

''آپ کے رب کی قسم ایمان نہیں ان میں جو آپ کو اپنے اختلاف میں حکم نہ مان لیں اور آپ کے فیصلہ پر دغدغہ نہ رکھیں دل سے مان جائیں''

اس طرح مسلمانوں نے سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی انداز سے قبول کیا جس طرح انھوں نے قرآن کریم کو قبول کیا، تاکہ خدا اور رسول کے حکم کی پابندی ہو سکے، اس لیے کہ سنت شریعت کا دوسرا بنیادی پتھر ہے، قرآن کریم کے بعد جس کے بنیاد ہونے کی شہادت خدا اور اس کے رسول دونوں ہی نے دی۔

سنت نے قرآن کی کئی حیثیتوں سے وضاحت کی، مثلاً جو احکام قرآنی مجمل تھے ان کی احادیث سے تفصیل معلوم ہوئی، مثلاً خدا نے مسلمانوں پر نماز فرض کر دی مگر نہ تو اس کے اوقات معلوم تھے، نہ رکعات کا پتہ، نہ ارکان ہی کا بیان تھا، خدا کے رسول نے اپنی نماز ادا کر کے مسلمانوں کو کیفیت نماز کی تعلیم دے کر اس کی وضاحت کر دی، چنانچہ آپؐ نے فرمایا صلوا کما رأیتمونی أصلی ''تم نے مجھے جس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح تم بھی نماز ادا کرو۔'' اسی طرح حج فرض ہوا، مگر اس کے مناسک معلوم نہ تھے، خدا کے رسول نے ان مناسک کی پوری کیفیت واضح فرمائی، اور فرما دیا'' خذوا عنی مناسککم میرے عمل سے مناسک کی ادائیگی معلوم کر لو۔'' خدا نے زکوٰۃ فرض فرمائی مگر اس کی وضاحت نہ تھی کہ مال و سامان زراعت میں کتنی زکوٰۃ واجب ہے، نہ یہی وضاحت تھی کہ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے، سنت نے ان ساری چیزوں کی وضاحت فرما دی۔

خدا کے رسول ہی کی وضاحت نے قرآن کریم کے عام احکام کی تخصیص کی، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے"یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین (سورۃ النساء)۔ خدا تمھاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہے کہ نر کا مادہ کے مقابل دوگنا حصہ ہے۔"

یہ ایک حکم عمومی تھا جس میں وراثت اولاد کا ذکر ہے، جو انھیں اپنے آباء وامہات یعنی والدین سے ملے گا، جو ہر مورث اور ہر وارث کے لیے یکساں ہے، مگر توریث انبیاء کا مخصوص حکم سنت سے معلوم ہوا، نحن معاشر الأنبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ، ہم انبیاء کے گھرانے کے لوگ ہیں جن کے درمیان وراثت نہیں ہے، ہم نے جو ترکہ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے ارث نہیں ہے (فتح الباری)۔ اسی طرح قاتل کا وارث ہونا بھی ختم کر دیا گیا، اگر کوئی قاتل ہو تو وہ کسی کا وارث نہیں قرار پائے گا، اس طرح سنت سے اس عموم میں تخصیص پیدا کردی گئی"لا یرث القاتل"(سنن ترمذی)۔

اسی طرح رسول خدا کے کلام سے مطلق قرآنی حکم میں قید لگائی گئی مثلاً قرآن کریم میں: والسارق والسارقۃ فاقطعوا أیدیھما۔ اس آیت میں چور کے ہاتھ کاٹنے کے مقام کا تعین نہیں ہے کہ یہ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا، اس لیے کہ ہاتھ کا اطلاق، ہتھیلی، کلائی اور بازو سب پر ہوتا ہے، مگر حدیث نے اس مطلق کو مقید کر دیا کہ یہ قطع ید پہنچا کے پاس سے ہوگا، خود پیغمبر خدا نے عملاً اس کو کر کے بتلایا، آپ کے پاس ایک چور لایا گیا جس کا ہاتھ آپ نے ہتھیلی کے جوڑ سے اتروائے (سبل السلام)۔

سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یا تو قرآن کریم کے احکام کا اثبات ہوتا ہے یا تاکید ہوتی ہے، یا کوئی ایسی فرع نکل آتی جس کی اصل پہلے سے موجود ہوتی ہے، اس کا ثبوت وہ احادیث ہیں جو نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے وجوب کو بتلاتی ہیں۔

اس سنت کی مثال جو اصل کتاب میں تفریع کا کام دیتی ہے مثلاً ایسے پھلوں کی خرید و فروخت پر پابندی جن میں پختگی کے آثار نہ ہوں، قرآن کریم میں خدا کا فرمان ہے:

"لاتأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" "آپس میں مال غلط انداز سے نہ کھاؤ، ہاں ایک دوسرے کی پسندیدگی سے تجارت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں" (النساء)

جب حضور ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے تو کاشت کاروں کو دیکھا کہ وہ درختوں کے پھل قابل فروخت ہونے سے پہلے ہی فروخت کر دیتے ہیں، یعنی خریدار کو اندازہ نہیں ہوتا کہ پھل کی مقدار کتنی ہوگی اور فصل کے اختتام تک وہ درختوں میں کتنے رہ جائیں گے، جب درختوں سے پھل لینے کا وقت آتا ہے اور نتیجہ بہتر نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے بائع اور مشتری کے مابین بہت سے لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، مثلاً کبھی ٹھٹھرا لگ جانے سے پھل جھڑ جاتے ہیں یا کسی درخت میں کوئی بیماری ہو جاتی ہے جس سے پورا ہی تباہ ہو جاتا ہے اور پھل بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور نے اس قسم کی بیع سے منع فرمایا جب تک پھل تیاری پر نہ آ جائیں اور خریدار کو اس کے مکمل ہونے کا یقین نہ ہو جائے، اس کی خرید و فروخت نہ ہونی چاہیے، اور فرمایا کہ خدا نے جب پھل روک لیا پھر کس طرح تم اپنے بھائی کا مال لینا چاہتے ہو۔

سنت میں بہت سے احکام آئے ہیں جس پہ کتاب اللہ خاموش ہے، اور اس کی کوئی مناسب وضاحت نہیں ہے اور نہ کوئی مناسب تاکید ہی ہے جو منصوص ہو جیسے پالتو گدھے یا دندان دار درندے، یا عورت کا نکاح ماموں و چچا سے کرنے کی ممانعت۔

اس تمہید کے بعد ہم سنت کی بحث کی طرف آتے ہیں جو نبیؐ کے عہد سے تدوین حدیث کے معروف و مشہور عہد تک مشتمل ہوگی، بتوفیق الٰہی۔

پہلا باب

حدیث عہد رسالت میں

ہم اس سے پہلے اس معاشرہ کا ذکر کر چکے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور وہ مدت جو دونوں نبوتوں کے درمیان گزری، اس سے بھی آپ کی دعوت کو دوچار ہونا پڑا جو مرحلہ وار تعلیم کی حامل تھی، اسلامی تمدن کی اعلیٰ قدروں کے لیے مضبوط بنیاد کہنا مناسب ہے، اس تمدن نے تاریخ تمدن کا رخ پھیر دیا، اور زندگی کے مختلف مراحل میں یہ تمدن برابر انسانیت کی اعانت کرتا رہا۔

جب ہم اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کو ایک چوتھائی صدی سے کم ہی عمر ملی جس میں رسول خدا کی دعوت کا آغاز و اختتام دونوں ہی عمل میں آ گیا تو ہم پاتے ہیں کہ آپ نے ایک بہت بڑی درس گاہ کھول دی جس میں نئی زندگی کی تربیت کے مراکز قائم ہیں جس میں طلباء کی تربیت و تعلیم پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی قائم رہی اور زانوئے تلمذ تہ کرنے والے حضور کے صحابہ ہیں اور نصاب تعلیم قرآن کریم اور سنت نبی اکرم ہے۔

اگر ہم اس تربیتی تجزیہ سے پوری طرح واقف ہونا چاہتے ہیں اور اس پر کوئی فیصلہ کن بات کہنا چاہتے ہیں جو علم و حجت عقل کے ساتھ ہے تو اس موقع کے لیے ضروری ہے کہ ہر ترقی پذیرانہ طریق درس کا پوری عقل و ہوش سے جائزہ لیں تا کہ ہم اس عظیم درس گاہ کی کامرانی کی وسعتوں کا جائزہ لے سکیں، اس نصاب تعلیم سے کتنا نفع پہنچ سکا، جو بحث اور تطبیق کا موضوع بنا، یہ چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب کہ ہم اس معلم و مربی کی

شخصیت کو پوری طرح جان لیں اور آپ کے نصاب و رسالت کے اثرات اور محصلین علم کے ساتھ آپ کا رابطہ اور ان کا آپ سے تاثر اور ان طلبائے علم کا مذاکرۂ علمی جو نصاب اور مربی سے متعلق ہے، اس کی وسعت کا اندازہ لگانا یہ اس لیے ضروری ہے کہ جن علمی مفاد کے لیے یہ پاپڑ بیلے گئے ہیں، اس کی منفعت کا اندازہ لگ جائے، اور اس میں اس علمی سفر کا جس کے تطبیق کی کوشش کی جارہی ہے، اس کی کامیابی کی حدود کا علم سامنے آجائے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم پر واجب ہے کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مربی و معلم کی حیثیت سے متعارف کرائیں، تاکہ آپ کے انداز اور اسلوب تربیت و تعلیم سے واقف ہوجائیں اور وہ مادہ جو تربیت و تطبیق کا موضوع اس حیثیت سے ہے کہ طالبین علوم کی معاشرت اور اس کی روزمرہ زندگی سے اس کا لگاؤ کس درجہ کا ہے اور صحابہ نے آپ کی ان تعلیمات کو کس انداز سے انگیز کیا، اس سے بھی واقفیت حاصل کی جائے اور ان کا انداز گفتگو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا اور شریعت کے ساتھ ان کا کردار کیا تھا، بالخصوص سنت نبوی کے ساتھ ان کا مقام کیا تھا، یہ ساری چیزیں ہمارے دقیق موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے سنت کی حقیقی تصویر آجائے گی۔

مواد و تربیت مربی اور طالبین کے مباحث اس لئے ضروری ہیں کہ اس سے اس تجربہ کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ لگ جائے گا، اس لیے ان تینوں چیزوں کے دور رس اثرات، علم کے تدریسی مواد کو سمجھنے اور ان کو طالبین کے ذہن میں عرصہ تک باقی رکھنے کے لیے کھلے طور پر نفع بخش ہے، جب یہ عوامل سہ گانہ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو اس سے غیر معمولی نفع حاصل ہوتا ہے اور مضمون طالبین کے ذہن میں عرصہ تک باقی رہتا ہے اور جب یہ عوامل ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور اس کا حلقۂ گفتار تنگ ہوجاتا ہے تو اس سے وہ ثمرات مرتب نہیں ہوتے اور متوقع نفع کی مٹی پلید ہوجاتی ہے اور بہت جلد لوگ اس مضمون کو فراموش کردیتے ہیں جو درس اور مباحث و تطبیق کا اصل موضوع تھا اسی روشنی پر ہم آئندہ ان تینوں کے مختلف گوشوں سے بحث کریں گے۔

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم ومربی

میں نے جب اس درجہ کا جس درجۂ اخلاق کریمانہ اور سلوک مستقیمانہ پر آپ فائز تھے، بیان کرنے کا ارادہ کیا تو اس کا احاطہ میری بساط سے باہر تھا۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے، اس لیے کہ کسی ادیب کے بس میں نہیں ان عنایات الٰہیہ کی تعبیر جو رسول خدا پر ان کی زندگی کے تمام مراحل پر حاوی تھیں، اپنی زبان سے ادا کر سکے، نہ کسی مورخ کی سکت میں ہے کہ وہ آپ کے تمام اخبار خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا ظاہر ہوں ان کی صحیح تعبیر کر سکے، حالانکہ آپ کی زندگی کے حالات اس کثرت سے مختلف انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اب ہم اپنے اس موضوع کو ایک وسیع دائرہ میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔

خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کر کے آپ کی تربیت فرمائی، تعلیم دی، عنایت الٰہی آپ کی شامل حال رہی، تاکہ آپ رسالت اور اس کی تبلیغ کا بوجھ برداشت کر سکیں، اس طرح آپ پوری طرح تیار کیے گئے کہ آپ کا خلق قرآن کریم ہی ہو گیا، خدا کی رضا آپ کی رضا ٹھیری اور اس کی ناراضی آپ کی ناراضی، آپ کی بعثت ہی اتمام مکارم اخلاق کے لیے ہوئی نہ آپ بدخو تھے نہ بدگو، اور فرماتے تم میں کا بہتر وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں، آپ کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، جب آپ کو کوئی چیز ناپسند ہوتی تو چہرہ گواہی دیتا، جب آپ مسرور ہوتے تو چہرہ جگمگا اُٹھتا، جیسے چمکتا چاند اور آپ کے ہم نشیں آپ کی اس ادا سے واقف تھے، آپ نے کسی معاملہ میں کسی انسان سے کچھ نہیں کہا، نہ کسی سے اپنا بدلہ لیا، ہاں کسی نے خدا کے حقوق میں بے راہ روی دکھائی تو آپ نے اس موقع پر خدا کے لیے انتقامی کارروائی کی۔

اپنے اخلاق و معاملات میں آپ سب سے برتر تھے اور یہ کیوں نہ ہوتا خود خدا نے آپ کو چنا تھا تاکہ آپ دُنیا کے لیے درخشندہ نشانی ہوں اور آپ پر وحی کی گئی کہ آپ انسانوں کے لیے بشیر ونذیر ہیں:

"هوالذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین" (الجمعۃ)

"وہ خدا ہے جس نے بے پڑھے لکھوں میں انہی میں سے ایک پیغامبر بنا کر بھیجا کہ ان کو ستھرا کریں اور انھیں تعلیم دیں کتاب اور حکمت کی حالانکہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی بے راہی میں تھے"

اس طرح آپ کے ذمہ ایک اہم کام سپرد تھا، خدائے پاک کی آیات کا پہنچانا اور ان کو سمجھانا دین کے معاملہ میں اور جس گندگی میں یہ لوگ ہیں ان سے ان کو نکالنا اور صاف ستھرا کرنا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوری طرح اپنی عمدہ عادتوں سے متمتع ہوتے رہے، اور اعلیٰ تربیت یافتہ شخصیت بن کر ابھرے۔ آپ میں بلند اخلاق و آداب جھلکتے تھے، آپ کی عادتیں آپ کے پاکیزہ اخلاق کا پرتو تھیں اور اس سلسلہ میں ہم کو زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ خود خدائے پاک کی شہادت کافی ہے، "وانك لعلیٰ خلق عظیم"۔ (القلم)

علمی حیثیت سے خدا نے آپ کا سینہ روشن کر دیا تھا اور آپ کو جو بھی آپ نہ جانتے تھے سکھا دیا تھا، اس طرح علم میں آپ اس حد تک پہنچے کہ کوئی انسان آپ کے سوا اس درجہ علم تک نہیں پہنچ سکا۔ آپ مسلمانوں کے لیے احکام قرآنی اور تعلیم اسلامی کے مرجع اول تھے۔ آپ نے امم سابقہ کی پوری داستان جان لی تھی اور اہل کتاب کا علم آپ کی دسترس میں تھا، آپ کو جوامع الکلم عنایت کیے، ساتھ ہی ساتھ اور دوسرے علوم بھی دیئے گئے جن کا تعلق انسانی زندگی سے تھا، آپ کے اخبار واحادیث وسیرت کے مطالعہ سے یہ بات علم میں آسکتی ہے:

"وأنزل اللّٰه علیك الکتاب و الحکمة و علمك ما لم تکن تعلم و کان فضل اللّٰه علیك عظیما" (النساء)

"خدا نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت آپ کا حصہ بنایا اور آپ جو نہ جانتے تھے اسے بتلایا، خدا کا بڑا کرم آپ پر ہے"

آپ احکام قرآن کی باریکیوں سے واقف تھے، اپنی پاکیزہ سنتوں کے ذریعہ آپ نے

اس کی وضاحت فرمائی اور آپ کی عمدہ و مناسب روش سے اس کا بیان ہوا اس طرح آپ معلم اول و مرشد صادق تھے، آپ نے سیدھی راہ پر لگانے میں ذمہ دارانہ رول ادا فرمایا، واقعتاً آپ تمام دنیا کے لیے رحمت تھے۔

(ب) آپ ؐ کا اپنی دعوت سے لگاؤ

مربی کے اقوال و گفتار سے طالبین کو غیر معمولی نفع پہنچتا ہے اور اس سے دلوں میں نفوذ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور علمی مواد طالبین کے ذہن میں پوری طرح دل نشین و جاگزیں ہو جاتا ہے، اس لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا لگاؤ رسالت و دعوت کے سلسلہ میں کیا تھا اس پر ایک ہلکی روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ شریعت کی حفاظت کے اثرات مابعد کو ہم سمجھ سکیں۔

اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری جگر کاوی سے اپنی ساری قوت تبلیغ و رسالت میں لگادی تھی اور اسلام کی ملت حنیفہ کے بقا کے لیے آپ نے بڑی اذیتیں برداشت کیں، مشکلات سے گزرے اور بڑا صبر آزما دور دیکھا، مشکلات اس حد تک برداشت کرنی پڑی کہ تنگ آکر آپ نے اپنے وطن مالوف ہی کو خیر باد کہہ دیا، بااین ہمہ آپ کی یہی آرزو تھی کہ میری قوم ہدایت کی راہ پر لگ جائے، اسے عمدہ اور سیدھا راستہ مل جائے۔ آپ کی اس خواہش اور آرزو کے پورے نہ ہونے پر خدا نے آپ کی تطییب خاطر فرمائی اور ڈھارس بندھائی کے آپ فکر مند نہ ہوں ہدایت کی راہ پر لگانا منزل تک پہنچانا ہمارا کام ہے:

"انك لاتهدى من أحببت ولكن الله يهدى من يشاء وهو أعلم بالمهتدين" (القصص)

"آپ جسے چاہیں ہدایت کی راہ پر لگادیں یہ آپ کے بس میں نہیں، خدا جسے چاہے منزل یاب فرمادے اور وہی جویائے ہدایت کو اچھی طرح جانتا ہے"

اپنی قوم کی ہدایت کی راہ میں جو اذیت آپ کو اپنی قوم سے پہنچی تھی اس کی تصویر قرآن کریم نے ان لفظوں میں کھینچی ہے:

"فلعلك باخع نفسك علی آثارھم إن لم یؤمنوا بھذا الحدیث أسفا" (الکہف)

"آپ شاید تاسف سے اپنے کو ہلکان کر ڈالیں گے کہ وہ اس پیام حق پر ایمان نہیں لاتے"

آخر وہ وقت بھی آہی گیا کہ اسلام کی بنیادیں ٹھوس انداز میں جم گئیں اور اس کی شوکت بڑھ گئی اور اسلام کی سلطنت قائم ہوگئی۔ حضور خود اس سلطنت کے قائد اور نگراں تھے اور فقیہہ و معلم تھے اور مفتی و فتویٰ نگار تھے، یہ ساری چیزیں خود آپ کی پاکیزہ ذات اور آپ کی بلند روح امانت الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے بے چین تھی، آپ نے اپنی پوری زندگی دعوت میں گزاری، آپ ہمیشہ معلم و مرشد رہے، اپنے ساتھیوں کو دل سے پیار کرتے، ان کی ہر مصیبت و تکلیف آپ کا رنج والم ہوتی، اُن کی ہر خوشی و مسرت آپ کے دل کی کلی کھلا دیتی، ان ساری باتوں میں آپ نے پورے نظم و ضبط سے کام لیا اور اپنی رسالت اور دعوت کی سعادت کو لوگوں تک پہنچانے میں بھی وہی دلداری کا انداز تھا، دنیا کے ہر نبی جس نے زندگی کی راہوں کو دکھایا ان میں آپ سب سے اعلیٰ و بلند کردار کے مالک تھے، آپ کا یہ اسوۂ حسنہ آپ کے ان صحابہ کے سامنے تھا جنھوں نے آپ سے گھل مل کر رہنا سیکھا، آپ کو دیکھا، آپ کی باتیں سنیں اور آپ کے اندر و باہر کا معاینہ کیا، پھر ہم تک اسی اخلاص اور اسی باریکی کے ساتھ ان تعلیمات کو منتقل کیا۔

(ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف علمی

آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا اور اس شان سے اس کا آغاز ہوا کہ سب سے پہلی آیت اتری تو اس نے انسان کی توجہ کو علم سیکھنے کی طرف لگایا اور انسان سے قرأت کا مطالبہ کیا چنانچہ قرآن نے علی الاعلان فرمایا:

اقرأ باسم ربك الذی خلق (العلق)

"اس رب کے نام سے پڑھو جس نے خلق فرمایا"

آپ نے دیکھا قرآن علم سیکھنے کی دعوت دے رہا ہے، طلب علم پر اُبھار رہا ہے اور علم

حاصل کرنے والوں کے اور علم والوں کے درجات بیان کرر ہا ہے، انھیں آیات قرآنی میں سوچنے تدبر کرنے کی ہمت افزائی کرر ہا ہے، مثلاً خدا کا فرمان ہے:

"قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون وشهد الله أن لااله الاهو والملائكة وأولوالعلم قائما بالقسط" (آل عمران)

"آپ کہہ دیں کیا وہ لوگ جو علم والے ہیں اور جو بے علم ہیں برابر ہو سکتے ہیں، خدا گواہ ہے کہ وہ ایک ہے اور ملائکہ اور علم والے جو میانہ روی پر قائم ہیں، گواہ ہیں"

اور اللہ کا فرمان ہے:

"يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين أوتوا العلم درجات" (المجادلة)

"جو تم میں ایمان لائے اور ان کو بھی جنھیں علم عطا کیا گیا کئی درجہ بلندی عطا فرمائی"

علماء سے سوال پر اُبھارا چنانچہ فرمایا:

"فسئلوا أهل الذكر ان كنتم لاتعلمون"

"جو اہل ذکر ہیں ان سے پوچھ لیا کرو اگر تم کو واقفیت نہیں ہے"

پھر علم کے پھیلانے اور خدا کے احکام بیان کرنے کی ہدایت فرمائی:

"اذأخذالله ميثاق الذين أوتوالكتاب لتبيننه للناس ولاتكتمونه" (آل عمران)

"خدا نے عہد و پیمان ان لوگوں سے لیا جنھیں کتاب عطا کی کہ تم کھلے طور پر، اسے لوگوں کے سامنے پیش کرو گے اور اسے چھپانے کی بات نہ کرو گے"

اسی طرح علم کے حاصل کرنے اور تعلیم دینے پر بھی اُبھارا:

"فلولا نفر من كل فرقة بينهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون" (التوبة)

"کاش ہر فرقہ سے ایک گروہ نکلتا جو دین کو سمجھتا سمجھاتا اور اپنی قوم کو ڈراتا جب وہ ان کی طرف رجوع کرتے بہت ممکن ہے کہ وہ بچ جاتے"۔

اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مزید علم کے حاصل کرنے کی بھی ہدایت فرمائی:

"قل رب زدني علما" (طه)

"آپ کہیے اپنے رب سے زیادہ کر دیجیے میرا علم"

ہمارا مقصد اس باب میں وارد ساری قرآنی آیتوں کو بیان کرنا نہیں ہے اس لیے کہ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ علم و تعلیم و علماء کے بارے میں سبھی آیتیں بیان کر دی جائیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ رسول خدا کا منشا حصول علم اور علم کے سلسلے میں کیا تھا، آپ نے علماء اور طالبین علم کی کس طرح پذیرائی فرمائی، ان کو اس کے حصول پر کیسی تحسین فرمائی اور کس طرح مبارکباد پیش کی، اس طرح ہمارے سامنے رسول خدا کا قول و فعل کھلے طور پر آ گیا اس لیے کہ اس کو حفاظت سنت رسول میں بڑا مقام حاصل ہے، پھر قرآن کریم کی حفاظت و صیانت کا بھی اس میں پہلو نظر آتا ہے اور ہم جو کچھ بھی آپ کے سامنے یہاں بیان کریں گے سمندر سے ایک قطرہ کے برابر ہو گا۔

رسولؐ اللہ کا طلب علم کی حوصلہ افزائی فرمانا

خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے مدارج بیان فرمائے اور طلب علم پر ابھارا:

"من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"

"خدا جس کے ساتھ بڑا خیر کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے"

دوسری جگہ فرمایا:

"فقيه واحد أشد على الشيطان من الف عابد" (ابن ماجه)

"دین کی سمجھ رکھنے والا شیطان پر ایک ہزار محض عبادت گزار سے زیادہ وزنی ہے"

آپ نے علم کو خیر کا ایک رکن فرمایا اور انسان کا امتیاز و شرف بتلایا چنانچہ فرمایا:

"الناس معادن فخيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا"

"لوگ یعنی انسانی برادری کان کی حیثیت رکھتی ہے، جو لوگ ان میں کے جاہلیت کے دور میں پسندیدہ اور پیش رو تھے وہی اسلام میں بھی) پسندیدہ اور پیش رو رہے اس لیے کہ انھیں دین کی سمجھ تھی"

آپ نے اس علم کو جس سے امور دین کے قیام وفہم میں احتیاج ہو مسلمان پر اس کا حاصل کرنا فرض قرار دیا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" (ابن ماجہ)

"جستجوئے علم فرض ہے ہر مسلمان پر مرد ہو کہ عورت"

شریعت کے علم کے علاوہ دوسرے علوم جن کی ضرورت مسلمان کو اپنی زندگی میں پڑتی ہے، ان کی تحصیل فرض کفایہ ہے، اسی طرح تمام مسلمان مجرم ہوں گے اگر کوئی علم جس کی ضرورت مسلمانوں کو پیش آئے اور مسلمانوں میں اس علم کا جاننے والا ایک بھی نہ ہو، مسلمان اس کوتاہی کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کے لیے اس وقت تک زیر عتاب رہیں گے جب تک کہ اس کمی کی تلافی نہ کر گزریں۔

اور خدا کے رسول نے علم کو وہ نعمت قرار دیا جس پر رشک کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں خود بینی تک عمل میں آجاتی ہے، چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا حسد الا فی اثنتین رجل آتاه الله مالا فسلطه علی هلكته فی الحق و آخر آتاه الله حكمة فهو يقضی بها ويعلمها" (بخاری ومسلم)۔

"دو چیزیں قابل حسد ہیں، ایک ایسا آدمی جسے اللہ نے مال سے نوازا اور اسے راہ حق میں خرچ کرنے پر مامور کیا، دوسرا وہ شخص جسے خدا نے حکمت عطا فرمائی جس سے وہ فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے"

حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے مسلمانوں کو اس بات پر بار بار ابھارا کہ ہر ایک کو حصول علم کرنا چاہیے اور اس سے ایک حصہ وافر حاصل کرنا چاہیے، چنانچہ فرمایا:

"اغد عالما أو متعلما أو مستمعا او محبا، ولا تكن الخامسة فتهلك"

"زندگی گزارو عالم ہو کر یا طالب علم ہو کر یا گوش پذیرائے علم ہو کر یا علم دوست ہو کر اور کوئی پانچویں راہ مت اختیار کرنا کہ ہلاکت کا سبب ہے"

عطاء نے فرمایا کہ مسعر نے اس میں ایک اضافی بات بھی بتلائی کہ پانچویں بات جو ہم کو حاصل نہیں ہے، پانچویں بات یہ ہے کہ تو علم کو اور اہلِ علم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔

حضور اپنے اصحاب کو دین کے معاملات سمجھنے، جاننے پر برابر اکساتے رہتے اور اس بات کا حکم دیتے کہ جو بات معلوم نہ ہو اس کو دریافت کرتے رہیں اور بلا علم کے فتویٰ دینے سے روکتے، اس سلسلے کی ایک کڑی وہ حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ عہد نبوی میں ایک شخص کو زخم ہوگیا اور اسے بدخوابی ہوگئی، کسی نے غسل کرنے کے لیے کہا جس سے اس کی موت ہوگئی جب یہ خبر آپ کو پہنچی تو فرمایا کہ "اس کی جان لے لی، خدا ان کی بھی جان لے، کیا ناواقف کی شفاء سوال میں نہیں ہے"۔

آپ نے اسی پر بس نہیں کیا کہ اپنے اصحاب کو کھل کر شرعی علم کی تحصیل کی ہدایت کریں اور انھیں صرف قرآن و سنت طاہرہ تک محدود رکھیں بلکہ آپ نے صحابہ کو ہر ایسے علم سیکھنے کی ہدایت فرمائی جس سے مسلمانوں کو نفع ہو بلکہ آپ جب مدینہ تشریف لائے اور زید بن ثابت سے قرآن کی چند سورتیں سنی اس وقت زید بہت چھوٹے تھے، آپ کو ان کا قرآن تلاوت کرنا بہت بھلا لگا آپ نے ان سے فرمایا کہ یہود کی زبان سیکھیں چنانچہ ان سے فرمایا:

"یا زید تعلم لی کتاب یهود فانی والله ما آمن یهود علی کتابی"

"اے زید میرے لئے یہود کی زبان سیکھ لو، کیونکہ خدائے پاک کی قسم میں اپنے مکتوب کے سلسلہ خانی میں قوم یہود پر اعتماد نہیں کرسکتا"

اور ایک روایت میں ہے کہ

"انی أکتب الی قوم فأخاف أن یزیدوا علیّ وینقصوا فتعلم السریانیة"

"میں ایسی قوم کی طرف مکتوب بھیج رہا ہوں جن سے اس بات کا ڈر ہے کہ کچھ بڑھا دیں یا گھٹا دیں، چنانچہ سریانی زبان سیکھ لو"

حضرت زید کی زبانی یہ روایت ہے کہ میں نے اسے سترہ روز میں سیکھ لیا، (تاریخ دمشق، طبقات ابن سعد)

اور حضور اکثر یہ دعا خدائے کریم کے سامنے پیش فرماتے:

"اللّٰهم انی أعوذُبك من علم لاینفع و من دعاء لایسمع ومن قلب لا یخشع ومن نفس لاتشبع" (سنن ابن ماجہ)

"اے خدا ایسے علم سے پناہ دے جو نفع بخش نہ ہو اور ایسی دعا سے بچالے جس کی شنوائی نہ ہو اور ایسے دل سے محفوظ رکھ جس میں ڈر نہ ہو، اور ایسے جی سے دور رکھ جو آسودہ نہ ہو"

مزید برآں حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے علم کو ان تین اعمال صالحہ میں جن کا ثواب موت کے بعد بھی ملتا ہے شمار کیا ہے، چنانچہ فرمایا:

"اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاثة أشياء من صدقة جارية أوعلم ينتفع به بعده أو ولد صالح يدعو له"

"جب انسان موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے تو اس کا عمل بھی منقطع ہوجاتا ہے، ہاں تین چیز ہی رہ جاتی ہیں، صدقۂ جاریہ یا وہ علم جس کا نفع اس کے بعد بھی باقی رہے یا ولد صالح جو اس کے لیے دعا کرتا رہے"

اس طرح آپؐ نے مختلف طرز بیان اور عمل سے علم کا مقام عالی متعین فرمایا اور اپنے ساتھیوں کو اس پر اُبھارا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی یہ تعلیم دی کہ علم کی جستجو میں لگ جائیں اور آپ نے صرف تحصیل علم ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی تبلیغ کرنے کی بھی ہدایت فرمائی۔

تبلیغ علم کی حوصلہ افزائی

علم کا مقصد یہی ہے کہ خود اس سے نفع اٹھائیں اور غیروں کو بھی اس سے نفع پہنچائیں، ایسے علم سے کیا فائدہ جو منھ بند کلی کی طرح ہو، ایسی دین فہمی جو اہلِ علم کے سینوں تک رہ جائے کسی دوسرے انسان کو اس سے کوئی حصہ نہ ملے، اس لیے آپؐ نے اشاعت علم کی ہدایت فرمائی اس کا چھپانا جرم قرار دیا، اس کا ذکر مختلف عنوان سے فرمایا اور اس کے ہزاروں علماء گواہ ہیں چنانچہ حضرت ابن مسعود فرماتے:

"سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: نضراللّٰه امرأ

سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه فرب مبلغ أحفظ له من سامع“

”خدا شاداب رکھے ایسے شخص کو جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور اسے یاد رکھا یہاں تک کہ دوسروں کو پہنچایا اس لئے کہ بہت سے ابلاغ کئے جانے والے سننے والے سے زیادہ یادداشت رکھتے ہیں“

یہ حدیث مشہور ہے اور بہت سے ایسے طریق سے مروی ہے جن کے الفاظ قریب قریب یکساں ہیں، جیسے یہ الفاظ دوسری روایات میں ہیں:

”رب مبلغ أوعى من سامع ورب حامل فقه غير فقيه، ورب حامل فقه الى من هو أفقه منه....يا نضر الله عبدا سمع مقالتي فوعاها ثم أداها الى من لم يسمعها فرب حامل فقه لا فقه له ورب حامل فقه الى من هو أفقه منه، ثلاث وطاعة عليهن قلب المؤمن، اخلاص العمل لله عزوجل وطاعة ذوى الامر ولزوم الجماعة فان دعوتهم تكون من ورائهم“

”بہت سے تبلیغ کرنے والے سننے والے سے زیادہ یادداشت احتیاط رکھنے والے ہوتے ہیں، خدا شاداب رکھے اسے جس نے میری بات سنی پھر اس نے یاد رکھا اس کے بعد اس نے نہ سننے والوں کو پہنچایا، بہت سے بات نقل کرنے والے ناسمجھ ہوتے ہیں بات نقل کرنے والے جن کو پہنچاتے ہیں وہ زیادہ ذی ہوش و ذی فہم ہوتے ہیں تین چیزیں ہیں جس میں کسر اور کمی نہیں کی جاتی، مومن کا دل، اخلاص عمل خدا کے لیے، امیر المومنین کی اطاعت اور جماعت کی ہمنوائی“۔

آپ مدینہ طیبہ آنے والے وفود کو بھی تبلیغ فرماتے، وہ اسلام کو ان تک پہنچائیں جو یہاں نہیں آسکے، یا جن تک یہ پیام حق نہ پہنچ سکا اور انھیں دین کی باتیں سمجھادیں۔ اس کی نظیر وفد عبدالقیس ہے جو مدینہ آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کس قوم کا وفد ہے، لوگوں نے کہا ربیعہ کا، آپ نے فرمایا، خوش آمدید، کسی عار و شرم کی بات نہیں ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ ایک دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں اور ہمارے اور آپ کے مابین کفار مضر کی آبادی ہے، ہم آپ

کے پاس محترم یا شہر حرام میں ہی آسکتے ہیں اس لیے ہمیں آپ ایسا حکم فرمائیں کہ ہم سیکھ کر اس کو دوسروں تک پہنچا دیں جس سے ہم جنت میں داخل ہوسکیں، آپ نے انھیں چار باتیں کرنے اور چار سے رک جانے کو فرمایا اور آپ نے فرمایا کہ ان کو یاد کرلو اور جو لوگ نہ آسکے ان کو پہنچا دو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام اور نشر کلمۃ اللہ کا اپنے زمانے میں پورا اہتمام فرمایا، ہر طریقہ سے تبلیغ اختیار کیا، آپ نے ایلچی روانہ کئے اور خطوط و مکاتیب بھیجے اور امرا و قاضیوں کو متوجہ فرمایا غرض رسالت کی اشاعت کا اچھوتا اور عمدہ طریقہ اختیار فرمایا، آپ کو جو امانت خداوندی ملی تھی اس کو آپ نے گھر گھر پہنچایا اور علم کو چھپانے سے روکا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص سوال کرنے پر بھی اپنا علم چھپائے رکھا تو روز قیامت اس کے منھ میں آگ کی لگام لگائی جائیگی اور حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مثل الذی یتعلم علما ثم لا یحدث بہ مثل رجل رزقہ اللہ مالا فکنزہ فلم ینفق منہ"

"اس کی مثال جو علم سیکھ کر اس علم کا پرچار نہیں کرتا اس آدمی کی طرح ہے جو خزانہ پاکر اسے دفن کردے اور اس میں سے خرچ نہ کرے"

گویا وہ قرآن کریم کی اس آیت کے مصداق ہے:

"والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب ألیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ماکنزتم لأنفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون" (التوبۃ)

"جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اسے خرچ نہیں کرتے خدا کی راہ میں انھیں دردناک تکلیف دیں گے، جب کے انھیں دہکایا جائے گا جہنم کی آگ کی طرح جس سے جل اٹھیں گے ان کی پیشانی، پہلو، پشت، یہ وہی ہے جو تم جمع کرتے تھے اپنے لیے بس چکھو جو تم نے جمع کر کے رکھا ہے"۔

علماء کا مقام

اہل علم کے لیے یہ فضل کافی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کے رہنما ہیں جس ذات گرامی نے جہالت وگمراہی کے خلاف پرچم علم وہنر بلند کیا اور اہل علم کا مقام بتلایا، آپ نے فرمایا علماء وارث انبیاء ہیں اور امت کو علماء کے احترام اور ان کی حق شناسی پر ابھارا چنانچہ آپ نے فرمایا:

"ليس من أمتي من لم يجل كبيرنا ويرحم صغيرنا ويعرف لعالمنا حقه"

"جس نے ہمارے بڑے کا اجلال نہیں کیا، اور چھوٹے پر ترس نہیں کھایا اور ہمارے علماء کا عرفان نہیں حاصل کیا وہ میری امت میں سے نہیں"

خدا کے یہاں ایسے عالم کے لیے بڑا اجر ہے، جس طرح سے کے طالب علم کا بھی نصیب ہے، اسی سلسلے کی بات اس حدیث میں ہے جس میں آپ نے فرمایا:

"العالم و المتعلم شريكان في الأجر"

"جاننے والا اور علم حاصل کرنے والا دونوں ہی شریک اجر ہیں"

آپ نے فرمایا کہ معلم خیر کے لیے ہر چیز استغفار کرتی ہے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی،

طلبہ علم کا مقام

اسلام کو دوسرے دین سے ممیز کرنے والی چیز میں ایک چیز یہ ہے کہ ہر وہ عمل جس کو مسلمان انجام دیتا ہے، اس سے اس کو نفع الگ ہوتا ہے اور خیر نصیب بن جاتا ہے اور اس عمل پر اسے خدا کی جانب سے اجر الگ ملتا ہے جب تک کہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی گزارتا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من غدا الى مسجد لايريد الا أن يتعلم خيرا أو يعلمه كان

له كأجر حاج تاما حجته"
"جس نے کسی درس گاہ مسجد کا قصد کیا کہ اس سے خیر سیکھے یا سکھلائے، اس کے لیے اس حاجی کی طرح کا اجر ہے جس نے اپنا حج مکمل کیا"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"كان بمنزلة المجاهد في سبيل الله" معلم ہو یا متعلم وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے درجہ میں ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

"من طلب العلم فأدركه كتب الله له كفلين من الأجر ومن طلب علما فلم يدركه كتب الله له كفلا من الأجر"
"جس نے علم کی جستجو میں اپنے کو لگایا اگر اس نے علم حاصل کرلیا تو خدا اس کے لئے دوہرا اجر مقرر فرمائے گا اور جو علم کی طلب کی راہ میں نکلا مگر حاصل نہ کر سکا خدا اس کے لئے ایک اجر مقرر فرمائے گا"

اور آپ نے فرمایا،

"اذا جاء الموت طالب العلم وهو على حاله مات شهيداً"
"اگر کسی طالب علم کی موت طلب علم کے زمانہ میں آجائے تو اس کی موت شہید کی موت ہوگی"

علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اس لیے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

"فضل العلم خير من فضل العبادة وملاك الدين الورع"
"علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے کہیں زیادہ ہے اور دین کی اصل و اساس پرہیزگاری وتقویٰ ہے"

طالبین علم کا مرتبہ کھلے طور پر آنکھوں کے سامنے ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ نے روایت فرمایا، رسول خدا سے منقول ہے،

"من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل اللّٰه له به طريقا الي الجنة وما اجتمع قوم في بيت من بيوت اللّٰه يتلون كتاب اللّٰه ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة و غشيتهم الرحمة و حفتهم الملائكة و ذكرهم اللّٰه عزوجل فيمن عنده ومن أبطأ به عمله لم يسرع به نسبه"

"جو کسی ایسی راہ پر چلا جس میں علم کا حاصل کرنا ہی مقصد ہو تو خدا اس کے لئے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے جو قوم خدا کے کسی گھر میں اکٹھا ہوئی اور خدا کی کتاب کی تلاوت کی اسے پڑھا پڑھایا تو ان پر طمانیت اور سکینت خدا کی طرف سے نازل کی جاتی ہے اور یہی فرشتے ان پر چھا جاتے ہیں اور رحمت الٰہی انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور خدا ان کا ذکر اپنے ہر مقربین میں فرماتا ہے، اور جو اپنے عمل کے اعتبار سے کوتاہ رہا اس کا صرف نسب نافع نہ ہوگا"۔

حضرت صفوان بن عسال فرماتے ہیں کہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ مسجد میں اپنی سرخ چادر پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، میں نے عرض کیا، اے خدا کے رسول میں علم کی طلب کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ نے فرمایا خوش آمدید، جویائے علم خوش آمدید، طالب علم کو فرشتے اپنے پروں میں لے لیتے ہیں ایک دوسرے پر جماتا ہے، تا آنکہ پہلے آسمان تک پہنچ جاتا ہے، آسمان سے زمین تک ایک کے اوپر ایک فرشتے ہوتے ہیں طالب علم کے طلب علم کی محبت میں، ایک روایت میں ہے کہ "من حبهم لما طلب" اس طلب کی محبت میں۔

طالبین علم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت

ابو ہارون عبدی کہتے ہیں کہ ہم لوگ جب حضرت ابو سعید خدری کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ فرماتے خوش آمدید رسول اللہ کی وصیت کے ساتھ، پھر فرمایا کہ ہم نے کہا کہ وصیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ میرے بعد بہت سے لوگ تم سے میری حدیث دریافت کرنے

آئیں گے جب وہ تمھارے پاس آئیں تو نرمی سے کام لینا اور ان سے حدیثیں بیان کر دینا، ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب آپ جوانوں کو دیکھتے تو فرماتے مبارک ہو، مبارک وصیت رسول اکرم مبارک، ہمیں خدا کے رسول نے وصیت فرمائی کہ ہم تمہارے لئے مجلس میں جگہ نکالیں اور تمھیں دین سمجھا کر سکھائیں اس لیے کہ تم ہمارے پس رو ہو اور ہمارے بعد علم حدیث کے جاننے والے ہو۔

ایک دوسری روایت حضرت ابوسعید خدری سے ہے کہ رسول خداؐ ہم کو حکم فرماتے کہ وہ علم طلب کرنے والوں کی پیشوائی کریں، آپؐ نے فرمایا کہ عنقریب تمہارے پاس لوگ آئیں گے علم کی جستجو میں تو جب تم انھیں دیکھو تو ان سے کہو مبارک ہو تمھیں رسول خداؐ کی وصیت اور ان کو فتویٰ سکھاؤ۔

ایک دوسری روایت میں ہے یہ لوگ یعنی طالبین علم تمہارے پاس آئیں گے ہر علاقے سے کہ دین میں سمجھ پیدا کریں جب وہ تمھارے پاس آئیں تو تم انھیں بھلائی کی وصیت کرو۔

علم کے سلسلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جو موقف تھا اس پر یہ ایک طائرانہ نظر ہے آپؐ نے علماء کو کس طرح آمادۂ تعلیم کیا، طالبین کو کس انداز سے سیکھنے پر ابھارا، علم، علماء وطالبین علم کی فضیلت بیان کی اور ہر ایک کا مقام ان کا ثواب واضح فرمایا کہ اگر انسان اس کا کوئی حصہ بھی سن پائے تو خود کو پوری طرح متوجہ کر دے کہ علم کے کسی رخ کا تو ہو جائے، اب اس کے بعد بھی علم پر اُبھارنے کے لیے اور اس کی تحصیل کے لیے کوئی میدان ہے، اب بھی حدیث کی تعلیم اس کی یاد اور اس کی چھان بین کے لیے جو صحابہ اور اس کے بعد کے لوگوں نے کر دکھایا ہے کوئی اور موقع رہ جاتا ہے؟

علم کے حصول پر اکسانا مختلف انداز سے نظر آتا ہے علم کے حصول کی راہ سب کے لیے ہے، اس کے اور طالبین علم کے مابین نہ کوئی مانع ہے نہ پردہ، خیر کی تعلیم دینے والا ہر ایک کو خوش آمدید کہتا ہے۔

آگے ہم رسول خدا کا طرز تعلیم جو انھوں نے صحابۂ کرام کی تعلیم کے لیے اختیار کیا، بیان کریں گے۔

آپؐ کا طرز تعلیم

آپؐ کا طریقۂ تعلیم اپنے اصحاب تک تبلیغ کرنے میں قرآن کے طرز تعلیم سے علاحدہ نہ تھا اس لیے کہ رسول کریمؐ مبلغ تھے کتاب خداوندی کے، اس کے احکام کی وضاحت کرتے، اس کی آیت کو کھول کر رکھ دیتے، قرآن کریم جستہ جستہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوا، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو اس کی تبلیغ کرتے، یا جو لوگ آس پاس کے ہوتے، تعلیمات اسلامی کو تفصیل سے ان کے سامنے پیش کرتے اور قرآن کریم کے احکام کو حالات کے مطابق کرتے، آپ معلم بھی تھے، حکایت کرنے والے، قضا فرمانے والے، فتویٰ دینے والے اور رہنمائی کرنے والے سبھی کچھ تھے، اپنی زندگی کی پوری مدت میں وہ ساری چیز جس کا تعلق امت اسلامیہ سے تھا، اس کی ہر حیثیت سے خواہ وہ معمولی ہو یا بڑی ہو اور جس کا تعلق فرد سے ہو یا پوری جماعت سے، زندگی کے تمام مراحل میں جو قرآن کریم میں مذکور نہیں ہیں وہ سنت میں موجود ہے، خواہ اس کی حیثیت عمل کی ہو خواہ قول کی ہو، یا تقریری کی ہو، اسی وجہ سے ہمارے سامنے احکام، آداب، عبادات، قربات، یعنی نیک کام جو مشروع ہوئے یا اس کو کیا، یا مروج و مسنون رہا، چوتھائی صدی کی مدت میں اس لیے کہ سنت کی وضع اچانک نہیں جیسے بناوٹی مذاہب میں یا فطری عادات میں جیسے بعض حکماء اور واعظین ایک دم سے املا کرا دیتے ہیں بلکہ ان کی مشروعیت امت کی دینی، اجتماعی، اخلاقیاتی، سیاسی تربیت کے لیے ہوئی ہے، جو جنگ اور صلح، کشادگی اور تنگ دستی ساری حالتوں کو محیط ہے، اس میں علمی عملی دونوں ہی اطراف و جوانب کی رعایت ہے، یہ اس لیے کہ لوگوں میں اچانک کوئی انقلاب لانا ایک دشوار امر تھا کہ وہ صبح و شام میں اپنی پرانی تعلیمات ترک کر کے اچانک دوسرے رخ میں بدل جاتے، ان کی دنیا، ان کی عادت، ان کا مذہب، اسلام کے ہر دینی نظم، تعلیمات، عقائد اور عبادات میں اچانک کیسے بدل جاتے۔

قرآن کریم نے بھی تدریجی طور سے ان کے عقائد فاسدہ اور ضرر رساں عادات کو چھڑانے کی طرف توجہ دی اسی طرح ان منکرات کے خلاف جنگ کرنے میں جس میں لوگ

جاہلیت کے دور سے مبتلا چلے آتے تھے۔ دھیرے دھیرے ہی عقائد صحیحہ، عبادات، احکام کی پابندی کے خوگر ہوئے اور آہستہ آہستہ آپؐ نے انھیں بلند کرداری، اخلاق فاضلہ کے رخ پر ڈالا اور جو لوگ حضور علیہ السلام کے جانثار تھے انھیں صبر و استقلال پر اُبھارا، اس کے ساتھ ساتھ پیغمبرؐ خدا قرآن کی وضاحت فرماتے لوگوں کو فتویٰ دیتے اور آپسی جھگڑے چکاتے اور حدود قائم فرماتے، اور قرآن کی تعلیمات پر ان کو ڈھالتے یہ ساری چیزیں سنت ہیں، عنقریب ہم آپؐ کا ان ساری چیزوں میں انداز و طرز زندگی بیان کریں گے مگر اختصار کا لحاظ رکھیں گے۔ آپؐ کا طرز تعلیم اور انداز تدریس سنت رسول کو دل میں بٹھانے کی ایک گہری چھاپ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کی تعلیمات نہ پیش کرتے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دین کی تبلیغ کھلم کھلا نہ تھی تو اپنا اور اپنے اصحاب کا مستقر دار ارقم بنائے رکھا۔ اس وقت آپ کے وہ جانثار جو ابتدا میں اسلام لائے تھے مشرکین سے علاحدہ رہ کر قرآن کریم کا تکرار کرتے اور آپ ان کو مبادیات اسلام سکھلاتے اور قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا اسے یاد کراتے، پھر مکہ میں رسول خدا کی قیام گاہ مسلمانوں کی انجمن بن گئی اور ایسا ادارہ جہاں قرآن کی تعلیم ہوتی اور حدیث نبوی کی جام خود حضور کے دست مبارک سے لیتے اور پیتے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ صحابہ نے آیات قرآنی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ آپس میں ایک دوسرے سے پڑھتے پڑھاتے اپنے گھروں میں، دکان میں، شہر میں، میدان میں تاکہ جو کچھ رسول خدا سے سنا ہے وہ دلوں میں بیٹھ جائے کبھی اس کی تفسیر بھی سیکھتے جو حضور سے سنی ہوئی ہوتی وہ آپ کی تفسیر قرآن ہوتی جسے حدیث رسولؐ کہتے ہیں۔ ظہور اسلام کے ابتدائی ایام میں حدیث کی یادداشت بھی چلتے پھرتے قرآن کے پہلو بہ پہلو ہوتی، چنانچہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کی کہانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان قرآن کو اپنے گھروں میں پڑھتے تھے اور دین سیکھتے تھے۔

کچھ دنوں بعد مسجد ہی تعلیم کا مقررہ مقام بن گیا۔ یہیں سے فتویٰ صادر ہوتا، فیصلے جاری

ہوتے، عبادتیں الگ ہوتی رہتیں اور شعائرِ دینیہ کی حفاظت کا سامان کیا جاتا اور مسلمانوں کے امورِ عامہ پیش کئے جاتے بااین ہمہ حضور کی تعلیمات کسی مکان تک محدود نہ تھیں نہ کسی معین تقاضے کی محتاج تھیں، اگر لوگوں نے راستے میں فتویٰ دریافت کیا تو آپ نے وہیں بتلا دیا۔ کسی خاص موقع پر بھی سوالوں کا جواب دیتے، غرض ہر فرصت کو تبلیغ احکام کے لیے غنیمت جانتے اور ہر جگہ ہی اس کا چرچا کرتے، خواہ وہ حضر ہو یا سفر ہو صلح و امن ہو کہ جنگ کی حالت ہو۔

مزید برآں آپ کی مجالس علمی بھی ہوتی رہتیں جس میں اپنے اصحاب کو پند و موعظت فرماتے، جب آپ بیٹھتے آپ کے اصحاب بھی گرداگرد بیٹھ جاتے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز کے بعد صحابہ گروہ در گروہ بیٹھ جاتے، قرآن کی تلاوت کرتے اور فرائض وسنن کی تعلیم حاصل کرتے۔ ہمیں صحابہ کی تاریخ اور ان کی علمی زندگی کا جائزہ لینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں علم سکھانے کے سلسلے میں ہمیشہ کشادہ رو تھے، آپ کی اپنے اصحاب کے ساتھ اکثر مجلسیں تعلیم و تزکیہ ہی کے لیے ہوتیں، آگے بحث میں یہ چیز واضح ہو جائے گی۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول خدا ہمیں دنوں کا وقفہ دے کر نصیحت فرماتے تا کہ ہم اکتا نہ جائیں، آپ اپنے اصحاب کی گراں خاطری کا پورا لحاظ رکھتے، اس لیے ان کی وعظ و پند کے لیے اوقات میں وقفہ دیا کرتے، اس لیے کہ ہمہ وقت تعلیم اور توجہ دلانے سے گرانی خاطر کا اندیشہ تھا، اس طرح مطلوبہ فائدہ کم ہو جاتا اس لیے بہ تقاضائے حکمت اسی طریقۂ تربیت و تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے، آج کل کی تربیت گاہوں میں یہی طریقہ عام طور سے تعلیم کے سلسلے میں مروج ہے اور یہی ان کے نزدیک قابل اعتماد طریق تربیت بھی ہے در حقیقت یہ راستہ طالبین کے دل میں جاگزیں کرنے اور ذہنوں میں پوری طرح جمانے کا بہترین طریقہ ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق ہی گفتگو فرماتے، اس لیے کہ سننے والا جن باتوں کو سمجھ نہ سکے وہ اس کے لیے فتنہ ہو جاتا ہے، ممکن ہے وہ مقصد سے دور جا پڑے تو کیا تعجب ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخاطبین سے اسی حد تک بات کرتے جس کو ان کا ذہن لے سکتا، چنانچہ آپ دیہات کے لوگوں سے اسی روکھی زبان میں بات کرتے جو ان کی سخت گیرانہ فطرت سے قریب ہوتی، اور متمدن لوگوں کو اس طرح سمجھاتے جو ان کی زندگی سے قریب اور ان کے ماحول کے مناسب ہوتی، اسی طرح آپؐ فہم صحابہ کے تفاوت کا لحاظ فرماتے اور صحابہ کی زود فہمی، تیز گیری، فطری ذہانت اور اکتسابی عقل و ہوش کا بھی پورا لحاظ فرماتے، چنانچہ آپ کا اشارہ زیرک دانا کے لیے کافی ہوتا اور معمولی جھانکیاں بھی عمدہ قوت حافظہ والے محفوظ کر لیتے۔

چنانچہ ابو ہریرہ کی یہ روایت آپ کی تفہیم و استمزاج کا نمونہ ہے، بنو فرازہ سے ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میری عورت نے ایک کالا کلوٹا بچہ جنا ہے جو میرا نہیں ہے، آپؐ نے اس سے فرمایا کہ تمھارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا ضرور ہیں، آپ نے فرمایا ان کے رنگ کیا ہیں، اس نے جواب دیا سرخ رنگ ہے، آپ نے فرمایا کیا اس میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے، اس نے جواب دیا، ہاں خاکستری بھی ہے، آپ نے دریافت فرمایا یہ کیونکر خاکستری ہو گیا؟ اس نے جواب دیا کہ کوئی رگ ہوگی جو اس کو خاکستری بنا گئی ہوگی، آپؐ نے فرمایا یہاں بھی کوئی رگ ہوگی۔

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ قریش کا ایک جوان رسول خدا کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کے رسول مجھے زنا کی اجازت دیجئے، یہ سن کر حاضرین اس پر پل پڑے اور اسے ڈانٹا، آپؐ نے فرمایا ٹھیرو ٹھیرو۔ آپؐ نے اس کو فرمایا قریب آجاؤ، وہ آپؐ کے قریب آگیا، آپ نے فرمایا کیا زنا تم اپنی ماں کے لیے جائز سمجھتے ہو؟ اس نے کہا بالکل نہیں، آپؐ کے قربان، مجھے تو خدا نے اسی کے ذریعہ جنوایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی طرح لوگ اپنی ماؤں کے لیے یہ چیز پسند نہیں کرتے، پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم اپنی لڑکی کے لیے یہ پسند کر سکتے ہو، اس نے کہا بالکل نہیں آپ کے قربان جاؤں، آپ نے فرمایا اسی طرح لوگ بھی اپنی لڑکیوں کے لیے یہ چیز پسند نہیں کرتے ہیں۔ پھر خدا کے رسول نے اس کی بہن، پھوپھی، ممانی کے

بارے میں دریافت فرمایا، جوان ہر سوال کا جواب سابق انداز میں دیتا رہا (لا واللہ یارسول اللہ جعلنی اللہ فداك) آپ نے اس کے بعد اپنے دست مبارک اس کے سر پر رکھے اور فرمایا:

"اللھم اغفر ذنبہ و طھر قلبہ وحصّن فرجہ"

"خدایا اس کے گناہ معاف فرما، اس کے دل کو پاکیزہ بنادے، اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما"

چنانچہ اس گفتگو کے بعد پھر جوان کسی طرف مائل نہیں ہوا۔

رسول خدا نے وہ انداز تفہیم اختیار فرمایا جس سے زنا کے اثرات بد سوسائٹی میں کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کا پورا پورا علم اس جوان کے دل میں بیٹھ جائے کہ پورے معاشرۂ انسانی میں کوئی ایسا نہیں کہ وہ اپنے کو اس پر راضی کر سکے یا اپنے متعلقین و گھربار کے لوگوں کو راضی کر سکے جس طرح کہ خود سائل اپنے کو اس پر آمادہ نہ کر سکا اس کے نتیجے میں اس جوان نے زنا سے دست برداری عقل و ہوش کی روشنی میں اختیار کی، اگر کسی کا نفس کسی بات سے مطمئن ہو جائے اور طبیعت ہی اس کو دل سے نکال دے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

آپ قوم کو ان کی زبان اور لہجے میں مخاطب فرماتے چنانچہ عاصم اشعری سے خطیب بغدادی نے جو روایت کیا ہے اسے سنئے، وہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "لیس من امبر امصیام فی امسفر یعنی لیس من البر الصیام فی السفر، چونکہ اشعری لام کو میم بنادیتے ہیں اس لیے آپ نے بھی وہی انداز تعلیم اختیار فرمایا۔

آپ گفتگو کرتے وقت بات کو ایک نہیں تین بار ادا فرماتے تاکہ مخاطب پوری طرح سن لے اور سمجھ لے۔ آپ جب گفتگو فرماتے تو ٹھیر ٹھیر کر گفتگو کرتے سامع اسے سن کر اپنے ذہن میں بیٹھا لیتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح رواں دواں گفتگو نہ فرماتے بلکہ گفتگو میں پوری بات ٹھیر ٹھیر کر الگ کر کے ادا کرتے جس سے سننے والا یاد کر لیتا، دوسری روایت میں ہے کہ آپ بات اس طرح فرماتے کہ اگر کوئی الفاظ شمار کرنا چاہتا تو شمار کر لیتا۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ بھی تھی کہ آپ اپنی بات مکرر سہ کرر ادا کرتے تا کہ سامعین اس پوری گفتگو کو اخذ کرلیں، کسی سننے والے سے کوئی بات رہ نہ جائے، حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ جب گفتگو فرماتے تو ہر جملہ کو تین بار دہراتے کہ سننے والا پوری طرح سمجھ جائے اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لے جاتے تو تین بار سلام فرماتے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ آپ ہمیشہ یہی انداز اختیار فرماتے بلکہ اگر ضرورت ہوتی تو ایسا کرتے اور جب اندازہ ہوتا کہ ضرورت نہیں ہے تو اپنی قوت بے کار صرف نہ کرتے۔

اوپر کے حالات اور روایات سے یہ بات آئینہ ہوگئی کہ آپ لوگوں کے سامنے احکام کا بیان عمدہ انداز میں فرماتے کہ سامع کو کسی بات کے دریافت کرنے کا موقع ہاتھ نہ آتا اور نہ کسی سائل کا کوئی سوال تشنۂ تفہیم رہ جاتا، بلکہ آپ جواب اس انداز سے دیتے کہ سوال کرنے والے کے لیے شافی و کافی ہو جاتا۔

آپ اپنے تمام معاملات میں آسانی ملحوظ رکھتے، سخت اور الجھی ہوئی بات نہ فرماتے، آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ مسلمان رخصت و آسانی پر بھی اسی سرور و شادمانی کا اظہار کریں جس طرح کہ وہ مہمات اور جان جوکھم معاملات میں جاں سپاری و جذبہ و جوش کا اظہار فرماتے ہیں۔ کمر توڑ عبادتوں سے روکتے، اسی طرح احکام میں تنگی ناپسند فرماتے، یہ چیزیں نا قابل فہم نہیں اس لیے کہ آپ اس شریعت کے ترجمان تھے جس میں آسانی اور کشادگی ہے، آپ کا یہ انداز زندگی جو آپ کی سیرت کا گہرا مطالعہ کرے گا، کھلے طور پر دیکھ لے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی بردباری لوگوں کے لیے آئینہ ہے اور امت سے آپ کا دلی تعلق دوسری طرف نمایاں و روشن ہے تو ایک طرف حق کے معاملہ میں آپ کا غضب بھی قابل دید ہوتا، کبھی الجھاؤ سے منع فرمانے میں ان کا اسلوب ظاہر ہوتا ہے، اس کے لیے ابوہریرہ کی یہ روایت عمدہ شہادت ہے کہ ایک اعرابی مسجد میں آیا اور دو رکعتیں ادا کی اور یہ دعا کی "اللھم ارحمنی و محمداً ولا ترحم معنا

أحدا'' اور آنحضور یہ سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم نے خدا کی کشادہ اور پھیلی ہوئی رحمت کو سمیٹ کر مختصر کر دیا، پھر کچھ دیر بعد اس نے مسجد ہی میں پیشاب بھی کر دیا، یہ دیکھ کر لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگوں کو خدا نے آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجا ہے تم کو سخت گیر بنا کر نہیں رکھا ہے اس پیشاب پر چند ڈول پانی کے بہا دو یا ایک مشکیزہ ہی پانی ڈال دو۔

آپؐ ہمیشہ سہولتوں کے داعی رہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سکھلاؤ آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرو، تنگی اور دشواری کی راہ نہ دکھاؤ، تم میں سے کوئی غصہ سے بھڑک اُٹھے تو تم خاموش ہو جاؤ، حضرت انس نے فرمایا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین میں بہترین راہ سہولت کی راہ ہے اور سب سے بڑی عبادت دین کی سمجھ ہے، آپ الجھن پیدا کرنے والی باتوں اور مشکل مسائل میں پڑنے سے روکتے تھے، ہمارے اس معلم خیر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کیسی خدا لگتی ہے کہ جب دو چیزیں تمھارے سامنے ہو تو ان میں سے آسان چیز کو اختیار کرو، اگر کسی گناہ کا خدشہ نہ ہو، اگر گناہ ہو تو پھر سب سے زیادہ دور بھاگ نکلو، حضورؐ نے اپنی کسی بات کا خود اپنی جانب سے انتقام نہیں لیا، اس وقت آپؐ نے تادیب فرمائی جب کہ خدا کی حرمت کو کم تر کرنے کی کوشش کی جاتی، اس وقت آپ خدا کے لیے عقوبت و انتقام کے حدود قائم فرماتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر مسلمان کے بارے میں انداز معاشرت یہی تھا کہ آپ سب کے لیے ایک خاکسار بھائی کی طرح بردبار معلم کی طرح ہوتے، بلکہ شفیق باپ کی طرح جب آپ اپنے اصحاب کو کچھ بتلانا چاہتے تو انھیں بڑے نرم انداز میں مخاطب فرماتے جسے مخاطب بھی دل سے پسند کرتا، مثلاً آپ فرماتے کے میں تمھارے لیے شفیق باپ کی طرح ہوں، جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو قبلہ کا نہ استقبال کرو نہ قبلہ کا استدبار، جس سے آپؐ کے صحابہ کو آپ کا انداز بھانے لگتا اور ان میں سے کوئی تعریف کے دفتر کھولتا یا آپ کو حد سے زیادہ اُچھالتا تو آپ اسے ناپسند فرماتے، آپ فرماتے تم مجھے اس طرح نہ اُچھالو جس

طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو اچھال رکھا ہے، میں تو بندہ ہوں تم کہو اس کے بندے، اس کے پیامبر، آپ کو یہ بالکل پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو درجۂ انسانیت سے بلند کریں اور آپ کی عظمت کے گن گائیں، آپ ان سے کسی جزا اور شکریہ کے بھی طالب نہ ہوتے۔

تعلیم نسواں:

کچھ عورتیں حضور کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ ہم آپ کی مجلس میں مردوں کے ہوتے ہوئے حاضر نہیں ہو پاتے، اس لیے ہمارے لیے ایک دن مقرر فرما دیجیے، جس میں ہم لوگ حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں شخص کا گھر تم لوگوں سے گفتگو کے لیے مقرر کرتا ہوں اور ان عورتوں کی تعلیم کے لیے مقرر وقت اور مقرر دن پر تشریف لاتے، آپ نے ان آنے والی عورتوں سے فرمایا کہ کوئی عورت جس نے اپنے تین بچے اپنی زندگی میں خالصتاً لوجہ اللہ وقف کر دیے وہ ضرور جنت میں داخل ہوگی، ایک عورت بول پڑی کہ اگر دو بچوں کی موت ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا دو ہی سہی۔

عورتیں حضور سے سوال کرتیں، آپ ان کے جوابات تمام دینی امور میں عنایت فرماتے، یہ باتیں کچھ گاہے ماہے حادثاتی طور سے نہ ہوتیں، بلکہ آپ نے ان کے لیے مخصوص اوقات نکال رکھے تھے جس میں عورتیں آپ کی خدمت میں باقاعدہ آتیں آپ انھیں اسلام کی تعلیمات کی تلقین فرماتے اور ان کو فتوے عنایت کرتے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سب سے عمدہ عورتیں انصار کی عورتیں ہیں جنھیں دین سیکھنے سے شرم و حیا مانع نہیں ہوتی۔

یہ دیکھو ام سُلیمؓ ملحان کی صاحبزادی حضرت انس بن مالک کی والدہ ہیں، رسول خدا کے پاس اس وقت گئیں جب ام المومنین ام سلمہؓ وہاں موجود تھیں، حضور سے مخاطب ہو کر فرمایا "ان اللہ لا یستحی من الحق" سچی بات میں خدا سے کیا آنچل، کیا عورت کو احتلام کے موقع پر غسل کرنا چاہیے، حضور نے فرمایا اگر منی نکل پڑے، حضرت ام سلمہ نے شرم سے آنچل کر لیا اور کہا کہ رسول خدا عورت کو احتلام ہوتا ہے، آپ نے فرمایا ہاں تیرے

ہاتھ خاک آلود ہوں بچہ ماں کے مشابہ کن بنیادوں پر ہوتا ہے۔

اس پاکیزہ روح، بلند طبیعت، کشادہ سینہ اور تربیت کے صحیح و دلکش انداز کے ساتھ آپ اپنے صحابہؓ کو تعلیم فرماتے اور عامۃ المسلمین کی رہنمائی کرتے، اسلام کے احکام، اس کی تعلیمات، اس کے آداب عام لوگوں کے سامنے رکھتے، مسلمانوں اور خدا کے رسول کے مابین کوئی دربان و حاجب نہ ہوتا جیسا کہ سلاطین قیصر و کسریٰ کے یہاں ہوتے بلکہ مسجد ہی گہوارۂ علم تھا جہاں آپ مسلمانوں کو شریعت کی تعلیم فرماتے، لوگ آپ سے راستے میں مسائل پوچھ لیتے، آپ خندہ پیشانی سے ان کے جواب دیتے، لوگ حج کرتے مناسک ادا کرتے ہوئے آپ کے سامنے آجاتے یا آپ کی سواری روک کر مسائل دریافت کرتے، آپ ان کو اسی حالت میں جواب دیتے، خندہ روئی، شگفتہ مزاجی تو آپ کی فطرت تھی، آپ لوگوں کے سوال کا جواب اسی انداز سے دیتے، پوچھنے والے خواہ کم ہوں یا زیادہ، کبھی آپ ممبر ہی سے لوگوں کو تبلیغ اسلام فرماتے اور تعلیمات دین سے نوازتے، احکام کی تفصیل و تشریح فرماتے، لوگ اسے سن کر دوسرے لوگوں کو پہنچاتے جو ان لوگوں سے قریب ہوتے جس نے سنا اور آپ کی باتوں کی شہادت دی، اسے محفوظ رکھا۔ اس کے آثار اس کے دل میں عرصۂ دراز تک قائم رہتے حتیٰ کہ کبھی کوئی شک ہوتا تو پھر حضور سے حاضر ہو کر دریافت کر لیتا تا کہ اس کا واہمہ دور ہو جائے اور وہ صحیح ڈگر پر لگ جائے اور سچائی کو جان جائے۔

اوپر کی گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسول خدا کا طریقہ ایک قسم کی ضمانت ہے کہ رسول کریمؐ جو کچھ اپنے اصحاب کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتے اور شریعت کے احکام میں اپنے قول و عمل کی روشنی میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے وہ ساری باتیں مشاہد و معلوم ہو جائیں اور اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ یہ احکام و تعلیمات ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں۔

اب ہم آپ کے سامنے ان مواد کے اسباق رکھنا چاہتے ہیں جس سے صحابہ کا ربط اور ان کی جد و جہد معلوم ہو جائے جو حضور کے ساتھ صحابہ کو تھی۔ اس کے بعد ہم صحابہ کی ان کیفیات کا ذکر کریں گے جس میں انھوں نے شریعت کو رسول خدا سے حاصل کیا۔

مادۃ السنۃ

آپ کو اس باب کے ابتدائی صفحات میں یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ سنت ہی وہ مادۂ اصلیہ ہے جسے صحابہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حاصل کیا تھا اور سنت کو قرآن کے ساتھ مطابقت دینے اور اس کا اتباع کرنے میں صحابہ کی جدوجہد مشترک و یکساں انداز کی تھی۔

ہم کو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ سنت کا تعلق مسلمانوں کی زندگی کے سارے معاملات سے ہے خواہ وہ عقائد ہوں، عبادتیں ہوں، مناسک ہوں، خرید و فروخت کے معاملات ہوں یا ان کی نجی زندگی ہو، سبھی سے اس مادہ کا تعلق ہے اسی طرح ان کی اخلاقیات و معاشرت سے بھی اس کا گہرا رابطہ ہے، مسلمان کی روزمرہ زندگی، امن و جنگ آرام و تکلیف غرض ساری چیزوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

جس مادہ میں اتنی خصوصیات ہوں، شاگرد کیوں نہ اس کی دل و جان سے قدر افزائی کرے اور کیوں نہ اس کا حریص ہو اس لیے کہ سنت ہی سے اس کے سارے نظام قائم ہیں اس کے سارے تصرفات میں اسی کا خون ہے صحابہ کی پوری ٹولی سنت نبوی کی حریص ہی نہیں شیفتہ تھی، آپ کی مجالس میں آنے میں ایک دوسرے پر مسابقت کرتی اور اُن کا مضبوط و راسخ ایمان اس کی طرف کھینچتا اور ان کی محبت ان کے گرامی علم کو حاصل کرنے پر ابھارتی، انھوں نے رسول خدا سے سن کر علم کا فضل اور علم کا مقام جان لیا تھا اور یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ طالبین علم کی منزلت اور اس کا اجر کیا ہے، اسی چیز نے انھیں سنت کے حصول اور اس کی تطبیق پر پورے اخلاص اور صداقت کے ساتھ متوجہ کیا تھا یہ ساری باتیں رسول خدا سے تعلیم سنت لینے کا ان کا کیا انداز تھا آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔

صحابۂ کرام کا رسول اللہ سے اخذ سنت کا طریقہ

جیسے جیسے ایمان رسول خدا کے اصحاب کے دلوں میں جاگزیں ہوتا گیا ان کی راہ روشن ہوتی گئی، انھوں نے اسلام کی عظمت کو پہچان لیا، صحابہ قرآن کے سرچشمہ سے پوری طرح

سیراب ہونے لگے اس لیے کہ یہ وہ چشمہ تھا جو خشک ہونے والا نہ تھا، انھوں نے اس معجزہ کو بھی کھلی آنکھوں دیکھا اور ہدایت کی راہ پالی، ان کے دل خدا اور رسول کی محبت سے سرشار تھے، جس کے نتیجہ میں انھوں نے آغاز ہی میں آپ پر جاں نثاری کا حق ادا کردیا، اور اپنے قائد و معلم کی حمایت میں جان لڑادی، صحابہ نے اپنا مال و جان اپنی اولاد بھی چیزیں خدا کے رسول پر نچھاور کردیں، ان کی ساری فطری قوتیں بدل گئیں، ان کی طبیعتوں میں انقلاب آگیا، ان کی عام زندگی بدل گئی، وہ سب کچھ اسلام کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے لیے خرچ کرنے لگے، تاریخ کے صفحات پر یہ نقش دوام باقی رہے گا کہ مسلمانوں نے کیسی کیسی عظیم قربانیاں پیش کی ہیں، جب بھی اسلام کو مال کی ضرورت ہوئی تو مسلمان مال کو پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی غیر معمولی سعی کرتے، مسلمان اپنے مال کا تہائی، نصف، بعض ساری دولت ہی حضور کی خدمت میں پیش کرکے دم لیتے حالانکہ مسلمان انتہائی عسرت و تنگی میں گزارتے مگر رسول خدا کی ایک آواز پر لبیک کہہ کر سب کچھ نثار کردیتے، حضرت عثمان شام سے اپنے تجارتی مال لے کر آئے تو قافلہ کے سارے مال کو مسلمانوں کے لیے ہبہ کردیا اور ملنے والے غیر معمولی منافع کو یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ مجھے اس سے زیادہ نفع حاصل ہوچکا ہے۔

مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کردیں اور غزوۂ احد میں حضور اکرم پر مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے تو مسلمانوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر رسول خدا کی حفاظت میں جس جگرداری کا ثبوت دیا وہ قابل ذکر ہے یہ ابودجانہؓ صحابی ہی تھے جنھوں نے اپنی پشت کو رسول خدا پر آنے والے تیروں کا ڈھال بنادیا تھا، زخموں نے انھیں نڈھال کردیا تھا، ان کے بغل میں علیؓ تھے جو اپنی تلوار سے جانبازانہ دفاع کررہے تھے اور سعد بن وقاص دشمنوں پر تیر برسا رہے تھے کہ فتح مسلمانوں کے حصہ میں گئی۔

یہ نمونۂ مشتے از خروارے کے طور پر ہم نے بیان کئے کہ رسول خدا پر فداکارانہ، جاں نثارانہ انداز میں صحابہ نے خدا کے رسول کے ساتھ عقیدت اور دین کی حفاظت کا حق ادا

کردیا، ان کا یہی جذبۂ حب رسولؐ اور پامردزندگی نے رسول خدا سے علم حاصل کرنے پر انھیں اُبھارا اور انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب کچھ سیکھا۔

صحابہ حضور سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے، آپ سے آیات قرآنی یاد کرتے، ان کے معنیٰ ومطالب سمجھتے اور ان آیتوں سے استنباط کا طریقہ سیکھتے اور اپنے اوپر اسے منطبق کرتے، پھر اسے دوسروں کو یاد کراتے اسی سلسلہ میں ابوعبدالرحمٰن السلمی کی یہ حدیث ہے کہ ہم سے قرآن وہ لوگ بیان کرتے جنھوں نے خود رسول خدا سے قرآن کی تعلیم پائی، مثلاً عثمان بن عفان، عبداللہ بن مسعود وغیرہ کہ وہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے اس سے آگے اس وقت تک نہ بڑھتے جب تک کہ وہ اس میں جو علم وعمل ہے پوری طرح سیکھ نہ لیتے اس طرح ہم نے قرآن سے علم وعمل بھی کچھ سیکھ لیا۔

بعض صحابہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں ٹھہر جاتے اور اسلام کے احکام وعبادات سیکھتے، پھر اپنی قوم اور خاندان میں واپس آکر تعلیم دیتے اور دین کی سمجھ عطا کرتے، اسی قسم کی بات اس حدیث میں ہے جو بخاری نے مالک بن حویرثؓ سے نقل کی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، ہم سب کے سب جوان العمر ہم سن تھے، ہم لوگ آپ کے پاس بیس دن ٹھہرے، حضور کو ہمارا قبیلہ سے اپنے اہل وعیال اور گھر بار سے دور رہنا محسوس ہوا، چنانچہ آپ نے سوال فرمایا کہ تم لوگوں نے اپنے اہل وعیال کو کس حال میں چھوڑا تھا، ہم نے آپ کو ساری کہانی بتادی، آپ بڑی نرم طبیعت، دل جوئی کرنے والے تھے، فرمایا اپنے گھربار میں واپس جاؤ، انھیں سکھاؤ اور ان کو حکم دو، نمازیں اسی انداز میں ادا کرو جیسی تم نے مجھے ادا کرتے دیکھا، جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان پکارے پھر تم میں جو بڑا ہو امامت کرے۔

صحابہ رسول خدا کی خدمت میں حاضری کے لیے بے چین رہتے، دوسری طرف اپنے معاشی خودکفالتی اور تجارت وغیرہ کے نظم کو بھی بحسن وخوبی انجام دیتے، بعض کو حاضری میں دشواری ہوتی تو باری کرکے رسول خدا کی مجلس مبارک میں حاضری دیتے جیسا کہ حضرت عمرؓ

کیا کرتے تھے خود ہی فرماتے کہ میں اور میرا انصاری پڑوسی جو بنی امیہ بن زید سے تھے، یہ مدینہ کا خاندان تھا ہم دونوں حضور کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے، ایک دن وہ آتے دوسرے دن میں حاضری دیتا، جب میں آتا تو وحی اور دوسرے معاملات کی خبر اس دن اپنے پڑوسی کو دیتا اور جب وہ آتا تو وہ سارے دن کے کوائف مجھے پہنچاتا۔

براء بن عازب اوسیؓ فرماتے ہیں ہم نے ساری حدیثیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہیں بلکہ بہت سے ہمارے ساتھیوں نے ہم سے بیان کیں اس لیے کہ ہم اونٹوں کی داشت و پرداخت میں مشغول ہوتے اور اصحاب رسول کا طریقہ تھا کہ جو حدیث ان کے سننے سے رہ جاتی یا خود حضور علیہ السلام سے براہ راست سن نہ پاتے وہ اپنے ساتھیوں سے سن لیا کرتے، ان میں سے بہت سے بڑے قوی الحافظہ ہوتے اور جو خود حضور علیہ السلام سے براہ راست سنتے ان پر جانچ پڑتال کی نگاہ رکھتے ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم میں کا ہر ایک براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں سن نہ پاتا اس لیے کہ ضرورتیں اور مشغولیتیں مانع ہوتیں اور یہ زمانہ ایسا تھا کہ لوگ جھوٹ نہ بولتے اس لیے جو موجود ہوتا وہ غیر موجود کو باتیں پہنچایا کرتا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم جو حدیثیں تم لوگوں سے بیان کرتے ہیں اس میں کی سبھی حضور سے براہ راست سنی ہوئی نہیں ہوتیں، بلکہ ہم میں سے بعض سن کر آتے اور پھر ہم سے بیان کرتے اور ہم میں سے کوئی کسی کو متہم نہ کرتا، ایک روایت قتادہ سے ہے کہ انس نے کوئی حدیث بیان کی اس پر ایک شخص بول پڑا کہ تم نے براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں نے خود سنی ہے یا یہ فرمایا کہ مجھ سے ایسے آدمی نے بیان کیا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا، بخدا ہم جھوٹ نہیں بولتے، بلکہ ہم کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جھوٹ کیا ہوتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ رسولؐ خدا سے جو سنتے اس کا مذاکرہ ہمیشہ کیا کرتے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ہوتے، آپ سے حدیث سنتے، جب

وہاں سے اُٹھتے تو ہم اس کی تکرار کر لیتے کہ ہمیں یاد ہو جائے۔

ان مجلسوں کے علاوہ بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ مختلف طریقوں سے حدیث حاصل کیا کرتے تھے، جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

(الف) کوئی اچانک بات پیغمبرؐ کے سامنے پیش آتی اور آپ اس کا حکم بیان فرماتے اور یہ حکم مسلمانوں میں پھیل جاتا، جس نے اس کو سنا اس کے ذریعہ، کبھی خود صحابہ کی کثرت بھی نشر و اشاعت کا سبب بن جاتی اور تیزی سے بات پھیل جاتی، کبھی تعداد کم ہوتی تو حضورؐ لوگوں میں اعلانیہ جاری فرماتے تا کہ سب کو معلوم ہو جائے۔

اس کی مثال وہ روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ نے بیان فرمائی کہ رسول خدا ایک ایسے تاجر کے پاس سے گزرے جو اناج بیچ رہا تھا، آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیسے فروخت کرتے ہو، اس نے بتایا، رسول خدا کو اس کا انکشاف ہو گیا، آپ نے اپنے ہاتھ غلہ کے اندر ڈالے تو وہ اندر سے بھیگا ہوا تھا آپ نے فوراً ہی فرمایا (لیس منا من غش) ''ملاوٹ کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے۔''

اس کی دوسری مثال قاسم بن محمد کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے ان کو بتلایا کہ حضور میرے پاس تشریف لائے، اس وقت میں ایک رنگین شال اوڑھے ہوئی تھی جس میں صورتیں تھیں، آپ کا چہرہ دیکھتے ہی بگڑ گیا آپ نے وہ چادر اپنے ہاتھوں سے لے کر اس کے پرزے اڑا دیئے اور فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو مخلوق الٰہی کی شبیہ بنا کر ہم پلۂ مصور حقیقی بن جاتے ہیں۔

کبھی حضور علیہ السلام کسی صحابہ کی غلطی دیکھتے یا ان کی خطاء کاری کی آپ کو اطلاع ہو جاتی تو آپ اسے درست کرتے اور صحیح راہ پر لگا دیتے، اس قسم کی وہ حدیث ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کا وضو کیا، اس نے ناخن کے برابر قدم میں پانی نہیں پہنچایا اسے رسول خدا نے دیکھ لیا، آپ نے اس سے کہا جاؤ دوبارہ اچھا وضو کر کے آؤ، وہ شخص لوٹا وضو کیا اور پھر نماز ادا کی۔

اسی قسم کی وہ روایت بھی ہے جو عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ خیبر کی جنگ میں ایک جماعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ فلاں آدمی شہید ہو گیا اور فلاں جاں بحق ہو گیا، وہ جماعت ایک شخص پر گزری اور کہا کہ فلاں شہید ہے اس پر رسول خداؐ نے فرمایا کہ بالکل نہیں میں نے اسے جہنم میں ایک چادر میں جلتے دیکھا یا ایک عباء میں، پھر آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا ابن الخطابؓ جاؤ اور لوگوں میں منادی کردو کہ جنت میں ایمان دار داخل ہوں گے، میں نکلا اور یہ اعلانیہ کر دیا کہ باخبر رہو بجز مومن کے جنت میں دوسرا داخل نہ ہوگا۔

(ب) وہ ہنگامی حالت جن سے خود مسلمانوں کو سابقہ پڑتا اور اس کے بارے میں رسول خُدا سے دریافت کرتے، آپ ان کو فتویٰ دیتے، جواب عنایت فرماتے، جس میں سوال کا کھلا اور واضح جواب ہوتا، اس قسم کے ہنگامی حالات میں خود سائل کی خصوصیات شامل ہوتیں یا کسی اور سے متعلق ہوتیں، غرض یہ واقعات جو انسان کو اس کی زندگی میں پیش آتے، صحابہ ان کے دریافت کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے، بلکہ معلم اول کی جانب تیزی سے بڑھتے تاکہ حقیقت حال سے واقف ہو کر اپنے دل کا اطمینان حاصل کرلیں اور سینہ کی بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑ جائے، کبھی کوئی صحابی لجا جاتا تو پھر دوسرا صحابی اس کی جانب سے سوال کرتا، اس کی مثال حضرت علی کی وہ روایت ہے کہ میں مذی کا مریض تھا (کثرت شہوت سے) مجھے حضور سے سوال کرتے حجاب ہوتا، اس لیے کہ آپ کی صاحبزادی میرے نکاح میں تھیں میں نے مقداد بن اسودؓ سے صورت حال بیان کی، آپ نے سوال کیا، اس کا جواب بھی آپ نے فرمایا قضیب کو دھو کر وضو کرلیا جائے۔

ایک دوسری حدیث جس میں قیس بن طلقؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے خود یا ان کی جانب سے کسی نے دریافت کیا کہ میں نماز میں تھا، اپنے ہاتھ سے ران کو کھجلا رہا تھا کہ میرا ہاتھ میرے ذکر تک پہنچ گیا، اس پر حضور نے فرمایا کہ وہ بھی تو جسم ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس سے بھی زیادہ پوشیدہ باتوں کے بارے میں بھی لوگ دریافت کرتے جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے عروہ نے روایت بیان کی کہ حضرت رفاعہؓ کے گھر

میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ انھوں نے مجھے طلاق دے دی ہے پھر میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر سے نکاح کرلیا، وہ عنین ہیں، ان کا ذکر گھنڈی کی طرح ہے، آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم رفاعہؓ کے پاس جانا چاہتی ہو؟ ایسا ممکن نہیں، جب تک کہ دونوں ایک دوسرے سے لذت یاب نہ ہو جائیں۔ حضرت ابو بکر حضورؐ کے پاس موجود تھے۔ خالد بن سعید منتظر تھے کہ انھیں اجازت نکاح دی جائے، آپ نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ ابو بکر نہیں دیکھتے کیسی کھلی بات حضور کے پاس وہ کہہ رہی ہے۔

مسلمان حضور کے پاس اپنے سارے معاملات و حالات رکھتے۔ اس سلسلے میں کوئی مانع نہ تھا نہ کوئی پردہ تھا جو انھیں سوال سے روک دیتا۔ ایک دور افتادہ دیہاتی بھی آپ سے اسی طرح سوال کرتا جس طرح ایک ہمہ وقتی خدمت میں رہنے والا صحابیؓ، ہر ایک سچائی کی تلاش میں تھا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی رسول خدا کے پاس حاضر ہوا اور حضور سے کہا کہ ہم لوگ جنگل میں رہتے ہیں، ہم میں سے بعض کو گوز نکل جاتی ہے۔ رسول خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ خدائے پاک حق سے شرم نہیں کرتا، جب تم میں سے کسی کو یہ صورت پیش آئے تو وضو کرلو اور دیکھو عورتوں کے دبر میں جماع نہ کرنا۔

یہ صحابہ ہیں جو خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ذات سے متعلق باتیں دریافت کرتے جن کے پوچھنے میں دوسرے شرما جاتے مگر صحابہ کسی بات کے دریافت کرنے میں شرماتے نہ تھے۔ اپنے معاملات، عبادات، عقائد اور بہت ساری باتیں دریافت کرتے، بلکہ صحابہ کا یہ دستور تھا کہ جہاں انھوں نے کوئی بات سنی تو لوٹ کر آپ کے پاس آتے کہ اس سرچشمہ سے سیراب ہوں اور آپ کے علم سے کچھ زادِ راہ لے لیں۔ ضمام بن ثعلبہؓ اور ان کی قوم کو جب کہ رسول خدا کا پیامبر پیغامِ رسالت لے کر ان کے پاس پہنچا، تو ضمام فوراً ہی حضور کی خدمت میں چل پڑے۔ آپ کے صحابہ آپ کے ساتھ تھے، ضمام اونٹ پر سوار مسجد میں آئے۔ حضرت انس کہتے ہیں، وہیں مسجد میں انھوں نے اونٹ کو بٹھایا اور اس کے پیروں کو حلقہ لگایا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے، تم میں محمد کون ہے؟ حضور لوگوں میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے، ہم

نے ان سے کہا یہی تکیہ لگائے سفید رنگ کا انسان۔ پھر ضمام نے آپ سے کہا ابن عبد المطلب آپ نے فرمایا میں نے تو جواب دے دیا۔ اس شخص نے حضور سے کہا، میں تم سے پوچھنے والوں میں ہوں، سوال میں سخت ہوں، اس کا بُرا نہ ماننا۔ آپ نے فرمایا پوچھو بھی، جو پوچھنا ہو۔ ضمامؓ نے کہا میں آپ کے رب اور آپ کے پہلے لوگوں کے رب کے واسطہ سے دریافت کر رہا ہوں، کیا خدا نے آپ کو رسول بنا کر سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک کہتے ہو، پھر ضمام نے کہا میں آپ سے دریافت کرتا ہوں بخدا کیا خدا نے آپ کو پنج وقتہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے، پھر ضمام نے کہا کہ آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں اس پر میں ایمان لایا، میں اپنی قوم کا فرستادہ ہوں، اپنی قوم کا نمائندہ ہوں، مجھے ضمام بن ثعلبہ اخو بنی سعد بن بکر کہتے ہیں۔

اسی قبیل سے وہ حدیث بھی ہے جس پر کسی صحابی نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا، اس پر انھیں غیر معمولی صدمہ ہوا، انھوں نے اپنی اہلیہ کو صورتِ حال کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ وہ حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس آئیں اور ان کے سامنے صورت حال رکھی۔ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ رسول خدا روزے کی حالت میں بوسہ لیتے ہیں، عورت واپس گئی اور اپنے شوہر کو مطلع کیا اس پر وہ برانگیختہ ہو گئے کہ ہم رسول تھوڑے ہی ہیں خدا اپنے رسول کے لئے جو چاہے حلال کر دے، پھر وہ عورت ام سلمہؓ کے پاس آئی حضور کو حضرت ام سلمہ کے پاس پایا، اس پر خدا کے رسول نے دریافت کیا کہ اس عورت کا کیا قصہ ہے۔ ام سلمہؓ نے آپ سے کہا، آپ نے کہا کہ کیا تم نے اس کو بتایا نہیں کہ میں ایسا کرتا ہوں۔ ام سلمہ نے کہا کہ میں نے بتایا، وہ اپنے شوہر کے پاس گئی اور اس سے بیان کیا، وہ غصہ ہوا کہ ہم رسولؐ خدا کی طرح نہیں ہیں، خدا اپنے رسول کو جو چاہے حلال کر دے۔ اس پر حضور ناراض ہوئے اور فرمایا میں خدا کے سامنے تم سے زیادہ پابند ہوں اور حدود خداوندی میں تم سے کہیں زیادہ واقف ہوں۔

صحابی کو اپنی احتیاط کی بنا پر یہ خیال گزرا کہ رسول خدا کے ساتھ یہ معاملہ خاص ہوگا، اس پر خدا کے رسول نے بتلایا کہ نہیں یہ ایک عام حکم ہے۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین کی عادت تھی کہ وہ کوئی

ایسی بات سنتیں جس کا ان کو حکم نہ معلوم ہوتا تو حضورؐ سے اس کا حکم معلوم کرتیں پھر بتلاتیں۔

دو مسلمان کسی معاملے میں ایک دوسرے سے جھگڑتے تو وہ رسول خدا کی جانب رجوع کرتے کہ وہ اس معاملے کا فیصلہ کردیں اور صحیح بات یا حکم بتلادیں۔ اسی قبیل سے مسور بن مخرمہؓ کی حدیث ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے بیان کیا کہ ہشام بن حکم بن حزامؓ نے سورۂ فرقان تلاوت کی اس میں کچھ ایسے حروف پڑھے جو حضور سے پڑھتے ہوئے نہیں سنے گئے، میں نے سوچا کہ نماز ہی میں ان پر چڑھ بیٹھوں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا کہ یہ قرأت تم کو کس نے سکھائی۔ انھوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ میں نے کہا کہ تم غلط بیان کررہے ہو، بخدا خدا کے رسول نے تم کو اس طرح نہیں پڑھایا ہوگا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور لئے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ میں نے کہا کہ حضورؐ آپ نے فرقان کی سورت مجھے پڑھائی ہے۔ میں نے ان کو ایسے حروف پڑھتے سنا جو آپ نے کبھی نہیں پڑھایا، آپ نے ہشامؓ سے فرمایا، ہشام پڑھ کر سناؤ۔ ہشامؓ نے اسی طرح پڑھا جیسے پہلے پڑھا تھا۔ اس پر رسولؐ خدا نے فرمایا اس طرح بھی نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے کہا کہ تم پڑھ کر سناؤ، میں نے پڑھا تو آپ نے فرمایا، یوں بھی نازل ہوئی ہے کہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے جو آسان لگے پڑھ لو۔

ان جوابوں، فتوؤں اور فیصلوں میں سنت کی کتابوں کے مختلف ابواب کے بہت سے مواد ہیں، رسول خدا کی سنتوں کا ایک بڑا حصہ ان واقعات سے تعمیر ہوتا ہے، قطعاً ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ واقعات و حادثے جہاں جس وقت اور جس کی وجہ سے واقع ہوئے وہ ان کو بھلا دے یا انھوں نے کسی خاص موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات دریافت کی ہو وہ اسے بھول جائے۔ اس لیے کہ سائل کی زندگی کا ایک حصہ بلکہ جوہری حصہ وہ واقعہ ہے جو اس کی زندگی میں پیش آیا۔ پھر وہ کیسے بھلا سکتا ہے۔

(ج) وہ واقعات و حوادث جس میں صحابۂ کرام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرفات کو ملاحظہ کیا ہے۔ ایسے واقعات لاتعداد ہیں جو آپؐ کی نماز، روزہ، حج، سفر و اقامت سے متعلق ہیں جن کو صحابہ سے تابعین نے لیا اور آنے والی نسل کو اس سے باخبر کیا۔

اس سے بھی سنت کا ایک بڑا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ بالخصوص آپ کی وہ ہدایات جو عبادات، معاملات اور سیرت سے متعلق تھیں، اور اسی قسم کے معاملات سے اس کا بھی تعلق ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کی صورت میں آپ کے سامنے رکھا تھا۔ نماز کیا ہے؟ اسلام اور احسان کس چیز کا نام ہے؟ قیامت کا علم کہ کب آئے گی؟ پھر اس کے جوابات جو حضورؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیئے۔ حضرت جبرئیلؑ کے چلے جانے کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے گرد وپیش کے مصاحبین کی طرف متوجہ ہونا اور فرمانا، عمر یہ سائل کون تھا، تمھیں اس کا کچھ علم بھی ہے؟ حضرت عمر نے اس کا جواب یوں دیا کہ اللہ اور اس کے رسول اس کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ جبرئیل تھے، تمھارے پاس آئے تھے کہ تمھیں دین کی تعلیم دیں۔

اسی قسم کی تعلیمات میں سے وہ روایت بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے وتر اول لیل میں، آخر لیل میں، درمیانی رات میں، ادا کی۔

اسی سلسلہ کی وہ روایت بھی ہے جو سالم بن ابی عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے رسولؐ خدا، ابوبکرؓ وعمرؓ و دیکھا کہ وہ جنازہ سے آگے چل رہے تھے۔

اسی سلسلہ کی وہ روایت بھی ہے جو حضرت علی بن ابی طالبؓ سے مروی ہے کہ ہم رسولِ خدا کے ساتھ نماز کے لیے گئے، آپ لوٹ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔ پھر آپ تشریف لائے آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، آپ نے ہمیں نماز پڑھائی پھر فرمایا، مجھے یاد آیا کہ میں جنبی ہوں، یوں ہی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا اور میں نے غسل نہیں کیا ہے، اس لیے نماز سے پہلے اگر کسی کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہو یا وہ صورت ہو جس سے میں دوچار تھا تو اسے لوٹ کر قضائے حاجت کرنا چاہیے یا غسل کر لینا چاہئے پھر نماز ادا کرنی چاہیے۔ حضرت علیؓ سے اور بھی روایات ہیں۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی آخری بات بس یہ تھی نماز، نماز۔ ماتحتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔

ہمارے سابقہ بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ان تینوں صورتوں میں سنت کی

حفاظت کی مساعی عہد نبوی میں غیر معمولی طور سے تھیں اور انہی عوامل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی شخصیت مربی اور معلم کی یا اس سے بلند تر شخصیت تھی۔ آپ کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تو یہی ہے کہ آپ رب العالمین کے رسول ہیں اور سنت مادہ کی حیثیت رکھتی ہے اور صحابہ ان تلامذہ کی حیثیت میں ہیں، جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت حاصل کی۔ اپنی زندگی اس کے مطابق کرنے کی سعی کرتے رہے اور معلم اول اور مادۂ سنت دونوں کو پورے اخلاص کے ساتھ قبول کیا۔

دلوں میں اس کی عظمت عیاں ہوگئی تھی اور اس بات کی آرزو جاگزیں تھی اور اتباع سنت کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ تھا کہ ان سے ایمان کی تکمیل کرسکیں اور گمرہی و بے راہی سے ان کا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ ان ساری باتوں نے ایک گہرا نقش چھوڑا ہے جس کا اصل سبب صحابہؓ کا غیر معمولی طور پر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سنت کی حفاظت میں لگے رہنا۔ پھر ان سنتوں کو تابعین تک جوں کا توں نقل کرنا، پھر ان کا آنے والوں تک پہنچانا تھا۔ اس لیے کہ پیمبرؐ نے اپنے اصحابؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم سنتے ہو پھر یہی سنی ہوئی بات تم سے سُنی جائیں گی اور پھر اسے وہ سنائیں گے جنھوں نے تم سے سننے والوں کو سنایا۔

اس لیے ہمارے لیے یہ دور کی بات نہیں کہ ہم بڑے وثوق واطمینان سے یہ کہیں گے کہ سنت عہد نبویؐ میں صحابہؓ کے ہاتھوں میں محفوظ تھی۔ انھوں نے اس کی حفاظت قرآن کے پہلو بہ پہلو کی تھی۔ اگرچہ ہر صحابیؓ کا حصہ اس سلسلے میں دوسرے صحابی سے مختلف تھا، ان میں سے بہت نے کثرت سے سنت کو یاد رکھتے تھے۔ بہت سے کم یاد کرنے والے تھے بہت سے درمیانہ درجہ کے تھے، اس لیے ہمیں کہنے دیجیے کہ انھوں نے سنت کے گرد ایسا گھیرا ڈال دیا تھا کہ وہ پوری طرح سے محفوظ تھی اور تابعین تک سنت کو منتقل کرنے کی ذمہ داری بھی انھوں نے لی تھی۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بعض سنتیں تمام ہی صحابہ سے چھوٹ گئیں یہ خیال خام ہے۔ اس لیے کہ ان کی حدیث کی جانب توجہ اور حصولِ سنت وترویج سنت کا شوق بے پایاں ہمارے سامنے ہے۔ ایسی صورت میں سنت کے کچھ حصے ان کی نگاہ سے اوجھل رہ جائیں

ناقابل فہم بات ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پیمبر کی اثر بار صحبت میں بیس سے زائد سالوں تک ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد رہے، اور آپ کی باتیں، عمل، بیداری وخواب، حرکت و سکون، نشست و برخاست، آپ کی غیر معمولی محنت، عبادت گزاری، آپ کے عادات، چھوٹی بڑی لڑائیاں، آپ کی مسرّت وغصہ، تعذیر، آپ کے طعام وشراب اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ معاملات، آپ کی اخلاقی تربیت، گھوڑوں کی نگرانی، مسلمانوں کی نگہداشت، اہل شرک کے نام خطوط، آپ کے عہد و پیمان، سبھی چیزیں ان لوگوں کے سامنے تھیں۔ آپ کے عہد وپیمان، آپ کے ہر ہر لمحے اور سانسیں اور اوصاف حمیدہ۔ یہ تمام کے تمام اس کے ماسوا ہیں جو صحابہؓ نے آپؐ سے احکام شریعت سیکھا اور عبادات اور حلال وحرام کے سلسلہ میں جانکاری حاصل کی، یا آپ سے کوئی فیصلہ کرایا۔ حق بات تو یہ ہے کہ وہ سلف صالح کے خلف صالح تھے۔ (رضی اللہ عنہم)

عہد نبوی میں اشاعت حدیث

دعوت اسلامی کے ابتدائی زمانے سے ہی قرآن کریم کے ساتھ ساتھ سنت کی بھی اشاعت ہوتی رہی۔ مسلمان اس زمانے میں تعداد کے اعتبار سے کم تھے۔ دارِ ارقم بن عبد مناف میں اکٹھا ہوتے، وہیں دین کی تعلیمات حاصل کرتے، قرآن کریم پڑھتے اور اپنے شعائر کی اقامت کرتے، حضورؐ اس وقت تک یہ انداز اختیار فرماتے رہے تا آنکہ خدا کے احکام کی کھلم کھلا تعلیم کا حکم ہوا۔ مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور اسلام پورے جزیرۃ العرب پہ چھا گیا، ان تمام مراحل دعوت میں حضورؐ اپنی دعوت کو لوگوں تک پہنچاتے رہے اور فتویٰ جاری کرتے اور فیصلہ فرماتے، ان کے ازدواجی تعلقات کراتے، انھیں درست رکھتے اور جنگ وامن میں راحت وتکلیف ہر حال میں ان کی رہنمائی کرتے، انھیں تعلیم دیتے اور احکام کی حفاظت کرتے اور اسے اپنی زندگی پر ڈھالتے، اس کے علاوہ بہت سے اسباب ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے دنیا میں اشاعتِ سنت کی کفالت کی۔

(۱) پیمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی لگن اور آپ کی جد و جہد اسلام کی تبلیغ، اس کی اشاعت میں آپ نے ہر طریقۂ دعوت استعمال فرمایا، ہر انداز اپنایا، آپ نے اسے خود قبائل کے سامنے رکھا، ہر طرح کی تکلیف اٹھائی، مصیبتیں جھیلیں، موسم حج میں آنے والے وفود سے ملے اور ان پر اسلام پیش کیا۔ غرض تبلیغ رسالت میں آپ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تا آنکہ اسلام سر بلند ہوا اور اس کی حکومت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ ان سارے تغیرات و تمام حالات میں سنت مسلمانوں کے دل میں اپنا گھر بنا کے رہی۔

(۲) اسلام کی طبیعت اور اس کا نظام نو، جس نے لوگوں کو اس پر ابھارا کہ وہ رسول خدا سے اس کے احکام دریافت کرتے، اس کی غایت معلوم کرتے، اس میں سے بعض رسولِ خدا کی دعوت کو سنتے ہی اسے قبول کر لیتے، یا اسلام کے بارے میں سوالات کرتے، تسلی ہونے پر وہ اپنے اسلام کا اعلان کرتے، کوئی اپنی قوم میں جا کر ان تعلیمات کی تبلیغ کرتا اور خدمت اقدس میں جو کچھ اسے نظر آتا یا آپ سے سنتا وہ اپنی قوم کو سنا تا پہنچاتا۔

(۳) پیمبر کے ساتھیوں نے علم کے حاصل کرنے، اسے محفوظ رکھنے کی لگن کا مظاہرہ کیا اور اسے لوگوں میں پھیلانے کی انتھک کوشش کی، صحابہ کے اس لگن اور انتھک جد و جہد کا ذکر ہم ان کی علمی جد و جہد کے عنوان سے کر چکے ہیں، اور صحابہ کا طریق تحصیل تعلیم بھی بیان کر چکے ہیں۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن

امہات المومنین نے دین کے پھیلانے میں بڑا زبردست حصہ لیا۔ سنت کی اشاعت مسلمان عورتوں کے مابین کی، اس لیے کہ بہت سی عورتیں اپنی فطری حیا کی وجہ سے رسولِ خدا سے باتیں پوچھتے شرماتیں۔ آنحضرت کی ازواج کے پاس آتیں اور اپنی مشکلات کا حل کر لیتیں۔ اس لیے کہ وہ حضور کی ازواج تھیں ان کا دن رات کا خلوت و جلوت کا رسولِ خدا سے ساتھ تھا، ان کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو دوسروں کو نہ معلوم ہوتیں۔ حضرت عائشہؓ تو وفورِ علم کے لیے مشہور ہی تھیں اور احکام کو سمجھنے کا شوق

بھی ان کا بے پایاں تھا۔ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ عائشہ زوجِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر حضور سے کوئی بات سنتیں اور سمجھ میں نہ آتی تو پھر مراجعت کرتیں اور سمجھتی تھیں۔ پیمبرِ خدا نے فرمایا کہ جو حساب کتاب کی زد میں آ گیا وہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ خدا نے خود فرمایا کہ ہم آسان حساب کریں گے، اس کے جواب پر حضورؐ نے فرمایا یہ ''عرض'' ہے مگر خدانخواستہ جو محاسبہ میں آ جائے گا تو ہلاک ہی ہو جائے گا۔

مسلمانوں نے حضرت عائشہ کے پایۂ بلند کو جان لیا تھا اور اسلامی احکام میں ان کی گہری نگاہ سے بھی واقف تھے۔ اسی وجہ سے حضور کے وصال کے بعد طالبان علوم اسلامیہ، طالبان فتویٰ آپ کی طرف رجوع کرتے۔ آپ ان کا مرکزِ علم و عمل تھیں، اور دین کی سینکڑوں باتوں میں مسلمانوں کی آماجگاہ وسند تھیں۔

صحابیات:

وہ عورتیں جو حضور کی حیات میں حضورؐ پر ایمان لائیں اور آپ سے تعلیم دین حاصل کی، وہ عورتیں تحفظ سنت کے سلسلے میں اہم ترین مقام پر تھیں، وہ تبلیغِ دین میں صحابہؓ کے شانہ بہ شانہ تھیں بلکہ بعض حیثیتوں سے اور بھی بڑھی ہوئی تھیں، ان میں حضور کی خدمت میں حاضری کا غیر معمولی شوق تھا۔ حتیٰ کہ جب انھیں احساس ہوتا کہ حضورؐ کی مجلس میں مرد ہی چھائے ہوئے ہیں تو اس وقت اپنے لیے الگ مجلس برپا کرنے کی خواہش کا اظہار کرتیں، اس میں وہ اپنی باتیں دریافت کرتیں اور اسلام کے احکام کی تعلیم حاصل کرتیں، کبھی وہ عید کی نمازوں میں حاضر ہو کر رسولؐ خدا کی احادیث سنتیں۔ ان صحابیات نے عورتوں سے متعلق مسائل میں اچھا خاصا اثر چھوڑا ہے، انھوں نے عورتوں سے متعلق ازدواجی زندگی کے بارے میں بہت سے احکام معلوم کیے جن کا خود مردوں کو معلوم کرنا مشکل تھا۔

اس طرح احادیث کی اشاعت میں ان کا ایک اہم مقام رہا۔

آپؐ کے ایلچی، وفود اور گورنر:

مدینہ جو ہجرت کے بعد دولت اسلامی کا دارالسلطنت تھا دعوت اسلامی کی اساس تھا، یہیں سے ساری دنیا میں ہدایت کا نور پھیلا اور بتوں کی خدائی کے قلعے یہیں سے مسمار کیے جاتے، اسی مدینہ کے سامنے سرکشوں کے تخت ڈھائے جاتے۔ مدینہ سے ہی حضورؐ اپنے ایلچی دور اور قریب کے قبائل کو روانہ فرماتے۔ جس میں انھیں دعوتِ اسلامی دی جاتی اور انھیں احکام اسلامی سکھلائے جاتے اور نظم سلطنت کے گُر بتلائے جاتے۔ یہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور قبائل کے درمیان اپنی قوت کی وجہ سے حائل رہے۔ رسول خدا اپنے اصحاب کو قبائل کی طرف بھیجتے اور انھیں اصول دعوتِ اسلامی سکھلاتے اور انھیں حکمت و خیر خواہی کے ساتھ خدا کی طرف بلانے کی ہدایت فرماتے۔ اسی انداز کی وہ وصیت ہے جو آپ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن روانہ کرنے کے وقت فرمائی تھی۔ اس میں آپ نے انھیں ہدایت دی تھی۔ یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا۔ تم دونوں آسانی پیدا کرنا، تنگی و سختی کو راہ نہ دینا، ان کو خوش آیند کہنا، دور باش نہ کہنا۔ (بخاری ج ۲ صفحہ ۲۲)

اور معاذؓ سے فرمایا "تم کو اہل کتاب بھی ملیں گے، ان کو ایک خدا کی شہادت اور میرے رسولؐ ہونے کی شہادت کے کلمے کی طرف بلانا۔ اگر انھوں نے تمھاری بات مان لی تو انھیں سکھانا کہ خدا نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جب اسے مان جائیں تو بتلانا کہ خدا نے تم پر صدقہ فرض فرمایا ہے جو مالداروں سے لے کر ضرورت مندوں کو دیا جائے۔ اگر وہ اسے بھی تسلیم کرلیں تو ان کی عمدہ چیزوں کو لینے کی مت سوچنا اور مظلوم کی پکار سے ڈرتے رہنا، اس لیے کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا ہے۔ آپ اپنے گورنروں، ججوں کی ہمت افزائی فرماتے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسولؐ خدا نے مجھے یمن بھیجنا چاہا، میں نے عرض کیا، اے خدا کے رسول آپ ایسی قوم کی جانب مجھے بھیج رہے ہیں جو مجھ سے عمر میں بڑھی ہوئی ہے، میں ان میں کیسے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا، جاؤ خدا تمھیں ثابت لسان بنائے گا اور تمھارے دل کو نیک راہ پر لگا دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفود اور آپ کے گورنر ایسے عمدہ اور چنے ہوئے ہوتے جو اچھی طرح پیام رسائی کرتے اور ذمہ داری سے عمدہ انداز میں عہدہ برآ ہوتے، اور ہجرت کے چھٹے سال تو آپ کے وفود کی بڑی کثرت تھی، آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد اپنے پیامبروں کو سلاطین کی جانب روانہ فرمایا، جو آپ کے گرامی نامہ لے کر ان سلاطین و امراء تک جاتے۔ ایک ہی دن میں چھ آدمی مختلف سمتوں میں روانہ کئے جو اس علاقے کی مادری زبان سے واقف تھے تاکہ اس قوم کے لوگوں سے انہی کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ آپ نے اپنے سفیر قیصر روم امیر بُصریٰ، حارث بن ابی سمرہ والی دمشق کے پاس ہرقل سے پہلے روانہ فرمائے۔ مقوقس امیر مصر کے نام ہرقل سے پہلے سب کو اسلام کی دعوت دی، آپ نے اپنا مکتوب نجاشی شاہ حبشہ کو بھی روانہ فرمایا۔ کسریٰ شاہ ایران کے نام بھی اور منذر بن ساوی شاہ بحرین کے نام بھی، عمان و یمامہ کے سلاطین و امراء کے نام بھی، یہ سفراء وہاں حاضری کے بعد ان امراء، سلاطین و روساء قبائل کی طرف سے کئے گئے سوالوں کا جواب دیتے ان کے سامنے اسلام اور اس کے مقاصد رکھتے جو منشاء نبی کی روشنی میں پورا ہوتا، توحید و ارشاد کی باتیں ان کے کانوں میں ڈالتے۔ حضورؐ پر جو لوگ ایمان لاتے آپؐ ان کے بڑے ذی وجاہت کو ان کا سردار بنا دیتے، اس کی اعانت ایسے علماء سے کرتے جو انھیں دین سمجھاتا اور تعلیم دیتا۔

فتح مکہ، فتح مبین

ہجرت کے آٹھویں سال قریش نے صلح حدیبیہ کے اقرار نامے کو توڑ دیا، آپؐ نے ان قبائل کو جو مسلمان ہو چکے تھے رمضان میں مدینہ طیبہ بلایا اور دس ہزار جنگجو سپاہیوں کے ہمراہ آپ مکہ کے جانب روانہ ہو گئے۔ آپ نے مکہ فتح کر لیا، بت پرستی کا خاتمہ ہوا، اصنام کو توڑ دیا، پھر آپ منبر خطابت پر گئے، ہزاروں مسلمانوں اور کفار کے مجمع میں آپ نے اپنے ان دشمنوں کو پروانۂ عفو سے نوازا جنھوں نے آپ کو ستایا اور آپ کو تکلیفیں دی۔ پھر برملا بہت سے احکام جاری کئے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے نہ مارا جائے اور دو الگ قومیت و ملت رکھنے والے ایک

دوسرے کے وارث نہ ہوں گے، کوئی عورت اپنی پھوپھی اور خالہ کے نکاح میں ہوتے ہوئے وہاں نکاح نہ جائے گی۔ پھر حضورؐ کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے۔ فتح مکہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو ایک بڑے مجمع نے نقل کیا اور اسی کے ساتھ آپ کی تقریر بھی نقل کرکے دنیا کے سبھی حصوں کو پہنچائی گئی، جس طرح کہ نومسلموں نے آپ کے ارشاد کو سنا اور اسے سن کر اپنے لوگوں، گھربار، اہل وعیال، قرابت داروں میں مکہ اور بیرون مکہ ہر جگہ پہنچایا۔

حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال ذی الحجہ کے مہینے میں حضورؐ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے اور لوگوں کے ساتھ آپ نے مراسم حج ادا کیے۔ آپ کے ساتھ مسلمانوں کا ایک عظیم مجمع تھا جو نوے ہزار یا اس سے زیادہ پر مشتمل تھا، اسی عظیم مجمع کے ساتھ آپ نے وقوف عرفہ فرمایا اور لوگوں کے سامنے ایک جامع خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں احکام کثیرہ بیان کیے، اس میں مسلمانوں کے خون اور ان کے مال کی حرمت کا اعلان فرمایا، امانت کے ادا کرنے کی ہدایت، جاہلیت کے سود کو کنڈم کیا۔ اسی طرح جاہلیت کی خون ریزیوں کو بھی آپ نے یک لخت ختم کردیا اور بہت سی عادات و مراسم باطلہ کے خاتمہ کا اعلان کیا، اسی طرح آپؐ نے آیت قرآنی کی تاکید فرماتے ہوئے حرمت والے مہینوں کے آگے پیچھے کرنے سے منع فرمایا، اَنَّما النَّسِیُٔ زِیادۃٌ فی الکفر (مہینوں کا آگے پیچھے کردینا کفر کی زیادتی ہے)۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق بیان کیے، عورتوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کی ہدایت فرمائی اور وارث کے لیے وصیت سے منع فرمایا۔

یہ خطبہ جو کانٹے کی چیز تھی سنت کی اشاعت میں سب سے اہم تھا، اس سے قبائل عربیہ میں پوری طرح اشاعت سنت ہوئی، اس لیے کہ اس کو ہزاروں ہزار نے سنا پھر ان لوگوں نے اسے تمام دنیا میں پھیلایا تاکہ حضورؐ کے اس قول کا امتثال ہوجائے جس میں آپ نے فرمایا:

"ألا هل بلغتُ؟ اَللّٰهم اشهد فليبلغ الشاهد منكم الغائب"

"اے خدا اگر میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا ہو تو آپ اس کے گواہ رہیں، اسی انداز سے حاضر غیر حاضر کو پہنچا دے"۔

حجۃ الوداع کے بعد وفود

فتح مکہ کے بعد حضور علیہ السلام کی خدمت میں تمام جزیرۃ العرب اور اس کے اطراف سے وفود کی آمد شروع ہوگئی، وہ آتے ہی حضور سے بیعت کرتے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتے، ان وفود کی آمد کا تانتا حجۃ الوداع کے بعد بندھ گیا، آنے والوں کو آپ خوش آمدید کہتے اور انھیں اسلام کی تعلیم دیتے، اور اپنے نصائح اور ارشادات سے نوازتے۔ بعض وفود آپ کے پاس آکر ٹھیر جاتے پھر واپس جاکر اپنے قبیلہ کے لوگوں کو دین مبین کی تعلیمات پیش کرتے، ان وفود میں ضمام بن ثعلبہؓ کی سربراہی میں آنے والا وفد ہے جس کو رسولؐ خدا نے اسلام کی تعلیمات سے نوازا، یہ اپنی قوم میں واپس گئے، انھیں یہ تعلیمات اسلامی پیش کیں وہ سب کے سب اسلام لائے۔

وفد عبدالقیس، وفود بنی حنیفہ وطیٔ و کندہ، وازوشنوءہ اور حمیر کے سلاطین کے سفراء یہ سارے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے پیامبروں کو اسلام کی اطلاع کے ساتھ حضور کی خدمت میں روانہ کیا تھا، پھر آپ نے ان کے پاس مکتوب مبارک روانہ کیا، جس میں ان کے اسلام لانے کی اطلاع پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ اس مکتوب میں آپ نے انھیں خدا کی اطاعت اور دین کو بڑی مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت فرمائی۔ اس میں آپ کی وصیت تھی جو ان سفراء اور وفود کے ذریعہ روانہ فرمائی کہ رعیت کے ساتھ بھلائی کریں، ویسے ہی ہمدان سے بھی وفود آئے جن کے آپ نے جواب دیے، ثعلبہ و بنو سعد کے وفود جو ہذیم سے آئے تھے اور بہت سے وفود جن کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

رسولِ خدا ان وفود میں منتخب آدمیوں پر نظر رکھتے، ان کی تکریم فرماتے، ان کو تعلیم دیتے، وہ لوگ بھی آپؐ سے سوالات کرتے، آپؐ ان کے جواب عنایت فرماتے، انھوں نے آپ کی باتیں سنیں اور آپؐ کے نظریات سے واقف ہوئے، آپؐ نے ان کو عبادت میں شریک کیا، انھوں نے آپؐ کے بہت سے تصرفات دیکھے۔ اس طرح ان وفود نے بھی سنت کی نشرواشاعت میں بڑا حصہ لیا۔

یہ عوامل کثیرہ سنت کی اشاعت کے لیے اور مسلمانوں تک دین پہنچانے کے لیے کافی ذرائع

تھے جس سے اسلامی سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑی آسانی سے اشاعت سنت کا کام ہوتا رہا۔
یہ مختصر مدت تھی جس میں عہد نبوی ہی میں سنت کی اشاعت عمل میں آئی۔ صحابہؓ اور تمام مسلمان اس کی حفاظت اور دوسروں تک پہنچانے میں بڑی لگن رکھتے تھے۔ حضورؐ کے وصال سے پہلے ہی پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل چکا تھا، قرآن وسنت اہلِ عرب کے سینوں میں رچ بس گیا تھا، دلوں کی بہار بن گیا تھا، قرآن کا یہ اعلان سچ ہو کے رہا، الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔"

دوسرا باب
فصل اوّل

حدیث دور صحابہ وتابعین میں

عہد نبویؐ میں شریعت کی اساس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ تھی، آپؐ پر وحی کا نزول ہوتا اور آپ اسے دوسرے لوگوں تک پہنچاتے، وحی کے مقاصد بیان فرماتے، اس کے احکام کو زندگی کے مختلف انداز پر ڈھال کر دکھلاتے۔ اس طرح امت کے سارے معاملات میں حضورہی مرجع اولین تھے۔ خواہ یہ امور قضاء سے تعلق رکھتے ہوں کہ فتویٰ سے ان کا لگاؤ ہو یا مالی، سیاسی، فوجی تنظیموں سے وہ متعلق ہوں۔ آپ اہم امور، مشکل گتھیوں کو اپنے صحابہؓ کی نظروں کے سامنے سلجھاتے، یہ گتھیاں قرآن کریم کی روشنی میں سلجھائی جاتیں، اگر کسی مسئلے پر قرآنی حکم موجود ہوتا تو اس کے متعلق فیصلہ کرتے، اگر کوئی ایسا حکم نہ ہوتا تو خود اجتہاد فرماتے، کبھی وحی کا انتظار فرماتے تھے تاکہ حکم الٰہی ومنشاء خداوندی کا علم ہو جائے، کبھی آپ اپنی عقل سے اجتہاد فرماتے اس کے بعد وحی سے اس کی تصدیق ہو جاتی، اس لیے کہ خدائے پاک اپنے رسول کو غلطی پر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دن یونہی گزرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا۔ اب امت کے سامنے قرآن کریم اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق موت سے قبل فرما دی تھی:

"ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما، کتاب اللّٰه وسنتی"

''میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انھیں پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، خدا کی کتاب اور میری سنت''۔

صحابہ اور تابعین نے آپ کی سنت کے ساتھ پوری طرح تمسک کیا۔ اس لیے کہ قرآن کا

یہ حکم تھا، اس حکم کی اطاعت اور اس کے حکم کا قبول کرنا ضروری تھا۔

"وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا"

"جو خدا کے رسول نے دیا اسے لے لو اور جس سے روک دیا اس سے رک جاؤ"

دوسری جگہ فرمایا:

"فلا وربك لايؤمنون حتىٰ يحكموك فيما شجر بينهم ثم لايجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما" آل عمران

" آپ کا رب گواہ ہے کہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے اختلاف میں آخری فیصلہ کن طاقت نہ مانیں اور اس پر دلوں میں کوئی میل بھی نہ ہو کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا، اور اس فیصلہ کو دل سے تسلیم کر لیں"

"وأطيعوا الله و الرسول لعلكم ترحمون"

"اطاعت گزار ہو جاؤ خدا کے اور رسول کے تاکہ تم پر رحمت کی بارش ہونے لگے"

رسول خدا کی ہر دعوت کو قبول کرنا آپ کی زندگی میں جس طرح واجب ہے اسی طرح آپ کی موت کے بعد بھی اطاعت واجب ہے۔ صحابہ نے عہد نبوی میں خدا کے ہر حکم کی پوری پابندی کی اور ان احکام کو پورے اخلاص سے نافذ کروایا، شریعت مطہرہ کی حمایت میں مال اور جان دونوں ہی کی قربانی دی، آپ کی وفات کے بعد بھی ان کا انداز اطاعت وہی تھا اس لیے کہ وہ وصیتِ رسول سے پوری طرح باخبر تھے۔

جس وصیت کو صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا جس کے راوی عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں:

"وعظنا رسول الله صلى الله عليه وسلم موعظة وجلت منها القلوب، وذرفت منهاالعيون، فقلنا: يارسول الله كأنها موعظة مودع فأوصنا، قال: أوصيكم بتقوى الله عزوجل والسمع والطاعة وان تأمّر عليكم عبد، فانه من يعش منكم فسيرى اختلافا كثيرا،

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، عضوا عليها بالنواجذ، وإياكم و محدثات الأمور فان كل بدعة ضلالة"

(ابو دائود وترمذی)

"ہمارے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کو پگھلانے والا وعظ فرمایا۔ اس کو سن کر آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ہم نے حضور سے کہا یہ وعظ تو وعظ رخصت معلوم ہوتا ہے، اس لیے آپ کچھ وصیت فرما دیں۔ آپ نے فرمایا میں تمھیں خدا کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور حکم سننے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اگر چہ تمھارے اوپر کوئی غلام ہی کیوں نہ امیر بنایا گیا ہو، اس لیے کہ تم میں کا جو زندہ رہے گا وہ بڑے اختلافات دیکھے گا، اس لیے تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر چلنا واجب ہے، ان کو دانت سے پکڑو اور نئی فتنہ سامانیوں سے بچتے رہو، دین میں بلا دلیل نئی بات گمراہی ہے"۔

صحابہ نے سنت کا تمسک پوری طرح کیا اور سنت نبوی کو لے کر آگے بڑھے، اور اس بات کو ناپسند کیا کہ اس شخص کی طرح ہوں جس پر رسول اللہ کا یہ قول صادق آتا ہے:

"يوشك الرجل متكئًا على أريكته يحدّث بحديث من حديثي فيقول: بيننا وبينكم كتاب اللّٰه عزوجل فما وجدنا فيه من حلال استحللناه وما وجدنا فيه من حرام حرمناه، ألا وان ماحرم رسول اللّٰه مثل ماحرم اللّٰه" (سنن ابن ماجہ)

"وہ دن قریب ہے کہ کچھ بے عقل اپنی مسند سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، ان کے سامنے میری حدیث بیان کی جائے گی تو اسے سن کر کہیں گے کہ ہمارے لیے تو خدا کی کتاب کافی ہے جو اس میں حلال ہے اسے ہم نے حلال جانا اور جو حرام ہے اسے حرام سمجھا۔ خبردار یہ گمان غلط ہے، خدا کے رسول نے جو حرام کیا وہ بھی ایسا ہی حرام ہے جیسا خدا کا حرام کیا ہوا"۔

صحابہ سنت کے سلسلے میں عظیم موقف رکھتے تھے اور جس نے اس کے خلاف سمجھا اس کی پوری طرح تردید کی۔ چنانچہ ابونضرہؒ نے بیان کیا کہ عمران بن حصین کے پاس ایک شخص آیا اور

کوئی بات پوچھی۔آپ نے سنت سے اس کا جواب دیا۔اس پر اس شخص نے کہا کہ مجھے کتاب اللہ سے جواب دو، میں کسی اور کی سننا نہیں چاہتا۔عمران بن حصینؓ نے کہا کہ تم احمق آدمی ہو، کیا تم کتاب اللہ میں ظہر کی چار رکعتیں پاتے ہو جن میں جہر کا حکم نہیں ہے۔پھر دوسری نمازوں کا ذکر کیا، زکوٰۃ کا بیان اس کے سامنے رکھا، اسی طرح اور دوسرے مسائل، پھر پوچھا کیا کتاب اللہ میں اس کی تفسیر ملتی ہے، خدا کی کتاب کا جو حکم ہوتا ہے سنت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔کسی شخص نے مُطَرِّف ابن عبداللہ الشخیر جو ایک بلند پایہ تابعی ہیں سے کہا کہ بجز قرآن کے کچھ اور نہ بتاؤ۔اس پر مطرف نے بیان کیا کہ ہم قرآن کا بدل نہیں چاہتے لیکن اس ذات کی بات چاہتے ہیں جو ہم سے زیادہ قرآن کا جاننے والا ہے۔(مقصد حدیثِ رسول ہے)

اب ہم آپ کے سامنے صحابہ اور تابعین کی پیروی رسول اور تمسک سنت مطہرہ کے بارے میں عرض کریں گے کہ صحابہ نے روایت سنت میں کس قدر تقویٰ، بیداری اور احتیاط سے کام لیا ہے، اس کا ذکر کریں گے، ہم آپ کو یہ بھی دکھلائیں گے کہ صحابہ نے رسول خدا کے عمل، اور آپ کی باتوں پر جمے رہنے میں کیا کیا پامردی دکھلائی۔

صحابہ وتابعین کا جذبۂ اتباع رسولؐ

اولین مسلمانوں نے خدا کے قول لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة کو بڑھ کر لیا، انھوں نے رسولؐ خدا کی اتباع میں اپنے کو فنا کر دیا۔آپ کی سنت پر چلتے رہے، صحابہؓ سنت نبوی کے تمسک کی اچھوتی تصویر ہیں جس میں رعیت وراعی کے حالات مختلف شعبہ ہائے زندگی پر مشتمل سنتوں کو اپنایا گیا ہے۔

یہ ابوبکر صدیقؓ ہیں جنھوں نے اسامہ بن زید کے پرچم کو گرہ لگائی اور ان کی فوج کو روکنے سے انکار کر دیا، جبکہ انھیں اس کی شدید ضرورت تھی، اور فرمایا کہ جس پرچم کو خدا کے رسولؐ نے لہرایا ہو اس کی گرہ کشائی میں کیسے کر سکتا ہوں۔خالد بن ولید کو پرچم دے رہے ہیں کہ وہ مرتدین سے جنگ کریں، اور فرمایا کہ میں نے رسولؐ خدا کو یہ کہتے سنا، خدا کا

پسندیدہ بندہ خاندان نبوت کا مددگار خالد بن ولید ہے، اللہ کی تلوار ہے۔ خدا نے اس تلوار کو میان سے نکالا تاکہ کفار و منافقین کی گردن اڑا دیں۔

آپ کے پاس صاحبزادی فاطمہؓ آتی ہیں رسولؐ خدا کا ترکہ مانگنے کے لیے، آپ ان سے فرماتے ہیں کہ میں نے رسولؐ خدا کو یہ کہتے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ جب کسی نبی کو خدا کچھ دیتا ہے، پھر اس کو اپنے یہاں بلا لیتا ہے، اسے وہ ان لوگوں کے حوالے کرتا ہے جو اس پیمبرؐ کے بعد آئیں گے۔ اس لیے میں آپ کے نصیبہ کو مسلمانوں کے حوالے کروں گا، صاحبزادی نے فرمایا کہ آپ نے جو کچھ خدا کے رسول سے سنا ہے آپ اس سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ میں خدا کے رسولؐ کا عمل کسی بھی مقام پر نہ چھوڑوں گا، اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو مجھے خطرہ ہے کہ میں بے راہ ہو جاؤں۔

مسیلمہ کذاب اور اس کی قوم کے ارتداد کے موقع پر حضرت عمر نے ابو بکر سے کہا آپؐ ان سے جنگ کر رہے ہیں حالانکہ میں نے رسول خدا سے سنا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ جاری رکھوں، تا آنکہ لا الہ الا اللہ کا اعلان کر دیں، جب وہ اپنی زبان سے یہ کلمہ ادا کر دیں تو ان کی جان ان کا مال محفوظ ہو گیا، اب اس کا خون بہانا، مال چھیننا جائز نہیں، ان کا معاملہ خدا کے حوالے۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں زکوٰۃ اور نماز میں فرق نہیں کرتا، جو ان دونوں کو الگ الگ سمجھے گا میں اس سے جنگ جاری رکھوں گا۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کے ہمراہ ان سے جنگ کی اس وقت ہمیں آپ کی پختہ رائے کا اندازہ ہوا۔

حضرت سائب بن یزیدؓ نے حُویطبؓ بن عبدالعزیٰ کے ذریعہ روایت کی کہ انھوں نے مجھے بتلایا کہ عبداللہ بن سعدی نے خبر دی کہ وہ حضرت فاروق اعظم کی خدمت میں ان کے دورِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؓ نے ان سے کہا کہ تم کام پر کام دیتے ہو، جب تم کو عامل کا منصب دیا جاتا ہے تو تم ناپسند کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں ایسا تو ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ایسا کرنے کا مقصد۔ میں نے کہا کہ میرے پاس گھوڑے، سواریاں، خادم موجود ہیں، اور میں بھلی طرح ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ میرے کارگزار مسلمانوں کے لئے صدقہ رہیں۔ حضرت عمرؓ نے

کہا کہ ایسا نہ کرو، اس لیے کہ اس طرح کا ارادہ میں نے بھی کیا تھا۔ نبی کریمؐ مجھے عطیہ دیتے، میں کہتا دوسرے مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہیں انھیں دے دیجیے، ایک مرتبہ آپ نے مجھے مال عنایت فرمایا، میں نے کہا کہ مجھ سے زیادہ ضرورت مندوں کو دے دیجیے۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ لے لو خود مال والے ہو کر کسی پر صدقہ کر دو، یہ مال جب تمھارے پاس اس طرح آ گیا کہ نہ تو تم اس کے منتظر تھے نہ مانگنے والے، جس مال کے درپے تمھارا نفس نہ ہو اسے لے لو۔

فروخ مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمرؓ جس زمانے میں امیر المومنین تھے، مسجد میں گئے تو دیکھا کہ کھانے کی چیزیں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کس طرز کا کھانا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے یہاں لایا ہوا کھانا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا اس کھانے میں اور جو اس کو لایا ہے برکت دے۔ آپؓ سے کسی نے کہا کہ امیر المومنین یہ ایسا کھانا ہے جو مہنگا بیچنے کے لئے روک رکھا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کس نے اسے مہنگے کی غرض سے روک رکھا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ فروخ مولیٰ عثمان اور فلاں مولیٰ عمرؓ۔ آپ نے فرستادہ دونوں کو بلانے کے لیے بھیجا۔ جب وہ آئے تو آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے کھانے کو بغرض گرانی روک رکھنے پر کس نے ابھارا۔ دونوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی پونجی سے خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا سے سنا ہے کہ جس نے مسلمانوں کے کھانے کو بغرض گرانی روکے رکھا، خدا اس کو افلاس یا جذام میں مبتلا کرے گا۔ فروخ نے اس موقع پر کہا، امیر المومنین میں خدا سے عہد کرتا ہوں اور آپؓ سے بھی کہ اب کسی طعام میں ایسا نہ کروں گا۔ لیکن مولیٰ عمرؓ نے کہا کہ ہم خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں، ابو یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم نے مولیٰ عمرؓ کو بحالت جذام دیکھا۔

واقعۂ یرموک میں سربراہان فوج نے عمر بن الخطابؓ کو کہا کہ ہم پر موت نے فوج کشی کی ہے، امداد چاہتے ہیں۔ ان کو آپ نے جواب دیا، میں تمھیں اس ذات کی طرف توجہ کرنے کو کہتا ہوں جو نصرت میں بہت بلند ہے اور نگرانی میں تیز، یعنی خدائے پاک۔ پھر اسی سے مدد طلب کرو اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں تم سے بہت کم لوگ تھے، اس

وقت ان کی خدا نے مدد فرمائی۔ میرا خط ملتے ہی تم ان سے نبرد آزما ہو جاؤ میری طرف آنے کی ضرورت نہیں۔

پیمبر کے صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کو اسی انداز میں قبول کرتے، خواہ ان کو موت ہی آجائے یا ہلاکت ہی سے پالا پڑ جائے۔

سبھی صحابہؓ سنت نبی کے لیے حریص تھے، ایک صحابی دوسرے صحابی سے اتباع کے لیے کہتا، اسی قسم میں سے وہ واقعہ بھی ہے جس میں یہ ہے کہ زید بن خالدؓ جہنی کو آپؓ نے بعد عصر دو رکعت پڑھتے دیکھا، آپؓ نے ان کے پاس پہنچ کر درے لگائے۔ اس پر زید نے کہا امیر المومنین ماریئے جتنا مار سکیں، مگر میں نے پیمبر کو پڑھتے دیکھا ہے، میں انھیں چھوڑ نہیں سکتا۔ حضرت عمر نے ان سے کہا اے زید، اگر مجھے اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ اس نماز سے رات تک کی نماز کے لیے ایک زینہ بنالیں گے تو میں تمھیں ہرگز نہیں مارتا۔

حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو دنیا کی فراوانی پر پلا ہوا دیکھا تو آپ نے انھیں رسول خدا کی یاد دلائی، اور فرمایا کہ آج تم کس سیر چشمی سے کھا پی رہے ہو۔ مجھے وہ دن یاد ہیں کہ حضورؐ جب بھوک سے بے چین ہوتے تو ردی کھجوریں بھی نہ ملتیں کہ اس سے ہی آپؐ اپنا پیٹ بھر لیتے۔

حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ممکن حد تک ہر معاملہ میں کرتے۔ حضرت عمر کو جب تیر لگا تو آپ سے کہا گیا کہ ہم خلیفہ بنالیں، تو آپؐ نے فرمایا، اگر ہم ترک کر دیں تو ہم سے بہتر رسول خدا نے ترک کیا اور اگر خلیفہ بنادیں تو یہ بھی صحیح ہے کہ ابو بکر نے خلیفہ بنایا تھا۔

مالک بن عبداللہ زیادی ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت دے دی، آپ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ حضرت عثمان نے فرمایا اے کعب! عبدالرحمان کا انتقال ہو گیا، اور اس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا اس میں تمھاری کیا رائے ہے۔ فرمایا اگر انھوں نے خدا کے حقوق ادا کر دیے تو کوئی بات ہی نہیں۔ اس پر ابوذر نے اپنا عصا اٹھایا اور کعب کو مارتے ہوئے فرمایا کہ میں

نے رسولؐ خدا کو کہتے سنا ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ اس پہاڑ جیسا سونا میرے پاس ہو اور میں اسے خرچ نہ کر ڈالوں اور اسے قبول بھی کر لیا جائے، ان میں سے ۶ اوقیہ میں اپنی موت کے بعد چھوڑوں، جو کہہ رہا ہوں عثمان تمھیں یاد ہے۔ کیا تم نے بھی یہ سنا ہے کہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا اس پر حضرت عثمان نے کہا ہاں سنا ہے۔

عطاء خراسانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے حضرت عثمان کو نشست گاہ میں بیٹھے دیکھا، وہاں آپ نے کھانا جو آگ پر پکا تھا منگایا، پھر اسے کھایا، کھا کر نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور نماز ادا کی، پھر نماز پڑھ کر آپ نے منہ پھیرا اور فرمایا، میں نے رسول خدا کی سی نشست اختیار کی اور خدا کے رسول کی طرح کھایا اور رسول خدا کی نماز کی طرح نماز ادا کی۔

میسرہ بن یعقوب طہوی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کو کھڑے کھڑے پانی پیتے دیکھا۔ میں نے آپ سے کہا کہ آپ کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں، اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ اگر میں کھڑے ہو کر پی رہا ہوں تو میں نے خدا کے رسول کو بھی کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہوگا، اور اگر بیٹھ کر پیتا ہوں تو ضرور ہے کہ میں نے خدا کے رسول کو بھی بیٹھ کر پانی پیتے دیکھا ہوگا۔

عبد خیر بن یزید خیوانی ہمدانی تابعی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ باطن قدم میرے نزدیک ظاہر قدم سے زیادہ مستحق مسح تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ رسول خدا ظاہر قدم پر مسح فرماتے ہیں تو میں نے بھی وہی انداز اختیار کیا۔

علی بن ربیعہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کے پاس سواری لائی گئی کہ اس پر سوار ہوں، آپ نے جب اپنا پیر رکاب پر رکھا، فرمایا، بسم اللہ، جب آپ اس پر سوار ہو گئے فرمایا، الحمدُ للہ، سبحان الذی سخرلنا ھذا وما کنا لہ مقرنین و انا الی ربنا لمنقلبون۔ پھر تین بار الحمدللہ اور تین بار اللہ اکبر کہا۔ پھر فرمایا سبحانک لاالٰہ الا أنت قد ظلمت نفسی فاغفرلی، پھر ہنس پڑے۔ میں نے کہا کہ آپ

کو کیوں ہنسی آئی، آپ نے فرمایا کہ پیمبر خدا کو میں نے اسی طرح کرتے دیکھا، پھر ہنس پڑے۔ میں نے کہا آپ کو کس بات پر ہنسی آئی اے رسولِ خدا۔ فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے رب اغفرلی تو خدا کو بھلا لگتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرے بندے نے جان لیا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہ کو نہیں بخشتا۔

صحابہ جاں نثارِ نبی تھے، آپ کی سنت کی حفاظت ان کا کام تھا خواہ اس سنت کی حکمت کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ اس کی حکمت سے واقف ہوں یا ناواقف۔ حضرت عبداللہ ابن عمر سنتِ رسول کریم کی محافظت کے لیے بہت زیادہ اہتمام فرماتے۔ رسول خدا ہی ہر چیز میں آپ کا اسوہ ہوتے۔ نماز ہو، کہ حج ہو، کہ روزہ حتیٰ کہ قضائے حاجت میں بھی اور اکثر پڑھا کرتے لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ، آپ رسول خدا کی کوئی بات سنتے یا آپ کے ساتھ کسی جنگ میں شریک ہوتے تو اس حد سے نہ آگے بڑھتے اور نہ پیچھے رہتے جس پر حضور علیہ السلام کا رکنا ٹھیرنا معلوم ہوتا، یا رسول خدا کا کوئی عمل معلوم ہوتا تو آپ بلا افراط وتفریط اس پر عمل پیرا ہوتے، چنانچہ مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ ابن عمر کے ہمراہ ایک سفر میں تھے، آپ ایک جگہ سے گزرے تو وہاں سے ہٹ گئے، آپ سے اس عمل کا سبب معلوم کیا گیا، فرمایا کہ میں نے رسول خدا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ مکہ اور مدینہ کے مابین ایک درخت تھا، آپ اس کے نیچے سو جاتے اور لوگوں کو بتلاتے کہ حضورؐ کو اسی انداز پر عمل کرتے میں نے دیکھا ہے۔

حضرت عمر نے رکن کے پاس وقوف فرمایا اور کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، اگر میں نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھیں بوسہ دیتے اور استلام کرتے نہ دیکھا ہوتا تو نہ بوسہ دیتا، نہ استلام کرتا، "لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ"

آپ رسولِ خدا سے ذرا بھی زائد کام یا عمل کرنے سے روکتے، یعلی بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطاب کے ہمراہ طواف کیا، جب ہم اس مقام پر پہنچے جو رکن کہلاتا ہے جو حجر اسود کے پاس پائے جانے والے دروازے سے قریب تھا، میں نے ان کا ہاتھ

استلام کے لیے پکڑا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے رسول خدا کے ساتھ طواف کیا ہے، میں نے کہا کہ ہاں۔ اس پر آپ نے اس انداز استلام کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ نے اس طرح سے استلام کیا میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر اس سے دور رہو۔

فان لك في رسول الله أسوة حسنة

حضرت علی فرماتے ہیں کہ جنازہ کے لیے قیام کے بارے میں ہم نے اگر رسولِ خدا کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہو گئے تو ہم بھی کھڑے ہو گئے اور اگر دیکھا کہ بیٹھے رہے تو ہم بھی بیٹھے رہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے مونڈھے کھولے رکھیں اور طواف میں دلکی انداز سے دوڑیں تا کہ مشرکین ان کی قوت اور بہادری کا اندازہ کر سکیں۔ جب اسلام کی قوت مضبوط ہوگئی، حکومت میں جان آگئی، حضرت عمر نے اب اس کی ضرورت نہیں سمجھی، پھر بھی آپ نے کہا کہ رمل کی ضرورت اور مونڈھوں کو کھولنے کی حاجت اب نہیں ہے، اس لیے کہ شوکتِ اسلام بڑھ چکی ہے، کفر اور اہلِ کفر ختم ہو چکے ہیں مگر ہم عہدِ رسول میں جو کرتے آئے ہیں اسے ترک نہیں کریں گے۔

لوگوں نے عبداللہ بن عمر سے کہا کہ ہم نمازِ سفر کا ذکر قرآن میں نہیں پاتے۔ اس پر ابن عمر نے فرمایا کہ خدا نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ہمارا نبی بنا کر بھیجا ہم کچھ نہ جانتے تھے ہم تو وہی کریں گے جیسا کہ ہم نے رسول خدا کو کرتے دیکھا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم بھٹکے ہوئے تھے ہمیں آپؐ کے ذریعہ ہدایت نصیب ہوئی، ہم کو تو انہی کی اقتداء کرنا ہے۔

صحابہ تو خدا کے رسول کی کوئی سنت جو آپ سے ثابت ہے چھوڑنا پسند نہ کرتے اور سنت کے مقابلے میں کسی کی رائے خواہ وہ کتنی ہی عظیم شخصیت کا مالک ہو پرکاہ نہ سمجھتے بلکہ اس پر شدید ناراضی کا اظہار کرتے اور بری طرح انکار کرتے، اگر کسی نے رسول خدا کی کسی سنت کو قبول کرنے پر اینچ پیچ سے کام لیا، یا آپ کی کوئی عادت جو آپ سے دیکھنے میں آئی اس پر انکار کرنے والے رہے تو ان سے لڑتے خواہ وہ ان کے اپنے لڑکے ہوں یا رشتہ دار ہوں۔

چنانچہ سعید بن جبیر نے عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا کہ ان کے پہلو میں ان کا بھتیجا بیٹھا تھا۔ اس نے کنکری پھینکی، انھوں نے اسے منع کیا اور کہا کہ رسول اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے کیوں کہ اس کنکری سے نہ تو کوئی شکار ہوتا ہے نہ کوئی دشمن ہی مغلوب ہوسکتا ہے۔ البتہ دانت ٹوٹ جاتا ہے یا آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ ان کا بھتیجا اس کے بعد بھی دوبارہ کنکری پھینکنے لگا، تو آپ نے فرمایا کہ میں حدیثِ رسول تم سے بیان کر رہا ہوں کہ آپؐ نے اس سے روکا پھر بھی تم نے کنکری پھینکا، اب میں تم سے کبھی بات نہ کروں گا۔

سالم نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا کہ انھوں نے حدیث بیان کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے نہ روکو، آپ کے ایک صاحبزادے بول اٹھے کہ ہم تو روکیں گے۔ آپ اس پر سخت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ میں حدیث نبویؐ بیان کر رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم منع کریں گے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بری طرح ڈانٹا اور فرمایا افسوس ہے کہ میں کہہ رہا ہوں کہ رسولِ خدا نے فرمایا اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نہیں کروں گا۔

سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ فرمایا، اس پر عروہ بن زبیر بولے کہ ابوبکر وعمر نے اسے روک دیا، اس پر ابن عباس نے کہا کہ عروہ کیا کہہ رہے ہو، انھوں نے کہا کہ ابوبکر وعمر نے متعہ روک دیا۔ ابن عباس نے کہا کہ مجھے نظر آرہا ہے کہ وہ ہلاک ہوجائیں گے۔ میں کہہ رہا ہوں رسولِ خدا نے فرمایا اور تم کہہ رہے ہو ابوبکر وعمر نے اس سے منع کیا۔

عبادہ بن الصامت جو نقیب تھے اور رسول خدا کے صحابی، روم میں معاویہ کے ہمراہ جنگ کررہے تھے۔ وہاں آپ نے لوگوں کو سونے کے ٹکڑوں کے بدلے دینار کی خرید وفروخت کرتے دیکھی اور چاندی کے ٹکڑوں کو درہم کے بدلے، تو آپ نے کہا کہ لوگو! سن لو کہ تم سود کھا رہے ہو، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ سونا دیکر سونا مثلاً بمثل جائز ہے، نہ تو اس میں زیادتی ہے نہ مہلت جو دونوں ہی ناجائز ہے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا ابوالولید میرے نزدیک جب تک معاملہ میں تاخیر نہ ہو یہ ربا نہیں ہے۔

عبادہ نے معاویہ سے کہا کہ میں حدیث رسول بیان کر رہا ہوں اور تم اپنی رائے پیش کر رہے ہو۔ میں ایسی سلطنت میں جہاں تمھارا وارد ہو، نہیں رہ سکتا، چنانچہ قافلہ کے ساتھ مدینہ واپس آ گئے۔ عمر بن الخطابؓ نے دریافت کیا کہ تم کیوں مدینہ آ گئے۔ آپ نے ساری کہانی سنائی اور پھر اپنے قیام کے بارے میں بتلایا۔ آپ نے فرمایا ابوالولید تم وہیں جاؤ اس زمین کے برے نصیب ہوں گے جہاں تم جیسے نہ ہوں اور معاویہ کو آپ نے لکھا کہ تمھاری حکمرانی سے یہ مستثنیٰ ہیں لوگوں کو اس کا خوگر بناؤ جو ابوالولید نے کہا اس لیے کہ اصل حکم وہی ہے۔

یہ صحابہ ہی تھے جنھوں نے سنت نبوی کی حفاظت کی اور امت کو پسندیدہ راہ پر لگایا اور حکام کو شریعت کے احکام پر عمل کرنے کرانے پر ابھارا، اور خدا کے دین میں راہِ حق سے انحراف کرنے سے انکار کیا اور اس میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کی۔

الزبیر بن عربی نے بیان کیا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ حضرت ابن عمر سے حجر اسود کے بارے میں کچھ پوچھ رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ خدا کو حجر اسود کو بوسہ دیتے اور استلام کرتے دیکھا۔ پھر اس نے سوال کیا کہ اس کے لیے آپ نے مزاحمت کرتے بھی دیکھا، اس پر ابن عمر نے کہا کہ تم نے یمن کو دیکھا ہے۔ (غیر ضروری سوال تھا) میں نے حضور کو بوسہ دیتے اور استلام کرتے دیکھا۔

وبرہ بن عبدالرحمان بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص ابن عمر کے پاس آیا اور کہا کہ میں طواف بیت اللہ احرام کی حالت میں کر سکتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ تم کو اس سے کیا مانع ہے؟ اس نے کہا فلاں شخص روک رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جب تک لوگ موقف سے واپس نہ آ جائیں اس وقت تک تم رکے رہو، مجھے یہ شخص ایک دنیادار کی طرح لگا، تم مجھ کو زیادہ پسند آئے، ابن عمر نے فرمایا کہ رسول خدا نے حج کیا، بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے مابین سعی کی، رسولِ خدا کا طریقہ فلاں ابن فلاں کے طریقہ سے زیادہ قابل پیروی ہے۔ اگر تو صحیح بات کہہ رہا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس کنایہ کی تصریح بھی کر دی اور فلاں ابن فلاں سے مراد عبداللہ بن عباس تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر تمتع کے بارے میں جو رخصت نازل فرمائی گئی ہے اس پر فتویٰ

دیتے تھے اور حضور نے بھی اس پر عمل کر دکھایا، لوگوں نے ابن عمر سے کہا کہ آپ اپنے والد کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں حالانکہ انھوں نے اس سے منع کیا، عبداللہ نے ان سے کہا خبردار خدا سے ڈرو، اگر عمر نے اس سے روکا تو اس میں کوئی خیر ہوگا اور ان کا مقصد صرف اتمام عمرہ ہی رہا ہوگا، پھر ایسی صورت میں تم لوگ کیوں اسے ناجائز قرار دیتے ہو جب کہ خدا نے حلال کیا اور رسولِ خدا نے اس پر عمل فرمایا۔ سنتِ عمرؓ سے زیادہ سنتِ نبویؐ قابلِ اتباع ہے۔ عمر نے تو یہ نہیں کہا کہ حج کے موسم میں عمرہ ناجائز ہے، بلکہ انھوں نے یہ کہا کہ بہترین عمرہ وہ ہے جو حج کے مہینوں کے سوا میں ادا کیا جائے۔

اخیر میں ہم عبداللہ بن عمرو بن العاص کے تمسک بالعبادۃ کا ذکر کریں گے، جن پر حضور علیہ السلام کی وفات ہوئی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص صحابہ میں بڑے عبادت گزار، نہایت متورع اور اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے۔ کثرت سے روزہ رکھتے، کثرت سے نمازیں پڑھتے۔ آپ کو حضورؐ نے خصوصی اجازت دی تھی کہ ہر مہینے کے کچھ دن روزے سے گزاریں۔ لیکن ان کو روزہ رکھنے میں قوت کے گھٹنے کا اندیشہ نہ تھا اور انھوں نے صوم دہر کا ارادہ کر لیا تھا، آخر عمر میں کثرتِ صوم سے ضعف کا احساس ہو گیا تھا، فرماتے کہ کاش میں حضورؐ کی اجازت خصوصی پر عمل کیے ہوتا اور اس سے انحراف نہ کیے ہوتا تو وہ میرے لیے زیادہ بہتر ہوتا، لیکن حضور سے جدا ہونے کے وقت میرا یہی انداز تھا اس لیے اس کی مخالفت کرنا مجھے پسند نہیں۔

روایت حدیث میں صحابہ وتابعین کی احتیاط

صحابہ سنت کی اہمیت پہچان کر اس کے پورے طور پر پابند رہے، رسول خدا کے تمام آثار کی پیروی کی اور جو چیز بھی آپ کی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی اس کی مخالفت سے گریز کیا۔ اسی طرح پیمبر کے آخری فعل سے بھی گریز کرنے سے پوری طرح آبی رہے، آپ سے احادیث کی روایت میں محتاط رہے کہ کہیں غلطی کا صدور نہ ہو جائے اور حضور کی پاکیزہ سنت میں دروغ کی آمیزش نہ ہو جائے یا کسی تحریف کے مرتکب نہ ہو جائیں، اس لیے کہ قرآن

کریم کے بعد سنت ہی شریعت کا مصدر اولین ہے۔ اس لیے صحابہ نے ہر وہ انداز حفاظت اپنایا جس سے نور سنت قائم رہے۔ رسول خدا سے روایت میں میانہ روی کو اپنا کر اپنا دامن پاک رکھا، بعض نے تو کم سے کم احادیث بیان کیں، چنانچہ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب کثرت سے روایت کو نہایت ناپسند کرتے یا کوئی ایسی حدیث اور حکم جس کا کوئی شاہد نہ ہو ڈھٹائی پر محمول کرتے اور روایات کے کم کرنے کی ہدایت کرتے، اس سے آپ کا مقصد روایت میں پھیلاؤ کو روکنا تھا کہ ہر کس و ناکس بیان نہ کرنے لگے جس سے شکوک پیدا ہو جائیں اور منافقین و فجار اور بدوؤں کو التباس و کذب کا موقع نہ مل سکے، جلیل القدر صحابہ کی اکثریت، اسی طرح حضور کے ساتھ دن رات کے ہم نشیں صحابہ مثلاً ابو بکرؓ، زبیرؓ، ابو عبیدہؓ۔ عباس بن عبدالمطلب آپ سے کم تعداد میں روایت کرنے والوں میں تھے۔ بعض تو ایک دم سے کسی حدیث کی روایت کا بار اپنے ذمہ لینا نہیں چاہتے تھے، جیسے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل جو عشرۂ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔

صحابہ نے خلافت راشدہ کے زمانہ میں حضرت عمر کا انداز اختیار کیا۔ احادیث کی روایت کی پوری جانچ کرتے، اس کے حروف و معنیٰ دونوں کی حفاظت کرتے، پھر بھی ڈرتے رہتے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے، اسی وجہ سے ہم بہتوں کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے پیمبر خدا سے بہت کچھ حاصل کیا، مگر اس عہد میں ان کی روایات زیادہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نے ایک حدیث بھی بیان نہیں کی، بہت پر رعشہ پڑ جاتا۔ جلد پہ جھریاں آ جاتیں، رنگ بدل جاتا۔ یہ ساری بات حدیث کے احترام اور احتیاط کے نتیجے میں پیش آئی۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جسے عمرو بن میمون نے بیان کیا کہ میں ہر پنجشنبہ کی شام میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ میں نے ابن مسعود کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ رسول اللہ نے یہ کہا، ایک موقعہ ایسا آیا کہ جمعرات کی شام میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے فرمایا، قال رسول اللہ۔ یہ کہتے ہی آپ منہ کے بل گر پڑے۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد آپ کو دیکھا تو آپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، آپ کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ آپ

کھڑے اپنی قمیص کی بٹن کھول رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے کہا ایسا ہی یا اس سے کچھ زیادہ یا اس کے قریب یا اس کے مشابہ فرمایا۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی غلطی کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان باتوں کو بیان کرتا جو میں نے پیمبر خدا سے سنی ہیں، آپؓ جب بھی حدیث بیان کرتے تو فرماتے أو کما قال۔ اسی طرح ابودرداء صحابی کا بھی حال تھا، امام شعبی ابن عمرؓ کے پاس ایک سال تک رہے مگر کبھی آپ کو یہ بیان کرتے نہیں دیکھا کہ آپ رسول خدا سے یہ حدیث بیان کر رہے ہیں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے کثرت حدیث سے یہ حدیث روکتی ہے، من تعمد عليّ كذبا فليتبوّأ مقعده من النار، ثابت البنانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک کے صاحبزادوں نے ان سے کہا کہ ابا جان آپ ہم سے کیوں اس طرح حدیث نہیں بیان کرتے جس طرح غرباء سے بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بیٹے جو کثرت سے حدیث بیان کرتا ہے اس سے اعراض کیا جاتا ہے۔

عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک سو بیس (۱۲۰) انصاری صحابہ سے ملاقات کی، ان میں سے ہر کوئی حدیث بیان کرتے وقت صرف یہ تمنا کرتا کہ اس کے بھائی کو کفایت کرے گی۔ اسی طرح وہ فتویٰ بھی اسی وقت دیتے جب ان کو یقین ہوتا کہ وہ اس کی پوری متابعت اور حفاظت کریں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب کسی سے مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ اس کو دوسرے کے پاس لوٹا دیتا، یہاں تک کہ وہ مسئلہ پھر پہلے ہی کے پاس دریافت کے لیے آجاتا، مجاہد بیان کرتے ہیں کہ میں نے مکہ سے مدینہ تک ابن عمر کی ہمرکابی میں سفر کیا مگر بجز اس حدیث کے کوئی حدیث ان سے نہیں سنی مثل المؤمن مثل النخلة (صحیح مسلم)

اسی طرح سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ میں نے سعد بن ابی وقاصؓ کے ہمراہ مدینہ سے مکہ تک کا سفر کیا۔ آپ نے اس پورے سفر میں ایک حدیث بھی بیان نہیں فرمائی، پھر انہیں کے ہمراہ میں واپس بھی ہوا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے بیان کیا کہ میں نے زبیر بن العوامؓ سے کہا کہ کیا بات ہے آپؐ رسول خدا سے اس انداز پر حدیثیں نہیں بیان کرتے جس طرح کہ ابن مسعود وغیرہ کو بیان کرتے دیکھتا ہوں۔ اس پر زبیر نے جواب دیا کہ اسلام لانے کے بعد سے میں جناب نبی کریم سے جدا نہیں ہوا۔ مگر ان سے ایک بات سن لی ہے، من کذب علی متعمدا فلیتبوّأ مقعده من النار، ایک دوسری روایت میں ہے کہ من کذب علیّ فلیتبوّأ مقعده من النار۔ (سنن ابن ماجہ)

عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ نے بیان کیا کہ ہم نے زید بن ارقم سے حدیث رسول بیان کرنے کی گزارش کی تو آپ نے فرمایا کہ ہماری عمر زیادہ ہوگئی اس لیے اب باتیں یاد نہیں رہتیں اور حدیث رسول اکرم کا معاملہ تو بہت شدید ہے۔

حدیث کے معاملہ میں صحابہ نہایت ہی محتاط تھے۔ بعض تو تحریف کے خطرے یا زیادتی و کمی کے اندیشے سے حدیث رسول بیان نہ کرتے، اس لیے کہ کثرتِ حدیث سے غلطی کا امکان زیادہ تھا، مزید برآں جھوٹ کی تہمت کا بھی امکان کچھ دور نہ تھا، اور پیمبر علیہ السلام پہلے ہی جھوٹ بیان کرنے سے روک چکے ہیں یا ایسی روایت جس میں جھوٹ کا شائبہ ہو اس کے بیان سے روک چکے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میری کسی بات کو یہ جانتے ہوئے کہ غلط ہے کسی نے اگر بیان کیا تو وہ جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے سبھی بیان کردے۔

صحابہؓ جب عام حالات میں کذب سے خوف کھاتے تھے تو پھر حدیث رسول کے بارے میں وہ کیسے جھوٹ بول سکتے، حضرت علی فرماتے ہیں کہ رسول خدا کی نسبت سے جھوٹ بیان کرنے سے کہیں بہتر میرے لیے یہ ہے کہ میں آسمان سے گر پڑوں۔

حضرت فاروق اعظم کا رویہ تو اور بھی اس سلسلے میں سخت تھا۔ آپ نے جو کچھ سنا اس کے لفظ بہ لفظ پر قائم رہے اور جو کچھ وہ صحیح طور پر بیان کرسکتے ہوں ان کی روایت کرنے پر لوگوں

کو ابھارا، چنانچہ احادیث کی حفاظت اور اس کو حشو و زوائد سے پاک رکھنے میں آپ کا بہت اہم کردار رہا ہے، اسی انداز پر صحابہ نے بھی اپنے کو ڈھالا، چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے کہ کثرتِ روایت حدیث علم نہیں بلکہ علم اس سلسلے میں احتیاط کامل کا نام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی اس بات سے حفاظت سنت اور عمر کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جیسا کہ ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ سے سوال کیا کہ کیا خلافت عمر میں بھی آپ اسی طرح حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ اس پر ابو ہریرہ نے ابو سلمہ سے کہا، میاں اگر عہد عمر میں اس طور سے ہم بیان کرتے جس طرح آج بیان کرتے ہیں تو ڈنڈے سے خبر لی جاتی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ زمانۂ عمر فاروق میں اگر اس طرح بیان کرتا جیسا کہ آج کل کر رہا ہوں تو کوڑے پڑتے۔

فاروق اعظم اور صحابہ دونوں ہی نے یہ عمل قرآن کریم کی حفاظت کے لیے کیا۔ ساتھ ہی سنت کی حفاظت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔ اس لیے کہ قرآن کریم جو دستور اسلامی تھا کہیں روایت حدیث کی وجہ سے قرآن پر نہ آنچ آجائے۔ بلکہ وہ پوری طرح مسلمانوں کو یاد ہو جائے پھر سنت کی طرف توجہ کی جائے۔ اس لیے کہ احادیث کا سارا سرمایہ دور نبوی میں کتاب اللہ کی طرح مدون نہ ہوا تھا۔ اس لیے آپ نے اسے پائدار سرمایۂ علمی بنانے کی طرف توجہ فرمائی اور اس کا ایک اچھا طریقہ کم سے کم روایت کا بنایا تاکہ غلطی کا امکان بھی کم سے کم تر ہو جائے۔

آپؓ جن صحابہ کے احتیاط اور روایت حدیث میں غیر معمولی حافظہ کی خوبی دیکھتے ان کو روایت حدیث کی اجازت عنایت فرماتے۔

آپ کا انداز خود آپ کی وصیت سے آئینہ ہو جاتا ہے جو آپ نے کوفہ جانے والے وفد کو عنایت فرمایا جس کو قرظہ بن کعب نے بیان فرمایا، کہ حضرت عمر نے ہمیں کوفہ روانہ فرمایا اور صرار کے مقام تک ہمیں الوداع کہنے کے لئے تشریف لائے۔ صرار مدینہ سے کچھ فاصلہ پر ایک مقام ہے۔ آپ نے یہاں پہنچ کر فرمایا کہ میں نے یہاں تک تمھارے ساتھ آنے کی زحمت کیوں برداشت کی، کچھ سمجھے بھی؟ ہم نے کہا رسول خدا کے صحابہ ہونے کی فضیلت اور انصار کے حقوق کی ادائیگی آپ کو یہاں تک لائی ہوگی۔ آپ نے فرمایا خیر یہ تو ہے ہی لیکن اصل مقصد

یہ تھا کہ کچھ باتیں تمھارے سامنے رہنما بنا کر بیان کردوں امید کہ تم میری اس زحمت فرمائی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے یاد رکھو۔ تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو قرآن کی تلاوت اور اس کی یاد میں اس طرح لپٹی ہوئی ہے جس طرح کھولتی ہانڈی، جب وہ تمھیں دیکھیں گے تو گردن بلند کرکے تکتے جائیں گے، اور کہیں گے کہ اصحاب نبی کریم ہیں، اس لیے تم رسول خدا سے روایت کم کرنا، اپنی نصیحت میں میں خود تمھارے ساتھ ہوں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب قرظہ بن کعب تشریف لائے تو لوگوں نے حدیث بیان کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا کہ فاروق اعظم نے ہمیں بیان حدیث سے روک دیا ہے۔

حضرت عثمان سے بھی یہی روایت ہے کہ انھوں نے بھی فاروق اعظم کا ہی انداز اختیار فرمایا اور اکثار روایت سے روک دیا۔ چنانچہ محمود بن لبید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان کو منبر سے خطاب کرتے ہوئے سنا کہ کسی کو کوئی ایسی حدیث بیان نہ کرنا چاہئے جو میں نے عہد صدیقی یا دور فاروقی میں نہ سنی ہو۔ اس لیے کہ آپ نے ہمیں حدیث بیان کرنے سے یونہی نہیں روکا بلکہ اس وجہ سے روکا کہ ہم حدیث کے سلسلے میں صحابہ رسول کریم سے زیادہ محتاط نہیں ہوسکتے اور خود نبی کریم نے فرمادیا ہے کہ جس نے کوئی جھوٹ بات میری نسبت سے بیان کی اس کا ٹھکانا جہنم ہی ہوگا۔ اس سے پہلے ہم حضرت علی کا منہاج صحابہ پر چلنا بیان کرچکے ہیں۔

حضرت معاویہ نے بھی فرمایا کہ حضور سے روایات کرنے میں احتیاط سے کام لو، ہاں وہ روایات جو عہد فاروقی میں بیان کی جاتی تھیں اسے بیان کرنے میں کچھ حرج نہیں، اس لیے کہ فاروق اعظم لوگوں میں خوفِ خدا پیدا کرنے کا شعور رکھتے تھے۔

یہ تھے صحابہ، ان کا انداز حفاظت حدیث اور غلطی پر کانپ اٹھنے کا طریقہ یا اس میں ملاوٹ کا جاہلوں اور ہوا پرستوں کی طرف سے خطرہ، جس سے حدیثیں کچھ کا کچھ مطلب دینے لگیں، اور احکام شرعیہ کے بیان کرنے میں گڑبڑ کا شائبہ وخطرہ، اس لیے بھی صحابہ نے احتیاط سے کام لیا، تاکہ دین میں رخنہ نہ پڑے اور مسلمانوں کو کسی فتنے سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ اس کا مقصد حدیث نبوی سے بے اعتنائی نہ تھا، نہ ان کو بےکار درانگان سمجھنا تھا،

اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ صحابہ بالخصوص حضرت عمر حدیث نبوی کو کوئی خاص مقام نہ دیتے تھے۔ یہ کوئی احمق اور اناڑی ہی کہہ سکتا ہے یا سوچ سکتا ہے یا اسلام کے غلط اندیش دشمن ہی کہہ سکتے ہیں، یا جسے صحابہ کی بلند کرداری کی ہوا نہ لگی ہوگی یا صحابہ کی تعلیمات کی روشنی سے اسے کوئی حصہ نہ ملا ہوگا۔ جسے سنت کا معمولی علم ہوگا وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکتا۔ تمام صحابہ کا تمسک بالحدیث اور حدیث کی عظمت اور ان کا حدیث کو اختیار کرنا بالکل آئینہ کی طرح ہے۔ اسی طرح یہ بھی تواتر سے ثابت ہو چکا ہے کہ صحابہ اجتہاد سے کام لیتے، اگر کوئی شرعی معاملہ حرام وحلال کا ان کے سامنے پیش آتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ کتاب اللہ کو دیکھتے۔ اگر اس میں حکم مل جاتا تو فبہا اس کے مطابق حکم فرما دیتے اگر کتاب اللہ میں نہ ملتا تو پھر سنت نبی کریم میں اس کی جستجو کرتے۔ اگر کوئی حدیث مل جاتی تو اس کے مطابق عمل کرتے کراتے، اگر یہاں سے بھی کوئی رہنمائی نہ ملتی تو پھر اجتہاد بالرائے سے کام لیتے۔

شیخین کا طریقہ اس سلسلے میں مشہور ہے۔ ابوبکر صدیق کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا تو کتاب اللہ پر نظر کرتے، اگر حکم قرآنی مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر قرآن میں حکم نہ ہوتا تو سنتِ رسول کی جستجو فرماتے، اگر یہاں کوئی حکم مل جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر اس سے کام نہ چلتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا کسی کے پاس کوئی حدیث، خبر، عمل جناب نبی کریم کا اس سلسلے میں ہے۔ اگر لوگ بتاتے کہ ہاں ہے تو پھر اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ اگر کہیں سے کوئی روشنی سنت کی نہ ملتی تو وجوہ الناس کو اکٹھا کر کے مشورہ فرماتے۔ حضرت عمر بھی یہی کرتے، غرض تمام صحابہ کا انداز پیش آنے والے مسائل میں یہی ہوتا۔ اب اس کے بعد بھی کسی کو اس پر کہنے کی جرأت ہوسکتی ہے کہ صحابہ سے جو باتیں منقول ہیں وہ ان کی اپنی خواہشات تھیں، سنت نبوی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا؟ اس سلسلے میں ہم علمائے حدیث کا موقف بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) حافظ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ بعض اہل بدعت جن کو علم و معرفت کا کوئی حصہ نہیں ملا وہ حدیث کے بارے میں حدیث عمرؓ "أقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله

علیہ وسلم" کو آڑ بنا کر محدثین پر طعن کرتے ہیں اور حدیث وسنت رسول کی "کچھ خاص ضرورت نہیں کا" پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ حالانکہ کتاب اللہ کو بغیر سنتِ رسول کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ محدثین پر طعن کرتے ہیں جس کی یہ کوئی دلیل نہیں، اور کوئی دوسری دلیل بھی ان کے پاس نہیں جس کو وہ پیش کرسکیں۔

حالانکہ حضرت عمر کے قول کا مخاطب ایسے لوگ تھے جنھوں نے قرآن کا استیعاب نہیں کیا تھا۔ اس لیے انھیں خدشہ ہوا کہ اس کے سوا کا اشتغال مضر ہوسکتا ہے، اس لیے کہ قرآن ہی پر تمام علوم کا دارومدار ہے۔ ابوعبید کے قول کا یہی مطلب ہے۔

آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ عمر نے ایسی حدیث کی روایت سے روکا جو نہ تو کسی حکم شرعی میں مفید تھی، نہ اسے سنت کا درجہ دیا جا سکتا تھا۔

دوسرے حضرت قرظہ بن کعب والی حدیث جس میں حضرت عمر کی وصیت موجود ہے، اسے لوگوں نے قابل اعتراض سمجھا ہے، اور اس کا رد کیا ہے، کیونکہ جو آثار حضرت عمر سے ثابت ہیں وہ اس کے سوا ہیں۔ اسی قبیل سے حدیث سقیفہ ہے جسے مالک ومعمر وغیرہما نے ابن شہاب سے روایت کیا انھوں نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت کیا کہ حضرت عمر نے جمعہ کے دن خطاب فرمایا اور خدا کی تعریف وثنا کرنے کے بعد فرمایا کہ میں آپ کے سامنے ایسی بات رکھنا چاہتا ہوں جو کہنے کی ہے، جو میری بات کو یاد کر سکے، سمجھ سکے وہ اسے بیان کرے، جہاں تک اس کے لیے ممکن ہو اور جس کو نسیان کا خطرہ ہو، بات کو پوری طرح نہ یاد کرسکتا ہو اسے میں جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں کرتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ممانعت کا دائرہ محدود تھا، کثرت روایت سے آپ روکتے تھے، اور قلت روایت کا حکم محض اس بنا پر تھا کہ کہیں خدا کے رسول پر کوئی جھوٹی بات عائد نہ ہو جائے۔ دوسرے اس کا بھی اندیشہ تھا کہ کثرتِ روایت سے حفظ کا تعین ممکن نہ تھا پھر بھی روایت جاری رہتی، اس لیے کہ مقلین روایت کے یہاں روایت مکثرین سے زیادہ محفوظ رہتی، اس طرح قلت روایت میں خطرات اور بے احتیاطی کے مواقع کم تھے جب کہ اکثر روایت میں اس کے برخلاف

بڑا احتیاطی زیادہ تھی، اگر آپ کا مقصد حدیث کی روایت کو روکنا ہوتا تو آپ اکثار و اقلال دونوں ہی سے روکتے، اس لیے کہ آپ نے فرمایا: فمن حفظها و وعاها فليحدث بها۔ حضرت فاروق اعظم ایک طرف روایتِ حدیث کی بھی تعلیم دیتے، پھر دوسری طرف وہ تعلیم حدیث اور اشاعت حدیث سے روکتے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے روکنے کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ آپ کو اس سے پہلے معلوم ہو چکا کہ خود اپنی بیان کردہ حدیثوں کی اجازت باہوش قوی الحافظہ لوگوں کو عطا فرمائی، لیکن جو اس درجہ کے نہ تھے انھیں آپؐ نے ان لفظوں میں روک دیا: ومن خشي أن لا يعيها فلا يكذب عليّ۔ اس وضاحت کے بعد کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہیں، مزید برآں اہل مدینہ کی بہت سی روایتیں حضرت عمر سے قرظہ بن کعب والی وصیت کے خلاف ہیں، اس حدیث کو شعبی نے بھی بیان کیا ہے جو کسی خاص موقع اور محل کے اعتبار سے رہی ہوگی۔ اس سے عموم حجت نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ کتاب و سنت دونوں ہی کے معارض ہے۔ قرآن نے اعلان کیا "لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة وقال وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا" اس طرح کے احکام دوسری جگہ بھی مذکور ہیں، ظاہر ہے کہ آپ کی باتوں کا اتباع اس پر عمل، اس سے واقفیت بلا حدیث رسول کے کیسے ممکن ہے۔ اس لیے حضرت عمر کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ خدا کے حکم کی مخالفت کریں گے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی موجود ہے: نضر الله عبداً سَمعَ مقالتي فوعاها، ثم أدا ها الى من لم يسمعها۔ اس حدیث میں رسول خدا کے قول و عمل کو لوگوں تک پہنچانے کی سخت تاکید ہے۔ دوسری جگہ آپ کا ارشاد ہے، خذوا عني في غير ما حدثت و بلغوا عني۔ ان ساری باتوں سے یہ بات دن کی روشنی سے بھی زیادہ نمایاں ہوگئی البتہ اس کے لیے عقل و ہوش کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث رسول کے دو پہلو ہیں، خیر و شر۔ ظاہر ہے کہ حدیث نبوی مجموعۂ خیر ہے اس لیے خیر کا اکثار ہر صورت میں مطلوب ہے۔ اس لیے حضرت عمر کے کہنے کا صاف

مطلب یہی ہے کہ آپ کے حکم کا مطلب رسول خدا پر تہمت کذب نہ آجائے اور کثرت روایت سے قرآن اور سنت پر تدبر وغور کی قوت مجروح نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ مکثرین حدیث کے یہاں روایت حدیث ہی اصل ہوتی ہے۔

مسلم بن حجاج نے کتاب التمییز میں ذکر کیا ہے کہ قیس بن عبادہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عمر کو کہتے ہوئے سنا کہ جس کسی نے کوئی حدیث سنی اور بعینہ اسے بیان کردیا تو وہ صحیح سالم ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر سے جو مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "سنت وفرائض ایسے ہی سیکھو جیسے تم قرآن سیکھتے ہو"۔ اس روایت میں آپ نے قرآن وحدیث کی تعلیم میں برابری کی۔ ایسے ہی عمر نے اپنے مکتوب میں لکھا کہ سنت وفرائض اور تجوید کا علم سیکھو جیسے کہ تم قرآن سیکھتے ہو، اور عمر ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے مختلف مواقع پر لوگوں سے مطالبہ کیا کہ اس معاملہ میں کسی کے پاس رسول اللہ کی کوئی حدیث ہے؟ مثلاً مالک وغیرہ سے جو مروی ہے "عورت کا اپنے شوہر کی دیت میں وارث بنانا" اور "حاملہ کے پیٹ پر مارنے سے جنین کا مردہ ہو جانا" اور اسی طرح کے دیگر مواقع۔ اس حالت میں کیسے حضرت عمر پر یہ وہم کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر آچکا ہے جب کہ عمر ہی اس بات کو کہنے والے ہیں کہ "ایاکم والرأی فان أصحاب الرأی أعداء السنن الخ، (رائے زنی سے پرہیز کرو کہ رائے زنی کرنے والے احادیث کے دشمن ہیں) حفظ احادیث کے سلسلہ میں وہ ناکارہ ہیں اور عمر ہی اس بات کو کہنے والے ہیں کہ افضل راہ راہِ محمد ہے، اور عمر ہی نے کہا کہ عنقریب ایسی قوم نمودار ہوگی جو مشتبہاتِ قرآن میں تمھارے ساتھ جدال کرے گی ایسی حالت میں تم انھیں احادیث کی طرف متوجہ کرنا کیونکہ علمائے حدیث کتاب اللہ کی باتوں کا ادراک زیادہ رکھنے والے ہیں۔

ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ عمر کے تمام آثار صحیح اور متفق علیہ ہوں۔ اس سے یہ معنی واضح ہوتا ہے کہ جو کسی حدیث میں شک میں مبتلا ہو جائے اسے ترک کردینا چاہیے اور جو اچھی طرح حفظ کرسکے اس کے لیے روایت کی اجازت ہے۔ کیونکہ بکثرت احادیث بیان کرنے والے اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، کھری ہے یا

کھوئی۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ آدمی کے دروغ گو ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کردے۔

اور اگر خیالِ عمر وہی ہے جس کا ذکر ہم نے کیا تو اس کی دلیل حدیثِ رسول سے بھی ہے کہ آپ نے فرمایا "اللہ اس بندے کو شاداب بنائے جس نے میری باتوں کو سن کر محفوظ کیا اور اس کی ادائیگی کرتے ہوئے اس کی تبلیغ کی"، اور نبیؐ نے فرمایا کہ اے میرے صحابہ! تم میری باتیں سنتے ہو آئندہ تم سے بھی میری باتیں سنی جائیں گی۔ (اسے ابوداؤد، امام احمد اور حاکم نے روایت کیا ہے)

(۲) خطیب بغدادی کی رائے: کوئی معترض اگر یہ کہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو روایت کرنے پر کیوں ڈانٹ پلائی اور انھیں اس عمل سے کیوں روکا؟ اس سے کہا جائے گا کہ آپ کا یہ عمل دین میں محتاط رہنے کے لیے اور مسلمانوں کی پوری طرح نگہداشت پر مشتمل ہے کہ کہیں مسلمان صرف ظاہر احادیث کے ابلاغ کو سب کچھ سمجھ کر اعمال سے غافل نہ ہو جائیں، اس لیے کہ ساری احادیث کھلا مطلب نہیں رکھتیں نہ اس کو ہر سننے والا فقیہ ہو تا کہ وہ سن کر الفاظ کے معنیٰ اور اس کی تہ تک پہنچ جائے۔ احادیث کے الفاظ مجمل ہوتے ہیں اس کے معنیٰ کی دوسروں ہی کے ذریعہ وضاحت ہوتی ہے، ایسی صورت میں روایت بالمعنیٰ کے کچھ سے کچھ ہو جانے کا خطرہ بہرحال باقی تھا۔ چنانچہ معاذ بن جبل ہی ہیں جو کہتے ہیں میں رسولِ خدا کے پیچھے ایک گدھے پر جسے عُفیر کہتے تھے سوار تھا۔ اسی انداز سے آپ سوار چلے جا رہے تھے، مجھے فرمایا، معاذ خدا کا حق بندوں پر اور بندوں کا حق خدا پر کیا ہے۔ میں نے عرض کیا یہ تو اللہ و رسول ہی کو معلوم ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ خدا کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ خدا کی عبادت کریں اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ بنائیں، اور بندوں کا حق خدا پر یہ ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو جو اسی کی عبادت کرتا ہو اور اس کا شریک نہیں ٹھیراتا اسے وہ عذاب نہ دے۔ حضرت معاذ نے کہا آپ فرمائیں تو میں لوگوں کو خوشخبری دے دوں۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو کہ لوگ عمل سے رہ جائیں گے۔

اسی قبیل سے یہ حدیث بھی ہے جسے ابو العباس احمد بن یحییٰ تغلب کی خدمت میں رہنے والے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت علی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا جب کہ ابوبکر وعمر آپ کی خدمت میں آرہے تھے کہ یہ دونوں جنت کے بڑے بوڑھوں کے سردار ہیں علی اس کی اطلاع تم ان کو نہ دو۔ انھوں نے جواب دیا کہ تقصیر عمل کے خوف سے، بالکل اسی انداز کی نہی حضرت عمر کی بھی ہے کہ وہ اکثار حدیث نہ کریں کہ وہ صرف گفتگو کی دنیا میں رہ جائیں گے اور کردار کے غازی نہ بن سکیں گے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر کی تشدید کا ایک اور رخ ہے کہ حفاظت حدیث پر پوری توجہ صرف کی جائے اور سنت نبوی میں کوئی ایسی چیز داخل نہ کی جائے جو سنت کے قبیل سے نہ ہو۔ حدیث اور سنت نکھری ہوئی مسلمانوں کے سامنے آنی چاہیے۔ اس طرح آپ کی جانب غلط بیانی اور کذب کی نسبت سے مسلمانوں کی مکمل طور سے تنبیہ ہوگئی۔ ہم اس سے پہلے اس حدیث کا ذکر کر آئے ہیں جو عبداللہ بن عامر یحصبی نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ نے دمشق میں منبر امامت سے اعلان فرمایا: لوگو حدیث کا معاملہ معمولی نہیں ہے سوائے ان حدیثوں کے جو دور صدیقی وفاروقی میں بیان و روایت کی جاتی تھیں اس کے سوا کوئی حدیث بیان نہ کی جائے، اس لیے کہ فاروق اعظم لوگوں کو خوف خدا دلاتے رہتے۔ چنانچہ وہ بات جو حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے گرامی صحابی سے حدیث استیذان میں تین بار سلام کی روایت کے سلسلے میں گواہ پیش کرنے کو کہا تھا، حالانکہ وہ ایک عام حدیث تھی لیکن حضرت عمر نے یہ انداز اختیار کیا تاکہ حدیثوں کے بیان کرنے میں پوری احتیاط مدنظر رکھی جائے۔

گزشتہ سطور میں ہم نے جو کچھ کہا اس سے آپ کو اس کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ صحابہ کی پوری جماعت حدیث کے معاملے میں نہایت محتاط تھی، کوئی حدیث سنتے ہی قبول نہ کرتے بلکہ اس کے گرد و پیش کا جائزہ لے کر ہی اس کو سند قبول عطا کرتے۔ اس وقت تک کوئی حدیث بیان نہ کرتے جب تک کہ انھیں اس کی صحت کا یقین نہ ہوجاتا، اور احادیث کی حفاظت میں ہر ہر قدم پھونک کر رکھتے تاکہ سنت میں کھوٹ نہ پیدا ہو اور جو کچھ مسلمانوں کے سامنے آئے نکھرا ستھرا ہو۔

سنت کی حفاظت کا ہر ایک دل و جان سے کوشاں تھا، اس میں فاروق اعظم کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ چنانچہ ہم نے گذشتہ سطور میں آپ کے اہتمام و احتیاط کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جو احادیث بھی آپ سے مروی ہیں، ہر ایک کی کڑی ایک دوسرے سے لگی ہوئی ہے۔ اس سے آپ کو علم دین کی اشاعت سے جو شغف تھا اس کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس لیے اشتغال بالحدیث اور وصیت اشاعت حدیث میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اقلال حدیث کا مقصد ہی حفاظت سنت تھا، اور روایت حدیث کی ذمہ داری کا احساس ابھارنا پیش نظر تھا، جو حدیث کے مقام سے واقف ہو اور اس کی پوری حفاظت کر سکتا ہو اس کو حضرت عمر کے فرمان سے کوئی ضرر نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبدالبر اور خطیب بغدادی وغیرہ ائمۂ حدیث نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بھی مقصد یہی ہے۔

غرض اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابہ کی پوری جماعت کو حدیث رسول کا پورا اہتمام تھا، ان میں سے کسی نے بھی کسی موقع پر اس سے اغماض نہیں کیا، بلکہ صحابہ ہی کو حدیث رسول کا اولین محافظ کہنا مناسب ہے۔

آخر میں ہم ان روایات سے بھی بحث کریں گے جن پر فاروق اعظم کا بعض صحابہ کو روایت حدیث کی بنا پر قید و بند کی سزا دینا ثابت ہے جنہوں نے کثرتِ روایت حدیث کو معمول زندگی بنا لیا تھا۔ ابھی تو ہم کو اس روایت کی صحت میں بھی کلام ہے۔ مگر اس کے پایۂ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد اس کے حقائق سے بحث کرنا ضروری ہے۔

حافظ ذہبی کی روایت ہے کہ سعد بن ابراہیم نے اپنے والد سے روایت کیا کہ فاروق اعظمؓ نے ان تین صحابہ کو قید کر دیا تھا، ابن مسعود، ابودرداء، ابومسعود انصاری۔ ان صحابہ سے آپؓ نے فرمایا کہ تم نے حدیث رسول کے دفتر بکھیر دیئے ہیں۔ حالانکہ یہ تینوں صحابی اجلۂ صحابۂ رسول کریم میں ہیں، ان کا تقویٰ ان کی احتیاط ایسی چیز نہیں جسے زیر بحث لایا جائے۔ کیا حضرت عمر جیسا گرامی باہوش آدمی ان کو سزائے قید دے سکتا ہے اور کیا صرف تکثیر حدیث ان کے قید کا جواز پیش کر سکتی ہے؟

یہ ایک ایسی بات ہے جو خواہ مخواہ آدمی کو سوال پر مجبور کرتی ہے اور وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور غور کرنے لگتا ہے کہ اقلال و اکثار کی حدیں پہلے متعین ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اس پر بحث کیا ہے اور فاروق اعظم کی جانب اس روایت کی سختی سے تردید کی ہے اور یہ فرمایا کہ یہ روایت مرسل ہے اور مشکوک ہے۔ اس کی روایت شعبہ سے ہے اس لیے اسے صحیح نہیں کہہ سکتے۔ اس روایت کو دلیل بنانا یا انکار حدیث کا طرۂ امتیاز بنانا سخت نادانی ہے، یوں بھی یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کو مان لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت عمر نے صحابہ کو متہم قرار دیا۔ خدانخواستہ یہ مان لیا جائے تو ہزاروں فتنے اسی ایک سوراخ سے سر نکالنے لگیں گے، کہ آپ کا حدیث سے روک دینا رسول خدا کی سنت کی تبلیغ پر قدغن لگانا ہوا، اور سنت رسول کو چھپانا اور دوسروں تک پہنچانے سے روکنا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تعلیمات پیمبر کا کتمان کرے اس کی اشاعت پر پابندی لگائے تو پھر وہ مسلمان ہی کب رہ جائے گا۔ امیر المومنین حضرت عمر کو خدا نے ان ساری آلائشوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں تمام صحابہ پر اتہام کذب و دروغ بافی کا التزام آتا ہے۔ بس لے دے کے صرف عمر ہی اس سے مستثنیٰ رہ جاتے ہیں۔ حاشا و کلا ایسی لغویات کسی مسلمان کے دل میں بھی نہیں آسکتی چہ جائے کہ اس کا برملا اعلان۔ دوسری طرف اگر ان اجلۂ صحابہ پر یہ تہمت نہیں ہے تو پھر ان کا حبس بے معنیٰ و ظلم ہوگا، اس لیے ایسی لغویات کہنے پر دونوں جانب فساد و خبث نمایاں ہے، کسی نہ کسی کو اختیار کرنا ہوگا۔ خود فاروق اعظم نے بہت ساری حدیث روایت فرمائی ہیں، تقریباً پانچ سو سے زائد احادیث کے آپ راوی ہیں، جو آپ نے حضورؐ کے وصال کے بعد سے اپنی موت تک فرمائی ہیں۔ آپ کا شمار بھی کثیر الروایت صحابہ میں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کثیر الروایات صحابہ کی تعداد دس سے کسی طرح متجاوز نہیں ہے۔

اگر روایت کی صحت کی گڑبڑی کو تسلیم کرلیا جائے تو آپ دیکھیں گے روایت میں محبوسین کے اسماء میں اختلاف موجود ہے۔ ذہبی کی روایت میں ابن مسعود، ابودرداء اور ابو مسعود انصاری ہیں جب کہ ابن حزم نے ابودرداء، ابوذر اور ابن مسعود کا ذکر کیا ہے اگر یہ قید

و بند بار بار عمل میں آیا تو اسے مسلمانوں میں مشتہر ہونا چاہئے نہ کہ مرسل الشکوک۔ پھر یہ کہ ایک عظیم خبر ہے، اس کے تو پر ہونے چاہئیں جو پوری دنیا میں پھیل جائے، چہ جائے کہ روایت مشکوک ہو۔ اس لیے کہ یہ حضرات اعیان صحابہ میں ہیں۔ اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ آپ نے تکثیر روایت کی بنا پر ان لوگوں کو قید کیا تو دوسرے صحابہ جو ان سے بھی زیادہ احادیث کے راوی ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ ان کو فاروق اعظم نے کیوں نہ قید کیا؟ اس لیے یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ جرم میں یکسانیت ہوتے ہوئے فاروق اعظم بعض کو سزا دیں اور بعض کو نوازیں۔ حضرت عمر کا دامن اس سے پاک ہے۔ ابو ہریرہ نے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) حدیثیں بیان کیں اور ابن مسعود نے آٹھ سو اڑتالیس (۸۴۸)، ابو درداء نے ایک سو اناسی (۱۷۹) اور ابو ذر نے دو سو اکیاسی (۲۸۱) حدیثیں بیان کیں۔

کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابو ہریرہ کی کثرت روایات دور عمر میں نہ تھی بلکہ اس کے بعد تھی، اس لیے کہ انھیں اس کا ڈر تھا۔ ہم کو یہ کہنے دیجیے کہ یہ ایک غیر ضروری بات ہے اس لیے کہ ابو ہریرہ کے علاوہ دوسرے مکثرین حدیث بھی تو موجود تھے جو عہد فاروقی میں کثرت سے روایت کرتے رہے، پھر ابو ہریرہ ہی کی بات کیوں زیر بحث رہتی ہے؟ پھر یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جب حضرت عمر کو حضرت ابو ہریرہ کی احتیاط، تقویٰ، حافظہ اور خشیت الٰہی کا علم ہوا تو خود فاروق اعظم نے آپ سے حدیثیں سنیں۔ چنانچہ ذہبی کہتے ہیں کہ مجھے ابو ہریرہ کی یہ گفتگو پہنچی جو انھوں نے خود بیان کی کہ میری حدیث حضرت عمر کو پہنچی، انھوں نے مجھے بلا بھیجا، میری حاضری پر آپ نے فرمایا کہ تمہیں یاد ہوگا کہ حضور کے پاس ہم سب فلاں دن موجود تھے اور فلاں شخص کے مکان پر موجود تھے۔ میں نے کہا ہاں یاد ہے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ تم نے مجھے کس لئے بلایا ہے۔ میں نے کہا کہ اس دن حضور نے فرمایا: من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار۔ اس پر فاروق اعظم نے فرمایا بس ہوگیا جو ہونا تھا، جاؤ حدیثیں بیان کرو۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص کہہ سکتا

ہے کہ حضرت عمر نے ابن مسعود، ابو درداء، ابو ذر اور ابو مسعود انصاری کو محبوس کر دیا تھا؟ حالانکہ حضرت عمر آپ حضرات کے تقویٰ، پرہیزگاری، احتیاط و بے مثال حافظہ سے واقف تھے، بلکہ حقیقت یوں ہے۔

امیر المومنین نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کو جب کوفہ روانہ کیا تو اس ایثار کا ذکر فرمایا جو آپ نے اہل کوفہ میں فرمایا تھا۔ جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے، انی واللہ الذی لاالہ الاھو آثرتکم به علی نفسی فخذوا منه، (قسم اس خدائے وحدہ لاشریک کی، میں نے تمھارے لیے ابن مسعود کو اپنے سے زیادہ مناسب پایا لہٰذا تم ان سے سیکھو)۔ دوسری جگہ حضرت عمر نے ابن مسعود کے بارے میں فرمایا کنیف ملیٔ علما، آثرت به أهل القادسية، (ابن مسعود خزانۂ علم ہیں میں نے انھیں اہل قادسیہ کے لیے چنا ہے)۔ یہ تو معمولی عقل و ہوش کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ آپ حضرت ابن مسعود سے علم لینے کے بارے میں ہدایت دیں اور ان کی فاضلیت کا اقرار فرماتے ہوئے انھیں اسی فضل کی وجہ سے قید کر دیں۔

ہم نے ابن مسعود کے قید میں ڈالنے کی تغلیط کر کے باقی صحابہ کی جانب سے بھی وکالت کر دی کہ ان کے ساتھ بھی اس طرح کی روایات سراپا غلط ہیں، اس لیے کہ ابو درداء قاضی امام اور معلم القرآن کی حیثیت سے شام میں رہے۔

ان ساری تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت عمر کا مذکورہ صحابہ کو بیان حدیث میں اکثار روایت پر قید و بند کی سزا دینا ایک بے اصل بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت عمر کے اس قول کی روشنی میں لیس العلم بكثرة الحديث ولكن العلم الخشية (علم بکثرت حدیث بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ علم نام ہے تقویٰ کا)۔

سعد بن ابراہیم عن ابیہ کی روایت سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر خطیب نے کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے صحابہ کو مدینہ میں اس وقت تک روک رکھا جب تک روایت باللفظ کا چلن بازار نہ ہو گیا۔ چنانچہ خطیب کی روایت ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

"بعث عمر بن الخطاب الى عبدالله بن مسعود و الى أبى الدرداء والى أبى مسعود الأنصارى فقال: ما هذ الحد يث الذى تكثرون عن رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فحبسهم بالمدينة حتى اشتشهد لفظهم سواء" (شرف أصحاب الحدیث ج۱،۹۷)

''عمر بن الخطاب نے عبداللہ بن مسعود، ابودرداء اور ابومسعود انصاری کو واپس بلایا پھر فرمایا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم کیوں بکھیرتے ہو۔ چنانچہ ان کو مدینہ طیبہ میں اس وقت تک روک رکھا جب تک روایت باللفظ میں یکسانیت نہیں آ گئی''۔

اس روایت سے حضرت فاروق اعظم کا حدیثوں میں یکسانیت اور روایت باللفظ کے اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں جیل میں نہیں رکھا، بلکہ ان لوگوں کو مدینہ پاک میں ٹھیرنے کا حکم دیا، تاکہ ان سے الفاظ حدیث ثابت ہو جائیں۔ پھر جب اس بات کی تصحیح و تاکید ہو جائے تو ان حضرات کے لیے روایتِ حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ان ساری روایات سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ آپ نے کسی کو حبس نہیں کیا اس لیے رامہرمزی نے جو اپنے شیخ ابن البری سے بہ طریق سعد بن ابراہیم عن ابیہ روایت کیا ہے کہ أن عمر بن الخطاب حبس بعض أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم، فيهم ابن مسعود وأبوالدرداء۔ آپ نے ان کو روایت حدیث سے اس وقت تک روک دیا تھا جب تک کہ روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے پیدا ہونے والی گڑبڑی کی تلافی نہ ہو جائے، اس لیے کہ روایت میں اختلاف لفظ کی وجہ سے سامعین پر کلام رسول کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

غرض اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حبس عمر والی روایت کے معنیٰ میں خلط ہو جانے کی وجہ سے یہ ساری باتیں پیدا ہوئیں ورنہ حقیقتاً آپ نے انھیں قید نہیں فرمایا بلکہ اہتمام حدیث کو دلوں میں جاگزیں کرنے کے لیے یہ ساری پیش بندیاں فرمائی تھیں۔

تابعین کے زمانے میں شیوع علم غیر معمولی تھا اس لیے صحابہ کی ایک بڑی تعداد غیر عرب ممالک میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں تابعین صدر نشینان علم وعمل بن گئے۔ روایت حدیث میں بھی ان کو مقام خصوصی نصیب ہوا۔ تابعین بھی صحابہ ہی کے انداز پر قائم رہے، وہی انداز اختیار کیا، ان میں ورع وتقویٰ صحابہ سے کچھ کم نہ تھا۔ اس لیے کہ رسول خدا کے براہ راست تلامذہ صحابہ سے ہی انھوں نے علم وتقویٰ لیا تھا۔ چنانچہ امام شعبی کا یہ جملہ یاد رکھئے جو بڑے تابعی، ثقہ حافظ حدیث ہیں کہ لیتني أنقلتُ مِن علمي كفافاً لا لي ولا عليّ (کاش میں اپنے علم کا مختصر حصہ نقل کئے ہوتا تاکہ ادائیگی حق ہوجاتا اور میرے خلاف حجت نہ ہوتا) گویا انھیں یہ احساس ہوا کہ انھوں نے بکثرت احادیث بیان کردی ہیں۔

اپنی اس تکثیر حدیث پر فرماتے ہیں کرہ الصالحون الأولون الاكثار من الحديث ولواستقبلت من أمري مااستدبرت ماحدثت الا بما أجمع عليه أهل الحديث، (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صفحہ ۷۷) (عہد اول کے صالحین نے بکثرت روایت حدیث کو ناپسند کیا ہے اور اگر میں اپنے امر کا مقابلہ کرتا تو جو میں نے بیان کیا اس سے پشت نہ دکھلاتا الّا یہ کہ جس پر علما حدیث کا اجماع ہوگیا ہے۔)

امام شعبہ بن الحجاج فرماتے ہیں کہ حدیث میں تدلیس زنا کرنے سے بدتر ہے۔ میں آسمان سے زمین پر پھینک دیا جاؤں، یہ میرے نزدیک تدلیس حدیث کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ اگر میں اس فلک بوس عمارت سے قریب کے گاؤں میں سر کے بل گرادیا جاؤں تو میرے نزدیک یہ زیادہ پسندیدہ ہے اس بات سے کہ میں کہوں کہ فلاں نے مجھے کہا اور تم اس کو دیکھ رہے ہو بہ نسبت اس کے کہ میں یہ کہوں کہ میں نے یہ اس سے سنا حالانکہ میں نے اس سے نہیں سنا ہے۔

محدثین اپنی روایت سننے والوں کی جانچ پڑتال بھی کرتے تاکہ طالبین حدیث میں حدیث فہمی کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ چنانچہ خالد الحذاء کی روایت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ابوقلابہ

کے پاس حاضر ہوتے، آپ تین حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے بہت بیان کر دیا۔ اس کی تائید حافظ ابن عبدالبر کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ تابعین محدثین اکثار کو اس خطرہ کے پیش نظر کہ حدیثوں کی سمجھ بوجھ ختم نہ ہو جائے برا مانتے تھے۔ چنانچہ بشر بن الولید کی اس بات سے اندازہ کیجئے کہ اعمش نے امام ابو یوسف سے کوئی بات دریافت کی جس کا انھوں نے جواب دے دیا۔ اس وقت وہاں ان کے اور اعمش کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ آپ نے ابو یوسف سے کہا کہ یہ بات کہاں سے تم نے کہہ دی۔ آپ نے فرمایا کہ تمھیں سے سنی ہوئی ایک حدیث سے یہ بات میں نے جانی۔ پھر ابو یوسف نے وہ حدیث بیان کی۔ اعمش نے فرمایا کہ میاں تمھاری پیدائش سے پہلے سے یہ حدیث مجھے یاد ہے مگر اس کا مطلب میں نے اب تک نہ جانا تھا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ امام ابو یوسف وابو حنیفہ و اعمش میں مذاکرے چلے، اس پر اعمش نے فرمایا، أنتم الأطباء ونحن الصيادله (تم ڈاکٹر ہو ہم محض دوا فروش ہیں۔)

قبولِ حدیث میں صحابہ وتابعین کی چھان بین

جس طرح صحابہ وتابعین نے حدیث کے بیان کرنے میں احتیاط کو پیش نظر رکھا، اسی طرح اس کے قبول کرنے میں بھی حد سے زیادہ احتیاط رکھی۔ اسے تسلیم کرنے میں بھی محتاط و مضبوط کردار ادا کیا۔ جس کا ہم ذیل میں ذکر کریں گے۔

(الف) حضرت ابو بکر صدیقؓ کی قبول اخبار واحادیث میں چھان بین:

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حفاظتِ سنت میں مسلمانوں کے لیے عمدہ نشانِ راہ ثابت ہوئے۔ آپ نے میانہ روی اور حقیقت پسندی کو راہ نما بنایا تا کہ وہ خود اور مسلمان کسی غلط روی کا شکار نہ ہو جائیں جس سے مسلمانوں کا انجام بجائے خیریت اور عافیت کے کسی ناعاقبت اندیشی کی نذر ہو جائے۔ اس سلسلے میں ذیل کی شہادتوں سے آپ کو اندازہ ہوگا۔

(۱) ذہبی نے لکھا ہے کہ احادیث کے قبول کرنے میں سب سے پہلے جنھوں نے

احتیاط کو اپنا پیشرو بنایا وہ صدیق اکبر کی ذات گرامی ہے۔ ابن شہاب کی روایت ہے کہ ایک عورت جو رشتہ میں جدہ تھی ابو بکر صدیق کے پاس وراثت کی دعویدار بن کر آئی۔ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تمھارے لیے حکم نہیں ہے، اسی طرح پیمبر خدا سے بھی کوئی شہادت مسموع نہیں ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کو کوئی معلومات ہو تو بتائیں۔ مغیرہ اس مجلس میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ رسولؐ خدا سے میں نے سنا ہے کہ آپ جدہ کو سدس عنایت فرماتے تھے۔ آپ نے کہا کہ یہ تمھاری اپنی ہی بات ہے یا کوئی اور بھی ہے جو اس کی شہادت دے سکتا ہو۔ اسی درمیان میں محمد بن مسلمہ نے مغیرہ کی تائید کی کہ میرے علم میں بھی یہ بات ہے۔ حضرت ابو بکر نے ان دو صحابی کے قول پر فیصلہ فرمایا۔

(۲) یونس ابن یزید نے زہری سے بیان کیا کہ ابو بکرؓ نے ایک شخص سے حدیث بیان کی تو اس شخص نے ابو بکر سے اس کی کھود کرید کی۔ اس پر ابو بکرؓ نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل وہی بات صحیح ہے۔ اگر میں ایسی بات کہوں جس کا علم مجھے نہیں ہے تو کون سی زمین میرا بار برداشت کرے گی؟

حضرت ابو بکر کا خطبہ مشہور ہے جس میں آپ نے لوگوں سے کہا کہ جھوٹ بولنے سے بچو کہ جھوٹ فجور کی طرف لے جاتا ہے، اور فجور جہنم کا دروازہ ہے۔ اسی طرح ابو بکر صدیق لوگوں کو حکم دیتے کہ جو بات معلوم نہ ہو، جس کا کوئی وثوق نہ ہو، وہ بیان نہ کی جائے۔ آپ نے صرف اپنے ہی لیے احتیاط کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ تمام لوگوں کو اس کی ہدایت فرماتے۔ آپ لوگوں کو حدیث بیان کرنے میں چھان پھٹک پر زور دیتے، خواہ وہ کسی دوسرے کے سامنے حدیث بیان کریں، خواہ دوسروں سے حدیث سنیں، دونوں میں حقیقت پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اسی قبیل سے وہ روایت ہے جسے ذہبی نے ابن ابی ملیکہ کے مراسیل میں سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے وفات نبی کریمؐ کے بعد لوگوں کو اکٹھا کیا کہ آپ حضرات

رسول خدا سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جس میں خود آپ مختلف ہیں۔ آپ کے بعد آنے والے اس کو دیکھ کر اور بھی اختلاف کے شکار ہوں گے، اس لیے کرم فرما کر پیمبر کی حدیث بالکل نہ بیان کریں۔ اگر کوئی بات دریافت کرے تو صاف کہہ دیں کہ کتاب اللہ موجود ہے، جو اس میں حلال ہو حلال ہے اور جو حرام ہو حرام ہے۔ یہ اثر نقل کرنے کے بعد حافظ ذہبی بیان کرتے ہیں کہ صدیق اکبر کا مقصد احادیث میں چھان بین کی راہ کو اپنانا اور عقل و ہوش سے رہنمائی طلب کرنا ہے؛ روایت کا سدباب ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر سدباب مقصد ہوتا تو آپ جدہ والے معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ پاکر لوگوں سے دریافت روایت نہ فرماتے۔ حدیث رسول کی جستجو کی بنیاد پر فیصلہ خود شاہد ہے کہ آپ کا مقصد اس سے کچھ اور ہے ورنہ آپ بھی خوارج کی طرح فرماتے حسبنا کتاب اللّٰہ ہ (کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے)

(ب) قبول احادیث میں حضرت عمرؓ کی چھان بین:

(ا) بخاریؒ نے ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ ہم انصار کی ایک مجلس میں تھے، اتنے میں حضرت ابوموسیٰؓ تشریف لائے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کانپ رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمر سے تین بار اجازت طلب کی، انھوں نے اجازت نہ دی تو میں واپس آ گیا۔ آپ نے میرے لوٹ جانے پر مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں واپس گئے؟ آپ نے کہا میں نے تین بار اجازت طلب کی مگر اجازت نہیں ملی تو میں واپس آ گیا؛ اس لیے کہ پیمبر خدا نے فرمایا کہ کوئی تین بار اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو واپس آ جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اس بات پر تمھیں شہادت پیش کرنی ہوگی۔ کیا یہ بات کسی دوسرے نے بھی نبی کریم سے سنی ہے؟ اس پر ابی بن کعب نے کہا کہ اس کی شہادت جو سب سے کم سن ہے وہ دے گا۔ ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ میں ہی سن میں سب سے چھوٹا تھا۔ ابوموسیٰ کے ساتھ چل پڑا اور حضرت عمر کو آ کر بتلایا کہ حضور نے ایسا فرمایا۔ اس پر حضرت فاروق اعظم نے

حضرت ابوموسیٰ سے کہا، بُرا نہ مانئے یہ تہمت تراشی نہیں تھی بلکہ لوگوں سے ڈر تھا کہ کہیں یونہی رسول کریم کی نسبت سے باتیں نہ پھیلانے لگیں۔

(۲) مسلم نے مسور بن مخرمہ سے روایت کیا کہ عورت کے نامکمل بچہ جننے کے بارے میں حضرت عمر نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ اس پر حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ آنحضورؐ کا فتویٰ غرہ کا ہے یعنی غلام مذکر و مؤنث میں سے کسی ایک کو آزاد کرنا۔ حضرت عمرؓ نے مغیرہ سے اس پر شہادت طلب کی، محمد بن مسلمہ نے اس پر گواہی دی۔

(۳) صفوان بن عیسیٰ نے عبداللہ بن ابی بکر سے روایت کیا کہ عباس کا ایک کمرہ مسجد نبوی کے قبلہ کے رخ پر تھا مسجد میں نمازیوں کی کثرت سے تنگی ہونے لگی، فاروق اعظم نے عباس سے کہا کہ فروخت کردو۔ انھوں نے انکار کیا۔ اس سلسلے میں حضور کی حدیث بیان کی۔ حضرت عمر نے کہا یوں کام نہیں چلے گا، اس پر شہادت اور دلیل پیش کرو۔ دونوں ساتھ ساتھ نکلے، راستہ میں انصار کے کچھ لوگ ملے ان سے بات کی، سبھی نے کہا کہ ہم نے حضور سے یہ بات سنی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں آپ کو عیب نہیں لگاتا، بلکہ حقیقت شناسی کی حد تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

(۴) مالک بن اوس نے بیان کیا کہ ہم نے حضرت عمر کو عبدالرحمان بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد کے سامنے کہا کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کیا یہ بات تمھارے علم میں ہے کہ حضور نے فرمایا "انا لا نُورث ماترکنا صدقة" کعب نے کہا بالکل سچ ہے، حضرتؐ نے یہی فرمایا ہے۔

(ج) حضرت عثمانؓ کی حقیقت پسندی بسلسلۂ روایت حدیث:

بشر بن سعد نے بیان کیا کہ حضرت عثمان مقاعد میں تشریف لائے۔ وہاں آپ نے پانی مانگا کہ وضو کریں۔ پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا پھر اپنے چہرے کو تین بار دھویا اور دونوں ہاتھوں کو بھی، پھر سر پر مسح کیا اور دونوں پیر تین تین بار دھویا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے حضور کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا۔ بتاؤ بھائیو ایسا ہی ہے نہ۔ سبھوں نے کہا، ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ کے پاس ایک جم غفیر اصحاب رسول کا اس وقت موجود تھا۔

(د) حدیث رسول کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کی حقیقت پسندی:

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں جب رسول خدا سے کوئی حدیث سنتا تو خدا کو جو فائدہ مجھے دینا ہوتا دے دیتے۔ مگر جب کوئی دوسرا آپ کی حدیث مجھ سے بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ قسم کھا جاتا تو تصدیق کر دیتا۔ ابوبکر نے مجھ سے حدیث بیان کی اور ابوبکر راست گو تھے۔ انہوں نے حضور علیہ السلام سے یہ بات سنی تھی کہ کوئی مومن جو مبتلاء گناہ ہوتا ہے اٹھ کر عمدہ طریقہ پر وضو کرتا ہے اور دو رکعتیں پڑھ کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو خدائے پاک اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔

ان مذکورہ آثار صحابہ سے صحابہ کی حقیقت شناسی کھل کر آپ کے سامنے آگئی اور ان کی پرداخت اور داشت میں احتیاط کا علم بھی ہوگیا۔ پھر یہ بات کہ صحابہ قبول حدیث کے لیے دو راویوں یا اس سے زائد سے روایت کا ہونا شرط ٹھیراتے۔ ایک بیکاری بات ہے۔ اسی طرح راوی کی روایت پر طلب شہادت یا قسم دلاتے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتو اس حدیث کو رد فرمادیتے۔ بلکہ صحابہ کا طریقہ وہی تھا کہ وہ احادیث میں حقیقت پسندی کو رہنما بناتے اور وہ طریقہ استعمال کرتے جس سے ان کا ضمیر مطمئن ہوجاتا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اسی کے نتیجے میں کبھی تو حضرت عمر برہان وبینہ طلب کرتے، کبھی کسی ایک ہی سے سن کر مان جاتے۔ اور یہ جو آپ نے گزشتہ سطور میں دیکھا کہ ابوموسیٰ اشعری نے ابوسعید خدری کو شہادت کے لیے پیش کیا تو حضرت عمر نے فرمایا بھائی جان میں آپ کو شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ مقصد یہ تھا کہ اس دارو گیر سے بات بنانے والوں کی ہمت پست ہو جائے گی، اور یہ غلط بیانی کی جسارت نہ کرسکیں گے۔ ذہبی نے اس کی ایک اور حکمت لکھی ہے کہ ابوموسیٰ کی حدیث کو مزید پختگی اور تجوز عطا کرنے کے لیے آپ نے ایسا کیا۔ ان کا مقصد حضرت ابوموسیٰ کو متہم کرنا نہ تھا، اس لیے کہ جس حدیث کو دو ثقہ راوی بیان کریں اس میں اور جان آجاتی ہے۔ گویا حضرت عمر نے بیان حدیث میں صرف ایک ہی طریق پر اکتفا نہ کیا تاکہ لوگ مختلف طرق حدیث اختیار کرنے کے عادی ہوجائیں اور حدیث ظن کی حدود سے نکل کر یقین وعلم کی حدود میں داخل ہوجائے۔

اسی طرح صدیق اکبر کے عمل میں بھی چھان بین کا ایک باب ہے۔ان کا مقصد اخبار نبوی میں حقیقت شناسی کو راہنما بنانا ہے، نہ کہ روایت کا سرے سے بیان کرنا ہی روک دینا۔

صحابہ نے بھی کبھی کبھی راوی سے شہادت تو طلب کی ہے۔انھوں نے روایت آحاد کی بڑی تعداد قبول کی اور اس سے استخراج مسائل کیے۔کیسی عجیب بات ہے کہ بعض انتہا پسند مسلمان صحابہ کے اس عمل کو آحاد کے قبول میں دستور اور اصول تو تسلیم کرتے ہیں مگر صحابہ کے خبر آحاد قبول کرنے کو اپنا دستور نہیں مانتے بلکہ اسے رد کر دیتے ہیں اور نا قابل قبول ٹھیراتے ہیں۔یہ بات حافظ ابو بکر محمد بن ابو عثمان الحازمی نے بعض متاخرین معتزلہ سے بیان کی ہے۔اس طرح بعض محدثین سے بھی منقول ہے۔اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن حجر نے علوم الحدیث اور مدخل میں فرمایا کہ حاکم کی بات سے لوگوں نے یہ بات نکالی۔سب سے زیادہ حیرت انگیز تو وہ بات ہے جسے ابو حفص عمر بن عبدالمجید میانجی نے اپنی کتاب "ما لایسع المحدث جھله" میں نقل کیا ہے کہ شیخین کی شروط قبول حدیث میں سے یہ ہے کہ اس کو وہ صحیحین میں ذکر نہیں کرتے۔مگر جو ان کے نزدیک درست و ثابت ہوتی ہے اس کی بنیاد حضور کی وہ حدیث ہے "اثنان فصاعدا" دو ہوں یا اس سے زیادہ اور کسی ایک صحابی سے تابعین نے جو نقل کیا ہے اس میں اکثر میں چار تابعی ہیں اور تابعین سے جو نقل کیا گیا ہے وہ چار سے زائد ہی ہیں۔

ابن حجر نے اسی پر لکھا ہے کہ ایسی بات وہی کہتا ہے جس کو صحیحین سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ویسے تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ بخاری اور مسلم میں کوئی حدیث اس انداز کی نہیں ہے تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی۔ابن العربی نے شرح موطا میں لکھا ہے کہ مذہب شیخین یہ ہے کہ جب تک دو راوی نہ ہوں حدیث ثابت ہی نہیں ہوتی۔آپ نے فرمایا کہ یہ ایک باطل مذہب ہے۔ایک کی روایت ایک سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک صحیح ہے۔

ڈاکٹر سباعی نے لکھا ہے کہ یہ انداز فکر کہ صحابہ اسی روایت کو لیتے جس کے راوی حضور سے دو ہوتے، مروج ہو گیا تھا۔چنانچہ تاریخ تشریع اسلامی اور تاریخ السنہ فی عصر الحدیث کے بہت

سے مصنفین نے اسی کو لکھ رکھا ہے۔ چنانچہ ایک مسلم بات ہوگئی اس کے علاوہ دوسری بات کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس طرز فکر کی ہمارے ازہر کے بھی بہت سے اساتذہ، جنھوں نے تاریخ تشریع اسلامی تحریر کی ہے تائید کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں عمل بالحدیث کی شرائط کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوبکر، عمر، عثمان و علی سبھی کا عمل بالحدیث کے سلسلے میں یہی طرز فکر تھا۔

صحابہ نے بعض احادیث کے اثبات کے لیے دو راویوں کی بات کہی ہے۔ لیکن یہ تمام مرویات میں مروج نہ تھا بلکہ صحابہ نے اکثر احادیث یا حدیث کا بیشتر حصہ صرف ایک ہی راوی سے لے کر اسے مختلف مواقع پر نقل فرمایا۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ صحابہ دو راویوں کی قید صرف حدیث کو مؤکد کرنے کے لیے ہی لگاتے تھے۔ ورنہ ان کا ہرگز یہ انداز نہ تھا کہ کوئی روایت بلا دو صحابی کے ثابت ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ خلفاء اربعہ کے یہاں ایسی احادیث جو آحاد ہیں، ان احادیث سے کہیں زیادہ ہیں جن میں آپ حضرات نے دو راوی کی طلب کی ہو۔ ذیل کے آثار سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

(۱) سعید بن مسیبؒ نے بیان کیا کہ حضرت عمر فرماتے کہ دیت عاقلہ کے لیے ہے، اور شوہر کی دیت سے عورت کو کسی قسم کا ورثہ نہ ملے گا۔ مگر ضحاک بن ابوسفیان نے جب حضرت عمر کو بتلایا کہ حضور نے مجھے تحریر بھیجی تھی کہ اشیم الضبابی کی اہلیہ کو اس کی دیت سے حصہ ملے گا، تو فاروق اعظم نے پہلے حکم سے رجوع کر لیا۔

(۲) طاؤس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے لوگوں سے کہا کہ جنین کے بارے میں کسی کو کچھ نبی کریم سے معلوم ہو تو بتائیں۔ حمل بن مالک النابغہ اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اپنی دو لونڈیوں کے مابین جو ایک دوسرے کی سوکن تھیں موجود تھا، ان میں سے ایک نے دوسرے کی خیمہ کی میخ سے پٹائی کی جس سے ایک مردہ بچہ پیدا ہو گیا، یعنی اسقاط حمل صدماتی ہو گیا، تو حضور نے اس میں ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا، خواہ وہ مادہ ہو یا نر۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر مجھے حضور کی یہ بات نہ پہنچتی تو میں کچھ اور ہی فیصلہ دیتا۔

(۳) عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر شام کے سفر پر تھے، جب آپ سرغ

پہنچے تو ابو عبیدہ بن جراح اور ان کے رفقاء وہاں پر حضرت عمر سے ملے اور بتلایا کہ شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔

آپ نے مشورہ کیا مہاجرین وانصار اور قریش کے معمر جہاندیدہ حضرات سے ان لوگوں کی رائے میں اختلاف ہوا۔ اتنے میں عبدالرحمٰن بن عوف آ گئے، جو کسی نجی ضرورت کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے، تو آپ نے کہا اس سلسلے میں مجھے حضور کی بات کا علم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کسی جگہ سے وبا کی اطلاع تم کو ملے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر ایسی جگہ جہاں وبا پھیل چکی ہو اور تم وہاں پہلے سے موجود ہو تو پھر اس سے نکل بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ حضرت عمر عبدالرحمٰن بن عوف کی یہ بات سن کر واپس ہو گئے۔

(۴) امام شافعیؒ کی روایت، امام جعفرؒ کے ذریعہ ہے کہ حضرت عمر نے مجوس کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ سن کر ان سے کہا کہ مجھ سے سنو کہ حضورؐ سے یہ کہتے میں نے سنا کہ مجوس کے ساتھ وہی روش ہونی چاہیے جو اہل کتاب کے ساتھ جاری تھی۔

(۵) حضرت عمر نے سعد بن وقاص کی حدیث مسح علی الخفین کے بارے میں مان لی اور عبداللہ صاحبزادے کو ہدایت کی کہ اس پر نکیر نہ کرنا، حضرت سعد جب کوئی بات بیان کریں تو اس کی تردید نہ کرنا۔ حضور خفین پر مسح فرماتے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب سعد کوئی بات بیان کریں تو پھر کسی دوسرے سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح آحاد کے قبول کرنے پر اس سے بہتر دلیل کیا ہو سکتی ہے۔ اگر مزید راوی کی شہادت کی ضرورت ہوتی تو حضرت عمر اپنے صاحبزادے کو سب سے پہلے ہدایت کرتے کہ وہ سعد کی بات کے لیے دوسری شہادت طلب کریں۔

(۶) آپ نے ایک پاگل عورت کو زنا کی بنیاد پر رجم کرنا چاہا، مگر جب حضور کی بات معلوم ہوگئی کہ جوابدہی تین سے ساقط ہے تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم واپس لے لیا۔

آپ نے حاطب کی باندی کو رجم کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ جو حاملہ ہو

اس پر حد نہیں ہے تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم منسوخ فرمادیا۔

(۷) حضرت عمر انگلیوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے ان کی دیت میں مختلف احکام دیت جاری کرتے۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انگلیوں کو ایک ہی حکم کے تحت رکھتے تھے، تو حضرت عمر نے اس سے رجوع کر کے دیت میں یکسانیت کا حکم جاری فرمایا۔

(۸) رسولِ خدا کی مجلس میں حضرت عمر کے باری باندھ کر آنے کو بھی جانتے ہیں۔ ایک دن آپ اور دوسرے دن آپ کا پڑوسی حضور کی خدمت میں حاضری دیتے۔ چنانچہ حضرت خود ہی فرماتے ہیں کہ وہ ایک دن آتا اور ایک دن میں آتا، جس دن میں آتا اس دن کی ساری خبر احادیث یا وحی وغیرہ میں اپنے پڑوسی کو بتلاتا، اور جس دن وہ آتا واپسی پر وہ مجھے سارے دن کی تفصیلی رپورٹ دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر اپنے پڑوسی کی بات کو سنتے اور قبول کرتے، اور ان کے پڑوسی اور دیگر جن سے عمر نے روایت قبول کی کوئی فرق نہیں ہے۔

ان ساری روایات سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ فاروق اعظم نے کسی روایت کے قبول کرنے کے لیے دو راویوں کی شرط نہیں لگائی۔ حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ ایک منفرد واقعہ ہے، اس کی وجہ بھی انھوں نے بیان کر دی تھی اور معذرت کے الفاظ تھے، تہمت مقصود نہ تھی۔ اس کا ہرگز مقصد یہ نہ تھا کہ خبر بلا دو راویوں کے قبول ہی نہ کی جائے۔ آپ نے جہاں بھی دو راوی یا شاہد کا مطالبہ کیا ہے یہی حال ہے۔

رہ گیا حضرت ابوبکر صدیق کا موقفِ قبول روایت تو اس سے سوائے توثیق و وضاحت کے کوئی دوسری بات ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ آپ سے دو راویوں کی طلب کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بجز اس منفرد واقعہ کے جس کا ذکر ذہبی نے کیا ہے۔

اگرچہ ابن حزم نے اس کی تردید کی ہے اور اسے حدیث منقطع شمار کیا ہے۔ اس لیے اس کو معیار قبول حدیث نہیں بنایا جاسکتا۔ آپ نے بہت سی روایتیں صرف آحاد کی قبول فرمائی ہیں جن میں راوی صرف ایک ہے۔

اس لیے پہلے ہم ابن قیم کے قول کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق کا قبول حدیث میں معیار بیان کر چکے ہیں۔ جس میں صاف ہے کہ آپ کوئی شاہد قبول حدیث کے لیے طلب نہ فرماتے۔ آپ نے حضرت عائشہ کی بات جو خبر واحد تھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کے بارے میں تسلیم کر لی تھی۔

حضرت عثمان نے بھی ہر حدیث کے ثبوت کے لیے دو راویوں کی طلب نہیں فرمائی اور آپ نے وضوء کے سلسلہ میں جو اقدام فرمایا، اس کا مقصد محض یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر وضو کیا۔ آپ سے اخبار آحاد پر عمل کرنا بھی ثابت ہے۔ مالک بن سنان کی صاجزادی فُریعہ جو ابوسعید خدریؓ کی بہن تھیں، ان کے شوہر کی وفات پر ان کی عدت کے بارے میں معلوم کیا اور محض ان کے بیان پر فیصلہ فرمادیا۔

حضرت علی کے بارے میں جو یہ آتا ہے کہ انھوں نے دو شاہدوں کو حلف دلائی تو یہ ان کا عام دستورِ زندگی نہ تھا کہ اخبار و احادیث بلا دو شاہدوں کے قبول نہ فرماتے۔ آپ کے یہاں ایسی بھی حدیثیں ہیں جن میں آپ نے رواۃ کو حلف نہیں دلائی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کی بات بلا کسی پس و پیش کے قبول فرمالی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا اور روایت کے قبول کے معیار پر ابوبکر اور ایک عام صحابی میں کیا فرق کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے مقداد بن اسود کی بات بسلسلہ مذی بلا کسی حلف و سوگند کے قبول فرمائی۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ خلفاء اربعہ کے نزدیک احادیث کے قبول کرنے کی کوئی خاص شرط نہ تھی۔ اور ان حضرات سے جتنی روایتیں ایسی ہیں جن سے قبول حدیث میں دو کی شرط معلوم ہوتی ہے اس کا مقصد اظہار حقیقت اور چھان بین تھا۔ آپ حضرات نے آحاد کو بڑی کشادہ دلی سے بلا کسی اینچ پیچ کے قبول کیا۔ آپ کے نقش قدم پر عام صحابہ اور علماء صحابہ بھی تھے۔ اور جو احتیاط آپ کو نظر آ رہی تھی وہ سنت نبوی کی حفاظت کے پیش نظر تھی اور بس۔

(۹) تابعین اور تبع تابعین بھی قدم بقدم صحابہ کی راہ پر گامزن رہے۔ ان میں بھی سنت

نبوی کے قبول میں احتیاط کا انداز وہی تھا، وہ بھی رواۃ کی پوری جانچ پڑتال کرتے اور اس کے لیے سارے جتن کرتے تا آنکہ اطمینان قلب نصیب ہو جاتا۔ جو چاہے تاریخ رواۃ کو سامنے رکھ لے اور حدیث کے نقل و بیان کرنے، اسے ایک دوسرے تک پہنچانے کی کیفیت کو اس تاریخ سے معلوم کر لے تاکہ تابعین اور تبع تابعین کی غیر معمولی مساعی کا اندازہ ہو جائے۔ اس میں سے چند کا ذکر کافی ہوگا۔

مسعر بن کدام سے کسی نے کہا کہ اتنی چھان پھٹک آپ کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ یقین کی حدود کو مضبوط بنانے کے لیے۔ مصر کے محدث یزید بن ابو حبیب کہتے ہیں کہ جب حدیث سنو تو گم شدہ اونٹ کی طرح اعلانیہ جاری کرو۔ جب معلوم ہو جائے کہ واقعی حدیث ہے تو لے لو ورنہ چھوڑ دو۔

تابعین اور تبع تابعین کے یہاں بھی روایت کے قبول کرنے کے لیے کوئی خاص شرط نہ تھی اور کسی سے یہ منقول نہیں کہ انھوں نے دو راویوں یا اس سے زائد کی شرط قبول حدیث نبویؐ کے لیے لگائی ہو۔ بلکہ وہ حدیثیں ان تمام لوگوں سے لیتے جن میں حدیث کو یاد کرنے اور ادا کرنے کی صلاحیت محسوس کرتے۔ اس میں عدالت کا وہ پہلو بھی ملحوظ رہتا جس پر محدثین کا اجماع تھا۔ اگر کسی راوی کی عدالت زیر بحث ہوتی تو اس کی خبر کو نظر انداز کر دیتے، پھر اس سے کوئی روایت ہی نہ کرتے۔ یہی نہ تھا بلکہ وہ احادیث کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح کی احتیاط برتتے جس سے ان کے قلوب مطمئن ہوتے۔ اس لیے کہ صحابۂ کرام کی فہمائش اور کبار تابعین کی ہدایت کا ان کے دلوں میں بڑا مقام تھا۔ چونکہ وہ احادیث کی روایت کو دین جانتے تھے اس لیے جو لوگ اس قابل تھے کہ ان سے دین اخذ کیا جائے انہی سے وہ دین لیتے۔

وہ سونے چاندی کی امانت سے کہیں زیادہ احادیث رسول کی امانت کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ سلیمان بن موسیٰ نے طاؤس سے ملاقات کی اور کہا کہ فلاں نے مجھ سے یوں یوں بیان کیا۔ آپ نے کہا کہ اگر صداقت سے پُر ہو تو قبول کرو۔ ابن عون نے فرمایا کہ اثاڑی سے حدیث نہ بیان کی جائے۔ شعبہ بن حجاج نے ابن دینار محدث سے ولاء اور ہبہ کے

بارے میں ایک حدیث بیان کرتے سنا جو ابن عمر سے روایت کر رہے تھے۔ اس پر شعبہ نے ان سے سوگند طلب کی۔ جب انھوں نے قسم کھائی کہ ہاں ابن عمر سے میں نے سنا ہے، پھر تسلیم کیا۔ اسی طرح حکم نے سعید بن مسیب سے یہودی، نصرانی، مجوسی کے دیت کے بارے میں شعبہ سے حدیث بیان کی۔ تو انھوں نے کہا کہ تم نے سعید بن مسیب سے سنا ہے تو انھوں نے کہا کہ تم میرے سوا ثابت بن حداد سے دریافت کر سکتے ہو۔ چنانچہ میں ثابت بن حداد کے پاس گیا، انھوں نے وہی بات بیان کی۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ شعبہ بلا حلف کے حدیث قبول نہ کرتے تھے یا اس وقت تک کہ اس کی توثیق کسی دوسری روایت سے ہو جائے۔ یہ ساری باتیں بطور حقیقت جوئی اور وثوق کامل کے عمل میں لائی گئیں ہیں تاکہ حدیث نبوی میں کسی قسم کی کھوٹ نہ رہ جائے۔

روایت باللفظ یا روایت بالمعنیٰ

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی حقیقت جوئی احادیث نبوی کے قبول کرنے کے سلسلے میں ہم نے آپ کے سامنے رکھ دی ہے اور ان تینوں جماعتوں کے افراد کا تقویٰ، احتیاط، خشیت الٰہی، روایت حدیث نبوی کے سلسلے میں جس انداز کا تھا وہ بھی آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی حدیث کو اس وقت تک روایت نہ کرتا جب تک کہ اس حدیث کے الفاظ و معنیٰ کو پوری طرح سمجھ نہ لیتا۔ یہ احتیاط اس درجہ کی بڑھی ہوئی تھی کہ اس خطرہ کے پیش نظر کہ حدیث نبوی میں کسی قسم کی کمی بیشی ہو جائے حدیث ہی بیان نہ کرتے۔ آپ کو علاء بن سعد بن مسعود کی اس روایت سے خاصا مواد مل جائے گا کہ اصحاب نبی کریمؐ میں سے ایک سے لوگوں نے کہا کہ تم حدیثیں کیوں نہیں بیان کرتے؟ فلاں فلاں کو دیکھتے نہیں کہ وہ فر فر حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ ممکن ہے انہوں نے جس انداز پر سنا ہو میں نے نہ سنا ہو یا مجھے وہ بات یاد نہ ہو جو انہیں یاد رہی ہیں۔ پھر معاملہ اس انداز پر نہ ہوا اور لوگ ان باتوں کو گرہ دے لیں، مجھے تو وہی کافی ہے جو میری ذات تک ہے، میں حدیث

رسول میں زیادتی ونقصان کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم اس سے صحابہ کا اندازِ روایت، ان کی حقیقت جوئی اور صداقت پسندی کا ذکر کر چکے ہیں کہ وہ روایت میں کمی محض غلطی میں پڑ جانے کی بنا پر کیا کرتے تھے۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کسی قدر اس معاملہ میں تفصیل سے کام لیں گے، تاکہ حدیث نبوی کی روایت کا انداز نکھر کر سامنے آجائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ صحابہ لفظ حدیث نبوی کی حفاظت میں ہمیشہ کوشاں رہتے، وہ سنی ہوئی باتیں اپنے الفاظ میں بیان کرتے تو اس طرح بیان کرتے کہ معنیٰ و مرادِ نبوی میں کوئی تغیر نہ آنے پائے۔

ہم نے جب ان حدیثوں کو کھنگالا تو یہ بات سامنے آئی کہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد حدیث نبوی کو لفظ بلفظ نقل کرنے کی قائل تھی بعض صحابہ روایت بالمعنیٰ کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ چونکہ صحابہ میں لفظ کی پابندی کے ساتھ بھی روایت کا رواج تھا، اور روایت بالمعنیٰ بھی مروج تھا اس لیے اسی انداز کو تابعین نے بھی اختیار کیا۔ مگر صحابہ کا جذبہ حدیث نبویؐ وہی تھا کہ جن لفظوں میں آپ سے سنا تھا انہی لفظوں میں بیان کرتے۔ آپ سے سنے ہوئے الفاظ میں معمولی ردوبدل بھی صحابہ کو ناپسند تھا۔ حتیٰ کہ حضورؐ سے سنے ہوئے الفاظ کی ترتیب میں بھی کسی قسم کے تغیر کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فرماتے کہ جس نے رسول خدا سے کوئی بات سنی اور ہو بہو اسے روایت کر دیا تو وہ بچ نکلا۔ اسی قسم کی روایت عبداللہ بن عمرؓ اور زید بن ارقم سے بھی پائی جاتی ہے۔

صحابہ میں جو لوگ لفظ رسول کے باقی رکھنے پر متشدد تھے عبداللہ بن عمر ان میں مشہور زمانہ تھے۔ چنانچہ محمد بن سوقہ نے کہا کہ عبداللہ بن عمر رسولِ خدا سے کوئی بات سنتے یا کسی جنگ میں شریک ہوتے تو اس کی ہو بہو نقل کرتے نہ کمی ہونے دیتے نہ زیادتی پسند کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیٹھے ہوئے تھے اسی مجلس میں عبید بن عمیر نے اہل مکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا: مثل المنافق كمثل الشاة بين الغنمين ان أقبلت الى هذه الغنم نطحتها وان أقبلت الى هذه نطحتها (منافق کی مثال بکری کے دو ریوڑوں کے درمیان ایک بکری جیسی ہے، جب اس ریوڑ کی طرف آتی ہے تو سینگ ماری

جاتی ہے اور جب دوسرے ریوڑ میں جاتی ہے تو وہاں سینگ ماری جاتی ہے۔) اس پر لفظ میں تغیر ہونے کی وجہ سے عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ حدیث یوں نہیں ہے۔ عبید بن عمیر یہ سن کر خفا ہو گئے۔ عبداللہ بن صفوان اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے کہا کہ ابو عبدالرحمان تمہی بتلاؤ کہ حدیث کس طرح ہے؟ آپؓ نے فرمایا، یوں ہے: مثل المنافق مثل الشاة بين الربيضين ان أقبلت الى ذا الربيض نطحتها وان أقبلت الى ذا الربيض نطحتها (منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو دو گلہ کے درمیان ہے جب ادھر آتی ہے تو یہ گلہ اسے سینگ مارتا ہے جب دوسری طرف جاتی ہے تو وہاں سینگ ماری جاتی ہے) اس پر صفوان نے کہا کہ خدا آپ کا بھلا کرے، دونوں تو ایک ہی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے کانوں نے یونہی سنا ہے۔

ابن عمر نے بني الاسلام علی خمس (اسلام کے پانچ بنیادی ارکان) کی روایت بیان فرمائی۔ ایک دوسرے نے اس کی تکرار کی تو ابن عمر نے فرمایا کہ نہیں بلکہ صیام رمضان کو سب کے بعد بیان کرو، اس لیے کہ رسول خدا کے زبان مبارک سے جس طرح سنا ہے ترتیب وہی رہے گی۔ اسی بنیاد پر آپ کو احادیث کی روایت کے سلسلے میں بہت سی جگہ پر راوی کے یہ الفاظ ملیں گے: كذا وكذا، لا أدري، بأيهما بدأ أو أيهما قال، قيل، (یوں بھی اور یوں بھی، یا مجھے یاد نہیں رہا کہ ابتداء کس لفظ سے کی ہے یا دونوں میں سے کون پہلے ہے، یا اسی قسم کے الفاظ ہوتے ہیں)۔ اس سے اس بات پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ راوی نے حدیث سنا بھی اور سمجھا بھی، مگر اس کے ذہن میں ترتیب نہ رہی۔ اس لیے حدیث تو بالکل جوں کی توں ہے صرف اس کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جو خالد بن زید جہنی نے بیان کی کہ آپ نے فرمایا قریش و انصار واسلم وغفار یا عفار واسلم۔

بعض رواۃ نے نص حدیث کے الفاظ کی حفاظت میں تشدد سے کام لیا ہے اور ایک حرف کے تغیر اور حذف پر بھی انہوں نے دار و گیر کی، حالانکہ معنیٰ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ جیسا کہ سفیان کی روایت جو

زہری سے ہے کہ انس بن مالک نے اپنی روایت نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الدباء والمزفت أن ينتبذ فيه۔ سفیان سے لوگوں نے کہا کہ روایت میں ان ینبذفیه بھی ہے تو انہوں نے کہا کہ زہری نے یوں ہی روایت کیا ينتبذ فيه۔

بعض رواۃ نے تو حفظ الفاظ میں اتنی شدت برتی کہ جو سنا اسے ہی بیان کرتے، حتیٰ کہ ثقیل الفاظ کی تخفیف یا خفیف الفاظ کی تثقیل بھی جائز نہ جانتے۔ سنے ہوئے الفاظ کی حرکتوں کو بھی تبدیل کرنا ناپسند تھا، بلکہ اس کو انہی حرکات کے ساتھ جو سنا تھا بیان کرتے، اگر چہ اس تغیر سے معنیٰ میں کوئی عیب پیدا نہ ہوتا، حتیٰ کہ نما کو نمی سے بدلنا پسند نہ تھا۔ جیسا کہ حدیث رسول میں ہے: ليس الكاذب من أصلح بين الناس فقال خيرا أو نمى خيرا، حماد نے فرمایا کہ میں نے یہ حدیث دو آدمیوں سے سنی ایک نے خفت کے ساتھ نما بیان کیا اور دوسرے نے ثقل کے ساتھ نمّی بیان کیا۔

بعض محدثین اپنے طالبین کو اس وقت تک حدیث نہیں سناتے تھے جب تک کہ سننے والے کتابت نہ کرلیں صرف زبانی یادداشت سے مطمئن نہ تھے۔ اس لیے کہ کتابت میں حفظ تام ہے اور زبان میں حفاظت تام کا تیقن نہیں۔ اس سلسلے میں خطیب بغدادی کی روایت بسند ابن عیینہ قابل ذکر ہے جس میں محمد بن عمرو نے فرمایا کہ میں حدیث اسی وقت بیان کروں گا جب تم کتابت کے اہتمام کا یقین دلا دو، مجھے خطرہ لگا رہتا ہے کہ تم لوگ غلط بیانی سے کام نہ لینے لگو۔ دوسری روایت میں ہے کہ میرے سر جھوٹ نہ منڈھ دو۔

اس سلسلہ کی دوسری روایت رامہرمزی کی ہے جس میں طلحہ بن عبدالملک نے بیان کیا کہ میں قاسم کے پاس حاضر ہوا اور کچھ باتیں دریافت کیں، میں نے کہا کہ میں اسے لکھ لوں گا۔ آپ نے کہا ہاں ہاں۔ پھر آپ نے اپنے صاحبزادے سے کہا کہ ان کا لکھا دیکھو کہیں کمی بیشی نہ ہو۔ میں نے ان سے کہا ابو محمد اگر میں غلط بیانی کرتا تو پھر آپ کے پاس آتا ہی کیوں۔ آپ نے کہا کہ یہ مقصود نہیں تھا بلکہ یہ خیال ہوا کہ کہیں کچھ چھوٹ گیا ہو تو یہ اس کی اصلاح کر سکے۔

اعمش نے بیان کیا کہ علم حدیث ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو آسمان سے گرایا جاتا

آسان جانتے ہیں، چہ جائے کہ حدیث میں ایک واو، الف یا دال کا اضافہ کردیں۔ ابن عون نے تین آدمیوں کا تشدد فی الحدیث ذکر کیا ہے جو ایک حرف بھی ادھر سے ادھر نہیں کرنا جانتے تھے۔ قاسم بن محمد حجاز میں، محمد بن سیرین بصرہ میں، رجاء بن حیوہ شام میں، اسی طرح ابراہیم بن میسرہ اور طاؤس روایت باللفظ کرتے اور طاؤس تو روایت حدیث کا حرفاً حرفاً اہتمام کرتے۔ ابن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ حجاز کے محدثین میں ابن شہاب، یحییٰ بن سعید اور ابن جریج حدیث کی ہو بہو کاپی کے قائل تھے۔ اسی طرح مالک بن انس بھی حدیث رسول بیان کرنے میں بالکل ان ہی حروف کے ادا کرنے کے قائل تھے۔ پھر بھی بعض صحابہ و تابعین کے یہاں روایت بالمعنیٰ بھی ملتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک کلمہ کو دوسرے ہم معنیٰ کلمہ سے بدلنے کی اجازت دیتے تھے۔ لیکن اس طرح کی روایات میں یہ اہتمام بھی تھا کہ بیان کے فوراً بعد کہہ دیتے کہ روایت کے الفاظ حضور علیہ السلام کے نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے صحابہ کا ایک بڑا طبقہ حدیث رسول کے ذکر کے وقت بڑی احتیاط کرتا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس جب بھی حدیث بیان کرتے تو فرماتے کہ حضورؐ نے یوں ہی یا اسی انداز یا اسی کے قریب قریب الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور حدیث بیان کرتے وقت آپ پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت ابو درداء صحابیؓ بھی حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے کہ رسول خدا نے کہا ہے 'یونہی' یا 'اسی طرح' یا 'اسی شکل کا بیان' تھا۔ کبھی فرماتے خدارا یہی تو بات تھی یعنی اشکال بیان کرتے۔

محمد بن سیرین فرماتے کہ انس بن مالک قلیل الحدیث تھے اور جب بھی حدیث بیان کرتے أو کما قال فرماتے۔ عروہ بن زید فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجھ سے حدیث سن کر فوراً جا کر لکھ لیتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے سن کر جب کسی دوسرے سے وہی بات سنتا ہوں تو اس کے الفاظ بدلے ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ معنیٰ میں بھی تغیر ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ محمد بن سیرین سے ایوب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہی حدیث دس آدمیوں سے سنی، سب کے الفاظ الگ تھے گو معنیٰ ایک تھے۔

مکحول بیان کرتے ہیں کہ میں اور ابوازہر واثلہ بن اسقع کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ہم سے رسول خدا کی ایسی حدیث بیان کریں جو آپ نے حضورؐ سے سنی ہو جو وہم، زیادتی اور نسیان سے خالی ہو۔ انہوں نے کہا کہ تم میں سے کوئی قرآن کریم کا بھی علم رکھتا ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں، لیکن ہم عمدہ حافظ نہیں ہیں، کبھی واو، الف میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن کریم جس کا لفظ لفظ ہمارے سامنے مکتوب صورت میں ہے، اس کو تم پوری طرح یاد نہیں کر پاتے، تم کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم سے زیادت ونقصان، تلاوت وحفظ قرآن میں ہو جاتی ہے۔ پھر تم لوگ ان احادیث کے بارے میں جو ہم نے حضورؐ سے سنی ہیں، اس کے حرف بہ حرف یاد رکھنے کا مطالبہ کیسے کرتے ہو؟ بعض باتیں تو آپ کی ہم کو صرف ایک ہی بار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لیے ہم جو حدیث بیان کریں اسے روایت بالمعنیٰ ہی سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح قتادہ نے زرارہ بن ابی اوفی سے ملاقات کی، انہوں نے کہا کہ ہماری ملاقات حضور کے کئی صحابی سے ہوئی۔ ان سے میں نے حدیث سنی۔ الفاظ سب کے الگ الگ تھے البتہ معنیٰ ایک تھا۔ جریر بن حازم کہتے ہیں کہ میں نے احسن کو حدیث بیان کرتے سنا جو اصلاً ایک ہوتی مگر الفاظ بدلے ہوتے۔ عمران قصیر فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بصری سے کہا کہ ہم حدیثیں سنتے ہیں مگر اسی انداز پر وہ حدیثیں نہیں رہ جاتیں جس انداز پر ہم نے سنا ہے۔ اس پر حسن بصری نے فرمایا کہ میاں لفظ کی رعایت کے ساتھ اگر حدیث بیان کریں تو دو حدیث سے زیادہ بیان نہ کرسکیں گے۔ مگر حلال وحرام کے سلسلہ میں تو یکسانیت رہتی ہے۔

روایت بالمعنیٰ کی اجازت عبداللہ بن مسعود، ابودردا، وانس بن مالک، عائشہ ام المومنین، عمرو بن دینار، عامر شعبی، ابراہیم نخعی ابن ابی نجیح عمرو بن مرہ، جعفر بن محمد بن علی، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید القطان جیسے جلیل القدر صحابہ اور تابعین نے دی ہے۔ ابن عون نے بیان کیا کہ تین شخص روایت بالمعنیٰ کی اجازت دیتے تھے، حسن بصری، ابراہیم نخعی، عامر شعبی۔

پھر بھی ہم کو یہ احتیاط سب کے یہاں نظر آتی ہے جو ضرورتاً روایت بالمعنیٰ فرماتے کہ حدیث کے بیان کرنے کے بعد سامعین پر یہ بات واضح کردیتے کہ یہ حدیث بالمعنیٰ ہے۔

چنانچہ أو کما قال، و نحو هذا، فرمادیا کرتے۔ بعض محدثین کتابت حدیث کے سلسلے میں نہایت سخت تھے، اور ایسوں کو اجازت کتابت نہ دیتے جب تک کہ یہ بات کھل کر سامنے نہ آجائے کہ روایت کے الفاظ حضورؐ کی زبان سے نکلے ہوئے ہی ہیں۔ چنانچہ عمرو بن دینار حدیث بیان کرتے کرتے کہہ دیتے کہ جو کتابت حدیث مجھ سے سن کر کر رہا ہو وہ یہاں سے اٹھ جائے۔

اس سے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ روایت بالمعنیٰ کی جن محدثین نے اجازت دی ہے ان کے یہاں کچھ پابندیاں تھیں۔ ایرے غیرے نتھو خیرے سب کو اس کی اجازت نہ تھی بلکہ کسی خاص موقع محل، ضرورت کے وقت، جس کے حافظہ سے لفظ نکل جاتا یا بیان کرتے کرتے اچانک الفاظ بھول جاتا اور حدیث بیان کرنے کی ضرورت کو سمجھتا تو بالمعنیٰ ہی روایت کر گزرتا، اور ضرورت بقدر ضرورت ہوتی ہے۔ امام شافعی نے راوی کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حدیث اس سے بیان کی جائے جو دینداری میں حجت ہو، اور صدق مقال میں مشتہر د معلوم ہو، جو بیان کر رہا ہے اس سے خوب واقف ہو کہ کہیں معنیٰ حدیث لفظ کے بدلنے سے بدل نہ جائے، جو حدیث بیان کر رہا ہے وہ الفاظ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، اس کے معنیٰ نہیں بیان کر رہا ہے۔ اگر غیر عالم حدیث بالمعنیٰ بیان کرنے لگے تو وہ معنیٰ کچھ کا کچھ بنا دے گا، حلال کو حرام بنا دے گا۔ اگر حدیث، لفظ کی رعایت کے ساتھ بیان کر دی جائے تو پھر اس میں حدیث کے معنیٰ تبدیل ہو جانے کا سوال نہیں رہتا۔

رامہرمزی نے کہا کہ امام شافعی نے محدث کی جو صفت بیان کی ہے اسے لفظ کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اسی سے اس بات کا بھی علم ہوگیا کہ محدث روایت بالمعنیٰ بھی کر سکتا ہے، اگر راوی لغات عرب سے واقف ہو اور اس کے انداز خطاب کو بھی سمجھتا ہو۔ معنیٰ کا اسے خوب علم ہو، اس کو نکتہ رسی بھی حاصل ہو، اس کو جانتا بھی ہو کہ اس طرح معنیٰ میں کوئی خرابی نہ ہوگی اور دوسری طرح خرابی کا امکان ہے۔ اس کی سمجھ ایسی پختہ ہو کہ لفظ تبدیل کرنے کے بعد معنیٰ کے تبدیل ہو جانے کے خطرے پر بصیرت رکھتا ہو کہ کہیں احکام میں تغیر نہ ہو جائے۔ جو ان

صفات سے خالی ہو اس کے لیے روایت باللفظ ہی ضروری ہے، اسے سنے ہوئے الفاظ میں کوئی ردوبدل کرنے کا کوئی مجاز نہیں۔ یہی علماء وفقہائے حدیث کی عمومی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جواز پر وہ قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں قرآن نے ایک ہی قصہ کو مختلف جگہ مختلف لفظوں میں بیان کیا جن کے معانی ومطالب سب ایک ہیں ان کو عربی زبان میں خود ان کی زبانوں سے منتقل کیا گیا، اس میں تقدیم وتاخیر، حذف والغاء، زیادت ونقصان جیسے اختلافات موجود ہیں۔

صحابہؓ نے روایت بالمعنیٰ کا جواز یونہی نہیں تسلیم کیا بلکہ قرآن کریم کے اصول کو سامنے رکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ ابھی ابھی ہم اس کا ذکر رامہرمزی کی کتاب سے بیان کر چکے ہیں۔ حضورؐ دوسرے ممالک میں اپنے سفراء کو یہ پیام دے کر روانہ فرماتے جو آپ کے پیام کا ترجمہ فرماتے۔ اس حدیث کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی اباحت کے ساتھ ساتھ خود آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو متکلم اپنے الفاظ میں بیان کردے تو کوئی حرج نہیں کہ اباحت کا علم بآسانی ہوجاتا ہے، اس لیے کہ حضورؐ کی زبان سے نکلے ہوئے عربی الفاظ کو متکلم اپنے الفاظ عربی میں بیان کرتا ہے جو اقرب الی لفظ الرسول ہے۔ اس لیے روایت بالمعنیٰ کی اباحت واضح طور سے ثابت ہوگئی۔

جن لوگوں نے روایت بالمعنیٰ کو ناپسند کیا ان کا استدلال یہ حدیث ہے: نضر اللّٰہ امرأ سمع منا حدیثا فأداہ کما سمعہ، اس سلسلے میں براء بن عازب کی وہ روایت بھی قابل ذکر ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے براء سے کہا، میاں تم سونے کے وقت کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ خدا اور رسول کو اس کا علم ہے۔ آپؐ نے فرمایا جب سونے جاؤ تو اپنا دایاں ہاتھ تکیہ بنالو پھر یہ کہو: اللھم أسلمت وجھی إلیك وفوضت أمری إلیك وألجأت ظھری إلیك رغبة ورھبة إلیك، لاملجأ ولامنجی منك الا إلیكَ آمنت بکتابك الذی أنزلت و بنبیك الذی أرسلت، "اے اللہ میں نے اپنا رخ تیری طرف کرلیا اور اپنا معاملہ تیرے سپرد

کر دیا اور اپنی پیٹھ تیری طرف لگادی تیری امید وبیم میں، تیرے علاوہ میری کوئی پناہ گاہ اور نجات دہندہ نہیں ہے، میں تیری اُتاری ہوئی کتاب پر اور فرستادہ نبی پر ایمان لایا"۔
حضرت براء فرماتے ہیں کہ میں نے اس انداز پر دعا پڑھی ، البتہ بنبیك کی جگہ ورسولك کہا، اس پر حضورؐ نے میرے سینے میں دھپ لگائی اور فرمایا بنبیك، جوان دعاؤں کے بعد سوئے گا اگر اسی رات میں مر گیا تو اس کی موت اسلام پر ہوگی۔

اس سلسلے میں مخالف وموافق دونوں ہی نے طویل مباحث چھیڑے ہیں۔ مگر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ روایت بالمعنیٰ اسی کے لیے جائز ہے جسے نقل معنیٰ کا محل ومقام اور دوسری رعایات کا علم ہو، جو اس سے ناواقف ہو اس کے لیے جائز نہیں۔ جن لوگوں نے روایت بالمعنیٰ کی اباحت کا فتویٰ دیا ہے انھوں نے علم کے ساتھ چند شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے۔ ماوردی نے لکھا ہے کہ اگر لفظ بھول گیا تو جائز ہے اس لیے کہ تحمل لفظ ومعنیٰ کے باوجود ان دونوں میں سے ایک کے ادا کرنے سے عاجز رہا، اس لیے دوسرے سے ادا کرنا بہتر ہے۔ اگر خدانخواستہ لفظ ومعنیٰ دونوں ہی کو چھوڑ دیا تو کتمان علم وحکم ہوگا۔ جس کو نسیان لفظ نہ ہو اسے معنیٰ کے استعمال میں احتیاط برتنی چاہئے۔ اس لیے کہ حضورؐ کے کلام میں فصاحت کا جو انداز ہے وہ دوسروں کے کلام میں نہیں ہے۔ سیوطی نے کہا ہے کہ یہ شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ حدیث ایسے الفاظ پر مشتمل نہ ہو جو عبادت کے لئے مخصوص ہوں..... اور میرے نزدیک روایت بالمعنیٰ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ حدیث جوامع الکلم میں نہ ہو۔

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ روایت بالمعنیٰ بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت تھی۔ بالخصوص صحابہ وتابعین کے ورع اور ان کی دقت نظر، روایت اخبار، ان کی یادداشت، حقیقت پسندی چھان بین روایت وسماع کے سلسلے میں جو تھی اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پھر یہ روایت بالمعنیٰ اگر خود صحابی سے ثابت ہو تو وہ رسولؐ خدا کے الفاظ سے قریب تر ہوگی۔ اس لیے کہ انہوں نے حضور کو خود دیکھا وہ ان کے شمائل وانداز کلام سے پوری طرح واقف تھے۔ پھر انہوں نے خود سنا، وہ درس گاہ نبوت کے فاضلین میں سے تھے۔ حضور کی

توجہ اور عنایت نے ان کے قلوب میں روشنی پیدا کر دی تھی۔ وہ فصاحت و بیان کے اعتبار سے مخصوص کردار کے مالک تھے۔ لغت عرب کو سب سے زیادہ سمجھنے والے، ان کے کلام میں کھوٹ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ دوسری قوموں اور تہذیبوں کے اختلاط سے ان کی زبان وادب میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔

مجھے اس پر شرح صدر ہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ نے جو کچھ روایت کیا ہے اس کا بیشتر حصہ روایت باللفظ ہے۔ اس لیے کہ صحابہ میں سے بعض حضورؐ کی احادیث کو آپ کی موجودگی میں لکھ لیتے تھے۔ بہت سے مجلس مذاکرہ مقرر کر کے جو کچھ حضور سے سنے ہوتے اس کی تکرار کرتے پھر ان مجلسوں میں ایک کی غلطی کو دوسرے صحابی کی تصحیح سے قوت مل جاتی۔ اگر خدانخواستہ کوئی بات رہ جاتی یا مشکل پڑ جاتی تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر کے دریافت کر لیتے۔ اور تابعین کے اکثر رواۃ صحابہ سے سنی روایتوں کو لکھ ہی لیا کرتے تھے اور اسے یاد کر لیتے۔ بعض تابعین خود بھی یاد کرتے، جب پوری طرح یاد ہو جاتی تب لکھا ہوا مٹا دیتے۔ بعض یاد بھی کر لیتے اور لکھی ہوئی کاپیاں، نوٹ بک کو بھی محفوظ رکھتے۔ بعض تابعین قرآن کی طرح احادیث کو روزنامچہ اور ڈائری میں لکھنے اور جمع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ تابعین و تبع تابعین میں جن کو لکھنے کی عادت نہ تھی وہ زبانی یاد کر لیتے، پھر اس کی تکرار کبھی کبھار کیا کرتے۔ اس شہر سے اس شہر آتے جاتے رہتے تاکہ صحابہ سے حدیث رسول کی سماعت کر لیں۔ ان کا سفر اس لیے بھی ہوتا کہ جو کچھ سن لیا ہے اس کی صحت کی تصدیق دوسرے صحابی سے مل کر کر لیں، اگر معنیٰ اور حرف ولفظ میں فرق ہے تو اسے درست کر لیں۔

ہماری اس بات پر کہ صحابہؓ نے اکثر حدیثیں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بیان کی ہیں، اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ خدائے پاک نے حدیث کے حاملین کو غیر معمولی حافظہ عنایت فرما دیا تھا، جب کہ اس غیر معمولی حافظہ کی ضرورت نے شریعت اسلامیہ کی حفاظت کا نظم ان کو غیر معمولی یادداشت عطا فرما کر کر دی تھی، خواہ وہ صحابہ کی جماعت ہو یا تابعین و تبع تابعین کا جرگہ۔ حضرت ابو ہریرہ کے غیر معمولی حافظہ کی کہانی

تاریخ میں محفوظ ہے۔ تاریخ کے علماء ان کے غیر معمولی حافظہ، ان کی قوت اخذ حدیث وحفظ حدیث دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس جو اپنے غیر معمولی حافظہ کے لیے مشہور زمانہ ہیں جو کسی بھی بات کو صرف ایک بار سن کر یاد کر لیتے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ آپ نے ابن ابی ربیعہ کے قصیدہ کے اسّی شعر ایک مرتبہ سن کر یاد کر لیا۔ اسی طرح صحابہ میں ایسے بھی تھے جنھوں نے قرآن کریم کو بالغ ہونے سے پہلے ہی یاد کر لیا تھا۔ جیسے حضرت زید بن ثابت جنھوں نے یہود کی زبان کو صرف ۱۷ دن کی مختصر مدت میں سیکھ لیا۔ انہی میں حضرت عائشہ ام المومنین ہیں جو حفظ وفطانت کی علامت تصور کی جاتی تھیں۔ ایسے ہی دیگر صحابۂ کرام بھی تھے۔

تابعین میں نافع مولی بن عمر نابغہء زمانہ تھے، جن کے حافظہ میں آئی ہوئی بات کبھی نکلتی ہی نہ تھی۔ ان سے یادداشت کے سلسلہ میں کوئی غلطی روایات میں منقول نہیں ہے۔ ان کی قوت حافظہ کے سلسلہ میں نقاد کا اجماع ہے، جیسے زہری جو اپنے زمانے کے بہترین حافظ حدیث ہیں۔ اسی طرح عامر شعبی جنھیں دیوان عصر کہا جاتا ہے، اسی طرح قتادہ بن دعامہ السدوسی جو اپنے نادرۂ روزگار حافظہ کے لیے پوری اسلامی دنیا میں ضرب المثل تھے۔

اختلاف الفاظ اور روایت بالمعنیٰ کی جو حدیثیں ہمارے سامنے ہیں اس میں سے اکثر احادیث وہ ہیں جن کا تعلق حضور علیہ السلام کے عمل سے ہے یا کسی واقعہ کے حکم کو پہنچانے سے متعلق ہے جس کو ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان میں سے اکثر یوں بیان کرتے ہیں: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كذا اور أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بكذا، معنیٰ ہر ایک کا ایک ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان روایات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں، اس لیے کہ یہ ایک طبعی امر ہے، صیغۂ ادا کے مختلف ہوتے ہوئے اسے مختلف نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ ہر راوی اپنے مشاہدہ کو اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ آپ کے جو الفاظ منقول ہوئے ہیں ان میں کسی کو کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں آتا۔ اسی طرح سے جو الفاظ عبادت وثواب کے لیے مستعمل ہیں ان میں

بھی کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ جیسے اذان، اقامت، دعا وتشہد کی روایات کہ ان میں اختلاف الفاظ شاذ ونادر ہی پایا جاتا ہے۔

روایت بالمعنیٰ کے سارے اختلافات الفاظ کے حامل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا تعلق حضور کی مختلف مجالس سے بھی ہے جو کثرت سے ہیں ان کا تعدد دنیا جانتی ہے، اس لیے ایک ہی موضوع مختلف مناسبتوں سے اختیار کیا گیا ہے۔ آپ نے مختلف مجلسوں میں مختلف سوال کرنے والوں کو ان کی فہم وادراک کے مطابق مختلف الفاظ میں جواب عنایت فرمائے، جو باوجود اختلاف الفاظ کے روایت بالمعنیٰ نہیں، اس لیے کہ کسی ایک ہی واقعہ کو مختلف لوگوں نے مختلف ڈھنگ سے پیش کیا۔

ان کے استفسار کے مطابق علی قدر الفہم آپ مختلف جواب عنایت فرماتے۔ یہ جواب اکثر باللفظ ہی ہیں اور امانت علمی کے حاملین رواۃ تھے۔ انھوں نے جوں کا توں نقل کر دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت بالمعنیٰ ہے۔ صحابہ سبھی یادداشت، وقت فہم، احتیاط میں تقریباً یکساں ہی تھے۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا، سنا، اسے پوری احتیاط کے ساتھ نقل کر کے امت کو پہنچا دیا۔ اگر کوئی بھول چوک ہوتی تو اسے بھی بیان کرتے وقت ذکر کر دیتے۔ صحابہ کا طریق ہمیشہ یہی رہا ہے کہ روایت میں نبی کریم کے الفاظ کا پورا پورا لحاظ رکھتے کہ سر مو فرق نہ آنے پائے۔

ان ساری باتوں کے ہوتے ہوئے بعض اہل ہوا مصنفین جن خطرات کا روایت بالمعنیٰ کے سلسلے میں ذکر کرتے ہیں ان کا کیا وزن رہ جاتا ہے۔ جو چیزیں تاریخ کے صفحات پر روز روشن کی طرح آچکی ہیں، ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش بے سود ہے۔ روایت بالمعنیٰ کو علماء کی ایک بڑی جماعت جسے جمہور علماء کہنا مناسب ہے مروج کر چکی ہے اور اس کی تصدیق صدر اول سے آج تک ہوتی رہی ہے، اس میں کیڑے نکالنا ایک بے وقت کی بانسری ہے۔ صدر اول میں بھی اس کی ضرورت کا احساس اس حد تک تھا کہ روایت کے فن کو ضرر سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ اس لیے اس موضوع پر گفتگو ہی ایک بے ضرورت مباحثہ ہے۔ اس سے ضیاع وقت کے علاوہ حدیث رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر افزائی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اب کسی

واہمہ اور تشکیک کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، اس لیے کہ صحاح حدیث کو مکتوب صورت میں ساری امت تسلیم کر چکی ہے، جو رسول خدا سے علمی انداز میں نہایت بہتر طریقہ سے نقل ہو چکی ہے۔ پھر نقل کرنے اور روایت کرنے والے بھی صحابہ کرام اور علمائے تابعین و تبع تابعین مشہود لھم بالخیر و العلم جیسے حضرات ہیں۔

أضواء علی السنة المحمدية میں ابوریہ نے ایک لمبی بحث کی ہے اور موضوع کو ایک تنگ دائرہ میں بند کر دیا ہے۔ اس نے بغیر علم کے ہی یہ کہہ دیا کہ حدیث کا اکثر حصہ رواۃ حدیث کے اپنے الفاظ میں ہے، اور روایت بالمعنیٰ کے مقاصد کو پہاڑ بنا کر دکھایا ہے۔ حالانکہ نہ واقعات اس کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، نہ تاریخ ہی پشت پناہی کرتی ہے۔ اور بعض وقتی ضرورت کے تحت پیش آنے والی حدیثوں کا ذکر کر کے روایت بالمعنیٰ کے جواز سے پیدا ہونے والے عواقب کا ذکر کیا ہے اور روایتِ حدیث بالمعنیٰ کو غیر الحدیث بالمعنیٰ پر قیاس کر لیا ہے۔ حالانکہ ہم نے پوری چھان بین رواۃ اور حدیث کے سلسلے میں کی اور ان حدیثوں کا مختلف طریقوں سے جائزہ لیا، ان کا مقابلہ و مناقشہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض احادیث روایت بالمعنیٰ کی آ گئی ہیں۔ جس سے کسی قسم کا خطرہ نہ دین کو لاحق ہوا، نہ مسلمانوں نے غفلت سے دوسری حدیثوں کو ضائع ہونے دیا۔

یہ صحیح ہے کہ روایت بالمعنیٰ سے بعض غلطیاں پیدا ہوئیں، مگر یہ غلطیاں علمائے امت کے لیے کسی خطرہ کا باعث نہیں بن سکیں، اس لیے کہ وہ حدیث کے دروبست سے واقف تھے۔ اس لیے اس سے تخویف اور بے معنیٰ ڈر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ناقدین نے روایت کے محفوظ رکھنے اور جانچنے کا پورا جتن کیا اور روایت کی چھوٹی بڑی غلطیوں کو بتلایا، اور احادیث کو مختلف طریقوں سے روایت کر کے اس میں پیدا ہونے والے تمام شکوک کا دفاع کیا۔ پھر اب کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ حدیث اور روایت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر سکے۔

ابوریہ نے عقلمندی یہ کی ہے کہ سابقین کی روایت کا اختلاف اور ان کے احوال ہی کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس بات کی بھی کوشش کی کہ الفاظ روایات میں اختلافات محض روایت بالمعنیٰ کی

وجہ سے پیدا ہوئے۔ پھر اس کے لیے شواہد روایات سے پیش کئے۔ اس طرح تشہد کے صیغوں کا ذکر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موضوع سے الگ ہو کر پھر "حدیث الاسلام و الایمان" یا "حدیث زوجتکها بما معك" وغیرہ حدیثیں نقل کر کے شہادت پیش کی، حالانکہ ان سب کے بارے میں علماء کے اقوال موجود ہیں۔

ابوریہ کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کی تردید عبدالرحمان بن یحیی یمانی نے کی ہے۔ ان کا ایک جملہ ہم بطور شہادت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

علامہ یمانی نے لکھا ہے کہ ابوریہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۶۰ پر صیغہ تشہد ذکر کیا اور اس کے اختلاف کا بیان کیا ہے۔ میرا کہنا ہے کہ ابوریہ کی سب سے بڑی چوک یہ ہے کہ اس نے سمجھ لیا کہ حضورؐ نے ایک ہی تشہد کی تعلیم عنایت فرمائی، مگر صحابہ کے بعض لوگوں کو یاد نہیں۔ پھر جو کچھ انہیں خود یاد تھا اس کی نسبت حضور کی طرف کر کے بیان کرنے لگے۔ حالانکہ یہ بات قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ تشہد کی تکرار فرائض و نوافل میں دن بھر میں دس سے زیادہ مرتبہ ہوتی ہے، اور حضورؐ کسی ایک کو اس وقت یاد کراتے کہ یاد ہو جائے۔ حضور خود کسی سورۃ کو ایک صحابی کو ایک قرأت اور دوسرے صحابی کو دوسری قرأت پر تعلیم فرماتے۔ اسی طرح آپؐ نے تشہد بھی مختلف صحابی کو مختلف انداز پر تعلیم فرمایا۔ حضرت عمر کا تشہد کا منبر پر ذکر کرنا اور تمام صحابہ کا سن کر خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمر نے جو تشہد بیان کیا وہ بھی صحیح ہے۔ حضرت عمر نماز اور غیر نماز میں قرآن پڑھتے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہ کرتا۔ حالانکہ دوسرے صحابہ کو قرآن کی تعلیم اس قرأت کے علاوہ پر بھی ہوتی تھی۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ یا بعض صحابہ ان الفاظ سے ناواقف رہے ہوں جن کا حضرت عمرؓ نے ذکر فرمایا۔ ان کو معلوم تھا کہ حضور علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو مختلف الفاظ میں تعلیم فرمائی ہے اور ایسے موقع پر عمر وہاں موجود ہوتے۔

اور آپ اس بحث کا ذکر اس طور پر ختم کریں جو ائمۂ لغات عربیہ نے بیان کئے ہیں کہ حضورؐ کے مختلف الفاظ کے بیان کرنے میں قواعد نحوی کے مختلف اصول کا اثبات مقصود تھا۔

عبدالقادر بغدادی مؤلف خزانۃ الادب نے کہا کہ حدیث نبوی سے استدلال کو ابن مالک نے جائز کہا ہے، ان کی تائید محقق رضی نے کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو اہل بیت کے کلام کو حجت گردانا ہے۔ ابن صائغ اور ابو حیان نے اسے پسند نہیں کیا۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) حضور سے سنی ہوئی ساری روایت باللفظ نہیں ہے، بالمعنیٰ بھی ہے۔

(۲) مصر کے قدیم علماء نحو نے ان کو حجت نہیں بنایا۔

پہلی بات تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ کہنا درست ہے کہ روایت بالمعنیٰ صدر اول میں تدوین حدیث سے پہلے تھی۔ اس وقت لغت میں بھی گڈمڈ نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ انہوں نے ایک لفظ کے بجائے دوسرا لفظ ذکر کر دیا، اس سے کیا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یقین غیر مشروط ہے، اس کے لیے ظن ہی کافی ہے۔ دوسرے کا جواب یہ ہے کہ اگر انہوں نے حدیث سے استدلال نہیں کیا تو اس سے صحت استدلال پر کیا حرف آتا ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ حدیث نبوی سے نحو کے علماء کا احتجاج مناسب ہے، بلکہ صحابہ اور تابعین کی روایت کے الفاظ کو بھی حجت بنانا جائز ہے، جیسا کہ ہم ابھی شارح رضی کا ذکر کر چکے ہیں۔

جو لوگ احادیث کو حجت لغت و نحو نہیں بناتے ان کے بارے میں دمامینی نے بہت عمدہ بات کہی ہے۔ اور حقیقت یوں ہے کہ دمامینی نے اس معاملہ میں بڑی نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے لغت کے اکثر معاملہ میں احادیث نبوی سے استدلال کیا ہے۔ ابو حیان کو البتہ اس پر اعتراض ہے کہ جو انداز احادیث سے استدلال کا اختیار کیا گیا ہے وہ سائنٹفک نہیں، اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ کی وجہ سے اس کو حضورؐ کا لفظ نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صورت میں جبکہ حضورؐ کے الفاظ نہ ہوں، لغت کے لیے حجت بنانا صحیح نہیں ہے۔ ہم نے اپنے دور کے بعض بڑے اہل علم لوگوں کے سامنے یہ بات رکھی، انھوں نے ابن مالک کے رائے کی تصویب کی کہ اس بات میں یقین مطلوب نہیں ہے بلکہ غلبۂ ظن مطلوب ہے، اسی پر احکام شرعیہ کا دارو مدار رہا ہے۔ اسی طرح مفردات الفاظ و قوانین اعراب پر توقف نہیں کیا جا سکتا، ان ساری صورتوں میں ظن غالب اصل ہے۔ اگر ظن غالب اس بات کا متقاضی

ہو جائے کہ قابل حجت منقول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے تو یہ کافی ہے۔ اس لیے کہ بنیادی بات اس میں تبدیلی کا نہ پایا جانا ہی ہے۔ جب کہ احادیث کے الفاظ یاد کرنے، اس کو عقل و ہوش کی روشنی میں قبول کرنے میں انتہائی احتیاط، احادیث بیان کرنے والوں اور اس کو نقل کرنے والوں میں رہی ہے۔ جو لوگ نقل بالمعنیٰ کے قائل ہیں، حقیقت میں وہ عقل کی روشنی میں اس کا جواز سوچتے ہیں، جس کے مخالف بات سامنے آنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ احادیث کے الفاظ کو عقل کی روشنی میں باور کرنے کو بہتر جانتے ہیں، گو وہ روایت بالمعنیٰ کے بھی قائل ہیں۔ اس سے اس حقیقت تک بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ روایات میں کوئی تغیر نہیں ہوا، تبدیل و تغیر کا احتمال بہت ہلکا ہو جاتا ہے، اس لیے قابل توجہ نہیں، اب ایسی صورت میں ان الفاظ سے استدلال میں کیا حرج لاحق ہو گا۔

نقل و روایت بالمعنیٰ کی ساری بحث اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ تدوین حدیث اور کتاب کے مراحل سے سنت رسول نہ گزری تھی۔ لیکن جب تدوین ہو گئی اور کتابوں میں ان کا اندراج ہو گیا تو اب تغیر و تبدل کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ چنانچہ روایت بالمعنیٰ کے بارے میں ابن الصلاح اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اختلاف اب قابل ذکر نہیں، اور نہ اب محدثین ہی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ جہاں تک یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ کتابوں میں مذکور ہونے کے بعد اب روایت بالمعنیٰ کی بات ایک بے ضرورت بات ہے۔ اس لیے کہ لکھے ہوئے الفاظ، چھپی ہوئی کتابوں میں ثبت ہیں، کسی کو ہمت نہیں کہ وہ ایک لفظ مٹا کر دوسرا لفظ اس کی جگہ لکھ دے۔

احادیث نبوی، روایات پیمبرؐ کی تدوین بلکہ مرویات پیمبر کی تدوین عربی لغت میں خارجی اثرات کے داخل ہونے سے بہت پہلے ہی ہو چکی، اس لیے تبدیل و تغیر کی بات کرنے والے اپنی بات کو کسی دلیل سے مدلل کریں تو خوب ہے۔ یہاں تو اب اس کا کوئی ثبوت ہی مشکل ہے۔ اگر بعد میں کوئی تغیر ہوا بھی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل تو جوں کا توں محفوظ ہے۔ اس لیے بعد کے لوگوں کا پہلے کے لوگوں پر اعتراض جڑنا کسی طرح قرین عقل نہیں۔

فصل ثانی

صحابہ وتابعین کے دور میں علمی جدوجہد

صحابہ نے تابعین کو حفاظت شریعت اور اس کو صحیح انداز میں لے کر چلنے کی ذمہ داری سپرد کردی تھی۔ انہوں نے شریعت اسلامی کے مصدر اول کی حفاظت میں بڑی تیزی سے پیش قدمی کی۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے حفاظ سے ضائع ہو جانے کا خطرہ مرتدین سے جنگ کے بعد پیدا ہوگیا تھا۔ اسی لیے صحابہ نے دور صدیقی میں قرآن کو ایک جگہ کتاب کی صورت میں جمع کرلیا۔ اور قرأت کے اختلاف کا خطرہ بھی ان کے سامنے تھا کہ مختلف ممالک و بلاد میں اگر قرآن کریم مختلف انداز سے پڑھا گیا تو اس سے بعد میں بہت سے اختلافات رونما ہوسکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دور عثمانی میں قرآن کی دیگر قرأت کو منسوخ کر کے صرف ایک ہی قرأت پر تمام ممالک اسلامیہ میں تقسیم کردیا اور تمام احکام میں وہ قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے، پھر سنت نبی کریم میں ڈھونڈتے۔ اگر قرآن وحدیث میں ان احکام کے ثبوت مل جاتے، تو اسے دل وجان سے قبول کرتے اور قرآن وحدیث کے مطابق بنا کر اطمینان کا سانس لیتے۔ گذشتہ ابواب میں ان کا طریق اجتہاد ہم بیان کر چکے ہیں۔

اب صحابہ کو سنت کی حفاظت کی فکر ہوئی۔ چنانچہ ابوبکر صدیق ؓ نے پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ نے اس کی حفاظت کا بصورت کتابت اہتمام کیا۔ کتابت سنت سے انہی حالات میں روکا جب کہ ضیاع قرآن کریم کا خطرہ پیدا ہوگیا، ورنہ دوسرے تمام حالات میں اس کی اجازت دے رکھی تھی۔ جیسا کہ تدوین سنت کے کالم کے تحت ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ چنانچہ صحابہ ہمہ تن حدیث کی حفاظت میں مشغول ہوئے۔ اس کی تعلیم واشاعت کا مکمل اہتمام کیا۔ اس کے بارے میں

دور افتادہ علاقوں کے لوگوں سے دریافت اور تبلیغ دونوں ہی کام لئے۔ حفاظ حدیث سے کھود کھود کر معلوم کرنا، ان کی یادداشت کی جانچ پڑتال کرتے رہنا، صحابہ کا من بھاتا مشغلہ ہوگیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی وفات رسول کے بعد جو حالت تھی اس کا عکرمہ کی زبانی حال سنئے۔

"لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلت لرجل من الأنصار: هلم فلنسأل أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانهم اليوم كثير قال و اعجباً لك يابن عباس أترى الناس يفتقرون اليك وفي الناس من أصحاب رسول اللہ من فيهم قال فترك ذلك، وأقلبت أنا أسأل أصحاب رسول اللہ عن الحديث، فانه كان يبلغني الحديث عن الرجل فأتي بابه وهوقائل، فأتوسَّدُ ردائي على بابه تسفي الريح عليّ من التراب فيخرج فيقول يابن عم رسول اللہ ماجاء بك؟ ألا أرسلت اليّ فآتيتك، فأقول أنا أحق أن آتيك فأسأله عن الحديث" (الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع۔ صفحہ ۲۳)

"حضور کی وفات کے بعد میں نے ایک انصاری شخص سے کہا کہ آؤ اصحاب رسول خدا سے مسائل حدیث دریافت کریں۔ ابھی ان کی تعداد کثیر موجود ہے، تو انہوں نے کہا ابن عباس کیسی عجیب بات کہہ رہے ہو، لوگوں کو نہیں دیکھتے کہ تمہارے محتاج ہیں، مسائل میں رجوع کرتے ہیں اور اصحاب رسول میں کون رہ گیا ہے، یہ سن کر یہ بات کرنی چھوڑ دی، پھر میں حدیث رسول کے بارے میں اصحاب رسول کی جانب متوجہ ہوا کہ حدیث دریافت کروں کہ مجھے وہ حدیث رسول بیان کریں۔ چنانچہ میں بعض صحابہ کے یہاں پہنچا، اتفاق سے وہ سوئے ہوتے میں دروازے پر چادر بچھا کر پڑ جاتا، ہوا میرے چہرے پر غبار اڑا رہی ہوتی، اتنے میں وہ صحابی نکلتے اور کہتے کہ رسول خدا کے چچازاد بھائی کیسے آنا ہوا، مجھے آپ نے کیوں نہ بلایا۔ کیوں زحمت کی، میں ان سے کہتا کہ میں جس کام کے لیے آیا ہوں، آنا ہی بہتر تھا۔ پھر ان سے حدیث دریافت کرتا"

رسول خدا کی احادیث کو معلوم کرنے، سننے کا اشتیاق صحابہ میں بے پناہ تھا۔ بات بھی ٹھیک

ہی ہے، ہر ایک اپنے محبوب کی گفتار، احکام اور فہمائش کو سننے کا مشتاق رہتا ہی ہے۔ مسلمانوں کو گمراہی سے نکالنے والی اور خیر کی طرف لے جانے والی چیز سے زیادہ کیا چیز محبوب ہو سکتی ہے؟ اس کے آثار کو باقی رکھنے، اسے زندہ کرنے کی کیوں نہ ان میں لگن موجود ہوگی؟ صحابہ تو مردانہ وار رسول خدا کی بات سننے کے لیے ان کی سیرت وحدیث معلوم کرنے کے لیے تیار ہوتے۔ آیئے دیکھئے ابوبکر صدیق کو جو براء کے والد عازب کے پاس اونٹنی کا کجاوہ خریدنے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ براء کو حکم کرو کہ وہ میری منزل تک لائے۔ اس پر عازب جواب دیتے ہیں یہ تو بعد کی بات ہے پہلے آپؓ اس کہانی کو دہرایئے جب آپ حضور کے ساتھ سفر ہجرت میں نکلے تھے۔ ابوبکر صدیق نے ہجرت کی پوری داستان سنائی پھر کہیں معاملہ ہوا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؓ کو ہی لے لیجئے، ان کی ملاقات کعب احبار سے ہوئی۔ کعب نے ان سے کہا کہ علی تم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جس میں نجات دینے والی چیزوں کا ذکر ہے سنا ہو تو بتاؤ۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ہلاک کرنے والی، گرفت میں لینے والی حدیث کو سنا ہے۔ اس پر کعبؓ نے کہا کہ حضور نے جن ہلاک کرنے والی چیزوں کا ذکر کیا ہے ان کا ذکر کیجئے تا کہ پھر میں نجات دلانے والی چیزوں کا ذکر کروں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ انسان کو ہلاک کرنے والی چیزیں، ترک سنت، شکست بیعت اور جماعت سے علاحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر کعب نے حضرت علی سے نجات دینے والی چیزوں کا ذکر کیا: زبان قابو میں رکھنا، گوشہ نشینی اختیار کرنا، اپنے گناہوں پر اشک ندامت بہانا۔

بعض صحابہ نے بعض دوسرے صحابہ سے آپؐ کی زندگی میں اور آپؐ کی وفات کے بعد کثرت سے روایت کرنا ہی اپنی زندگی بنا لیا تھا۔ مثلاً حضرت فاروق اعظمؓ نے صدیق اکبرؓ سے حدیث "لا نورث ما ترکناه صدقة" بیان فرمائی۔ یہ حدیث صحیح ہے، اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے علم میں ایک کلمہ ہے جسے بندہ دل کی گہرائیوں سے ادا کرے تو اس پر

جہنم حرام ہو جائے گی، وہ کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" ہے (مسلم نے بیان کیا)۔ اسی طرح حضرت ابوبکر نے حضرت بلال سے روایت فرمائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے بلال سویرے اٹھا کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عمر سے روایت کیا کہ آپ نے رجم فرمایا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اسی کے قبیل سے وہ روایت ہے جو بجالہ بن عبدہ نے بیان کیا کہ میں مقام مناذر میں جریر بن معاویہ کی جانب سے کاتب مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت عمر کا فرمان پہنچا کہ ان ہجر کے مجوس کی طرف توجہ کرو اور ان سے جزیہ لو، اس لیے کہ عبدالرحمٰن بن عوف سے مجھے روایت پہنچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس اہلِ ہجر سے جزیہ لیا تھا۔ اسی طرح حضرت عائشہ ابوبکر صدیقؓ سے روایت فرماتی ہیں اور حضرت ابوبکر حضرت عائشہ سے حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ ابن عمرؓ نے ابن عباسؓ سے روایتیں لی ہیں، اور ابن عباس نے ابن عمر سے روایتِ حدیث کی ہے۔ ابوسعید خدری سے جابر ابن عبداللہ نے روایت بیان کی۔ ابوسعید نے بھی جابر سے حدیثیں اخذ کی۔ حضرت انس نے جابر سے، جابر نے انس سے، اسی طرح ابن عباس نے جابر سے، جابر نے ابن عباس سے۔ جو صحابہ کا صحابہ سے احادیث کی روایت معلوم کرنا چاہے اسے چاہئے کہ احادیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کرے۔ اس سے صحابہ کی علمی کاوشوں پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے۔ جس کا مقصد بجز حفاظت سنت اور حق شناسی کے کچھ اور نہ تھا۔

صحابہ نے ایک دوسرے سے درس حدیث لینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کی جستجو اور یاد کرنے پر بھی تابعین کو ابھارا۔ تابعین سے اہل علم کی مجلسوں میں نشست و برخاست کرنے اور ان سے علم کی تحصیل کی فہمائش کی۔ اس کے لیے کوئی ایسی صورت جو امکان میں تھی نہیں چھوڑی، ہر طرح سے نشر و اشاعت کا کام لیا۔ اسی سلسلے میں حضرت عمر کا قول ہے کہ حدیث کو سمجھو عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے، مزید فرمایا کہ فرائض و سنت کا علم قرآن کے علم کی طرح حاصل کرو۔ حضرت ابوذرؓ اشاعتِ سنت، تبلیغ صداقت میں نادرۂ روزگار تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر تم تیغ براں میری گردن پر رکھ دو اور یہ چاہو کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے

ہوئے کلمات تم لوگوں کو نہ پہنچاؤں میری جان میں جب تک جان ہے مجھ سے یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہاری تلوار میری گردن سے پار ہونے تک سچائی کی تعلیم میں دیتا رہوں گا۔ ابوذر کوئی معمولی درجہ کے صحابی نہ تھے۔ ان ہزاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے سنت کی حفاظت میں حصہ لیا۔

ابو قلابہ بیان کرتے ہیں کہ ابن مسعود بیان فرماتے ہیں علم کے اٹھ جانے سے پہلے تم علم کو اپنا لو۔ قبض علم سے مراد حدیث میں اہل علم کا خاتمہ ہے۔ آپ بدعت سے پرہیز اور سنت کے اتباع کی ہدایت فرماتے۔ چنانچہ فرماتے، الاقتصاد فی السنة أفضل من الاجتهاد فی البدعة: (سنت میں میانہ روی کی راہ اختیار کرنا بدعت میں اجتہاد سے افضل ہے)۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملتے رہو اور احادیث کا مذاکرہ کرتے رہو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو علم کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

عمرو بن العاصؓ کو قریش کے ایک مخصوص علمی حلقے کا پتہ چلا تو آپ نے فرمایا کہ کیوں ان چھوٹوں کو تم نے الگ کر رکھا ہے؟ ایسا نہ کرو، مجلس میں ان کے لیے وسعت پیدا کرو، ان لڑکوں کو بھی حدیثیں سناؤ اور انہیں ان کے معنیٰ سمجھاؤ، یہ چھوٹے ممکن ہے بعد میں قوم کے سردار ہو جائیں، اس لیے کہ تم بھی پہلے ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں تھے آج معززین میں ہو۔ ابن عباس اپنے شاگردوں کو ابھارتے کہ حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو۔ فرماتے حدیث کی رٹ لگاؤ کہیں ضائع نہ ہو جائے، اس لیے کہ وہ قرآن جیسی چیز نہیں۔ قرآن جمع اور محفوظ ہے۔ اگر تم نے حدیث کا مذاکرہ نہیں کیا تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ ابھی کل تو یہ بیان کیا تھا، پھر آج اس کو کیا بیان کروں؟ بلکہ کل کی بیان کردہ چیز کو آج بھی بیان کرو، آنے والے کل میں بھی بیان کرو، جب ہم سے کوئی بات سنو تو اس کی رٹ لگاؤ۔

حضرت ابو سعید خدری طالبینِ علم کو پسند کرتے اور ان کے لیے مجالس میں جگہ دلاتے، اکرام کرتے اور اکثر فرماتے حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو کہ اس سے دوسری حدیثوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ابو امامہ باہلی نے اپنے شاگردوں کو خطاب کیا کہ یہ مجلسیں خدا کے پیام کی مجلسیں ہیں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پیام خدا نے دیا، انہوں نے ہم تک پہنچا دیا۔ اب تمھارے ذمہ ہے کہ ہم سے ان باتوں کو سن کر دوسروں تک اچھے انداز میں پہنچادو۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ شاگردوں سے حدیثیں بیان کرتے، جب خاموش ہو جاتے تو فرماتے کہ ان کو سمجھو، پھر انہیں اسی انداز میں پہنچادو جس طرح ہم نے تم تک پہنچادیا ہے۔

آپ نے صحابۂ کرام کا حدیث کو ایک دوسرے تک پہنچانا اور لینا دیکھ لیا، ان کے مذاکرات کی شان معلوم کرلی، وہ اپنے طالبین کو اس پر ابھارتے اور ان کو سنی ہوئی احادیث کو لوگوں تک پہنچانے کی فہمائش کرتے۔

تابعین و تبع تابعین بھی اس معاملہ میں صحابہ کے نقش قدم کے پیرو تھے۔ وہ بھی اپنی اولاد، اپنے تلامذہ کو سنت کی حفاظت کی وصیت فرماتے اور علمی مجلسوں میں شرکت اور آمد و رفت کی ہدایت دیتے۔ عروہ نے اپنے صاحبزادوں اور اپنے شاگردوں کو حفظ سنت کی ہدایت فرمائی۔ حضرت علقمہ اپنے طالبین کو مذاکرۂ سنت اور تعلیم سنت پر ابھارتے۔ عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کی یہ بات قابل ذکر ہے، وہ کہا کرتے کہ حدیث کا احیاء اس کا مذاکرہ ہے، اس لیے مذاکرہ کرتے رہو۔ اور علماء کی یہ بات تو مشہور زمانہ ہی ہے کہ حدیث کا مذاکرہ کرو، ایک حدیث کی یاد سے دوسری حدیث زندہ ہو جاتی ہے۔

اس سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو حفظ حدیث پر ابھارتے، ان کو انعام دیتے، ان کی توقیر لوگوں میں کی جاتی جب وہ حدیث کا کچھ حصہ یاد کرکے سنا دیتے۔ چنانچہ نضر بن حرث نے ابراہیم بن ادہم کو یہ کہتے سنا کہ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ بیٹا حدیث یاد کرو، اگر تم نے ایک حدیث کو سن کر اسے یاد کرلیا تو تمہیں فی حدیث ایک درہم انعام دوں گا۔ اس طرح میں نے حدیثیں یاد کرلیں۔

جب کسی خاندان کے بڑے یا مربی اپنے بچوں کے ساتھ یہ معاملہ کریں، ان میں حصولِ حدیث کی جوت جگائیں، تو پھر حفظ حدیث اور اس کی تعلیم کا سلسلہ کس طرح جاری نہ ہو سکے گا۔ جب کہ کوئی بچہ ابتداء اسی کو اپنی مراد سمجھ لے اور پھر حفظ حدیث کے اس مادی نفع کو وہ کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ مگر جب دھیرے دھیرے حدیث سے ربط پیدا ہو جائے گا

تو اس کی پیاس بجھانے کے لیے یہ مادی وسائل کافی نہ ہوں گے، بلکہ اب تو اس کی تسکین حصول حدیث ہی سے ہو سکے گی۔ اب تو اس کے سامنے اصلی جولانگاہ حدیث ہی ہو گی۔ اس لیے کہ اس کو اس کی قیمت کا اندازہ ہو چکا ہو گا، حدیث کی منفعت اس کے دلنشیں ہو چکی ہو گی۔ اس کی حقیقت سے آشنا ہونے اور تعلق عشق کی حد تک بڑھ جانے کے بعد اب اسے کسی انعام کی خواہش باقی نہیں رہ جائے گی۔ یہ انعام ہاتھ آئے تو کیا، نہ آئے تو کیا۔

چنانچہ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ طالبین علم تحصیل علوم حدیث کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے کہ ان کے شوق فراواں کا کوئی مقابل نہیں رہا، خود ان طالبین کو ذاتی طور پر تحصیل حدیث سے تعلق ان کی رغبت الی الحدیث کسی ظاہری نوازش، عنایت و عطا کی محتاج نہ تھی۔ بعض طالبین تو صرف ایک یاد حدیث کی تحصیل و سماع کے لیے اس خدمات کی ادائیگی سے بھی گریز نہ کرتے۔ طالبین حدیث میں رشک و منافست کا جذبہ اس دور میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ذکی اسی کو سمجھا جاتا جو کسی خاص باب میں احادیث کو یاد کر لیتا۔ مجد اس دور میں یہ تھا کہ کون کس صحابی سے مل کر، یا اس کی زندگی ہی میں حدیث اخذ کر لیتا ہے۔ اور کامران اسے سمجھا جاتا جو اپنے شیخ کی محبت پالیتا اور اس سے انفرادی طور پر سیکھنے کی سعادت حاصل کر لیتا، یا اس شیخ سے حدیثیں لکھ کر اس کے سامنے حدیث پڑھ کر اس سے اس کی سند و متن کی تصحیح کر لیتا۔

غرض محدثین میں سے ہر ایک حدیث کی تحصیل میں دل سے کوشاں تھا۔ علم حدیث کو خیر کامل سمجھتا۔ علم کے شائقین بڑھتے گئے۔ حدیث دلوں کی ٹھنڈک، نگاہوں کا سرور، ہوتی گئی۔ روح میں تازگی، سینوں میں روشنی آتی گئی۔ اس شوق میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کوئی صحابی حدیث بیان کرتا تو لوگوں کا مجمع اتنا بڑھتا کہ کمروں کی چھت پر بیٹھتا اور لوگوں کا جم غفیر اس سے حدیثیں سنتا۔ انس بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ واقعۂ جماجم سے پہلے میں کوفہ آیا تو وہاں چار ہزار آدمیوں کو طلب حدیث میں مشغول پایا۔ زاد کی روایت میں ہے کہ ان میں سے چار سو فقہائے حدیث تھے۔ چنانچہ پہلی صدی کی انتہائی دہائیوں میں کوفہ محدثین کا گڑھ ہو گیا۔ یہ علمی جدوجہد بھی ایک علاقہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ علم کے

حلقے ہر جگہ منعقد ہوتے۔ جامع دمشق میں ابو درداء کے حلقے تھے، جو ڈیڑھ ہزار سے زیادہ طالبین پر مشتمل تھے۔ ابو درداء کے علاوہ دوسرے مشائخ دمشق کی درس گاہیں اس کے سوا تھیں۔ ان درسگاہوں میں طالبینِ حدیث آتے اور حدیثیں لکھتے۔ اسی طرح یہ درسگاہیں حمص، حلب اور فسطاط، بصرہ، کوفہ، یمن میں بھی پھیلی ہوئی تھیں اور مرکزی جامعات مکہ و مدینہ میں الگ تھیں۔ مدینہ تو گلشن علم و ہنر ہی تھا، طالب جو چاہتا لیتا، جس پھول کو چاہتا چنتا۔

عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مسجد حرام طالبین علم سے بھری رہتی کہ خود خلیفہ کو دیکھ کر اچنبھا ہوا، اس لیے کہ مسجد حرام میں بے شمار حلقۂ علم دیکھنے میں آتے، جس میں مسلمانوں کے بچے، طالبانِ علم موجود ہوتے۔ ان حلقوں کے شیوخ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عطاء، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، مکحول، مجاہد جیسے گرامی اساتذہ موجود ہیں۔ انہوں نے قریش کے بچوں کو علم کی طلب اور حفاظت پر ابھارا۔

اسلامی سلطنت میں مراکز علمی کی سرگرمیاں اس وقت کھل کر سامنے آ جائیں گی جب ہم عہد صحابہ و تابعین میں علمی چرچوں پر گفتگو کریں گے۔

اس امت کی خوش قسمتی ہے کہ خدا نے اس کی قسمت میں وہ اساتذہ مقدر فرمائے جو علم و ادب اور اصول تربیت کے ستون تھے۔ جنہوں نے خدا کے رسول علیہ السلام کی تربیت میں خود کو پروان چڑھایا تھا، یا ان کے صحابۂ کرام کے زیر پرورش رہے۔ اس زمانہ میں تعلیم کی خدمت جن کے سپرد تھی انھوں نے اپنے شاگردوں کی تعلیم میں، ان کو بڑھانے میں پوری پوری سعی فرمائی اور نئی پود کو پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ چنانچہ اب اسماعیل بن رجاء ہی کو دیکھ لیں جو اعمش کے معاصرین میں ہیں۔ ابھرتے بچوں کو جمع کر کے حدیثیں بیان کرتے۔ اعمش کے پاس سے ایک شخص کا گزر ہوا، اس وقت اعمش حدیث بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، کمسنوں میں حدیث بیان کرتے ہو؟ اعمش نے کہا کہ یہی کمسن تو دین کے محافظ ہوں گے۔ مطرف بن عبداللہ نے طلبۂ حدیث کو مخاطب کیا کہ تمہاری صحبت مجھے اپنے اہل و عیال کی صحبت سے زیادہ عزیز ہے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر طالبین

حدیث نہ آتے تو میں خود ان کے گھر پہنچ کر انھیں سکھاتا، حدیث بھی اور ادب بھی اور ان علوم کا احترام وجلالت شان ذہن نشین کراتا۔ علمی حلقوں کی بڑی قدر تھی، طالبین حدیث اپنے اساتذہ کا احترام کرتے، ان کی خدمت کرنے کو عزت جانتے، ان سے کوئی بات معلوم کرکے اپنی آبرو بڑھاتے۔ اساتذہ کا ہر مرحلہ میں وقار کیا جاتا، حصول علم کے وقت بھی اور مناقشہ ومباحثہ کے دوران بھی۔ صحابہ وتابعین کے نصائح اپنے شاگردوں کے نام آج تک مکتوب ہیں۔

علمی حلقے، شیوخ علم، طریق تعلیم لمبی بحثوں کا محتاج ہے بلکہ مستقل بالذات بحث ہے اور اس پر اتنے مواد ہیں کہ پوری کتاب تیار ہو جائے جس کا اس مختصر کتاب میں ذکر مشکل ہے۔ ہم مختصر طور سے صحابہ اور تابعین کا طریق تعلیم پیش کریں گے۔

اس سلسلہ میں قابل توجہ امروہ وسیع حدبندیاں ہیں جو فی زمانا تربیت کے میدان میں اہم بنیاد تصور کی جاتی ہیں، حسب ذیل ان بنیادوں میں سے ہیں:-

(۱) طالبین حدیث کے احوال کی رعایت:

صحابہ اور تابعین طالبین حدیث کے ظروف طلب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے، چنانچہ صرف وہی حدیثیں بیان کرتے جو طالبین کے فہم سے قریب تر ہوتیں۔ وہ حدیث کی وضاحت فرماتے اور مناسبات حدیث کو بیان کرتے تاکہ طالبین حدیث جو کچھ اپنے شیوخ سے سنیں پوری طرح اخذ وادراک کرسکیں۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ بسا اوقات کوئی شخص حدیث بیان کرتا ہے، سننے والے سنتے ہیں مگر ان کی عقل کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ نتیجتاً وہ حدیث ان کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے آپ کی یہ بات یوں منقول ہے کہ تم کسی قوم میں ایسی حدیث بیان کررہے ہوتے ہو جو ان کے عقل کے معیار سے بلند تر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ فتنہ ہوتا ہے۔ حماد بن زید نے بیان کیا کہ ایوب فرماتے ہیں کہ لوگوں سے وہ حدیثیں نہ بیان کرو جو ان کے مبلغ علم سے بلند ہوں کہ ان سے ان کو ضرر پہنچے گا۔

(۲) حدیث کی اہلیت رکھنے والے کے لیے حدیث:

راویوں کا لحاظ و خیال جس طرح صحابہ و تابعین کا معمول تھا اس کے باوجود وہ حدیث کی اشاعت ایسوں میں کرتے جو اس کے اہل ہوتے، یا جویائے حدیث ہوتے۔ مگر اسے اناڑی، ناوانوں، ہوا پرستوں سے نہیں کہتے تھے۔ ان کی ساری جدوجہد اس پر ہوتی کہ ان کی مجلس میں طالبین علم کے سوا دوسرے لوگ شریک نہ ہوں۔ چنانچہ زہری کہتے ہیں کہ نا اہل لوگوں میں حدیث پھیلانے کو میں معیوب سمجھتا ہوں۔ اعمش جن کو حدیث کی سمجھ نہ ہوتی ان میں حدیث بیان کرنا حدیث کو ضائع ہونا سمجھتے تھے۔ بہتوں کو یہ کہتے سنا کہ سور کی خوابگاہ میں موتی نہ بکھیرو، یعنی حدیث غیر اہل میں بیان نہ کرو۔ حتیٰ کہ ایسا کرنے والوں پر نکیر کی جاتی۔ چنانچہ اعمش نے شعبہ بن حجاج کو ایک قوم میں حدیث بیان کرتے دیکھ کر فرمایا، شعبہ تمہیں کیا ہو گیا ہے موتی کے ہار سور کی گردن میں ڈال رہے ہو۔ مجاہد بن سعید بیان کرتے ہیں کہ شعبی نے مجھ سے حدیث بیان کی۔ میں نے اس حدیث کو ایک جماعت کے سامنے بیان کیا وہ جماعت شعبہ کے پاس پہنچی اور اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا۔ شعبہ نے صاف انکار کر دیا۔ پھر میں خود یہ بن کران کے پاس گیا کہ کیا آپ نے وہ حدیث مجھ سے نہیں بیان کی؟ شعبہ نے کہا کہ میں تم سے دانشمندوں کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اسے اناڑیوں میں بیان کر دیتے ہو۔ پھر فرمایا کہ علم حدیث اس کے لیے ہے جو متقی ہو اور باعقل و ہوش ہو، اگر عقل و ہوش ہو اور تقویٰ ندارد تو اس سے کہہ دیا جائے کہ آپ کے بوتے کی یہ چیز نہیں ہے، اور اگر متقی ہو مگر عقل نہ ہو تو اس سے کہہ دو کہ یہ دانش وروں کے لیے ہے۔

یہ بیان ہم زائدہ ابن قدامہ کے بعض احتیاطات کے ذکر پر ختم کرتے ہیں۔ جب ان کے پاس کوئی طالب حدیث آتا اور وہ خواہش مند ہوتا اور سنت کی حفاظت کا پکا وعدہ کرتا تو اس سے بیان کر دیتے۔ عمرو بن مہلب ازدی بیان کرتے ہیں کہ زائدہ بن قدامہ اس وقت تک حدیث بیان نہ کرتے جب تک کہ طالب کو پوری طرح جانچ نہ لیتے۔ اگر طالب حدیث اجنبی ہوتا تو یوں پوچھتے، کہاں کے رہنے والے ہو؟ اگر شہری کا ہوتا تو پوچھتے کہ کس مسجد کے نمازی ہو؟ غرض جگوں

کی طرح پوری طرح جرح کرتے۔ اگر وہ بدعتی ہوتا تو فرماتے کہ آپ کرم فرما کر اس مجلس میں تشریف نہ لائیں۔ اگر کسی میں آثار خیر دیکھتے تو قریب کرتے اور حدیث بیان فرماتے۔ لوگوں نے کہا ابو الصلت ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو فرماتے، میں ایسے نادانوں میں علم حدیث بیان کرنا برا جانتا ہوں کہ کہیں بعد میں پیشوا بن جائیں اور اس میں تبدیلیاں کر کے من مانی بیان کرنے لگیں۔

بہت ممکن ہے اس تشدد کو کوئی نشر علم کے لیے بخل سمجھے اور مرشدین و معلمین کے لیے ہدایت کاروں کے طریقے کے خلاف جانے، مگر حقیقت وہی ہے کہ اصل مقصد سنت کی حفاظت تھا، اور اہل ہوا و اہل بدعت کے لیے رکاوٹ پیدا کرنا تھا جو حدیث میں ملاوٹ کر ہی گزرتے ہیں یا اسے بالکل ہی بدل کر تحریف کر دیتے ہیں۔

(۳) حدیث کا علم قرآن کے بعد:

یہ بات روز روشن کی طرح ہے کہ مسلمانوں پر کتاب اللہ کے حفظ، اس کی تعلیم، اس کی تلاوت، اس کی فہم، اس کی تفسیر کا مذاق عام تھا۔ اس کے لیے وہ پورا اہتمام کرتے اور محدثین خود اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی شخص اسی وقت علم حدیث حاصل کرے جب کہ وہ قرآن کے حفظ و قرأت سے فارغ ہو گیا ہو، خواہ مکمل قرآن یا اس کا اکثر حصہ اس کے سامنے ہو۔ پھر وہ سماع حدیث و کتابت حدیث کا مجاز ہے۔ چنانچہ محدثین کی عام روش یہی تھی کہ وہ اس وقت تک طالبین کو اپنے حلقۂ درس میں شریک نہ ہونے دیتے جب تک کہ قرآن کریم کے تعلیم کی توثیق نہ ہو جاتی۔ اس کا حفظ کم از کم ضروری تھا، خواہ وہ قرآن کا تھوڑا ہی حصہ کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حفص بن غیاث اعمش کی خدمت میں آئے اور ان سے حدیث بیان کرنے کے لیے کہا، آپ نے دریافت کیا کہ تم نے قرآن حفظ کر لیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا جاؤ حفظ قرآن کرنے کے بعد آنا، پھر میں تم کو حدیثیں سناؤں گا۔ چنانچہ وہ واپس آئے اور قرآن یاد کرنے کے بعد حاضر ہوئے، انہوں نے ان سے قرآن سنا پھر حدیثیں بیان کیں۔

(۴) منکر احادیث سے اجتناب:

صحابہ اور تابعین غلط سلط کمزور حدیثیں عام کرنے سے ڈرتے تھے چنانچہ ایسی احادیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حدیثوں کے سلسلے میں چھان بین، حق شناسی ان کا شعار تھا، مشہور و معلوم حدیثوں کے بیان کرنے ہی پر ابھارتے۔ خصوصیت سے نئے تلامذہ میں اس کی بڑی شدومد سے نگرانی رکھتے۔ اسی سلسلے کی وہ بات ہے جو حضرت علی سے منقول ہے ''لوگوں سے معروف حدیثیں بیان کرو اور منکر کا بیان بالکل روک دو، کیا تم کو خدا اور رسول کا جھٹلانا پسند ہے''۔ ذہبی کہتے ہیں کہ حضرت علی منکر حدیث کے بیان کرنے پر ڈانٹ پلاتے اور مشہور حدیثوں کو بیان کرنا ہی سکھاتے۔ حضرت علی کا یہ قول واہی تباہی باتوں کے پھیلاؤ کو روکنے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ فضائل، عقائد، اور زہد میں جو احادیث منکر اشاعت پذیر ہوگئی ہیں ان پر روک لگاتے اور یہ اسی وقت معلوم ہو سکتی ہیں جب تک کہ رجال پر گہری نظر نہ ہو۔

منکرات حدیث، شواذ حدیث اور ان کے طرق اور احادیث موضوعہ کو شیوخ نوکِ زباں رکھتے۔ ان میں سے جونہی کوئی حدیث ان کے سامنے آتی اس کی حقیقت کھول کر رکھ دیتے۔ اس کے علل کا واضح بیان شاگردوں کے سامنے رکھتے جب کہ طلبہ اپنی تعلیم کا اچھا خاصا مرحلہ طے کر لیتے۔ آئندہ ہم موضوع احادیث کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

(۵) دفع ملل کے لیے نوع بہ نوع موضوعات:

صحابہ اور تابعین اپنے تلامذہ کے نشاط طبع کا پورا لحاظ رکھتے، ان کی طبیعت کو اکتانے نہ دیتے۔ اس کے لیے طرح طرح کے انداز اختیار کرتے تاکہ مقصد کی تحصیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ کبھی احادیث مختلفہ کا بیان کرتے۔ گاہے رجال پر گفتگو کرنے لگتے، کبھی سیرتِ رسول کے مختلف گوشوں کا بیان کرتے، کہیں احادیث کے مناسبات کا ذکر کرتے۔ اس طرح درس حدیث طلبۂ حدیث کے لیے من بھاتی چیز بن جاتی۔ طالبین کو موضوعات حدیث کے تعدد کی

وجہ سے بڑی دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا، اس لیے کہ حدیث میں وہ ساری ہی چیزیں ملتیں جو ان کے دین اور دنیا دونوں ہی کے لیے نافع ہوتی۔ پھر بھی شیوخ اس خطرہ کا احساس رکھتے کہ ان طلبہ میں اکتاہٹ نہ پھیل جائے۔ اس لیے ان کو تنہائی میں بلا کر پند و نصیحت کرتے، جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ تھا۔ اسی کو صحابہ نے بھی اختیار کیا اور ام المومنین حضرت عائشہ تابعین کو وصیت فرماتیں۔ چنانچہ عبید بن عمیر سے سیدہ عائشہ نے فرمایا کہ لوگوں کو رنجیدہ خاطر کرنے سے اور انہیں مایوسی کا شکار ہونے سے بچاتے رہو۔ اس لیے وہ ان کو بہت دیر تک مجلس میں نہ رہنے دیتے، تاکہ افادیت ختم یا مختصر نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے امام زہری کا قول ہے کہ جب مجلس بہت لمبی ہو جاتی ہے تو شیطان اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کوئی مجلس میں قرآن اور اس کی تفسیر کے بعد باتیں کرنے لگے تو ذائقہ بدل لیا کرو۔ یعنی شعر و ادب کی باتیں بھی کرتے رہو۔ ابو درداء صحابی فرماتے ہیں کہ میں اپنے کو لہو و لعب سے بہلاتا ہوں تاکہ میرے اندر حق کے لیے قوت پیدا ہو جائے۔

چنانچہ صحابہ بھی، کبھی اپنی مجلسوں میں شعر گوئی، جاہلیت کی کہانیاں بیان کرتے تاکہ دل میں نشاط پیدا ہو جائے۔ اس طرح موضوع بدل جانے سے طبیعت میں تازگی آ جاتی ہے۔ چنانچہ ابو خالد فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ کی مجلسوں میں ہوتے تو وہاں شعر خوانی ہوتی اور جاہلیت کی کہانیاں سنائی جاتیں۔ چنانچہ زہری حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے، ارے بھائی کچھ سنو سناؤ کہ کان کا بھی حق ہے اور جی ذائقہ بدلنا چاہتا ہے، کبھی آپ فرماتے تھوڑی دیر کے لیے دل کو تازگی بخشا کرو۔

(٦) توقیر حدیث و احترام کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم:

سنت کے سلسلہ میں صحابہ و تابعین کی شان تمسک کا ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ صحابہ سنت کو قرآن کے بعد سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے، سنت کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو خواہ وہ رائے کتنی ہی اہم ہو اس کو بیان نہ کرتے، کتنی ہی عظیم شخصیت ہو کوئی مقام نہ دیتے، تمسک بالسنہ کے ساتھ ان مجالس کا وقار بھی ملحوظ رکھتے جس میں احادیث بیان

کی جاتیں۔ حدیث کے حفاظ کا احترام اور حدیثِ رسول کے طالبین وشیوخ ہر ایک کا احترام غیر معمولی طور سے کرتے۔

اعمش ضرار بن مرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ رسولِ خدا کی حدیث بلا وضو کے بیان کرنا ناپسند کرتے۔ اعمش کبھی حدیث بیان کرتے وقت بے وضو ہوتے تو تیمّم پر اکتفا کرتے۔ قتادہ فرماتے کہ حدیث رسول کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے وقت باوضو رہنا چاہیے، اس قسم کی بات بہت سے علماء سے مروی ہے۔

سعید بن المسیب بستر مرگ پر تھے، ان کو ایک حدیث بیان کرنی تھی تو آپ نے کہا کہ مجھے بٹھادو کہ میں لیٹا ہوا حدیث رسولؐ بیان کرنا بے ادبی شمار کرتا ہوں۔

رامہرمزی کا بیان ہے کہ اکثر محدثین نہایت درجہ پاک وصاف ہوکر مجلس میں حدیث بیان کرنے کے لیے مسند حدیث پر بیٹھتے۔ بیٹھنے کے وقت وہ عمدہ کپڑے پہنتے، وضو کرتے، گویا نماز پڑھنے والے ہیں۔ ابو العالیہ نے اس سلسلے میں خوب کہا ہے کہ جب حدیث رسول بیان کرو تو شان وشوکت کا اظہار کرو۔ امام مالک بھی حدیث بیان کرنے سے پہلے وضو کرتے، عمدہ کپڑے پہنتے، سر پر قلنسوہ پہنتے، داڑھی میں کنگھی کرتے۔ کسی نے اعتراض کیا تو فرمایا کہ حدیث رسول کی توقیر کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی جب اِدھر اُدھر سے آئے ہوئے لوگ ہوتے اور گھر میں گنجائش نہیں ہوتی تو ایک شخص اعلان کرتا کہ اہلِ حجاز گھر میں آجائیں، دوسرے لوگ باہر ہی رہیں۔ جب وہ لوگ رخصت ہوجاتے پھر منادی اہل شام کو داخل ہونے کا اعلان کرتا۔ اس طرح سے طالبین کی کثرت نہ ہونے دیتے کہ اس سے سوال کرنے والے زیادہ ہوجاتے اور مقصد ہی فوت ہوجاتا، باتوں میں حدیث کا وقار ہی باقی نہ رہتا۔

اس طرح اور بھی آداب برتے جاتے۔ سوال وقرأت حدیث کے اصول وقواعد مقرر تھے کہ کس طرح محدثین سے طلبۂ حدیث پیش آئیں۔ اس طرح مجلس میں بیٹھنے اور حلقۂ درس میں حاضری کا مختلف اصول برتا جاتا تاکہ حدیث کی بے وقاری کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

(۷) مذاکرۂ حدیث:

طالبین علم صرف مجالس کی حاضری پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ وہ احادیث کا مذاکرہ کرتے، ایک دوسرے کو سنتے سناتے پھر آنے والے مجلس میں حاضر ہوتے۔ ایسا نہیں تھا کہ سنا اور واپس آ گئے۔ حلقات درس میں حاضری وقت گزاری کے لیے نہ تھی کہ خالی وقتوں میں حاضر ہو جاتے۔ طالب جب چاہے جیسا چاہے، چلا جائے ایسا نہیں تھا بلکہ طالبین حدیث اوقات معینہ پر آتے۔ ان کے لیے متعین وقت نماز فجر کے بعد سے چاشت کے وقت تک تھا، یا ظہر و عصر کے مابین۔ درس شروع ہونے سے بہت پہلے ہی لوگ حلقۂ درس میں بیٹھتے جاتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نشست پر دوسرا آ جائے۔ جب استاذ مجلس درس میں آتا تو طلباء اپنی استعداد کے مطابق اس سے سبق لیتے۔ اگر کوئی طالب اتفاقاً غائب ہوتا تو استاذ غیر حاضری کا سبب معلوم کرتا اور تلامذہ میں سے کسی ایک کو اس کے حالات دریافت کرنے کے لیے متعین کر دیتا۔ اس زمانے کے درس کے حلقے آج کے درس نظامی کے حلقۂ درس کی طرح ہی ہوتے تھے۔

اس لیے طالبین حدیث اپنی مجلسوں میں آتے اور سنی ہوئی حدیثیں یاد کرتے۔ ان کا مذاکرہ و تکرار جاری رکھتے۔ صحابہ کا انداز بھی یہی تھا، عہد نبوی میں وہ بھی یہی کرتے تھے۔ حضرت انس بیان فرماتے ہیں کہ ہم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے، آپؐ سے حدیث سنتے، جب آپ کی خدمت سے الگ ہوتے تو آپس میں مذاکرہ و تکرار کرتے، تا آنکہ ہم آپ کی فرمائی ہوئی باتوں کو یاد کر لیتے۔

تابعین و تبع تابعین بھی مذاکرۂ حدیث کرتے۔ کبھی یہ تکرار اجتماعی ہوتی، کبھی انفرادی۔ ابوصالح سمان کہتے ہیں کہ ابن عباس نے ہم سے حدیث بیان کی مگر یاد نہ رہی، پھر ہم نے مذاکرہ کیا تا آنکہ یاد آ گئی۔ عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس ہوتے وہ ہم سے حدیث بیان کرتے۔ جب وہاں سے نکلتے مذاکرہ کرتے۔ اسی طرح مسلم البُطین کہتے ہیں کہ میں نے ابویحییٰ اعرج کو دیکھا جو ابن عباس کی حدیثوں کے عالم تھے۔ وہ اور سعید بن جبیر مسجد کوفہ میں اکٹھا بیٹھ کر حدیث ابن عباس کی تکرار

کرتے۔ عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ حدیثوں کی بقا ان کی تکرار ہے، چنانچہ تکرار کرتے رہو۔ عبداللہ بن شداد فرماتے خدا رحم فرمائے تم پر کہ میرے سینے سے غائب شدہ حدیثوں کو تم نے زندہ کر دیا۔ کبھی یہ مذاکرہ عشاء سے نماز صبح تک جاری رہتا۔ بہت سے طالبین حدیث رات گزرنے کا انتظار کرتے تاکہ اپنے بھائیوں سے ملاقات کر کے تکرار حدیث کریں۔ ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ میں رات گئے اپنے ساتھیوں کا مذاکرہ کے لیے انتظار کرتا۔ شعبہ بن حجاج سے روایت ہے کہ وہ عبداللہ بن عون کے پاس سے نکلے، مٹھی بندھی ہوئی تھی۔ کسی نے ان سے خطاب کیا، کہنے لگے ابھی گفتگو نہ کرو، ابن عون سے دس حدیثیں سن کر آرہا ہوں اس کے بھول جانے کا خطرہ ہے، اس لیے یاد کرلوں تو بات کرو۔ اسی طرح محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاکرہ کرتے، تاآنکہ یہ حدیثیں سینوں میں پیوست ہو جاتیں۔

بعض نے حدیث کو بیان کرنا اپنی یادداشت کا علاج بنا لیا تھا۔ اگر کوئی نہ ملتا تو اپنے نوکروں یا اپنے بچوں کو ہی سنا کر یاد کرتے۔ چنانچہ زہری کہتے ہیں کہ عروہ عبداللہ بن زبیر سے احادیث کی تعلیم لیتے۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر آتے، اپنی نوکرانی کو جگاتے اور اسے حدیثیں سناتے۔ وہ کہتی کہ اس سے میرا کیا سروکار؟ فرماتے میں جانتا ہوں کہ تم کو اس سے کوئی نفع نہ ہوگا، مگر میں نے ابھی یہ حدیث سنی ہے، اس کی تکرار کر کے یاد کرنا چاہتا تھا۔ اسماعیل بن رجاء کے بارے میں بھی آتا ہے کہ وہ تکرار کرنے کے لیے جب کسی کو نہ پاتے تو مکتب کے بچوں کو اکٹھا کر کے انہی سے بیان کرتے کہ بھول نہ جائیں۔

محدثین، مجلس مذاکرہ اور مجلس مناظرہ قائم کرتے تاکہ طرق حدیث واضح ہو جائیں اور قوی وضعیف حدیثیں معلوم ہو جائیں۔ یزید بن ہارون بیان کرتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ تمام مشائخ سے حدیثیں لیتے ہیں، خواہ وہ قوی ہوں یا ضعیف، پھر جب مناظرہ ہوتا تو حدیثیں چھن کر صاف ہو جاتیں۔

مذکورہ بالا سطور سے صحابہ، تابعین، تبع تابعین کا شغف سنت نبوی کے ساتھ معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے۔ ان کی تربیت واصلاح

کے کس طرح دلدادہ تھے۔ وہ سنتِ رسول کے کیسے جاں نثار تھے اور حدیث کا کتنا وقار ان کے دلوں میں تھا۔ ان کا شغف حدیث کس پیمانہ پر تھا۔ علمائے حدیث کا کس درجہ احترام ان کے دلوں میں تھا، اور طالبین کس درجہ سنت کی تحصیل، حفاظت، تکرار، حقیقت جوئی میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں عمل بالحدیث کا کتنا گرامی جذبہ تھا۔ ان ساری باتوں سے ہم کو اس زمانہ میں اس زندگی اور اس لگن کا اندازہ ہوتا ہے جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں موجود تھی۔ یہ ساری چیزیں کچھ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں بلکہ تاریخی حقائق ہیں جو کتابوں میں تحریر ہیں۔

ہم نے یہ ساری باتیں مختصر طور سے بیان کی ہیں، تفصیلات کی طرف ہم نے قلم نہیں اٹھایا۔ اس لیے کہ وہ مجلدات کا طلب گار ہے۔ غرض اس مختصر سے بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حدیث نبوی کے ساتھ ان کا تعلق، لگاؤ، توجہ کس درجہ تھی جو اس زمانے کے محدثین و طالبین حدیث کی مساعی و اہتمام کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ انہی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے حدیث کے دفتر موجود ہیں۔

دورِ صحابہ و تابعین میں اشاعتِ حدیث

جب حضور کا وصال ہوا، اس وقت پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل چکا تھا۔ یہ علاقے اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بن چکے تھے، بلکہ منارۂ علم و ہدایت تھے، یہاں سے علم و ہدایت کی روشنی ہر طرف پھیل رہی تھی، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح شام کے لیے وفات سے پہلے جیش اسامہ کو ترتیب دیا تھا۔ مگر موت نے اس کی روانگی سے پہلے ہی آلیا۔ آپ کے نائب حضرت ابوبکر صدیق ہوئے۔ آپ نے جیش اسامہ کو شام روانہ فرمایا۔ فتوحات اسلامیہ کی وسعت ہمہ گیر ہوتی گئی، اسلامی سلطنت جزیرۃ العرب کے چاروں جانب پھیل گئی، چنانچہ ۱۷ھ میں بلاد شام (فلسطین، اردن، سوریا، لبنان) اور عراق سارا کا سارا فتح ہو گیا۔ ہجرت کے بیسویں سال مصر بھی فتح ہو گیا اور دورِ خلافت عثمانی میں مسلمان ماوراء النہر تک بڑھ گئے، انھوں نے ایران کو بھی فتح کر لیا، یہ ہجرت کا اکیسواں سال تھا۔ اور

۵۶ھ میں سمرقند تک پہنچ گئے اور صدی کے اختتام تک اسپین پر بھی اسلامی سلطنت کا جھنڈا لہرانے لگے۔ اسلامی لشکر اس کے جھنڈے برانس کی پہاڑیوں پر لہرانے لگے یہ ۹۶ھ تھا، اس سال خلافت اسلامیہ کی وسعت مشرق میں حدود چین تک پھیل گئی۔

اس فوج کے ہراول صحابۂ کرام تھے۔ وہ جہاں بھی پہنچے انھوں نے فتح کے بعد وہاں مسجدیں تعمیر کیں، جہاں صحابہ اور تابعین ٹھیر کر مسلمانوں کے معاملات کو سدھارتے اور اشاعت اسلام فرماتے، ان کی نئی نسل کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے، سنت رسول سے آشنا کرتے۔ خلفائے اسلام ان نئے ملکوں میں علماء کی کھیپ روانہ کرتے، چنانچہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت ان علاقوں میں بس گئی جو یہاں کے رہنے والوں کی ہدایت کرتے اور ان کے بچوں کو تعلیم دیتے۔ لوگ اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتے۔ صحابۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش جمع ہو کر ایسی جوئے بار سے سیراب ہوتے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں جاری ہوئی تھی۔ انہی صحابہ کے حلقۂ درس سے فارغ ہو کر تابعین نے علم و معرفت کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لیا اور سنت نبوی کی حفاظت فرمائی۔ اس طرح تمام ممالک اسلامیہ و بلاد مفتوحہ میں مراکز علم و ہنر قائم ہو گئے جہاں سے علم کی شعاعیں پھوٹیں۔ یہ مراکز نور بیز و نور بار اس مرکز شعاع بیزی کے علاوہ تھے جس نے ان اطراف و بلاد اسلامیہ میں اساتذۂ علم و ہنر بھیجے۔

ہم ان مراکز علم و ہنر کے بارے میں مختصراً ذکر کریں گے تاکہ ہماری یہ بحث تشنہ نہ رہے جو ان ممالک اسلامیہ میں قائم کیے گئے تھے، اور مراکز میں مرکزی حیثیت کے مالک تھے۔

(۱) مدینہ منورہ

مدینہ منورہ، دار الہجرت اور اسلامی سلطنت کی راجدھانی ہے۔ اس شہر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد اپنی آغوش محبت میں لیا۔ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ بھی تھے، اور شریعت کا ابتدائی مرکز صدر اسلام میں مدینہ ہی تھا۔ اس کی مسجدوں میں لوگ حضور کے گرد پروانہ وار جمع ہوتے اور قرآن کریم کی تعلیم لیتے اور حدیث نبی

کریمؐ سنتے۔ یہیں مسلمانوں نے حضور سے آپ کے فیصلے سنے اور یہیں حضور نے مسلمانوں میں آئی ہوئی غنیمتوں کو تقسیم کیا، جیوش اسلامی کی تیاری کا منظر ان کی روانگی کا سین یہیں دیکھنے میں آیا۔ یہیں مہاجرین اسلام نے دین کی تعلیم لی۔ قریش کے دباؤ اور قبائل کے استبداد کے باوجود جو جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے، مسلمانوں کی نگاہیں مدینہ پر لگی ہوئی تھیں۔ یہی ان کی امید ورجا کا مرکز تھا، تا آنکہ صلح حدیبیہ نے کامرانی کے دروازے کھول دیئے اور چند ہی دنوں کے بعد فتح مکہ کی عظیم ترین دولت نصیب ہوئی۔ اس طرح سیاسی طور پر بھی حجاز ہی اس کا مرکز بنا اور اسی کو اسلام کے دارالسلطنت ہونے کا موقع ملا جو خلافت علی ابن ابی طالب کے ابتدائی دنوں تک قائم رہا۔

حضور کی وفات کے بعد اس بات کا خطرہ تھا کہ مہاجرین مدینہ کو ترک کر کے مکہ نہ آ جائیں، مگر محبت رسول کا جذبہ ان پر غالب تھا۔ انھوں نے مدینہ ہی میں قیام کرنا پسند کیا بلکہ اسی کو ترجیح دی اور جیسے پہلے رہتے تھے اسی طرح بعد وفات بھی مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں وہ اکابر جو علم کے پہاڑ تھے وہ مدینہ ہی میں رہے۔ ان صحابہ کو علم حدیث میں بڑا مقام حاصل تھا۔ ان کبار صحابہ میں جو لوگ یہاں مقیم رہے ان میں سے ابوبکر، عمر، عثمان وعلی، ابوہریرہ، عائشہ ام المومنین، عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری، زید بن ثابت ہیں۔ جو فہم قرآن میں اور حدیث وفرائض میں یگانہ روزگار تھے ان کو خلفائے راشدین نے بھی سینے سے لگایا، آنکھوں میں بٹھایا۔ چنانچہ زید بن ثابت کی تو وہ حیثیت تھی کہ قضا، فتویٰ، فرائض، قرأت میں ان سے اوپر کوئی نہ تھا۔ مدینہ ہی میں کبار تابعین نے صحابہ سے علم دین حاصل کیا۔ سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، ابن شہاب زہری، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، سالم بن عبداللہ بن عمر، محمد بن المنکدر وغیرہ جیسے گرامی جلیل القدر تابعین نے یہیں رہ کر ان کبار صحابہ سے علم حاصل کیا، اور پھر ان کی حیثیت بھی انہی صحابہ کی طرح سنت وقضا وفتویٰ میں تمام امت کے لیے مرجع ثابت ہوئی۔

(۲) مکہ مکرمہ

حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد حضرت معاذؓ کو حلال وحرام کی تعلیم کے لیے مکہ میں تعینات فرمایا۔ آپ لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے، قرآن کریم پڑھاتے۔ حضرت معاذ انصار کے ان چند جوان العمر علماء میں تھے جو اپنے علم تدبر اور سخاوت کے لیے شہرۂ آفاق تھے۔ پیمبر خدا کے ہمراہ ان کے تمام غزوات میں شریک رہے اور صحابہ کی جماعت میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نبی کریم کی زبان صدق ترجمان نے فرمایا معاذ بن جبل أعلم الناس بحرام الله و حلاله (اللہ کے حلال وحرام کردہ معاملات کے زیادہ جانکار معاذ بن جبل ہیں)۔ دوسری جگہ فرمایا: خذوا القرآن من أربعة من ابن مسعود وأبيّ ومعاذ بن جبل و سالم مولى أبي حذيفة (قرآن کو چار لوگوں سے سیکھو ابن مسعود، ابی، معاذ بن جبل اور سالم مولی ابی حذیفہ سے) معاذ بن جبل سے صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا۔ ان میں عبداللہ بن عباس ہیں جن کو بصرہ سے واپسی کے بعد مسندِ امامت مکہ معظمہ میں تفویض کی گئی۔ جس طرح کہ مکہ میں خباب عتاب بن اسید تھے جن کو رسول اللہ نے اہل مکہ کے لیے امیر برائے نماز مقرر کیا تھا، آپ کے بھائی خالد بن اسید بھی تھے، اسی طرح حکم بن ابی العاص، عثمان بن ابی طلحہ جیسے گرامی صحابہ تھے۔

صحابہ سے مکہ معظمہ میں جن لوگوں نے درس حدیث وقرآن حاصل کیا اُن میں مجاہد بن جبیر اور عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، عکرمہ مولی بن عباس وغیرہ تھے۔

مکہ مکرمہ، مکہ مکرمہ ہی ہے اس کی قدر ومنزلت کا کیا ذکر؟ اس شہر نے اسلامی ثقافت اور حدیث نبوی کی اشاعت میں موسم حج میں جو رول ادا کیا ہے، وہ کسی دوسرے شہر کو کب نصیب ہوا؟ اس لیے کہ تمام دنیائے اسلام سے آنے والے مسلمان اور تابعین یہاں آکر صحابۂ رسول اکرمؐ سے ملاقات کرتے اور اپنے ملکوں میں حدیث نبوی کی دلنواز وجاں نواز خوشبو پھیلاتے۔ آج بھی مکہ ومدینہ کو وہی حیثیت حاصل ہے اور رہتی دنیا تک اس کا مقام باقی رہے گا۔

(۳) کوفہ

کوفہ میں اصحاب نبی کریمؐ کی ایک بڑی تعداد مقیم ہوئی۔ یہ دور فاروقی کی بات ہے، جب آپؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے عراق کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا۔ پھر کیا تھا کوفہ و بصرہ فتح اسلامی کی اساس بن گئے۔ خراسان و فارس و ہندوستان کی فتح اس کوفہ و بصرہ ہی کی وجہ سے عمل میں آئی۔ کوفہ میں بیعت رضوان کے تین سو شرکاء مقیم ہوئے اور ستر بدری صحابہؓ کا مستقر کوفہ بنا جس میں مشہور ترین علی بن ابی طالب، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل وعبداللہ بن مسعود وغیرہ تھے۔ اور عبداللہ بن مسعود نے کوفہ کو جو شرف عطا کیا وہ محتاج بیان نہیں، اس لیے کہ آپ نے کوفہ میں قیام فرما کر اپنی ساری مساعی اہل کوفہ کی تعلیم پر خرچ کی۔ چنانچہ کبار تابعین نے آپ کے ہی درس گاہ علم و عمل سے فارغ ہو کر شریعت کی حفاظت و سنت نبوی کی اشاعت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے علم حاصل کرنے والے ساٹھ شیوخ حدیث کوفہ ہی میں تھے۔ بنی ثور کے تیس اشخاص اسی کوفہ میں مقیم رہے۔ ان تیس میں کوئی ایسا نہ تھا جو ورع، تقویٰ، عبادت، علم حدیث میں ربیع بن خیثم سے کمتر ہو۔ اسی کوفہ میں کمیل بن زید نخعی گزرے ہیں۔ عامر بن شراحیل شعبی، سعید بن جبیر اسدی، ابراہیم نخعی، ابو اسحاق سبیعی، عبدالملک بن عمیر وغیرہ۔ سبھی اسی کوفہ کے باشندے تھے۔

(۴) بصرہ

بصرہ میں انس بن مالک فروکش ہوئے جو بصرہ میں امام حدیث تھے۔ ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عباس جو گورنر بصرہ تھے، حضرت علی کے زمانے میں ان کے علاوہ عتبہ بن غزوان، عمران بن حصین، ابو برزہ اسلمی، معقل بن یسار، عبدالرحمان بن سمرہ، ابوزید انصاری، عبداللہ بن الشخیر حکم اور عثمان جو ابوالعاص کے صاحبزادے تھے، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے گرامی صحابہ اسی بصرہ میں مقیم رہے۔

بصرہ کی درس گاہِ علم وعمل سے جو لوگ فاضل ہو کر نکلے ان میں سب سے اہم شخصیت حسن بصری کی ہے جنہوں نے پانچ سو صحابہ سے درس حدیث لیا۔ محمد بن سیرین، ایوب سختیانی بہز بن حکیم قشیری، یونس بن عبید، خالد بن مہران الحذاء، عبداللہ بن عون، عاصم بن سلیمان الاحول، قتادہ بن دعامہ السدوسی، ہشام بن حسان وغیرہ جیسے علم وعمل کے منارے شامل ہیں۔
بغداد کو عباسی خلیفہ منصور سے پہلے کوئی علمی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

(۵) شام

شام میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد جو اسلامی لشکر کے ہمراہ آگئی تھی مقیم ہوگئی۔ یہاں حکومت کے قیام کے بعد صحابہ کی بڑی تعداد شام کے شہروں میں آباد ہوگئی۔ پھر دیہات کے باشندے بھی ان صحابہ سے علمی ودینی معاشرہ کی بہتی ہوئی گنگا سے جو مسلمان اپنے ہمراہ لائے تھے نفع اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، اور بعض صحابہ کو اپنے دیہاتوں میں لے گئے، اس لیے کہ یہ مفت کی دولت تھی جو خود ان کے گھر میں بلا کسی مشقت ومحنت کے آگئی تھی۔ صحابہ کی تعداد جو شام میں وقتی طور سے یا مستقل طور سے مقیم ہوئی شمار کرنا بہت مشکل ہے، لیکن اس مشکل کو ولید بن مسلم نے حل کر دیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ شام میں صحابہ کی تعداد دس ہزار تھی، جنہوں نے ایمان کی حالت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ یزید بن ابی سفیان نے فاروق اعظم کو لکھا کہ ہمیں علماء صحابہ کی ایک جماعت دیجیے تاکہ وہ اہل شام کو فقہ اسلامی کا درس دیں۔ چنانچہ معاذ بن جبل، عبادہ بن الصامت، ابودرداء کو آپ نے شام روانہ کیا جو دمشق کے مختلف حصے میں مقیم ہوئے۔ عبادہ حمص میں، ابودرداء دمشق میں، معاذ فلسطین میں سب کے بعد حضرت عمر نے عبدالرحمان بن غنم کو شام روانہ فرمایا۔
دور اموی میں علمی جدوجہد شام میں بالخصوص دمشق میں اپنے عروج پر تھی، جہاں فقہاء محدثین، مجودین قرآن کی بڑی تعداد پائی جاتی تھی۔ علم وعلماء کی پذیرائی اس طرح بڑھی ہوئی تھی کہ داریا کا گاؤں جو دمشق کے زیریں علاقہ میں واقع ہے علم وادب کا گہوارہ بن گیا تھا۔

اس کے بارے میں سمعانی کا قول سنئے کہ داریا میں علمائے محدثین کی نئی پرانی نسل کی کھیپ کی کھیپ موجود تھی۔ عبدالرحمان بن یزید الازدی دارانی صحابی کو ان میں بلند ترین مقام حاصل تھا جو فقہائے شام کے دوسرے طبقہ کے سرخیل سمجھے جاتے تھے۔

ان صحابہ کے علاوہ شام میں دوسرے صحابہ بھی مقیم رہے مثلاً ابوعبیدہ بن الجراح، بلال ابن رباح، شرحبیل بن حسنہ، خالد بن الولید، عیاض بن غنم، فضل بن عباس بن عبدالمطلب جو اردن میں مدفون ہیں اور عوف بن مالک اشجعی، عرباض بن ساریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صحابہ کی اس عظیم درس گاہ سے شام کے جہابذۃ العلماء تابعین فارغ ہوئے ان میں سالم بن عبداللہ المحاربی، قاضی دمشق ابوادریس خولانی جو حضرت معاویہؓ اور یزید کے زمانہ میں دمشق کے قاضی تھے۔ ابوسلیمان دارانی جو عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں قاضی دمشق رہے۔ اسی طرح عبدالملک کے بیٹے یزید و ہشام کے دور میں بھی خدمت قضا انہی کے سپرد رہی، حتیٰ کہ انھوں نے اس گرامی عہدہ پر تیس سال کی طویل مدت گزاری۔ عمیر بن ہانی عنسی الدارانی بھی انہی گرامی تابعین میں سے ہیں جو منارۂ علم و عمل ثابت ہوئے۔ فقیہ شام امام اوزاعی بھی اسی درس گاہ کے فاضلین میں تھے جن کا درجہ بہتوں کے نزدیک ابوحنیفہ و مالک کے ہم پایہ ہے۔ مکحول دمشقی، عمر بن عبدالعزیز، رجاء بن حیوہ، بحیر بن سعد الکلاعی ثور بن یزید کلاعی، عبدالرحمان بن یزید بن جابر وغیرہ غرض کس کا نام لیجئے اور کس کو چھوڑیے۔

(۶) مصر

دور فاروقی میں مسلمان عمرو بن العاص کی سربراہی میں مصر میں داخل ہوئے۔ آپؓ کے ساتھ بھی صحابہ کی ایک بڑی تعداد تھی، جن میں زبیر بن العوام، عبادہ بن الصامت، مسلمہ بن مخلد، مقداد بن اسود، اس جرگہ کے سربراہ حضرت عمرو بن العاص تھے، جنہیں فاروق اعظم نے مصر کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ عبداللہ بن عمرو بھی انہی کے ساتھ تھے جو روایت حدیث میں مکثرین صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور جنھوں نے حضور کی موجودگی میں ہی تدوین حدیث

فرمائی۔ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد تک مصر میں مقیم رہے۔ آپ سے غیر معمولی طور سے محدثین نے روایت حدیث کی۔

مصر میں عقبہ بن عامر جہنی، خارجہ بن حذافہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، محمیہ بن جزء، عبداللہ بن الحارث بن جزء، ابو بصرہ غفاری، ابو سعد الخیر، معاذ بن انس الجہنی، معاویہ بن حدیج، زیاد بن الحارث الصدائی وغیرہ گرامی مرتبت صحابہ مصر میں مقیم رہے۔

ان کے الگ الگ مدرسے قائم تھے، ان مدرسوں میں یزید بن ابی حبیب مصر کے عظیم محدث عمر بن الحارث، خیر بن نعیم الحضرمی، عبداللہ بن سلیمان الطویل، عبدالرحمان بن شریح الغافقی، حیوۃ بن شریح تجیبی وغیرہ محدثین نے سند حدیث واشاعت علم حدیث حاصل کی۔ یزید بن ابی حبیب کو بڑا مقام حاصل ہوا۔ آپ سے ہی لیث بن سعد، عبداللہ بن لہیعہ نے شرف تلمذ حاصل کیا، جن سے ایک دنیا نے علم حدیث سیکھا۔ اپنے زمانہ میں یہی دونوں مصر کے عظیم محدث شمار ہوتے تھے۔

(۷) مغرب اور اندلس

دور فاروقی میں ہجرت کے اکیسویں سال حضرت عمرو بن العاص برقہ وطرابلس پہنچ گئے۔ اس کے بعد عمرو بن العاص نے فتح افریقہ کی اجازت حضرت عمر سے چاہی جوان کو نہ مل سکی۔ انھوں نے امیر المومنین کے حکم کا احترام کیا اور مصر واپس آ گئے۔ حضرت عمرو بن العاص اور ان کے رفقاء مسلمانوں میں سب سے پہلی بار مغرب کے قرب و جوار میں داخل ہوئے۔ جب دور عثمانی آیا تو امیر مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو حضرت عثمان کی جانب سے پروانہ فتح افریقہ مل گیا۔ یہ ۲۵ھ کا ذکر ہے، ان کی اعانت کے لیے مدینہ سے ایک اور فوج روانہ ہوئی جس میں صحابہ کی ایک جماعت تھی، ان میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن جعفر، حسین وحسن، عبداللہ بن الزبیر تھے۔ ان کے فوجیوں کا استقبال عقبہ بن نافع نے برقہ میں کیا، پھر اس ٹکڑی اور پہلی فوج نے مل کر بہت سے ممالک فتح کیے، پھر مغرب کی

فتح کے لیے معاویہ بن حدیج ۳۴ھ میں نکلے، ان غازیوں میں مہاجرین اور انصار کی بھی ایک جماعت تھی۔ چنانچہ سلیمان بن یسار کہتے ہیں "غزونا أفريقيا مع ابن حديج و معنا من المهاجرين والأنصار بشر كثير" (ہم نے ابن حدیج اور مہاجرین وانصار کی بڑی جماعت کے ساتھ افریقہ کو فتح کیا) (فتوح مصر لابن عبدالحکم ۱۹۳) عقبہ بن نافع اس کے بعد مغرب کے گورنر بنائے گئے۔ آپ کی فوج میں صحابہ وتابعین کی ایک بڑی جماعت تھی جس کے ہاتھوں مغرب اقصی فتح ہوا، اور شمالی افریقہ میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ مذکورہ صحابہ کے علاوہ صحابہ کی جو جماعت افریقہ میں قیام پذیر ہوئی ان میں مسعود بن الاسود البلوی صحابی ہیں جو بیعت رضواں میں حضور کے ساتھ تھے، اور مسور بن مخرمہ، مقداد بن اسود کندی وغیرہ جو سابقین صحابہ میں ہیں وہ بھی موجود تھے۔ بلال بن حارث بن عاصم المزنی جن کے ہاتھوں میں فتح مکہ کے دن لواء مزینہ تھا، جبلہ بن عمرو بن ثعلبہ ابومسعود البدری کے بھائی جو فاضلین وفقہائے صحابہ میں سرفہرست تھے وہ بھی تھے۔ اسی طرح سلمہ بن الاکوع مشہور صحابی بھی شریک تھے۔

پھر تابعین کی ایک بڑی جماعت افریقہ میں پہنچی تھی، ان میں سائب بن عامر بن ہشام تھے۔ عبداللہ بن عباس کے بھائی معبد، عبدالرحمان بن الاسود، عاصم بن عمر بن الخطاب، عبدالملک بن مروان، عبدالرحمان بن زید بن الخطاب، سلیمان بن یسار فقیہ المدینہ، عکرمہ مولیٰ بن عباس، ابومنصور کے والد یزید بن منصور جیسے کبار تابعین تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی دس تابعین کو روانہ فرمایا تھا کہ اہل افریقہ کو فقہ شریعت کی تعلیم دیں۔ ان دس تابعین میں حبان بن ابی جبلہ، اسماعیل بن عبیداللہ الاعور، اسماعیل بن عبید، عبدالرحمان بن رافع التنوخی جو قضاء افریقہ پر مامور تھے۔ سعید بن مسعود التجیبی جیسے جلیل القدر اساتذہ وعلمائے حدیث تھے۔ جنھوں نے اس علاقہ کے لوگوں میں دین پھیلانے اور اسلام کی نشر واشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کی درس گاہوں سے افریقہ کے بہت سے لوگ فاضل ہو کر نکلے، مثلاً زیاد بن انعم المعافری، عبدالرحمان بن زیاد، یزید بن ابی منصور، مغیرہ بن ابی بردہ، رفاعہ بن

رافع، عمرو بن راشد بن مسلم الکنانی، عمران بن عبد المعافری، مغیرہ بن سلمہ، مسلم بن یسار الافریقی وغیرہ جنھوں نے افریقہ میں پرچم اسلام وعلم وحکمت بلند کیا۔

ابھی اسلام کو افریقہ پہنچے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ قیروان اہل مغرب کا سب سے اہم علمی خطہ بن گیا، جہاں سحنون بن سعید، سعید بن محمد الحدّاد تھے۔ اسی قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، بیلینہ کے شہروں میں بھی تیسری صدی کے آغاز میں یحیٰی بن یحیٰی، ابن حبیب، ابن مخلد وغیرہ کے ذریعہ شمع علم وہنر فروزاں ہوئی۔

(۸) یمن:

خود حضورؐ نے معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن روانہ فرمایا تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی یہاں آئے۔ اسی یمن میں تابعین میں سے ایسے علماء پیدا ہوئے جن پر زمانہ ناز کرتا رہا ہے، مثلاً منبہ کے بیٹے ہمام ووہب، طاؤس اور آپ کے صاحبزادے، پھر معمر بن راشد اور عبد الرزاق ابن ہمام اور ان کے معاصرین۔

(۹) خراسان

خراسان میں بھی صحابہ نزول فرما ہوئے۔ بریدہ بن حصیب اسلمی نے یہیں وفات پائی، جو مرو میں مدفون ہیں اور ابو برزہ اسلمی حکم بن عمرو الغفاری، عبد اللہ بن خازم اسلمی جو نیساپور میں مدفون ہیں۔ قثم بن عباس جو سمرقند میں محو خواب ہیں، ان علاقوں نے محدثین کبار کو پیدا کیا۔ چنانچہ بخاری میں عیسیٰ بن موسیٰ گنجاز، احمد بن حفص فقیہ، محمد بن سلام بیکندی، عبد اللہ بن محمد السندی، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری ہیں۔ اور سمرقند میں ابو عبد اللہ بن عبد اللہ بن عبد الرحمان الدارمی، محمد بن نصر مروزی شامل ہیں، اسی طرح علاقہ شاس میں حسن بن الحاجب اور ہیثم بن کلیب پیدا ہوئے۔ فریاب وفاراب میں بھی علماء کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی جس میں محمد بن یوسف الفریابی کو اولیت حاصل ہے، پھر قاضی جعفر بن محمد فارابی صاحب تصانیف کثیرۃ متوفی ۲۲٦ھ ہیں۔

ان گزارشات سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ مسلمانوں نے دور اور قریب کے علاقوں میں جب بھی سفر کیا تو اس کا مقصد سیر سپاٹا نہ تھا نہ اس کا مقصد تجارتی منافع کا حصول تھا بلکہ ان کا مقصد دنیا کو لوگوں کے ظلم وستم سے رہا کرنا تھا۔ دوسرا مقصد ان نومفتوحہ علاقوں میں دین اسلامی کی تعلیمات پھیلانا، شریعت سکھانا اور لوگوں کو راہ ثواب پر لگانا، ان میں جو خرابیاں تھیں ان کو نور ہدایت کی جگمگاتی روشنی میں دکھلانا اور حق ان کے سامنے پیش کرنا تھا۔ انہی باتوں سے اسلامی فتوحات، دنیا کے تمام فاتحین وحکومت کاروں سے ممتاز ہے۔ اور یہ ساری باتیں تاریخ میں آئینہ کی طرح نمایاں ہیں۔ یہ وہ مخصوص انداز تھا جس کے لیے علماء صحابہ مختلف حصوں میں پھیل گئے اور خلفائے اسلام نے ان علاقوں میں علماء کی ایک کثیر تعداد روانہ کی، تا کہ ان میں جذبۂ آزادی وہدایت اور تعلیم کو عام کرسکیں اور اسلام کو تازہ تازہ قبول کرنے والوں نے بھی ان صحابہ کی طرف پوری توجہ دی اور بڑی لگن سے علم دین حاصل کیا۔

ظاہر ہے کہ صحابہ اپنے یقین کی قوت کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہوئے بھی علم کے اعتبار سے تفاوت رکھتے تھے۔ ہر صحابی کے پاس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری تعلیمات اور احادیث نہ تھیں۔ اس لیے علمی اسفار احادیث کو جمع کرنے کے لیے شروع ہوئے۔ صحابہ خود اس قسم کے اسفار کے موجد تھے۔ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں تو یہ اسفار غیر معمولی طور سے بڑھ گئے تھے تا کہ جو باتیں ان کو نہیں ملی ہیں ان کو حاصل کریں۔ جو احادیث انھوں نے نہیں سنی ہیں اسے سن سکیں۔ یا کم از کم سنی ہوئی باتیں موکد ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ تابعین مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے صحابہ سے ملے اور ان سے احادیث نبوی کی تعلیم حاصل کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک حدیث یا دو حدیث کے حاصل کرنے کے لیے دن ورات مہینوں کا سفر کیا، اذیتیں برداشت کیں، کثیر تکالیف اٹھائیں۔ ہم نے ملاحظہ کیا کہ صحابۂ کرام مختلف علاقوں میں چمکدار ستاروں کی طرح ظاہر ہوئے، ان کے شاگرد انہی کے رنگ میں رنگ گئے اور انہی کا انداز اختیار کیا اور علم کے پرچم کو ہمیشہ ہاتھ میں لئے ہی رہے۔

طلب حدیث کے لیے اسفار

طلب حدیث میں سفر کا سلسلہ عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ جو لوگ اس رسالت محمدی کے بارے میں سنتے وہ خود حضورؐ کی خدمت میں دور دراز کا سفر کر کے حاضری کی سعادت حاصل کرتے کہ قرآن کریم کو سنیں اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کریں، پھر حلقہ بگوش اسلام ہو کر اپنی قوم میں واپس جاتے، جیسا کہ ضمام بن ثعلبہ کا واقعہ ہے۔ گویا عہد نبوی میں سفر تعلیم دین کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔

عہد صحابہ و تبع تابعین میں تو ان اسفار کا پوچھنا ہی کیا۔ ان بزرگوں نے خصوصیت سے طلب حدیث میں ریکارڈ شکن اسفار کیے۔ اکثر تو طول طویل مسافت کا سفر محض حدیث حاصل کرنے یا اپنی سنی ہوئی حدیث کی تائید حاصل کرنے کے لیے کرتے تاکہ اس کے محفوظ کرنے کی آسانیاں فراہم ہوں، یا سفر کا مقصد صحابی کی زیارت، ان کی صحبت میں کچھ دنوں قیام کرنا ہوتا، تاکہ جو سرمایۂ تعلیمات نبوی ان کے پاس ہے اسے سمیٹنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔ اس لیے کہ دور تابعین میں صحابہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اور انہی شہروں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ وہاں قیام کے ساتھ تعلیمات نبوی بھی اپنے سینے میں دبائے ہوئے مقیم تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ جو حدیث نبوی کو اکٹھا کرنا چاہتا وہ ان علاقوں کا سفر کرتا اور ان صحابہ سے ملتا جنھوں نے احادیث نبوی خود حضورؐ سے سنی تھیں اور احکام شریعت آپؐ سے معلوم کیے تھے۔ یہی حال تبع تابعین کا تابعین کے سلسلے میں ہوا کہ وہ تابعی کے پاس جاتے، وہاں ٹھیرتے اور احادیث نبوی ان سے سنتے اور سمجھتے۔ اس طرح احادیث نبوی انھوں نے اصل مراکز حدیث سے حاصل کیے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی علماء کا سفر علمی، مذاکرۂ علمی مشہور شیوخ حدیث کے ساتھ پوری تاریخ میں جاری رہا۔

رحلت صحابہ کے سلسلے میں عطاء بن ابی رباح کی یہ روایت قابل ذکر ہے کہ ابوایوب انصاریؓ عقبہ بن عامرؓ صحابی کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے کہ حضورؐ کی حدیث جو

انھوں نے خود زبان صدق ترجمان سے سنی ہے حاصل کریں۔ بجز ان کے اور عقبہ کے کوئی دوسرا نہ تھا جس نے اس حدیث کو حضورؐ سے سنا ہو۔ جب آپ مسلمہ بن مخلد انصاری امیر مصر کے مکان پر تشریف لائے آپ نے اطلاع کی۔ سنتے ہی وہ تیزی سے باہر آکر آپ سے گلے ملے، پھر پوچھا کیسے زحمت فرمائی؟ انھوں نے کہا کہ ایک حدیث کے سلسلے میں حاضری ہوئی جس کو میں نے اور عقبہ نے ہی حضورؐ سے سنا تھا۔ آپ ان کے گھر تک رہنمائی کے لیے کسی کو ساتھ لگا دیں۔ آپ نے ایک شخص کو ساتھ کر دیا جو عقبہ کے مکان پر آپ کو لے کر گیا۔ آپ نے عقبہ کو اطلاع کرائی، وہ تیزی سے باہر آئے اور گرم جوشی سے معانقہ کیا، پھر دریافت کیا ''ابوایوب کیوں تکلیف فرمائی''؟ آپ نے کہا کہ ایک حدیث کے سلسلے میں جسے میں نے اور تم نے سنا ہے کسی اور کو اس حدیث کا پتہ نہیں، وہ مومن کے عیب کو چھپانے کے بارے میں ہے۔ عقبہ نے کہا ہاں میں نے سنا ہے، رسول خداؐ نے فرمایا کہ دنیا میں جس نے کسی مومن کے عیب (جس کے بیان سے وہ شرما جائے) کی پوشش کی، خدائے پاک اس کے عیب کی پوشش قیامت کے دن فرمائے گا۔

ابوایوب انصاری نے یہ حدیث سن کر فرمایا تم نے سچ کہا۔ پھر آپ مدینہ منورہ واپسی کے قصد سے سواری پر سوار ہو کر چل پڑے۔ چنانچہ آپ کے لیے مسلمہ بن مخلد امیر مصر کا عطیہ مصر کے جھونپڑپٹی کے علاقہ میں پہنچ کر ملا۔ اس طویل سفر کی بنیاد محض اتنی تھی کہ حدیث ''من ستر المومن'' کا کچھ حصہ میرے ذہن سے نکل تو نہیں گیا ہے۔

محض اس کی تائید و تصویب کے لیے آپ نے اتنا طویل سفر حجاز سے مصر کا کیا جس میں بہت سے صحرا چٹیل میدان عبور کیے۔ یہ جاں گسل محنت صرف اس لیے تھی کہ جو کچھ انہیں یاد ہے اس کی تائید حاصل کریں اور تصحیح فرمالیں۔

ایک دوسرا واقعہ ابن عقیل نے جابر بن عبداللہ سے بیان کیا کہ انہیں اصحاب نبی میں سے کسی سے حدیث پہنچی تھی کہ انہوں نے سفر کا نظم کیا اور مہینہ بھر کے سفر کے بعد ملک شام پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ عبداللہ بن انیس ہیں۔ میں نے خبر بھیجی کہ جابر بن عبداللہ دروازہ پر ہیں۔

ایلچی نے واپس آ کر پوچھا کہ آپ جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اتنے میں وہ باہر نکلے اور مجھے گلے لگایا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کے واسطے سے ایک حدیث سنی ہے جو میں نے پہلے نہیں سنی تھی، مجھے اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں میں موت کا شکار نہ ہو جاؤں یا آپ ہی دنیا میں نہ رہیں۔ انہوں نے پھر وہ حدیث بیان کی:

"یقول رسول الله صلی الله علیه وسلم "یحشر الله العباد أو الناس عراۃ غرلا بُهماً قلت: ما بُهماً؟ قال لیس معهم شیئی فینادیهم بصوت یسمعه من بعد (أحسبه قال) کما یسمعه من قرب أنا الملك لاینبغی لأحد من أهل الجنة یدخل الجنة وأحد من أهل النار یطلبه بمظلمة ولاینبغی لأحد من أهل النار یدخل النار وأحد من أهل الجنة یطلبه بمظلمة، قلت: وکیف؟ وانما نأتی الله عراۃ بهما قال: بالحسنات والسیئات" (الأدب المفرد، صفحہ ۳۳۷)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا بندوں کو یا لوگوں کو ننگا غیر مختون، بہمانہ محشور فرمائے گا۔ میں نے کہا بہما کیا ہے؟ فرمایا ان کے ساتھ کچھ نہ ہوگا، پھر انہیں ایک آواز آئے گی جو دور سے معلوم ہوگی لیکن ایسا معلوم ہوگا کہ وہ قریب کی آواز ہے کہ میں وہ بادشاہ ہوں کہ کسی کی مجال اہل جنت میں سے نہیں ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو، نہ اہل نار میں سے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کا ظلم کیا جائے، اور نہ اہل نار میں سے کسی کی مجال ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہو یا کوئی اہل جنت میں سے کہ اس پر کسی قسم کا ظلم کیا جائے۔ میں نے کہا یہ کیسے ہوگا؟ ہم خدا کے پاس ننگے دھڑ نگے آئیں گے، کہا کہ حسنات اور سیئات کے ساتھ"۔

طلب حدیث میں تابعین اور تبع تابعین کے مابین اسفار کا سلسلہ بکثرت جاری رہا۔ بعض تابعی تو اس درجہ حدیث رسول کے شائق تھے کہ صرف ایک حدیث کے سننے کے لیے طول طویل سفر کرتے۔ اس لیے کہ ان کو یہ خیال رہتا کہ اصحاب رسول نے خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سماعت حدیث کی ہے۔ ابوالعالیہ کی یہ

روایت اس پر شاہد عدل ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ صحابی رسول سے کی ہوئی روایت بصرہ میں سنتے تو ہمیں تسکین نہ ہوتی جب تک کہ ہم مدینہ طیبہ میں آکر خود براہ راست صحابی سے نہ سن لیتے۔

شعبی نے تین حدیثوں کے لیے سفر کیا۔ کہنے لگے میں نے اس خیال سے یہ سفر کیا کہ بہت ممکن ہے کہ میری اس شخص سے ملاقات ہو جائے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہے۔ زہری نے سعید بن مسیب کی یہ بات نقل کی ہے کہ میں ایک حدیث کے لیے تین تین سفر کرتا تھا، ابو قلابہ مدینہ میں مقیم رہے، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایسے شخص سے ملاقات کریں جس کے پاس حضورؐ کی ایک حدیث ہے۔ مسروق کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ صرف ایک حرف کی سماعت کے لیے جو رسولِ خدا سے سنا گیا تھا سفر کیا۔ یہ بات سبھی کے علم میں ہے کہ مسروق بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عامر شعبی کی شہادت ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو پوری دنیا میں طلب حدیث میں مسروق سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ بھی روایت ہے کہ شعبی نے کسی سے حدیث بیان کی، پھر اس کے بعد اس سے کہا کہ یہاں میں نے تم کو بلا کسی معاوضہ کے وہ چیز دے دی جس کے لینے کے لیے سوار مدینہ اور اس کے قریب تک جایا کرتے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ طلب حدیث کے لیے ہمت افزائی کرتے، حتیٰ کہ اس کے لیے سفر ہوتب بھی۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ علم قرآن کسی کو مجھ سے زیادہ آتا ہے تو اگر تیز رفتار سواری کی ضرورت ہوتی تو میں اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کرتا۔ صحابہ طالبین علم کو خوش آمدید کہتے۔ ان کی ترحیب فرماتے۔ چنانچہ اس کا اثر تابعین پر بھی ہوا اور انہوں نے بھی علمی سفر سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ چنانچہ عامر شعبی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی انتہائے شام سے منتہائے یمن تک کا سفر کرے کہ کلمۂ حکمت سن لے تو میرے نزدیک اس کا سفر بے کار نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ سے حدیث لینے کے لیے رخت سفر بارہا باندھا۔

کثیر بن قیس کی روایت ہے کہ میں جامع دمشق میں حضرت ابودرداءؓ کے پاس حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ ابودرداءؓ میں مدینہ یعنی مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آرہا ہوں، اور ایک حدیث جس کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ تم نے بیان کی ہے خود سننے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ ابودرداء نے کہا کہ تجارت کے خیال سے تو نہیں آئے تھے؟ اس نے کہا بالکل نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کیا کوئی اور ضرورت تمہیں یہاں لائی؟ اس نے کہا نہیں۔ اس پر ابودرداء نے حدیث بیان کی کہ میں نے رسولِ خدا سے یہ سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ جو کوئی راستہ اس لیے طے کرے کہ اس سے علم حاصل کرے گا تو خدا اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے اور یہ کہ فرشتے طالبین علم کی راہ میں اپنے پَر بچھاتے ہیں، اور طالب علم کے لیے آسمان و زمین میں رہنے والے استغفار کرتے ہیں، حتیٰ کہ پانی میں پائی جانے والی مچھلیاں بھی، اور یہ کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی سب ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء دینار و دراہم کے مورث نہیں ہوتے، بلکہ علم کے مورث ہوتے ہیں، جس نے علم حاصل کر لیا اس نے وراثت انبیاء کا وافر حصہ پا لیا۔

زر بن حبیش فرماتے ہیں کہ میں صفوان بن عسال مرادی کے پاس آیا۔ انہوں نے پوچھا کیسے آئے؟ میں نے کہا کہ حصول علم کے لیے۔ فرمایا میں نے رسول خدا کو کہتے سنا ہے کہ جو شخص بھی اپنے گھر سے علم کے لینے کے لیے نکلا اس کے لیے فرشتوں نے خوش ہو کر پَر بچھایا، اس لیے کہ اس نے بڑا عظیم کام کیا۔

علماء کے حالاتِ سفر (برائے طلب حدیث) اتنے زیادہ ہیں کہ یہ جگہ ان کے ذکر کے لیے ناکافی ہے، ہمارے لیے ان کا تھوڑا ذکر کافی ہوگا۔ چنانچہ ابن شہاب نے شام کا سفر کیا تاکہ عطاء بن یزید، ابن محیریز اور ابن حیوہ سے ملاقات کریں۔ یحیٰ بن ابی کثیر نے اولاد صحابۂ کرام سے ملاقات کے لیے مدینہ طیبہ کا سفر کیا۔ محمد بن سیرین کوفہ گئے اور وہاں عبیدہ، علقمہ اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے ملاقات کی۔ اوزاعی نے یحییٰ بن ابی کثیر سے ملاقات کے لیے یمامہ کا سفر کیا اور وہاں سے بصرہ چلے گئے۔ اور سفیان ثوری نے یمن کا سفر کیا پھر بصرہ گئے۔ عیسیٰ

بن یونس اوزاعی سے ملاقات کے لئے شام گئے، اور شعیب بن ابی حمزۃ، زہری سے ملنے شام گئے۔ ایک ہی ملک میں علماء کا شہر شہر سفر کرنا تو اتنا زیادہ ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں۔

غرض اسفار علماء کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ ان اسفار نے سنت کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اور یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اسے خود دیکھتا، لوگوں سے اس کے حالات معلوم کرتا، بعض وقت اتنے سوال کرتا کہ بعض لوگ سوالات کی کثرت سے یوں کہہ دیتے کہ شادی کرنا ہے کیا؟

ان اسفار سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ حدیث کے مختلف طرق بھی سامنے آگئے۔ ایک حدیث کسی شہر خاص میں کسی خاص لفظ کے ساتھ اور دوسری جگہ کچھ کمی دبیش کے ساتھ مروی ہوئی۔ اس طرح مشائخ کے مابین اختلاف طرق پر مناظرے ہونے لگے جس کی وجہ سے تمام کمی وبیش کی وضاحت ہوجاتی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجاتا۔ دوسرے ورود احادیث کے اسباب بھی معلوم ہوجاتے، پھر اس کی تصحیح کے لیے صحابی وتابعی سے براہ راست ملاقات کرتے۔

ان اسفار کا یہی فائدہ کیا کچھ کم ہے کہ حدیث کی اشاعت، اس کو جمع کرنے، اس کو جانچنے اور اس کی حقیقت کا علم لوگوں کے سامنے آگیا؟ اس طرح صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے اسفار سنت نبوی کی حفاظت کا ایک اہم ذریعہ بن گئے۔ رواۃ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حفاظت سنت کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلے، کتنی کتنی مشکلات اٹھائیں، کیسی کیسی تکلیف سے دوچار ہوئے۔ مگر انہوں نے ان ساری باتوں کو صرف اس لیے برداشت کیا کہ اس کے صحیح مصادر سے حدیث کو حاصل کرکے آنے والی نسلوں تک من وعن پہنچادیں۔ انہوں نے دردر کی خاک چھانی، اس کا اندازہ تراجم صحابہ وتابعین کے ناموں کے ساتھ ان نسبتوں کے ذکر سے ہوتا ہے جو ان کے مختلف علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کے ناموں کے ساتھ ساتھ لگ گیا ہے۔ فلاں یمنی ثم مکی، ثم مدنی، ثم الشامی، ثم الکوفی، ثم البصری، ثم المصری، تاکہ ان کی ان بے پناہ مشقتوں سے پردہ اٹھ

جائے، انہی مشقتوں کے برداشت کا ثمرہ ہے کہ صحابہ وتابعین کے اسمائے گرامی رجال کی کتابوں میں آج تک محفوظ ہیں جن میں ان کی خدمات کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ حدیث نبوی کی اشاعت قرآن کی اشاعت کے پہلو بہ پہلو ہی عمل میں آئی، اور اسلام نے جن ممالک کو زیر نگیں کیا ان تک پہنچ کے رہی۔ یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ علم کچھ مکہ و مدینہ تک ہی محدود نہیں رہ گیا بلکہ اس کے مراکز مختلف، اس کی مجالس کثیرہ تھیں۔ دور دراز علاقوں نے جو فیض اٹھایا وہ قریبی دنیا سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس لیے کہ صحابہ کی علمی کاوشیں محدود انداز میں تھی ہی نہیں، اس کی شہادت وہ مدارس ہیں جو مختلف ممالک اسلامیہ میں بڑے پیمانہ پر موجود تھے، جن کی آبیاری صحابہ وتابعین ہی فرماتے رہے بالواسطہ یا بلاواسطہ۔

اشاعت سنت ہی کے حقائق کے پہلو بہ پہلو کچھ تلخ حقائق بھی ہیں کہ اسلام میں جو لوگ داخل ہوئے ان میں سبھی مخلص نہ تھے بلکہ بعض نفاق کے ساتھ آئے۔ مسلمانوں کی قوت کے سامنے انہیں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندرون جو بت تھے وہ بحالہ باقی رہے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں میں کوئی کمزوری دیکھی اپنے اصل روپ میں آگئے۔ مسلمانوں میں عقائد فاسدہ کی ترویج، دین محمدی پر طعن و تشنیع ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ چنانچہ بہتوں نے اپنی ثقافت کو ہوا دی۔ کہیں قومیت اور وطنیت کے بت کھڑے کیے۔ اس پر سیاسی اختلافات نے اور بھی روغن چڑھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وضع حدیث کا فتنہ اپنی پوری شورشوں کے ساتھ بلند ہوا، جس نے اس شریف فن پر ایک ضرب کاری لگائی۔ اگر صحابہ وتابعین وتبع تابعین اور بعد کے علماء کی مثبت مساعی نہ ہوتیں تو معلوم نہیں وہ دین محمدی کا کیا حشر کرتے۔

تیسرا باب
فصل اول

وضع حدیث کا آغاز اور اسباب

وضع کا آغاز

خلفائے اربعہ کے زمانہ تک حدیث ہر قسم کے کھوٹ سے پاک نتھرا ہوا چشمہ تھا، اس میں تحریف و نفاق کی آمیزش دور دور تک نہیں تھی۔ مگر جب اسلام میں اہل مصالح، اہل ہوا داخل ہوگئے تو تخریب کی وباء پھیل گئی۔ سب سے پہلے اسلام کو جو دھچکا لگا جس کے نتیجے میں مختلف فتنے رونما ہوئے، وہ پہلی صدی کا فتنہ شہادت عثمانؓ ہے۔ اس فتنہ نے اسلام کے تناور درخت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس فتنہ نے امت کو بعض ایسے حوادث سے دوچار کر دیا جس نے اسلام کا معدہ ہی بگاڑ دیا، اور اس میں سوء ہضم کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ آج تک اس فتنے کی مسموم ہواؤں سے عالم اسلامی زہر آلود ہے۔ اس فتنہ کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت پر مسلمانوں نے اپنی وحدت کا مظاہرہ کیا۔ مگر یہ وحدت بھی ناپائدار ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ حادثات کی رفتار اتنی تیز تھی کہ امن و سلامتی کی موجوں میں طوفان کی سی کیفیت پیدا ہوکر رہی۔ اسلامی صف دو حصوں میں بٹ گئی، ایک بڑی صف حضرت علیؓ کے لشکر اسلام کے ساتھ تھی تو دوسری صف حضرت معاویہؓ کے اسلامی لشکر کی صورت میں موجود تھی۔ اگر حضرت علیؓ کے ہمراہ اہل حجاز و عراق کی قوت تھی تو معاویہ امیر شام کے ہمراہ شام اور مصر کے لوگ تھے۔

امت کی یہ تقسیم بڑی مہنگی پڑی، مسلمانوں میں دردانگیز لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ جنگ ختم بھی ہوئی تو کہاں؟ تحکیم کے گھناؤنے نعرہ کے ساتھ، جس کی گندگی سے مختلف سیاسی فرقے اسلام میں پیدا ہوگئے۔ جمہور حضرت علی کے ہمنوا ہوگئے، اس لیے کہ حضرت علی ہی کے

ہاتھ پر عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عامۃ المسلمین نے بیعت کی۔ معاویہ کی ٹولی کے لوگ خون عثمان کا بدلہ لینے کے نعرے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے جو معاویہ کی خلافت کے مطالبہ پر جا کر ختم ہوئی۔ اس میں بھی حکم کا سوال اٹھا اور تحکیم کا حشر جو ہوا وہ امت کے سامنے ہے۔ شیعان علی میں سے جو تحکیم کے نعرے کے ساتھ الگ ہو گئے، اس لیے کہ ان کا نعرہ لا حکم الا اللہ تھا اور ابتداء وہ معاویہ کے دشمن بن گئے، اس لیے کہ وہ حضرت علی ہی کو خلیفہ بنانے کے حق میں تھے۔ ادھر حضرت معاویہ اپنی امارت کے خواہاں تھے جو بغیر مسلمانوں کی شوریٰ کے ممکن نہ تھی۔ خوارج سادہ مزاج مگر سخت قسم کے دیہاتی تھے، ان کے قویٰ بھی مضبوط تھے، دل بھی کٹھور تھے، اس لیے وہ حضرت علی سے بھی ساری زندگی برسرپیکار رہے اور ان کی شہادت پر بھی ان کے دل ٹھنڈے نہیں ہوئے۔ اسی طرح معاویہ سے بھی ساری زندگی جنگ آزما رہے، اموی حکومت کے لیے پورے دور اموی میں دردسر بنے رہے، ان کی نیند حرام کر دی۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد شیعان علی خلافت کا مطالبہ لے کر آگے بڑھے۔ اس طرح سے یہ سیاسی فرقے اور گروپ دیکھتے دیکھتے مذہبی فرقوں میں تبدیل ہو گئے اور اسلام میں فرق دینیہ کی ابتداء اس طریقہ پر بڑی تیزی سے عمل میں آئی۔ ہر فرقہ یہی چاہتا تھا کہ اس کے خیالات و دعاوی کی پشت پر کتاب و سنت کے احکام ہوں۔ ظاہر ہے کہ کتاب و سنت بازیچۂ اطفال نہ تھے کہ جو چاہتا اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا، اس لیے ان لوگوں نے قرآن میں تاویلات کے دروازے کھولے اور حدیثوں کی جانی پہچانی باتوں میں ایسی گھڑی تفسیروں کے دروازے کھولے جن کا ان احادیث سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے تحریف قرآن کی بھی راہ ہموار کرنی چاہی مگر ان کی بدقسمتی سے قرآن بہ سینۂ حفاظ محفوظ تھا، پھر اس کی کتابت نے ان کی اس ناپاک آرزو کو پورا نہ ہونے دیا۔ اب ان کے لیے کوئی اور راہ نہیں رہ گئی تھی، اس لیے انہوں نے حدیث کو اپنایا۔ اس میں من مانی اضافے کیے، پیمبرؐ نے جو باتیں نہیں فرمائیں ان کی طرف منسوب کرنے لگے، اور وضع حدیث کی وباء بڑی تیزی سے بڑھ گئی کہ صحیح حدیثوں کا چہرہ مسخ ہونے کے قریب ہو گیا۔ خلفائے اربعہ کی شان میں ان کے فضائل اور ان کے ہمنوا

دوسرے بزرگوں کی شان میں حدیثوں کا انبار لگ گیا۔ان سیاسی اور مذہبی فرقوں کی تائید اوران کو مضبوط بنانے کے لیے بلا کسی تاویل کے کھلی حدیثیں گھڑی گئیں۔غرض موضوع احادیث کا بازار فرق باطلہ کے وجود کے ساتھ ساتھ پورے شباب پر آ گیا۔ان فرقوں نے ایسی احادیث گھڑیں جو ان کے مخالف فرقوں کا بطلان کریں۔اس طرح مدافعت نے بھی موضوع احادیث کی کثرت کے اسباب پیدا کر دیئے،اس طرح موضوع احادیث کے دفتر جن کے چہروں کو علمائے رجال نے اور ماہرین فن احادیث نے بے نقاب کیا،وضع حدیث صرف اشخاص وافراد کے فضائل ہی تک محدود نہیں رہ گئی اور مختلف اشخاص کی رائے،ان کے عقائد باطلہ کی پشت پناہی تک ان کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ اس کا احاطہ حدیث کے مختلف ابواب تک بڑھا ہوا تھا،اور ایسا معلوم ہوتا کہ موضوع حدیثیں مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات کو خواہ وہ خواص سے متعلق ہوں یا عوام سے سب کو متاثر کیئے بغیر نہ چھوڑیں گی۔چنانچہ فضائل،معائب،شہروں کی خوبی،دنوں کی عظمت ونحوست،مختلف عبادات،معاملات،اطعمہ،ادب،زہد،ذکر ودعا،طب،مرض،فتنہ اور مواریث،غرض زندگی کے ہر باب سے متعلق احادیث گھڑی گئیں۔

ہمیں کہنے دیجیے کہ وضع احادیث اس صدی میں اپنی ترقی یاب صورت میں نہ تھا۔نصف صدی ہجری سے پہلے یہ معمولی طور سے ایک آدھ واقعہ وضع پر مشتمل تھا۔موضوع حدیثیں فوراً ہی گرفت میں آ جاتیں،اس لیے کہ اس صدی میں صحابہ وتابعین بکثرت موجود تھے جو حدیث سے بخوبی واقف اور اس کے حافظ تھے۔اس لیے جھوٹوں کی گندگی کی طرف کوئی مائل نہ ہوتا،احادیث گھڑنے والے تماشہ بن جاتے۔مزید براں اس صدی میں وضع حدیث کے اسباب بھی کمتر تھے۔وضع احادیث بدعت اور فتنے کی بنیاد پر بڑھتی گئیں۔صحابہ،کبار تابعین،علمائے اسلام اس لعنت سے بہت دور تھے۔اس کی تصویر کشی امام ابن تیمیہ نے ان لفظوں میں کی ہے،

''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بعد میں آنے والے مسلمانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ محفوظ تھے ان کو فتنوں کی ہوا نہیں لگ سکی،نبوت سے زمانہ جس قدر دور ہوتا گیا اختلافات بڑھتے گئے،روزانہ نت نئے فرقوں کا اضافہ ہوتا گیا،چنانچہ خلافت عثمانؓ تک کوئی بدعت دیکھنے میں نہیں

آئی، آپؓ کی شہادت کے بعد فرقہ بندیاں شروع ہوئیں اور دو متوازی بدعتیں سامنے آئیں۔ خوارج کی بدعت جو حضرت علی کی تکفیر کے قائل تھے، اور روافض کی بدعت جو آپ کی امامت اور عصمت کے قائل تھے یا آپ کی نبوت اور رسولِ خدا ہونے کے قائل تھے۔ صحابہ کے آخری دور امارت ابن زبیر و عبدالملک میں مرجئہ اور قدریہ کی بدعت پیدا ہوئی۔ تابعین کے ابتدائی دور اور خلافت اموی کے آخری زمانے میں جہمیہ اور ان جیسے دوسرے فرقوں نے جنم لیا۔ عہد صحابہ میں ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ اسی طرح تلوار کا فتنہ، دور معاویہ تک تلواریں صرف دشمنان اسلام کے خلاف نکلتی تھیں، مگر معاویہ کے فوراً بعد امام حسینؓ کا قتل مسلمانوں کے ہاتھوں، ابن زبیر کا مکہ میں محاصرہ، مدینہ میں حرۃ کا فتنہ، یزید بن معاویہ کے زمانۂ خلافت میں یزید کی موت کے بعد شام کا فتنہ مروان اور ضحاک کے مابین مرج راھط میں واقع ہوا۔ پھر مختار کا علی بن زیاد کے ساتھ اختلاف جس میں اس نے زیاد کو قتل کیا۔ پھر مصعب بن الزبیر کا فتنہ جس میں مختار مارا گیا۔ پھر عبدالملک نے مصعب کو قتل کیا اور ایک عظیم فتنہ برپا ہوا۔ پھر حجاج کو ابن الزبیر کے محاصرہ پر بھیجا گیا، یہ محاصرہ عرصہ تک رہا، اور عبداللہ بن الزبیرؓ کی شہادت عمل میں آئی۔ جب حجاج والی عراق ہوا تو محمد بن اشعث نے بغاوت کی، جس میں محمد کے ساتھ ایک بڑی جماعت باغی ہوگئی اور ایک عظیم فتنہ برپا ہوا۔ یہ سارے فتنے معاویہ کی موت کے بعد پیش آئے۔ پھر ابن المہلب کا فتنہ خراسان میں شروع ہوا، زید بن علی کا کوفہ میں قتل ہوا، جن کے ساتھ بہت سے لوگ مارے گئے۔ پھر ابو مسلم خراسانی نے بغاوت کی اور اس کے ہمراہ مختلف جنگ اور فتنے پیدا ہوئے جن کا تاریخ کے دیکھنے سے علم ہوگا۔

غرض وضع حدیث کا فتنہ مذکورہ فتنوں سے پہلے یقین کرنا مشکل ہے، بالکل اسی طرح جیسے صحابہ کے ہوتے ہوئے وضع احادیث عقل میں آنے والی بات نہیں۔ اس لیے کہ صحابہ حضورؐ پر کذب کی تہمت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے، یہ ناممکن ہے کہ صحابہ نے اپنا طریق بدل دیا ہو، ان کا ضمیر مردہ ہوگیا ہو، جب کہ انھوں نے خود کو اور اپنے مال

کو رسولِ خدا کے ایک اشارے میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر کبھی دریغ نہ کیا۔ ہر طرح سے حضور کی جانب سے مدافعت کی، اپنا گھربار چھوڑا، طرح طرح کی تکالیف واذیت، زندگی کی تلخیاں برداشت کیں، صرف حضورؐ کی دعوت وفرمان کے قبول کرنے پر۔ ایسوں سے حضور پر بہتان وافترا، جھوٹ کو عقل سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ صحابہ وہی ہیں جو آپؐ کی زیرتربیت پروان چڑھے، آپ کے مدرسہ میں زیرتعلیم رہے، آپؐ کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے، آپؐ کی ہر قدم پر پیروی کی۔ ان میں جو احتیاط، پرہیزگاری، پارسائی اور خشیت الٰہی تھی وہ اہل علم وہوش سے مخفی نہیں ہے۔ اس لیے رسولِ خدا کے خلاف وضع احادیث کو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

بعض ہوا پرستوں نے صحابہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض صحابہ وتابعین پر الزام لگایا ہے کہ حضرت علی کے بارے میں طعن اور الفاظ شنیعہ کا استعمال کرتے اور ان کے خلاف تبراء کرتے تاکہ امیر معاویہ کو خوش کریں۔ یہ ساری باتیں گھڑت ہیں ان کا حقیقت وصداقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ وہ صحابہ جن کو موردِ الزام گردانا ہے، ابو ہریرہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور تابعین میں سے عروۃ بن الزبیر ہیں۔ لیکن صحابہ کی سیرت کا بصیرت کے ساتھ مطالعہ ان مطاعن کے کذب وافترا ہونے پر دال ہے، تاریخ ان تمام الزامات کی تکذیب کرتی ہے کہ صحابہ سے حضور کی زندگی یا آپ کی وفات کے بعد اس قسم کی کوئی بات صادر ہوئی ہو۔ صحابہ کے بارے میں جھوٹ اور وضع حدیث کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جب کہ صحابہ حضورؐ کی زبانی یہ سن چکے تھے: من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار، دوسری جگہ حضور نے فرمایا: ان كذباً عليّ ليس ككذب على أحد، من كذب عليّ فليتبوأ مقعده من النار۔ کیا ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے کوئی صحابی اس کی جرأت کر سکتا ہے کہ وہ حضور پر جھوٹ کی تہمت باندھے؟ حضور کی صحبت نے جو نور صحابہؓ کے دلوں میں سمو دیا تھا اس کے ہوتے ہوئے ایسی باتوں کا ذکر ہی بے ہودہ وبے معنٰی ہے۔

صحابہ کی اکثریت فتنوں سے دور رہی، ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو بدعات کا مخالف نہ ہو، جو گمراہی سے دور نہ رہا ہو۔ بلکہ اس کے واضح دلائل ہیں کہ انہوں نے سنت کو تحریف و تاویل سے بچانے کی جان توڑ کوشش کی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ کے اوراق میں کہیں نہ کہیں اس کا اشارۃً ذکر پایا جاتا، صحابہ کا طرۂ امتیاز احتیاط وتقویٰ تھا، ان کا علم ایسا مستحضر تھا کہ وہ صحیح اور موضوع کو دیکھتے ہی یا سنتے ہی پہچان جاتے۔ پھر حق گوئی کی جو قوت خدا نے انہیں دی تھی وہ دنیا کی کسی قوم، کسی نبی کے اصحاب کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ کبھی کسی جابر کے سامنے نہیں جھکے، نہ کسی اثر و رسوخ کو دین کے مقابلہ میں قبول کیا۔ انہوں نے کبھی کسی ملامت ومخالفت کی پرواہ نہ کی۔ تاریخ اسلامی کو اپنے اکابر پر فخر ہے، یہ بے مثال راہنما تھے، اس لیے وضع حدیث کے الزام کا شعلہ خود ان کے مخالفین ہی کو خاکستر کر گیا۔

جس طرح یہ بات صحابہ کے لیے صادق آتی ہے، کبار تابعین اور علماء تابعین کا بھی بالکل یہی حال ہے۔ تابعین وتبع تابعین میں بعض خوارج اور دوسرے سیاسی فرقوں کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ وہ لوگ جو دین میں کمزور تھے اور ابھی ان کے آبائی دین کی عظمت و رسوخ ان کے دلوں سے نہ نکلی تھی وہی اس میں مبتلا ہوئے، باقی سبھی صحابہ وتابعین وتبع تابعین اس ہنگامے سے محفوظ رہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ صحابہ کے دور میں تو یہ چیز تھی ہی نہیں، تابعین بھی اس سے تقریباً محفوظ ہی رہے۔ البتہ تبع تابعین کے زمانے میں یہ چیز زیادہ پھیل گئی تھی، اس لیے کہ امت میں جھوٹ کی قیمت کسی قدر زیادہ ہوگئی تھی۔ قرب عہد نبویؐ کی وجہ سے دوسرے فتنوں نے ابھی دین و مذہب کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا، اس لیے صحابہ تابعین وتبع تابعین وضع احادیث کے فتنے سے بڑی حد تک محفوظ رہے مگر اس کے بعد اس میں اضافہ ہوا۔ احادیث موضوعہ کا سب سے بڑا گڑھ عراق تھا، اس لیے کہ قدیم تہذیب وثقافت کے آثار یہاں زندہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اکثر فتنے اور حوادث پیدا ہوئے اور دینی فرقوں کی نشوونما بھی یہیں ہوئی، دوسرے علماء ومحدثین کی تعداد ان علاقوں میں کم تھی۔ عراق کو اس قدر شہرت تھی کہ وضع احادیث کا ٹکسال کہا جانے لگا۔ اہل مدینہ عراق

واہل عراق کی بیان کردہ احادیث کو بڑی دقت نظر سے دیکھتے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اہل عراق کی احادیث اہل کتاب کی احادیث کے ہم پلہ ہیں، لاتصدقوھم ولاتکذبوھم، نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ عبدالرحمان بن مہدی نے حضرت مالک سے ایک بار کہا کہ ابوعبداللہ مدینہ میں چارسو حدیثیں چالیس دن میں بیان کرتے ہیں مگر ہمارے یہاں عراق میں تو ایک ہی دن میں چارسو حدیثیں بیان کی جاتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ تمھارے وہاں ٹکسال گھر ہے، جہاں راتوں رات حدیثیں تیار ہوتی ہیں اور دن میں سکہ رائج الوقت بن جاتی ہیں۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں حدیث اگر ایک بالشت ہوتی ہے تو وہ عراق میں پہنچ کر گز بھر ہو جاتی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ایک جماعت سے جو آپ سے حدیث کی سماعت کے لیے آئی تھی، فرمایا کہ عراق میں ایک جماعت ہے جو جھوٹ بولتی ہے اور سچوں کو جھٹلاتی اور مذاق اڑاتی ہے۔

اسباب وضع حدیث

اس سے پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ وضع حدیث کا بنیادی سبب امت کا مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہونا ہی تھا، جس نے بعد کو دین کی صورت اختیار کرلی۔ ہر گروہ نے یہ کوشش شروع کردی کہ اپنے موقف کی تائید یا اپنی رائے کی تصویب وضع حدیث کرکے اس کو رسول خدا کی نسبت سے مؤکد و مؤید بنائیں۔ اس کے بعد اور بھی اسباب پیدا ہوئے جن کا وضع حدیث میں بڑا کردار ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) سیاسی فرقے

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد سب سے پہلے شیعان علی پیدا ہوئے پھر معاویہ کی جماعت سامنے آئی اور جنگ صفین کے بعد خوارج وجود میں آئے، ان میں ہر جماعت نے احادیث کی وضع میں حصہ لیا۔

(الف) شیعہ اور ان کے مخالفین کا وضع حدیث میں اثر

نہج البلاغہ کی شرح میں ابن ابی الحدید نے کہا ہے کہ فضائل کی احادیث میں سب سے پہلے جھوٹے فضائل کا آغاز شیعوں نے کیا۔ انہوں نے اپنے بڑوں کے بارے میں ابتداء حدیثیں گھڑی جس کا سبب اپنے دشمنوں کی مخالفت اور ان کو زک دینا تھا۔ پھر ان کے مخالفین نے دیکھا کہ شیعہ تو بازی مار لے گئے، تو انہوں نے ان احادیث کے مقابلہ میں اپنی تائید میں حدیثیں گھڑنی شروع کردی۔ وضع حدیث کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض ہوا پرست علمائے اسلام نے تشیع کو اپنی خواہشات کے لیے ڈھال بنایا اور اسی راستے وہ اپنے ناپاک مقاصد تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس طرح بہت سے فتنے تو اہل بیت کے نام پر ظہور پذیر ہوئے۔ چنانچہ اہل بیت کو بڑی بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان مشکلات میں حضرت علی کی اولاد کو قربانی کا بکرا بنا پڑا۔ تاریخ میں یہ دردناک واقعات پڑھنے سے دل دہل جاتا ہے، جگر شق ہوجاتا ہے، شدت تکلیف سے بدن کانپ جاتا ہے۔ یہ سارے مشکلات ونوائب تو اپنے اہل بیت کے نام کو دشمنوں نے اپنے کاز کے لیے استعمال کرنے پر برسائے، یہ فریب کار وہی ہیں جنھوں نے اپنے مشن کی تائید میں وضع احادیث کی اور اس کاروبار کی پوری طرح پشت پناہی کی۔ حاشا وکلا ہم کو اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا کہ حسن وحسین، محمد بن حنفیہ، جعفر صادق، زید بن علی، اراکین اہل بیت رسول حضورؐ کے اوپر جھوٹی باتیں بیان کرنے میں کبھی بھی کسی زندیق کی موافقت کرسکیں گے، یا ادنیٰ تال میل ایسے ناب کاروں سے رکھ سکیں گے، اس لیے کہ ان کے تقویٰ، احتیاط، پاکبازی، صفائی قلب میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ اہل بیت اور رسول خدا کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں؟ ان کے یہاں تو اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس لیے ہم اس بحث کے آغاز سے پہلے ہی ان کے متعلق برأت اور پاکبازی کا اظہار کردیتے ہیں کہ اہل بیت رسول اس سے قطعاً مبرا تھے۔ حدیثوں کے گھڑنے کی ساری کہانی انہی بدبخت شیعوں کا کارنامہ ہے جو اپنی سیہ زوری کو چھپانے کے لیے اہل بیت رسول کا نام لیتے رہے، اگر انہوں نے اہل بیت رسول کے ساتھ کوئی خیر کیا تو اس کے سوگنا ان کے ساتھ برائی کی، چنانچہ ابن جوزی لکھتے ہیں:

حضرت علی کے حقیقی فضائل بے شمار ہیں مگر شیعوں نے وضع احادیث فضائل کر کے ان کے مرتبہ کو فروتر کر دیا، چہ جائے کہ اسے برتر کرتے۔ انہوں نے وضع حدیث میں ایسی نابکار سعی کی کہ عراق کا وزن ہی ختم کر دیا۔ اہل مدینہ عراق والوں کی حدیث سن کر اپنے کو بچانے کی کوشش کرتے۔ اس لیے کہ ان کے صحیح و سقیم کا تمیز کرنا مشکل تھا، جیسے کوئی اجنبی کسی ایسے شہر میں پہنچ جائے جس کا پچاس فیصدی جھوٹوں اور خائنوں پر مشتمل ہو، ایسا آدمی تو وہاں حیرت میں رہے گا، جب تک کہ اسے ثقہ اور صدوق کی تمیز نہ ہو جائے۔ حضرت علی کے بعض اصحاب کا یہ جملہ آب زر سے لکھا جائے گا قاتلهم الله أي علم أفسدوا (اللہ انہیں غارت کرے، انہوں نے کس علم میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کی ہے)۔ حضرت عامر شعبی فرماتے ہیں کہ جتنا جھوٹ اس امت میں حضرت علی کے بارے میں بولا گیا ہے کسی اور کے بارے میں اتنا جھوٹ نہیں بولا گیا۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ روافض نے جھوٹ کا ریکارڈ توڑ دیا ہے، ابن مبارک فرماتے ہیں کہ دین علمائے حدیث کے پاس اور حیلے اہل رائے کے پاس اور جھوٹ روافض کے پاس ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کہ روافض کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا ان کی بات نہ کرو، ان کی روایت نہ لو وہ کھلے جھوٹے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ روافض سے زیادہ کذاب میں نے کسی کو نہیں پایا۔ یزید بن ہارونؒ فرماتے ہیں کہ کسی بدعتی کی کوئی بات ذکر کی جا سکتی ہے اگر اس کی پشت پر کوئی گھناؤنا مقصد نہ ہو، مگر روافض کی کوئی بات نہ لی جائے کہ وہ خالص جھوٹ بولتے ہیں۔ حماد بن مسلمہ نے کہا کہ ایک شیخ نے جو شیعیت سے توبہ کر چکا تھا، بیان کیا کہ وہ لوگ جب اکٹھا ہوتے اور کوئی چیز پسند آتی تو اسے حدیث کی شکل دے دیتے۔

شیعوں نے جھوٹی احادیث کا انبار لگا دیا اور بعض حدیثوں کا چہرہ بگاڑ کر اپنی خواہشات یا اپنے فرقے کے مطابق کر لیا جو روزانہ ایک نئے چولے پر پڑھے جاتے تھے، حضرت علی کے مناقب میں اور حضرت معاویہ اور بنی امیہ کے معائب میں حدیثیں گھڑ کے رکھ دی۔ اس طرح اموی خلفاء کی بھی دھجیاں بکھیر دی، موضوعات کی کتابیں ان کی احادیث سے بھری

پڑی ہیں۔ان میں سے ذیل میں چند کا ذکر کریں گے،اور اس کا بھی تذکرہ کریں گے کہ ان کے مخالفین پر اس کے دوررس اثرات کیا مرتب ہوئے۔

شیعوں نے حضرت علی کو رسول خدا کا وصی بتانے کے لیے بہت سی حدیثیں گھڑیں، مثلاً:

"وصی، وموضع سری، وخلیفتی فی أهلی، وخیرمن أخلف بعدی علی، یاعلی أخصك بالنبوة ولانبی بعدی، ان لکل نبی وصیا و وارثا ووارثی علی بن أبی طالب، اب اسی طرح حدیث، لما أن عرج بالنبی صلی الله علیه وسلم أراه الله من العجائب فی کل سماء فلما أصبح جعل یحدث الناس من عجائب ربه وکذبه من کذبه من أهل مکة وصدقه من صدقه فعند ذلك انقض نجم من السماء فقال النبی صلی الله علیه وسلم فی دار من وقع هذالنجم فهو خلیفتی من بعدی، وطلبوا ذلك النجم فوجدوه فی دارعلی بن أبی طالب رضی الله عنه فقال أهل مکة ضل محمد وغویٔ وهوی أهل بیته، ومال الی ابن عمه فعند ذلك نزلت هذه السورة "والنجم اذاهوی"۔ اسی طرح حدیث خلقت أناوعلی من نور وکنا علی یمین العرش"

(''میرے وصی اور راز دار، میرے اہل وعیال کے لیے میرے خلیفہ، میرے بہترین خلیفہ علی ہیں۔اے علی! میں تجھے نبوت کے لیے مخصوص کرتا ہوں، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، ہر نبی کے لیے وارث ووصی ہوتا ہے۔میرے وارث ووصی علی بن ابی طالب ہیں) اور حدیث (جب نبی کی معراج ہوئی تو اللہ نے ہر آسمان پر انہیں عجائب کا نظارہ کرایا، صبح آپ نے اپنے رب کے عجائب کا ذکر لوگوں سے کیا، بعض نے اسے جھٹلایا اور بعض نے اس کی تصدیق کی، اسی دوران آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا، آپؐ نے فرمایا کہ جس کے گھر میں یہ ستارہ گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا، لوگوں نے جب تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی

کے مکان میں گرا ہے، اہل مکہ نے کہا کہ محمد گمراہ ہوگیا اور اپنے اہل بیت کی ہوس میں مبتلا ہوگیا، اور اپنے چچازاد بھائی کی طرف اس کا میلان ہوگیا، اس وقت آیت والنجم اذا ھوی نازل ہوئی)۔اس طرح حدیث (میں اور علی نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ہم دونوں عرش کے دائیں جانب تھے")۔

اسی طرح جب جیسی ضرورت ہوئی حدیثیں گھڑ لیں مثلاً:

"ستكون فتنة فان أدركها أحد منكم فعليه بخصلتين كتاب الله وعلي بن أبي طالب وهو خليفتي من بعدي "ومن لم يقل علي خيرالناس فقد كفر" والنظر الى علي عبادة "وحب علي يأكل السيئات كما تأكل النار الحطب" ومن أراد أن ينظرالى آدم في علمه ونوح في فهمه و ابراهيم في حكمه ويحيىٰ في زهده و موسىٰ في بطشه فلينظرالى علي "ومن مات وفي قلبه بغض لعلي ابن ابي طالب فليمت يهود يا أونصرا نيا" مثلي شجرة أنا أصلها وعلي فرعها والحسن والحسين ثمرتها والشيعة ورقها فأى شئ يخرج من الطيب الا الطيب"

"میرے بعد ایک فتنہ برپا ہوگا جو اس وقت رہے گا اسے چاہیے کہ کتاب اللہ اور علی کو اختیار کرلے، کیونکہ وہی میرے بعد میرے خلیفہ ہیں، جس نے علی کو خیر انام نہیں مانا وہ کافر ہے، اور دیدار علی عبادت ہے، حب علی گناہوں کو ایسے کھاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو، جو آدم کے علم، نوح کی فراست، ابراہیم کی حکمت اور یحییٰ کے زہد اور موسیٰ کی شدت کو دیکھنا چاہے وہ علی کو دیکھ لے، جو علی سے بغض کی حالت میں مرا وہ یہودی یا نصرانی ہو کر مرا، میری مثال ایک درخت کی ہے جس کی اصل میں ہوں، اور علی اس کی شاخ اور حسن وحسین اس کے پھل ہیں، اور شیعہ اس کی پتیاں ہیں، اچھی چیز سے صرف اچھی چیز نکلتی ہے"۔

اور اسی طرح حدیث:

"من أحبني فليحب عليا ومن أبغض عليا فقد أبغضني ومن أبغضني فقد أبغض الله ومن أبغض الله أدخله الله النار"

"جس نے مجھ سے محبت کی اسے علی سے بھی محبت کرنی چاہیے، اور جس نے علی سے بغض کیا اس نے مجھ سے بغض کیا، اور مجھ سے بغض کا مطلب بغض الٰہی اور اس کا نتیجہ جہنم ہے"

اور یہ حدیث:

"يا علي ان الله غفرلك ولذريتك ولوالديك ولأهلك ولشيعتك ولمحبي شيعتك"

"اے علی، اللہ نے تمہاری اولاد، والدین، اہل وعیال، تمہارے شیعان اور ان سے محبت کرنے والوں کے گناہ معاف کر دیئے"

اسی پر بس نہیں کیا، شیعوں نے ایسی حدیثیں بھی گھڑیں جس میں ابوبکرؓ، عمرؓ وغیرہ صحابہ کی جانب ایسی گھناؤنی باتیں منسوب ہیں جن کو سن کرتے آتی ہے۔ اس سلسلے میں ابن ابی الحدید نے کہا ہے:

یہ کیا ہیں گھناؤنے قسم کے معاملات جن کا شیعوں نے ذکر کیا ہے کہ عرش صحرائی فاطمہ کے گھر میں تھا اور عمر نے انہیں دروازہ اور دیوار کے درمیان دبوچا، اور علی کی گردن میں رسی ڈالی، انہیں گھسیٹا۔ یہ ساری باتیں ہمارے نزدیک بے اصل ہیں اور ہم میں سے کوئی اس کو تسلیم نہیں کرتا، نہ علمائے حدیث نے اس کی روایت کی نہ کسی نے اس کا ذکر کیا، صرف شیعہ حضرات ایسی باتیں نقل کرتے ہیں۔

دوسرے گروپ کے وضاعین نے دیکھا کہ ان احادیث سے ابوبکر، عمر وعثمان ومعاویہ کی ہوا خیزی معلوم ہوتی ہے تو انہوں نے بھی اس کے مقابل حدیثیں بیان کیں، جس سے شیخین کی شان میں اضافہ ہو اور معاویہ کی قدر افزائی ہو۔ اس سلسلے کی ایک حدیث سنیئے:

"لما عرج بي الى السماء قلت اللهم اجعل الخليفة من

بعدی علی ابن أبی طالب فارتجت السماوات وهتف بی الملائکة من کل جانب یا محمد اقرأ وما تشاؤون الا أن یشاء الله قد شاء الله أن یکون من بعدك ابو بکر الصدیق"

"جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں نے کہا اے خدا میرے بعد خلیفہ علی بن طالب کو بنائیے، تو آسمان کپکپا اٹھا اور تمام طرف سے ملائکہ نے شور مچایا اے محمد پڑھئے "وما تشاؤون الا أن یشاء الله" خدا نے تمھارے بعد ابوبکر صدیق کو چاہا ہے"

یا عبداللہ بن جراد والی حدیث:

"کنا عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فأتی بفرس فرکبه ثم قال: یرکب هذاالفرس من یکون الخلیفة بعدی فرکبه أبوبکر"

"ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ کے پاس ایک گھوڑا لایا گیا، آپ اس پر سوار ہوئے، آپ نے فرمایا، میرے بعد اس گھوڑے پر وہی سوار ہوگا جو خلیفہ ہوگا، چنانچہ ابوبکر سوار ہوئے"

اور یہ حدیث:

"أن أبابکر قال للنبی صلی الله علیه وسلم انی کنت معك فی الصف الأول فکبرت وکبرت فاستفتحت بالحمد فقرأتها فوسوس الی شئی من الطهور فخرجت الی باب المسجد فاذا أنا بهاتف یهتف بی وهو یقول وراء ك فالتفت فاذأنا بقدح من ذهب مملوء بماء أبیض من الثلج وأعذب من العسل وألین من الزبد، علیه مندیل أخضر مکتوب علیه لااله الاالله الصدیق ابوبکر فأخذت المندیل فوضعته علی منکبی وتوضأت للصلاة وأسبغت الوضوء ورددت المندیل علی القدح و لحقتك وأنت راکع الرکعة الأولی فتممت صلاتی معك یا رسول الله فقال

النبی صلی الله علیه وسلم أبشر یا أبابکر الذی وضأك للصلاة جبریل والذی مندلك میکائیل والذی مسك رکبتی حتیٰ لحقت الصلاة اسرافیل" (الفوائد المجموعة، ۳۳۰)

"ابو بکرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ صف اول میں تھا، آپ نے تکبیر کہی میں نے تکبیر کہی، آپؐ نے الحمد پڑھی میں نے پڑھی، اچانک مجھے پاکی کی حاجت محسوس ہوئی، پھر میں مسجد کے دروازہ کی طرف آیا تو مجھے ایک پکارنے والے نے پکارا کہ پیچھے دیکھو، میں متوجہ ہوا تو دیکھا کہ ایک پیالہ سونے کا ہے جس میں برف سے زیادہ سفید پانی اور شہد سے زیادہ شیریں اور مکھن سے زیادہ چکنا اس پر ایک سبز رومال ہے، جس کے اوپر لا الہ الا اللہ لکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی لکھا ہوا ہے کہ صدیق ابوبکر ہیں، میں نے اسے اپنے مونڈھے پر رکھ لیا اور نماز کے لیے وضو کیا اور مکمل طور سے وضو کیا اور مندیل کو پیالہ پر ڈال دیا اور آپ کی نماز میں شریک ہو گیا، آپ پہلی رکعت کے رکوع میں تھے، میری نماز آپ ہی کے ساتھ ختم ہو گئی یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا مبارک ہو ابوبکر جس نے تمہیں وضو کرایا نماز کے لیے جبریل تھے، اور جو تمہارے پاس تھے میکائیل تھے اور جس نے میرے گھٹنے پکڑ رکھے تھے کہ تم آ کر نماز میں مل جاؤ وہ اسرافیل تھے"

غرض اس طرح کی سیکڑوں حدیثیں اس گروپ نے بھی وضع کر لیں جو مطولات میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

وضاعین و کذابین نے امیر معاویہؓ کے سلسلے میں اس قسم کی حدیثیں وضع کر لیں، انہی حدیثوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بنو ہاشم کی ایک جماعت نے کتابت وحی کو معاویہ سے لینے کی پلاننگ کی، رسول خدا پر حضرت معاویہ ہی سے کتابت حدیث کے لیے وحی آئی۔ اس قسم کی حدیثوں میں سے یہ بھی ہے کہ رسول خدا نے حضرت علی سے قلم چھین کر حضرت معاویہ کو دے دیا۔ یا یہ حدیث کہ دین تین میں ہے میں، جبرئیل اور معاویہ۔ یا یہ حدیث کہ حضورؐ نے حضرت معاویہ کو ایک تیر عطا فرمایا کہ لو اس کے ساتھ ہی جنت میں ملو گے۔

یا وہ حدیث کہ لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ، حب معاویۃ فرض علی عبادی، شیعوں نے حدیث اللھم ارکسھما فی الفتنۃ رکسا اللھم دعھما الی النار دعا (اے اللہ ان دونوں کو فتنہ میں اوندھا کر دے، اور جہنم میں ڈھکیل دے)، جو کہی جاتی ہے کہ حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص کے سلسلے میں ہے اس لیے کہ ان لوگوں کو بھی موسیقی سے شغف تھا، حالانکہ یہ بات بالکل ہی غلط ہے، یہ حدیث معاویہ بن رافع، عمرو بن رفاعہ کے بارے میں ہے راوی نے نام کی تحریف کر دی۔

معاویہ کے گروپ کے لوگوں میں سے کسی نے یہ حدیث وضع کی کہ حضورؐ نے ابو ہریرہؓ سے فرمایا ابو ہریرۃ جہنم میں کرنجی آنکھوں والے دو کتے ہوں گے، ان کے سرین پر گھوڑے کی دم کی طرح بال ہوں گے، اگر ان میں سے کسی کو خدا اجازت دے دے کہ وہ ساتوں آسمان کو لقمہ بنا کر نگل جائیں تو اس کے لیے آسان ہوگا۔ یہ کتے معاویہ پر لعنت کرنے والوں پر مسلط کیے جائیں گے۔

غرض اس قسم کی حدیثیں ہر فرقہ نے اپنی تائید میں گھڑی تھیں تا کہ اپنی جماعت کے زعیموں کا مرتبہ لوگوں میں بلند کریں۔ خدا کے رسول کے ساتھیوں کے جو فضائل حسب صحیح ثابت ہیں وہ ان کے اعزاز کے لیے کافی ہیں۔ مگر برا ہو جہالت کا جس نے ان کے دلوں کو اندھا بنا دیا تھا۔ بعض لوگ جن کی نیتیں صاف تھیں، جب انہوں نے ان گروہوں میں آپس میں لعن وطعن کو دیکھا جس سے صحابہ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور ان کی کسر شان ہونے لگی اور انہیں خوف ہوا کہ ان کے فضائل برباد نہ ہو جائیں، تب صحابہ سے ان کی محبت نے انہیں فضائل صحابہ اور ان کی رفع شان میں احادیث وضع کرنے پر مجبور کیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی حسن نیت کی بنا پر بزعم خویش اسے ایک نیک عمل گردانا، جس سے صحابۂ کرام پر کیے جانے والے لعن وطعن پر لگام کسی جا سکے، اور گالی گلوج کا سد باب کر کے ملت کی شیرازہ بندی کی جا سکے۔ لیکن یہ سادہ لوح یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ بھی رسول خدا پر کذب کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ حدیث بھی سامنے آئی:

"ان الله أمرني أن أتخذ أبابكر والدا، وعمر مشيرا، وعثمان سندا، وأنت يا علي ظهيرا، أنتم أربعة، قدأخذ الله لكم الميثاق في أم الكتاب، لايحبكم الّا مؤمن تقي ولا يبغضكم الا منافق مسئی أنتم خلفاء نبوتي وعقد ذمتي"

"خدا نے مجھے حکم دیا کہ ابوبکر کو والد تسلیم کروں اور عمر کو مشیر اور عثمان کو سند، اور اے علی تم میرے پشتی بان ہو، تم چار ہو خدا نے تمھارے ہی لیے ام الکتاب میں میثاق لی ہے، تم سے وہی محبت کرے گا جو مومن پرہیزگار ہو، تم سے نفرت وہی کرے گا جو منافق اور گنہگار ہوگا، تم میرے نبوت کے خلیفہ ہو اور میری ذمہ داریوں کی دستاویز ہو"

اسی طرح یہ حدیث:

"ينادي مناد يوم القيمة من تحت العرش أين أصحاب محمد؟ فيؤتى بأبي بكر و عمر و عثمان و علي رضي الله عنهم و أبوبكر وزيري والقائم في أمتي من بعدي، وعمر حبيبي ينطق على لساني وأنا من عثمان و عثمان مني و علي أخي وصاحب لوائي، وأبوبكر أوزن أمتي وأرحمها و عمر بن الخطاب خير أمتي وأكملها عثمان بن عفان أحي أمتي وأعدلها وعلي بن أبي طالب ولي أمتي و أوسمها وعبدالله بن مسعود أمين أمتي و أوصلها وأبوذر أزهد أمتي و أرقها و ابودرداء أعدل أمتي و أرحمها و معاوية بن سفيان أحلم أمتي و أجودها، ومن حديث طويل ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا لعنة الله على مبغضي أبي بكر و عمر و عثمان وعلي"

"قیامت کے دن ایک نداد ینے والا عرش کے نیچے سے ندا دے گا کہ کہاں ہیں اصحاب محمدؐ جو ان کی نبوت کو تسلیم کرنے والے ہیں، ابوبکر و عمر و عثمان و علی۔ ابوبکر میرے وزیر ہیں اور انتظام چلانے والے ہوں گے میرے بعد میری امت کا، اور عمر میرے محبوب ہیں اور میری زبان پر گفتگو کرتے

ہیں، اور میں عثمان سے ہوں اور عثمان مجھ سے، اور علی میرے بھائی ہیں اور میرے پرچم برادر ہیں، ابوبکر امت کے سب سے گرامی آدمی ہیں اور امت میں سب سے زیادہ رحم دل ہیں، عمر بن خطاب میری امت کے سب سے زیادہ عمدہ آدمی ہیں اور سب سے زیادہ مکمل ہیں، عثمان بن عفان میری امت کے سب سے اچھے اور انصاف پسند آدمی ہیں اور علی بن اُبی طالب میری امت کے ولی ہیں اور سب سے زیادہ نمایاں ہیں، عبداللہ بن مسعود میری امت کے امین ہیں اور سب سے زیادہ قریب رہنے والے ہیں، ابوذر میری امت کے سب سے بڑے زاہد ہیں اور سب سے زیادہ رقیق القلب ہیں، ابو درداء میری امت کے سب سے زیادہ انصاف پسند اور رحیم ہیں، اور معاویہ بن سفیان میری امت کے سب سے زیادہ بردبار اور سخی آدمی ہیں، اور حدیث طویل کے بعد رسولؐ نے فرمایا کہ خدا کی پھٹکار ہے ان پر جو ابوبکر و عمر و عثمان و علی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"

غرض موضوعات میں نمایاں حصہ شیعہ حضرات کا نظر آتا ہے، ان کے مقابلے میں دوسرے بازی نہ لے جا سکے۔

(ب) خوارج اور وضع حدیث

خوارج کے وضع حدیث کی شہادتیں بہت کم دستیاب ہیں، اس لیے کہ ان کو اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے اور اپنے موقف کو مدلل کرنے کے لیے حدیثوں کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ لیکن بعضوں نے ان کے بارے میں بھی لکھ مارا ہے۔ چنانچہ ابن لھیعہ نے بیان کیا کہ میں خوارج کے ایک شیخ سے ملا جو اس عقیدہ سے تائب ہو چکا تھا، اس کا قول نقل کیا ہے کہ احادیث دین ہیں، اس لیے احادیث کو اختیار کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارا طریق یہ رہا کہ جب ہم نے کسی بات کو دین بنانا چاہا تو اس کے لیے حدیث بنالی۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن عبدالکریم نے بیان کیا کہ مجھ سے ایک خارجی نے بیان کیا کہ حدیث دین ہے، کس سے لے رہے ہو دیکھتے رہو۔ جب بھی ہم نے کسی امر کی خواہش کی اس کے لیے ایک حدیث بنالی۔ سیوطی نے بھی اسی قسم کی بات نقل کی ہے۔ ان تینوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ خوارج نے بھی وضع حدیث سے کام لیا، لیکن ہم کو ان کے بارے میں کوئی واضح دلیل نہیں ملی۔ چونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ کبیرہ کا مرتکب کافر وجہنمی ہے اور جھوٹ ان کے یہاں بھی کبائر میں سے ہے، اس لیے وضع حدیث کا پہلو ان کے بارے میں کمزور معلوم ہوتا ہے۔

اس پر بہت سی دلیلیں ہیں کہ خوارج کی بیان کردہ حدیثیں سچ ہوتی ہیں۔ ابن تیمیہ نے بھی اس باب میں لکھا ہے۔ چنانچہ وہ روافض کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ہم خوارج کو تم سے بھی زیادہ برا مانتے ہیں، بایں ہمہ ان کو کذب کی تہمت لگائیں، ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم نے ان کا بارہا تجربہ کیا ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں اور سچ کی حمایت کرتے ہیں۔ جرح وتعدیل کی کتابوں کو دیکھنے والوں پر یہ چیز واضح ہے کہ شیعہ سب سے زیادہ کذاب ہیں اور خوارج حدیث کے سلسلے میں سچے ہیں، انہوں نے جو حدیث بھی روایت کی ہے وہ سچ کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے لکھا ہے لیس فی أصحاب الأھواء أصح حدیثا من الخوارج (الکفایۃ ص ۱۳۰) (غلط مذہب رکھنے والے لوگوں میں خوارج سب سے زیادہ صحیح الحدیث ہیں)۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے بھی یہی کہا ہے کہ خوارج کے بارے میں وضع حدیث کی تہمت زنادقہ کا فتنہ ہے، ان سے جھوٹ دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ وہ محتاط اور پاکباز تھے۔

(۲) اعداء الاسلام زنادقہ

اسلام نے کسریٰ وقیصر کی سلطنتوں کا تیاپانچہ کر دیا اور ملوک وامراء جو اپنے ماتحت ٹکڑیوں پر حکومت کرتے تھے ان کی تمکنت ورعب کا خاتمہ ہو گیا جو ان کو طرح طرح کے عذاب دیتے تھے، ان کی دولت اور گاڑھی کمائی چھین لیتے، ان کی اولاد کو غلام بناتے، ان کے ماتحت ایک ایسا طبقہ تھا جو چاپلوسوں میں شمار ہو کر خواص کہلاتا، بادشاہوں کے علاوہ ان کی رعایا پر مظالم کرتا، ان کی رہی سہی پونجی کو بھی ہتھیاتا، اس کے لیے ان کے وسائل بہت بڑھے ہوئے تھے، غرض اس طبقہ کو ہر قسم کے مظالم ونوائب کا شکار ہونا پڑتا۔ اسلام کے آتے

ہی دلوں میں اس کی وقعت جاگزیں ہوگئی، یہ دبے دبائے لوگ اپنے نئے حکمرانوں سے نعمت آزادی کا مزہ چکھنے لگے اور انسانیت کو ایک آبرو اور اعزاز جان گئے۔ دوسری طرف حکمرانوں کی وہ اکڑ ختم ہوگئی، ان کے مناصب کا کوئی وقار باقی نہیں رہا، گویا وہ دن ہوا ہوئے کہ خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے کا منظر ہر طرف تھا۔ اب ان کے ہاتھ میں وہ حرام کی دولت باقی نہ تھی جسے وہ اللّلے تللّے خرچ کرتے، اس لیے کہ کمزوروں سے لوٹ کا خاتمہ ہوگیا۔ اب ان کمزوروں کی زندگی کی قیمت بڑھ گئی تھی، انہوں نے اسلام کو گلے لگایا تھا، اس لیے کہ ظلم کی دیواریں گر چکی تھیں۔ ان میں جو لوگ پہلے سوسائٹی میں ابھرے ہوئے تھے ان کا وزن کم ہو چکا تھا، اسے ان لوگوں نے برداشت نہیں کیا، اب ان کے پاس نہ مال تھا نہ فوج، نہ قوت کہ دوبارہ مسلمانوں کو مغلوب کرتے اور پھر اپنا سکہ چلاتے۔ اس لیے کہ اسلام کا دبدبہ، اس کا رعب، اس کی قوت مانع تھی، تو انہوں نے ایک دوسری رائے اپنے کو دوبارہ قوی کرنے کی سوچی۔ وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو عقیدہ کی راہ سے بدکا دو۔ اس کے لیے آسان ترکیب یہ تھی کہ حضورؐ کی طرف غلط سلط باتوں کا انتساب کریں، جس کا مقصد محض یہ تھا کہ لوگ اسلام سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہوتے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عقائد، عبادات و افکار کے ذریعہ اسلام کا چہرہ بگاڑنا شروع کر دیا۔ اب یہ مختلف روپ میں نمایاں ہوئے، اپنے نام الگ الگ ناموں سے رکھے۔ اگرچہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے، یہ دھوکہ، فریب اسلام کی قوت کے سامنے بکھر کر رہ گیا، اسلام کا مقصد بلند اور صفاء عقیدہ جگمگاتا ہوا آفتاب تھا۔

یہاں ہم ان کے کالے کرتوتوں میں سے چند بطور مثال کے ذکر کریں گے جو انہوں نے پیروان اسلام کے لیے رچے تھے تاکہ اسلام سے محبت کرنے والوں کو اس سے بدکا دیں۔ ان کی گندگی میں سے یہ روایت بھی ہے کہ یہود کی ایک جماعت حضورؐ کے پاس آئی اور آپؐ سے کہا کہ عرش کو کون اٹھائے ہوئے ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ شیروں نے اپنی سینگ پر اٹھا رکھا ہے، اور یہ کہکشاں جو آسمان پر نظر آرہی ہے بوجھ کی زیادتی سے نکلنے والا عرق ہے۔ یہود پکار

اٹھے کہ آپ سچ کہتے ہیں آپ رسول ہیں۔ ابوالقاسم بلخی نے کہا کہ یہ من گھڑت ہے، دنیا جانتی ہے مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور قرآن نے اعلان کیا ہے کہ حاملین عرش فرشتے ہیں۔ جو دین محمد کو نہ جانتا ہے نہ سمجھتا ہے اس طرح کی اکاذیب پر وہی ایمان لائے گا۔

زنادقہ اسلام کے لیے سب سے زیادہ ضرر رساں ثابت ہوئے یہ لوگ کھلا جھوٹ بولتے۔ عبدالکریم بن ابی العوجاء نے اپنے قتل سے پہلے ان باتوں کا اعتراف کرلیا تھا کہ میں جھوٹی حدیثیں بنایا کرتا تھا اور یوں بیان کیا:

بخدا میں نے تم میں چار ہزار حدیثیں گھڑیں جن میں حلال کو حرام بنایا اور حرام کو حلال۔ مہدی نے بیان کیا کہ زنادقہ میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اقرار کیا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں گھڑیں جو عام چلن بازار ہیں۔

حماد بن زید فرماتے ہیں کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں رسول خدا کے خلاف گھڑیں ہیں اور انہیں لوگوں میں پھیلایا، ایک روایت میں ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں گھڑیں اور پھیلائیں۔

مگر خدا بھلا کرے ان علمائے علم حدیث کا جنہوں نے ان حدیثوں کو اجاگر کرکے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ بگڑنے نہیں دیا، بلکہ اور سنوار دیا اور کاذبین حدیث کو طشت از بام کیا۔

(۳) قومی تفریق قبائلی شہری تعصب اور امام

امویوں نے حکومت کے کاروبار چلانے میں محض عربوں کو ہی حصہ دار بنایا، اور عرب و عربیت کا تعصب سب سے پہلے انہوں نے ابھارا۔ بعض عربوں نے دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کو ایک ایسے زاویہ نظر سے دیکھا جو روح اسلام سے کسی طرح موافق نہ تھی۔ چنانچہ موالی یعنی وہ مسلمان جو عرب کے علاوہ علاقوں کے رہنے والے تھے، انہوں نے اس علیحدگی پسندی کو بھانپ لیا۔ وہ یکسانیت و مساوات کے طالب تھے جو عربوں اور موالی میں قائم رہی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ امویوں کے خلاف شورش بغاوت اٹھتی رہی اور یہ موالی ان کے ساتھ ہمدردی یا دلچسپی رکھتے، ادھر عربوں میں اپنی عزت، فخر و نمائش کا بھوت سوار

تھا، دوسری طرف اس حالت نے غیر عرب لوگوں کو ایسی احادیث گھڑنے پر ابھارا جس سے ان کی قدر افزائی ہو اور ان کے فضائل میں اضافہ ہو، مثلاً یہ حدیث کہ جو لوگ عرش کے ارد گرد ہیں ان کی زبان فارسی ہے۔ یا یہ کہ خدا جب کوئی نرم بات اتارنا چاہتا ہے تو فارسی زبان میں وحی فرماتا ہے، اور جب کوئی سخت بات نازل کرنی ہوتی ہے تو عربی زبان میں وحی فرماتا ہے۔ اب کیا تھا فارسی کے مخالفین نے اس کے مقابل دوسری حدیثیں گھڑیں۔ خدا کو سب سے زیادہ ناپسند زبان فارسی ہے کیونکہ یہ شیطان کی زبان ہے اہل جہنم کی زبان فارسی ہے، اہل جنت کی زبان عربی ہے۔ یا یہ حدیث: سوڈانیوں کی بات نہ کرو، ان کی سیاہی حرام خوری و بدکاری کی وجہ سے ہے۔

اسی طرح بعض قبائل عرب کی فضیلت کی حدیثوں کا تعلق بھی اسی عصبیت سے ہے۔ یہ ساری وباء یزید بن معاویہ کی موت کے بعد دور اموی میں پیدا ہوئی۔ جس طرح نسل و قبائل کی فضیلت میں حدیثیں گھڑی گئیں، شہروں اور اماموں کی فضیلت میں بھی وضع حدیث کا چلن ہو گیا۔ پھر ایک تحریک جس میں دولت اسلامی کے مراکز مختلف شہروں میں منتقل کئے جانے لگے اس سے شہروں اور ائمہ کی تفضیل کے سلسلے میں وضع احادیث کا بازار گرم ہوا۔

ائمہ کے تفضیل کے سلسلہ میں جو عصبیت سامنے آئی وہ تیسری صدی ہجری کی پیداوار ہے۔ یہ عیب بھی بے علم پیروکاروں کا پیدا کردہ ہے۔ اسی تفضیل کی وجہ سے ان ائمہ کی قیام گاہوں کی تفضیل و تنقیص کی حدیثیں بنائی گئیں، مثلاً یہ کہ چار شہر جنت کے شہروں میں ہیں: مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور دمشق۔ اسی طرح ائمہ کے سلسلے میں آیا کہ میری امت میں محمد بن ادریس نام کا آدمی پیدا ہوگا جو میری امت کے لیے ابلیس لعین سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ اسی طرح میری امت میں ابوحنیفہ نام کا ایک شخص پیدا ہوگا جسے امت کی مشعل کہا جائے گا، اور ایک جگہ ہے کہ "میرے بعد نعمان بن ثابت نام کا ایک شخص آئے گا جس کی کنیت ابوحنیفہ ہوگی، اللہ کے دین اور میری سنت کا اختیار اس کے ہاتھوں میں ہوگا۔

(۴) واعظین وقصہ گو

خلافت راشدہ کے آخری دور میں واعظین و قصہ گویوں کی مجلسیں جمنا شروع ہو گئیں۔ اور دور خلافت راشدہ کے بعد تو تمام ممالک اسلامیہ کی مساجد میں ان کے حلقے اور مجالس روزمرہ ہو گئیں۔ واعظین کا مقصد اکثر اپنا بھاؤ بڑھانا ہوتا، لوگوں کا کثیر مجمع جمع کرنا ہی ان کی زندگی بن گئی، ظاہر ہے مجمع اکٹھا کرنے کے لیے ایسی باتوں کی ضرورت تھی جس سے ان کے دلوں میں اثر پیدا ہو۔ اس اثر انگیزی کے لیے حدیثیں وضع کی جاتیں تاکہ ان کی جانب میلان پیدا ہو، لوگوں کے دلوں میں گداز پیدا ہو۔ اب کیا تھا، جھوٹی حدیثوں کا سلسلہ ان مجالس میں جاری ہوتا، جس پر واہ واہ کے علاوہ واعظین کی آؤ بھگت اور ان کی اقتصادی و مالی آسودگی کا بھی سامان ہوتا، سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ یہ مجمع اسے خیر جانتا اس میں کوئی برائی اور گناہ نظر نہیں آتا۔

اور سننے والوں کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ وہ صرف سنتے ہی نہ تھے بلکہ اس جھوٹ بولنے یا اس جھوٹ کی مدافعت بھی کرتے، یہ عوام کسی دلیل و بحث سے کسی کی سنتے ہی نہ تھے، ان حدیثوں میں سے یہ حدیث ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے کہ اس کی شاخوں سے ملبوسات زرتار نکلیں گے اور جڑوں سے ابلق گھوڑا، جس پر سونے کا جڑا نمدا ہوگا اور موتی و یاقوت کی لڑی سے لگام بنی ہوگی، نہ پیشاب کرے گا نہ پاخانہ، اسی گھوڑے پر اولیاء اللہ بیٹھ کر جہاں چاہیں گے اڑتے پھریں گے۔

علمائے رجال نے ان واعظین کی دھجیاں بکھر دیں، ان کے جھوٹ کو کھول کر رکھ دیا۔ ان واعظین کے مریدین اٹھے اور اذیت پہنچائی۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں کو بڑی اذیتوں اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ امام شعبی نے کسی واعظ کی بیان کردہ حدیث کا بلاد شام میں انکار کیا، پھر کیا تھا عوام چل پڑے اور شعبی کی بری طرح مرمت کی تا آنکہ شعبی نے کہا کہ شیخ نے جو کہا ہے سچ ہے۔ اسی وجہ سے محدثین اپنے شاگردوں کو ان سے ملنے اور ان کی مجلسوں میں جانے سے روکتے تھے۔ چنانچہ عاصم کی روایت ہے کہ ہم

ابوعبدالرحمٰن سلمی کے پاس حاضر ہوئے، اور ہم لوگ ہم عمر لونڈے تھے، ہم سے انہوں نے کہا کہ واعظوں سے بچتے رہو، بجز ابوالاحوص کے، اور شقیق جو خوارج کی نمائندگی کرتا ہے اس کے پاس تو کبھی نہ جانا۔

بہت سے واعظ محض بھیک مانگنے والے ہوتے، ایسی حدیثیں گھڑتے جس سے لوگ ان کو زیادہ سے زیادہ رقم دے سکیں۔ ابن جوزی نے بسند جعفر بن محمد طیالسی بیان کیا کہ احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین جیسے گرامی بزرگ نماز پڑھ رہے تھے، ان کے درمیان ایک واعظ کھڑا ہوا اور احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین سے یہ روایت نقل کرنے لگا کہ حضور نے فرمایا کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہے اس کے ہر کلمہ سے ایک چڑیا جس کی چونچ سونے کی ہوگی خدا پیدا کرے گا، اس کے پَر مرجان کے ہوں گے۔ پھر ایک لمبی کہانی بیان کی جو بیس ورق سے بھی زیادہ طویل تھی۔ امام احمد بن حنبل اس کو سن کر یحییٰ بن معین کو دیکھنے لگے اور یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل کو اور پوچھا کہ تم نے یہ حدیث بیان کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ آج ہی سن رہا ہوں۔ اس کے بعد یحییٰ بن معین نے واعظ کو بلایا، اس نے سمجھا کچھ دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل، ہم لوگوں نے تو اس حدیث کو حضور سے نہ سنا نہ بیان کیا۔ اس پر واعظ نے کہا کہ عرصہ سے سنتا چلا آتا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے، آج تجربہ ہوا، تم ہی ایک یحییٰ بن معین ہو یا احمد بن حنبل، میں نے سترہ یحییٰ اور احمد دیکھے۔ امام احمد بن حنبل نے چہرہ پیٹ لیا اور کہا کہ چلو وہ واعظ احمق تھا، گویا ان کا مذاق اڑا رہا تھا۔

اس طرح کے سیکڑوں واعظ تھے جو سندوں کو طوطے کی طرح رٹے ہوتے اور موقع و مقام کے لحاظ سے حدیثیں گھڑ لیتے اور معترضین کے ساتھ وہی کرتے جو اس واعظ نے یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل کے ساتھ کیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ابوحاتم البستی نے بیان کیا کہ میں ایک مسجد میں داخل ہوا، نماز کے بعد ایک جوان کھڑا ہوا اور یہ حدیث بیان کی کہ مجھ سے ابوخلیفہ نے بیان کیا اور انسؓ تک سند بیان کی۔ میں نے اس سے وعظ کے بعد دریافت کیا

کہ ابوخلیفہ کو تم نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا پھر کیسے روایت کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ اعتراض دھینگا مشتی ہے، میں اس سند کو یاد رکھتا ہوں، کوئی حدیث بھی ہو اسی سند سے بیان کرتا ہوں۔

ایوب سختیانی نے بیان کیا کہ سب سے زیادہ احادیث کو تباہ و برباد کرنے والے واعظین ہیں۔ بجز واعظین کے علم حدیث کو کسی نے بھی فنا نہیں کیا۔

قرن اول کے قصاصین نے کم حدیثیں بنائیں، مگر بعد کو یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور خدا بھلا کرے ان علمائے رجال کا جنہوں نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دکھایا، سچ اور جھوٹ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

(۵) جذبۂ خیر وصلاح دین سے ناواقفیت کے ساتھ

ہم نے پہلے لکھا ہے کہ فتنوں کے پیدا ہونے کے بعد جب سیاسی مذہبی فرقوں کی بہتات ہوئی تو فرق باطلہ کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کی تائید میں حدیثوں کو گھڑنا شروع کیا، تاکہ ان کے رہنما قائدین کی عظمت میں اضافہ ہو اور ان کے مخالفین کی قیمت کم ہو جائے۔ اس میں کچھ صالح، تارک دنیا، عبادت گزار بھی گرفتار تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے امت مسلمہ کا نفاق و شقاق دیکھا تو انہوں نے مسلمانوں کو دین سے قریب کرنے کے لیے حدیثیں گھڑنی شروع کیں، تاکہ کسی کی بے قدری نہ ہو اور انتقام و مقابلہ کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ انہوں نے دنیا سے بے رغبتی، آخرت کا خوف ان حدیثوں کے ذریعہ دلانا شروع کیا تاکہ خوفِ خدا پیدا ہو کر یہ انشقاق و افتراق ختم ہو جائے۔ انہوں نے ترغیب و ترہیب کی حدیثیں وضع کیں جن کا مقصد دین کو نفع پہنچانا تھا۔ اصل میں دین سے ناواقفیت ہی اس داعیہ کا باعث بنا۔ مگر اس سے بجائے نفع کے نقصان ہی ہوا۔ ان لوگوں نے دھڑلے سے حدیثیں وضع کیں، جب ان کو من کذب علی متعمدا والی حدیث یاد دلائی جاتی تو یہ کہتے کہ ہم رسول اللہ کے اوپر کذب نہیں

کرر ہے ہیں بلکہ ان کے لیے کرر ہے ہیں۔ چونکہ بظاہر صالح متقی تھے اس لئے عوام کو بڑا دھوکا ہوا، انہوں نے ان کی لمبی باتوں کا انکار کرنے کے بجائے اقرار وتوثیق ہی کی، اس لیے یہ عباد، زہاد اتقیاء اور بھی دین کے لیے مصیبت ثابت ہوئے، بلکہ دوسرے معترین سے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئے، اس لیے کہ ان کو لوگ صلاح زہد و تقوئ کی خوبی کے ساتھ جانتے بوجھتے تھے، کوئی عامی ایسوں کے جھوٹ بولنے کا جلدی قائل نہیں ہوسکتا۔

محمد بن یحییٰ بن سعید قطان اپنے والد کی بات روایت کرتے ہیں کہ:

''صالحین کو دیگر چیزوں کے مقابلہ حدیث میں زیادہ جھوٹا پایا''۔

ابو عاصم النبیل فرماتے ہیں کہ زاہد آدمی کو دیگر چیزوں کے مقابلہ حدیث میں زیادہ جھوٹا پایا۔ یحییٰ بن سعید قطان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ میں نے خیر و زہد سے متعلق چیزوں میں ایسے ہی شخص کو سب سے زیادہ جھوٹا پایا۔

سورتوں کے فضائل بھی اکثر انہی صالحین کے وضع حدیث کا نتیجہ ہیں، چنانچہ حاکم نے بسند ابو عمار مروزی نقل کیا کہ ابو عصمت نوح بن ابی مریم سے کہا گیا کہ کیسے آپ عکرمہ سے بسند عباس فضائل قرآن کی حدیث بیان کرر ہے ہیں حالانکہ عکرمہ کی سند ایسے نہیں ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ کر فقہ ابو حنیفہ کی طرف ہوگئی یا ابن اسحٰق کے مغازی کی جانب ہوگئی اس لیے میں نے یہ حدیثیں وضع کیں۔ ابن مہدی نے میسرہ بن عبدربہ سے کہا کہ یہ حدیث تم کہاں سے لائے؟ انہوں نے کہا ترغیب کے طور پر میں نے یہ حدیثیں وضع کیں، احمد بن محمد بن غالب باہلی کے بارے میں اسی طرح کی باتیں مذکور ہیں جو لوگوں کے دل میں رقت پیدا کرنے کے لیے حدیثیں بناتا۔ اس کا زہد مشہور تھا، زاہد بغداد کہلاتا، اس کے موت کے موقع پر بغداد کے بازار بند کردیے گئے، اس کے تابوت کو بصرہ لے جایا گیا، بڑا عالم تھا پھر بھی علماء نے اس سے علم نہیں لیا اور اس کی حقیقت کھول کرر کھ دی۔

(٦) مذہبی اور کلامی اختلافات:

جس طرح سیاسی ٹولیوں نے اپنی رائے کو اور اپنی جماعت کو حدیث گھڑ کے مضبوط بنایا، بالکل اسی طرح فقہی مذاہب و مذاہب کلامیہ کے پیرو بھی اپنے مذاہب کی تائید میں احادیث گھڑتے رہے۔ ان میں سے یہ حدیث بھی ہے کہ محمد بن عکاشہ کرمانی سے دریافت کیا گیا کہ کچھ لوگ اپنے ہاتھ رکوع میں اور رکوع سے اٹھتے ہوئے اٹھاتے ہیں، اس پر انہوں نے حدیث بیان کی کہ مسیب بن واضح نے انس سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو رکوع میں اپنے ہاتھ اٹھائیں اس کی نماز نہیں ہوگی۔ یا یہ حدیث کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ مخلوق ہے، بجز قرآن کے اور خدا کے۔ اس لیے کہ کلام خدا سے شروع ہوکر اسی پر ختم ہوتا ہے، میرے بعد ایک امت آئے گی جو کہے گی قرآن مخلوق ہے۔ جو اس بات کا قائل ہوا اس نے کفر خدائے عظیم کیا، اس کی عورت مطلقہ ہوگئی، اس لیے کہ مومنہ کا شوہر کافر نہیں ہوسکتا۔ ان احادیث کے الفاظ ہی اس کے جھوٹ ہونے کی دلیل ہیں۔ زہیر بن معاویہ کی روایت بھی اسی کے قریب ہے کہ جس میں انہوں نے کہا کہ محرز ابورجاء نے بیان کیا، جو پہلے قدری تھا، پھر بعد کو تائب ہوگیا تھا، اس نے کہا کہ قدریہ سے کبھی حدیث نہ لینا، اس لیے کہ ہم اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے حدیث گھڑتے تھے، اس طرح چار ہزار قدری بنائے۔

(٧) حکام کی قربت اور دوسرے اسباب

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ خلفائے بنوامیہ سے تقرب کے لیے علمائے حدیث یا غیر علمائے حدیث نے باوجود ان کے حدیث کی طرف رغبت کے وضع حدیث سے کام لیا ہو، ہاں شیعوں نے بعض صحابہ پر افتراء باندھا ہے جس کی ہم نے فصل ثانی میں تردید کردی ہے۔ بعض ریاکاروں نے اس قسم کی حدیث بیان کرکے حکام کو راضی کرلیا ہو تو کوئی تعجب نہیں۔ عملاً اس کا حدوث دور عباسی میں ہوتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ حکم نے بسند ہارون بن ابوعبیداللہ روایت کیا ہے کہ مہدی نے کہا کہ کیا تو نے ملاحظہ کیا

کہ مقاتل میرے بارے میں کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر آپ پسند کریں تو خلفائے بنوعباس کی فضیلت میں احادیث وضع کردوں۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح غیاث بن ابراہیم نے مہدی کے لیے یہ حدیث وضع کی کہ مسابقت صرف نیزے کے پھل، اونٹ کی ٹاپ اور جانور کے کھر میں ہے۔ غیاث نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ تیز پرندہ کے بازو میں، جب اس نے دیکھا کہ مہدی کبوتر سے کھیل رہا ہے، چنانچہ مہدی نے اس کے بعد کبوتر سے کھیلنا چھوڑ دیا اور اسے ذبح کرنے کا حکم دیا، ساتھ ہی غیاث بن ابراہیم کو دس ہزار درہم سے نوازا، اور جب خلیفہ بنائے گئے تو کہا کہ میں بالتاکید گواہی دیتا ہوں کہ غیاث نے رسول اللہ پر کذب سے کام لیا ہے۔

مگر مہدی کا انکار بے معنیٰ ہے اس لیے کہ اس نے ایک حدیث وضع کرنے والے کو دس ہزار درہم بیت المال سے دیا جو بالکل ناجائز تھا۔ یہ درہم تو اس بہتان کا ہی صلہ تھا جو اس نے رسول خدا پر لگایا۔ مہدی کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو اگر قتل نہ کیا ہوتا تو کم از کم اس کی سرزنش کرتا اور سزائے حبس دیتا۔

اس کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب بھی ہیں جسے علمائے حدیث نے واضح کیا ہے۔ اس کی مثال بھی مسند حاکم میں سیف بن عمر تمیمی سے مروی ہے کہ ہم سعد بن طریف کی مجلس میں تھے کہ اس کا بیٹا مکتب سے روتا ہوا آیا۔ انہوں نے پوچھا کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا کہ استاذ نے پٹائی کی ہے۔ بس انہوں نے فوراً ہی ایک حدیث گھڑ دی کہ عکرمہ نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تمہارے بچوں کو تعلیم دینے والے سب سے زیادہ شر پسند ہیں جو یتیموں کے لئے بہت کم رحم رکھتے ہیں اور غریبوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔

دوسری مثال یہ حدیث کہ بہترین تجارت پارچہ فروشی ہے اور بہترین عمل سلائی ہے۔

اس طرح یہ حدیث کہ انسان کی سیادت کی علامت اس کے گالوں کا پتلا پن ہے۔

نیز یہ حدیث کہ تمام لوگ باہم دیگر کفو ہیں سوائے پارچہ باف اور پچھنا لگانے والے کے۔

بہت سے واضعین حدیث نے معروف سندوں کو قدیم حکمت کی باتوں کے لیے خاص کر لیا۔ بہتوں نے عجیب وغریب چیز بیان کرنے کے لیے حدیث کا سہارا لیا تاکہ لوگ ان سے نوادر حدیث لینے کے لیے ان کے پاس آئیں۔ یہ جہال اہل حدیث تھے، بلکہ اکثر کا مزاج احادیث کے سلسلے میں بچکانہ تھا۔ بہتوں نے کھانے پینے کی چیزوں میں حدیثیں محض اس کے پروپیگنڈے کے لیے یا کسی خاص پیشہ کے لیے وضع کیں۔ غرض اور بھی اسباب وضع حدیث ہیں جن کو علمائے حدیث ورجال نے بڑی خوبی سے بیان کر کے ان کی بیخ کنی کی ہے۔

فصل ثانی

وضع احادیث کے خلاف صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کی مساعی

حدیث گھڑنے والوں نے تو دین اسلام کو بڑے عظیم خطرۂ طوفان سے دوچار کر دیا تھا۔ اپنے جھوٹ سے انھوں نے اسلام کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ اسلام میں جن تعلیمات کا کوئی وجود نہ تھا بری طرح داخل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر خدا کو یہ دین محفوظ رکھنا تھا، اس نے ان حالات میں اسلام کی حفاظت کی، اس کو تحریف وتبدیل سے بچا لیا۔ رسولِ خدا کے کلام کو اہل ہوا و بدعت کی سواری نہیں بننے دیا، امت کو وہ علماء عطا کیے جنہوں نے مخلصین اور امانت رسول کی رکھوالی کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کر دی جس نے ان بدخواہان سنت نبی کریم کے بخیے ادھیڑ دیئے، جھوٹ اور سچ کو الگ کر دکھایا۔ خدا کا کرم ہے کہ صحابہ وتابعین اور علمائے امت نبی کریم نے ایسی عظیم خدمات انجام دیں، ورنہ دین کا ایک بڑا حصہ لوگوں کی نظر میں مشکوک ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے کہ حدیث گھڑنے والے کذابین نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور نبی کریم کی طرف بہت سی غلط باتیں محض اپنی قیمت بڑھانے کے لیے منسوب کر دیں۔ جن لوگوں کو خدا نے نظر عطا کی ہے انھوں نے ان علماء کی کوششوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور ان کی جدوجہد کی غیر معمولی قدر افزائی کی۔ ان کوششوں کا سلسلہ ابتداء عصر صحابہ سے اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ یہ فن حدیث پوری طرح مدون ہو کر نہ آ گیا۔ انہوں نے واضعین کے تمام کالے کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا اور سنت نبی کریم کی ایسی تنقیح کی کہ احکام شریعت اور نکھر کر سامنے آ گئے۔ ان احادیث کو پرکھنے کے لیے علماء نے جن قواعد کا انضباط کیا ان کی علمی وقیقہ سنجیوں کو دیکھ کر آج بھی اہل علم انگشت بدنداں ہیں۔ انہوں نے حفاظ حدیث کی جانچ کا وہ طریقہ اختیار کیا کہ اب بھی اہل علم اس کی ندرت پر

حیرت زدہ ہیں، ان کے طریق تفتیش و تحقیق اور وسائل تحقیق کے حصول کے لیے جس پامردی و استقلال اور محنت کا ثبوت دیا وہ ناقابل بیان ہے، ورنہ احادیث موضوعہ کے انبار سے احادیث صحیحہ کا نکال لینا کسی دوسرے کے بوتہ کا کام نہ تھا۔ ہم تو اسی پر اکتفا کریں گے جو حماد بن زید نے بیان کیا کہ چودہ ہزار احادیث دشمنان اسلام کی طرف سے وضع کی گئیں۔ عبدالکریم بن ابی العوجاء نے خود چار ہزار حدیثیں گھڑنے کا اعتراف کیا اور محرز ابورجاء قدری نے توبہ کرنے کے بعد بتلایا کہ چار ہزار حدیثیں مسائل قدر کے بارے میں وضع کی گئیں، اس سے سوا کاذکر ہی کیا۔ اس لیے ہمیں اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ واقعی علماء نے ان احادیث کی چھان بین میں بڑی بڑی اذیتیں اٹھائی ہیں جس کے نتیجہ میں دین اور دنیا میں ان کے آثار جلیلہ باقی رہ جائیں گے۔ یہ مشکلات اٹھانے والے کچھ معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے بلکہ علم کا معیار تھے، کسوٹی تھے، جن کے علم، ورع، وتقویٰ، دقت نظر کی علماء شرق وغرب نے شہادت دی۔ اس طرح سنت نبویؐ ان ہوا پرستوں کا کھلونا بننے سے محفوظ رہ گئی۔ اس پر ان گمراہوں کا نہ تو قابو چل سکا، نہ منکرین حدیث کا جادو ہی کام دے سکا۔ ابن مبارک نے بڑی عمدہ بات کہی کہ جب ان سے احادیث موضوعہ کے بارے میں پوچھا گیا، فرمایا کہ ان کا کیا خوف ہے، پیکر علم وعمل موجود ہیں،

انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون۔

آگے ہم ان مساعی کا مختصر ذکر کریں گے جو علماء نے حفاظت حدیث کے لیے کیں اور حدیث نبوی کے ہر ہر رخ کی جانچ و پرکھ روایت و درایت دونوں اعتبار سے کی اور حدیث کو بڑے خطرات سے بچا لیا۔

(۱) سند حدیث کا التزام

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آغاز اسلام میں رسول خدا کے عہد سے لے کر فتنہ عثمانؓ تک کوئی نہ جھوٹ بولتا، نہ کسی کو جھٹلاتا، بلکہ ان کے دلوں میں وثوق بھرا ہوا تھا، ایمان سے ان کے قلوب معمور تھے، تا آنکہ فتنہ نے آنکھ کھولی، فرقے اور ٹولیاں بننے لگیں، اور رسولؐ خدا پر جھوٹ

بولنے کا آغاز ہوگیا، اسے اہل ہوا نے اپنا سمند کامرانی بنالیا، ان واقعات کو صحابہ نے حفاظت حدیث کے لیے ایک فتنہ سمجھ کر احادیث کی سند پر سختی کی، اس کی جانچ شروع ہوئی، رواۃ کے بارے میں معلومات حاصل کی جانے لگیں، اس لیے کہ سند کسی کے لیے اسی درجہ ضروری ہے جس طرح صحت نسب کسی انسان کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن سیرین کی بات ٹکسالی ہے کہ، "عہد اول میں کوئی سند حدیث کے بارے میں سوال نہیں کرتا تھا، لیکن فتنہ عثمان کے بعد رواۃ کے سلسلہ میں پوچھ تاچھ ہونے لگی، اگر وہ اہل سنت ہوتے تو ان سے حدیث روایت کی جاتی اور اگر اہل بدعت ہوتے تو ان سے حدیث روایت نہ کی جاتی"۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ صحابہ وتابعین فتنہ سے پہلے سند کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ قاعدہ یہ تھا کہ بعض وقت تو روایت مع سند بیان کی جاتی اور بعض وقت اس کو دوسرے بیان کرنے والے نظر انداز کردیتے، اس لیے کہ ان کی امانت اخلاص وسچائی کانٹے کی چیز تھی۔ ہم بعض ایسی مثالیں آپ کے سامنے لاتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ صحابہ روایات میں سند کا ذکر فتنہ سے پہلے بھی کرتے تھے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براء بن عازب سے بیان کیا کہ فاطمہؓ نے انھیں خبر دی کہ رسولؐ خدا نے ان سے کہا کہ تم احرام اتار ڈالو، انہوں نے احرام اتار ڈالا اور بیت اللہ میں چھڑکاؤ کیا۔ حضرت ابوایوبؓ انصاری ابوہریرہؓ سے روایت کرتے جو حضورؐ سے خود نہ سنتے۔ اسی طرح ایک صحابی دوسرے صحابی سے روایت کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ فتنہ سے پہلے مسلمانوں میں سند کا ذکر پوری طرح مروج نہ تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک جھوٹ کا چلن نہ تھا، اور امانت اپنی جگہ پر قائم تھی۔ عربوں میں سند کا رواج اسلام سے پہلے بھی تھا کچھ اسلام کے آنے ہی کی وجہ سے اسناد کی طلب وتقاضا نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ جاہلیت میں اشعار وقصص سند سے بیان کرتے تھے۔ اسناد کا یہ التزام صغار صحابہ اور کبار تابعین کے دور میں مروج ہوا۔ چنانچہ امام مسلم نے بسند متصل بیان کیا ہے کہ "بشیر عدولی حضرت ابن عباس کے پاس آئے اور حدیث بیان کرنے لگے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ابن عباس نے بشیر کی حدیث کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ اس پر اس نے کہا کہ ابن

عباس تمہیں کیا ہو گیا کہ میں حدیث رسول بیان کر رہا ہوں اور تم اسے سن نہیں رہے ہو؟ ابن عباس نے جواب دیا کہ ایک وقت تھا جب ہم قال رسول اللہ سنتے تھے تو ہماری آنکھیں اور کان سب اس کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے پھر جب لوگ رطب ویابس کے عادی ہو گئے تو اب ہم صرف معروف چیزوں ہی کو لیتے ہیں۔

اور طاؤس کی روایت میں ہے کہ "جب بشیر حدیث بیان کرنے لگے تو ابن عباس نے کہا کہ اس حدیث کو ایسے دوبارہ بیان کرو، چنانچہ انہوں نے اسے دہرایا، تو ابن عباس نے کہا حدیث کو دوبارہ ایسے بیان کرو، چنانچہ انہوں نے پھر دہرایا اور کہا کہ معلوم نہیں میری بیان کردہ حدیث کو صحیح جانا اور صرف اس تھوڑے جزء کا انکار کیا، یا میری بیان کردہ پوری حدیث کا انکار کر کے اسی تھوڑے حصہ کو صحیح گردانا۔ ابن عباس نے فرمایا ہم رسول خدا کی احادیث اس وقت تک بیان کرتے اور سنتے تھے جب جھوٹ کا چلن نہ ہوا تھا، لیکن جب لوگ رطب ویابس کے عادی ہو گئے تو ہم نے رسول خدا کی طرف منسوب احادیث کو سننا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تابعین نے اسناد کے ذکر اور اس کے التزام کو ضروری قرار دیا، چنانچہ ابن عبدالبر نے شعبی سے انہوں نے ربیع بن خثیم سے بیان کیا کہ، جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور کسی کو خدا کا شریک نہ گردانا، اسی کے لیے ملک اور تعریف کا اثبات کیا کہ وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت سے آشنا بناتا ہے، اگر یہ کلمہ دس مرتبہ کہے تو اس کو کوئی غلام یا صرف ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔

شعبی کہتے ہیں کہ میں نے فوراً ہی ربیع بن خثیم سے دریافت کیا کہ اس حدیث کا راوی تم سے کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ عمرو بن میمون الاودی۔ میں عمرو بن میمون کے پاس حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ سے اس حدیث کی روایت کس نے کی؟ انہوں نے کہا کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے۔ میں ابن ابی لیلیٰ قاضی بصرہ وکوفہ کی خدمت میں آیا اور ان سے دریافت کیا، آپ نے یہ حدیث کس سے سنی؟ انہوں نے کہا کہ ابوایوب انصاری صحابی رسولؐ سے اس بارے میں یحییٰ بن سعید نے کہا کہ سند کے بارے میں تفتیش کا یہ پہلا واقعہ ہے۔

ابوالعالیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اصحابؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بصرہ میں حدیث سنتے تو ہم اس وقت تک نچلا نہ بیٹھتے جب تک کہ وہاں پہنچ کر خود نہ دریافت کر لیتے، اور ان کے منہ سے اس حدیث کو بیان کرتے سن کر ہی اطمینان کرتے۔ تابعین اور تبع تابعین تو اس کی ہدایت کرتے کہ سند ضرور دریافت کی جائے۔ چنانچہ ہشام بن عروہ فرماتے ہیں کہ جب بھی تم سے کوئی حدیث رسولؐ بیان کرے تو اس سے فوراً دریافت کرو کہ یہ روایت آپ کو کس سے ملی ہے؟ زہری جب حدیث بیان کرتے تو پوری سند کے ساتھ اور فرماتے کہ چھت پر چڑھنا بذریعہ زینہ ہی بہتر ہے۔ اوزاعیؒ کہا کرتے کہ سند کا نسیان علم کا فقدان ہے۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا، اسناد مومن کا ہتھیار ہے، اگر کسی کے پاس ہتھیار نہ ہو تو وہ پھر مقابلہ کیسے کرے گا؟ عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں اسناد دین ہے اگر سند کا معاملہ نہ ہوتا تو ہر کوئی جو چاہتا بیان کر گزرتا۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہمارے اور قوم (یعنی صحابہ) کے مابین فہرست ہے یعنی سند ہے۔

تابعین نے اسناد کی بڑی چھان بین کی اور اسناد کو بھی دوسرے علوم کی طرح پوری تحقیق سے حاصل کیا۔ اس سلسلے میں ابوداؤد طیالسی کا یہ مقولہ یاد رکھئے کہ ہم کو حدیث چار سے ملی، زہری، قتادہ، ابواسحاق، اعمش اور قتادہ ان چاروں میں اختلاف روایت کے ماہر تھے۔ زہری سندوں کے سب سے بڑے عالم اور ابواسحاق، علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کے ماہر تھے اور اعمش کے پاس یہ ساری خوبیاں اکٹھا تھیں۔

سندوں کا بیان کرنا ایک مسلم بدیہی معاملہ عوام و خواص سبھی میں ہو گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں ہم اصمعی کی یہ بات نقل کرتے ہیں کہ میں ابن عیینہ کے پاس حاضر تھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ مزاج بخیر ہیں، رات عافیت سے گزری؟ سفیان نے فرمایا بحمداللہ بخیریت رہے۔ پھر اس نے مسئلہ دریافت کیا کہ ایک عورت جو بقصد حج نکلی، طواف سے پہلے ہی اس کو ایام آنے لگے، اس کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ آپ نے کہا کہ طواف کے سوا سارے ارکان حج کرے۔ اعرابی نے دریافت کیا کوئی ثبوت؟ آپ نے فرمایا، ہاں ثبوت

ہے، حضرت عائشہ کو طواف کرنے سے پہلے اسی منزل سے گزرنا پڑا، ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارے ارکان حج ادا کریں، صرف طواف بیت اللہ سے رکی رہیں۔
پھر اعرابی نے پوچھا کہ اس حدیث کی روایت کا کیا انداز ہے، آپ نے فرمایا؟
''عبدالرحمٰن بن قاسم نے اپنے والد سے انہوں نے عائشہؓ سے روایت کیا''۔

(حدثني عبدالرحمان بن القاسم عن أبيه عن عائشة)

اس سند کے ذکر کے بعد ان سے اعرابی نے کہا عمدہ ثبوت بہتر انداز ابلاغ، خدا آپ کی رہنمائی فرمائے۔ مدائنی نے بیان کیا کہ ایک اعرابی نے کسی کو حدیث بیان کرتے سنا جس کا سر پیر نہ تھا، اس نے بیان کرنے والے سے کہا جلد نکیل سے اونٹ چھوڑ رہے ہو۔

بعض تابعین سے مراسیل بھی مروی ہیں، اس کو سامنے رکھ کر کوئی التزام اسناد واتصال روایت کو قابل اعتراض نہ سمجھے، اس لیے کہ اس کی پشت پر ایسی روایات موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راوی کو ان مراسیل کی سند پورے طور سے محفوظ تھی جونہی دریافت کیا فرفر اس کی سند بیان کر دی۔ اسی سلسلے کی یہ کڑی ہے جو ابن عبدالبر اپنی اسناد متصل میں مالک بن انس سے بیان کرتے ہیں کہ ہم زہری اور محمد بن المنکدر کے پاس بیٹھے تھے، اس موقع پر زہری فرماتے ہیں کہ ابن عمر نے یوں بیان کیا، اس کے بعد ہم ان کی خدمت میں جاتے اور ان سے کہتے کہ ابن عمر سے جو روایت آپ نے کی ہے وہ آپ کو کس سے پہنچی؟ آپ فرماتے کہ ان کے صاحبزادے سالم نے بیان کیا۔ حبیب بن الشہید راوی ہیں کہ مجھ سے محمد بن سیرین نے کہا کہ حسن سے پوچھو انہوں نے حدیث عقیقہ کس سے سنی؟ چنانچہ میں نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ سمرہ بن جندبؓ سے۔ اس کو سامنے رکھ کر ابوعمر ابن عبدالبر نے کہا کہ ثقات کے مراسیل کا انداز یہی ہے جب بھی ان سے پوچھا گیا انہوں نے ثقات کا حوالہ دیا۔ سلیمان اعمش بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے کہا کہ مجھ سے جب بھی حدیث بیان کرو تو سند ضرور ذکر کرو۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ جب میں کہوں عن عبداللہ یعنی ابن مسعود تو تم سمجھ لو کہ یہ روایت بہتوں سے مروی ہوگی، اگر اس میں کسی کا نام لے لیا تو پھر وہی اس سے مراد ہوگا۔

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جن لوگوں نے حدیث مرسل بیان کی، ان میں سے اکثر علم سے بھرپور تھے، اور سند سے بخوبی واقف تھے، گو بطور اختصار کے انہوں نے سند کو ترک کر دیا۔ اس کا ثبوت وہ روایت ہے جو حماد بن مسلمہ نے بیان کی ہے کہ ہم قتادہ کے پاس حاضر ہوتے تو وہ فرماتے ہمیں یہ روایت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی۔ کبھی کہتے کہ عمر سے، کبھی کہتے علی سے یہ روایت ملی، سند کا ذکر بہت کم کرتے۔ جب حماد بن ابی سلیمان بصرہ تشریف لائے، انہوں نے حدیث بیان کرنا شروع کیا کہ ابراہیم نے اور فلاں فلاں نے بیان کیا۔ یہ اطلاع قتادہ کو ملی تو انہوں نے انداز روایت بدل دیا اور فرماتے کہ میں نے مطرف سے پوچھا، سعید بن مسیب سے دریافت کیا، انس بن مالکؓ نے حدیث بیان کی، انہوں نے سند کا ذکر کر دیا۔ چونکہ قوم کو آپؒ پر اعتماد تھا اس لیے سند دریافت نہ کرتے۔ اس پر ابن سعید معمرؒ کی روایت سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ ہم قتادہؒ کے پاس پہنچے، ہم سب جوان العمر تھے ہم سند دریافت کرتے تو جو لوگ ان کے اردگرد ہوتے وہ کہتے ایسا نہ کرو ابن خطاب خود ہی سند ہیں، اس طرح ہماری بولتی بند ہو جاتی۔

شعبہ کہتے ہے کہ ہم قتادہ کی مجلس میں ہوتے، کوئی بات آجاتی تو میں سند دریافت کرتا تو جو بڑے لوگ ان کے ہم نشیں ہوتے، بول پڑتے کہ میاں قتادہ خود سند ہیں، میں خموش رہتا مگر میری حاضری اکثر ہوا کرتی، جب بھی کوئی بات آتی مجھے یاد ہو جاتی تھی۔ قتادہ نے جب میرا مرتبہ پہچان لیا تو پھر مجھ سے سند بیان کرنے لگے۔

اس طرح اسناد متصل نے دھیرے دھیرے اپنا مقام پا ہی لیا اور محدثین کی عنایت و اہتمام نے عہد تابعین میں وہ دن بھی دکھائے کہ محدثین نے روایت بیان کرتے وقت پوری سند کا ذکر کرنا اپنے ذمہ فرض کر لیا۔ چنانچہ بعض محدثین اس مسئلہ میں اتنی شدت برتتے کہ حدیث بلا سند کو ایسا مکان جس میں نہ چھت ہو نہ ستون سے تشبیہ دیتے، جس کو بعضوں نے شعر میں اور بھی چست کر دیا ہے۔

"والعلم ان فاته اسناد مسند كالبيت ليس له سقف ولا طنب"

"بلاسند کی حدیثیں ایسی ہیں جیسے گھر کہ جس میں سر چھپانے کو نہ چھت نہ ستون"

محدث حدیث کو سند کے ساتھ بیان کر کے بہر حال اپنا مقام بلند کر لیتا ہے اور رسول خدا تک بات کے سچ ہونے کے بارے میں اسے دلی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

(۲) علمی جدوجہد میں اضافہ اور حدیث کی چھان بین

خدا کا کرم بے پایاں ہے کہ اس نے صحابہؓ کو تمام ملکوں اور شہروں میں مختلف ضرورتوں کے پیش نظر پھیلا دیا۔ ان صحابہ میں سے بعض نے عمر دراز پائی جس سے انہوں نے سنت کی حفاظت میں اور فتنہ کو دبانے میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اس طرح ان کو شر پسند طبقہ کا (جس نے رسول خدا پر افترا اور جھوٹ باندھنے میں کوئی جدوجہد باقی نہیں چھوڑی) قلع قمع کرنے میں بڑی مدد ملی۔ طالبین علم رسول صحابہ سے حدیثیں سنتے، اگر صحابہ کے سوا کسی اور سے وہ حدیث سنتے تو جو صحابی بھی ان کے ارد گرد علاقوں میں مقیم ہوتا یا بطور مسافر کے مل جاتا تو اس سے ملکر وہ سنی حدیثوں کی تصحیح کر لیتے۔ اس طرح کھرے اور کھوٹے کی تمیز ابتدا ہی میں ہو جاتی۔ اس کی تائید اس واقعہ سے جو ابن ابی ملیکہ کے ساتھ حضرت ابن عباس کو پیش آیا ہوتی ہے۔ ابن ابی ملیکہ نے فرمایا کہ میں نے ابن عباس کی خدمت میں لکھا اور ان سے طلب کیا کہ وہ میرے لیے کتابچہ لکھ دیں اور مجھ سے بعض چیزیں پوشیدہ رکھیں۔ ابن عباس نے کہا، طالب خیر لڑکا ہے، میں اس کے لیے چند امور چنوں گا اور بعض اس سے مخفی رکھوں گا، چنانچہ ابن عباس نے حضرت علیؓ کے فیصلہ والی کتاب منگوائی اور اس سے نوٹ کرنے لگے، اور بعض چیزیں چھوڑتے، پھر کہا قسم بخدا، اگر علی نے اس طرح فیصلہ کیا ہوتا تو وہ راہ حق سے ہٹے ہوتے۔

طالبین حدیث کی ایک بڑی جماعت سفر کر کے صحابہ تک پہنچتی، اس کے لیے دشوار گزار راستے جنگل و بیابان کا سفر طے کرتی تاکہ تابعی سے سنی ہوئی حدیث کی تائید و تصحیح عمل میں لا سکے۔ ابو العالیہ کا قول کہ ہم حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بصرہ میں سنتے تو دل جب

تک کہ مدینہ پہنچ کر اس کی مزید تصدیق نہ کر لیتے مطمئن نہ ہوتا۔ اس لئے ہم سفر کرتے، مدینہ پہنچ کر ان صحابہ سے بالمشافہ سنتے تو تسکین ہوتی۔ خود صحابہ بھی لوگوں سے حدیث بیان کرتے، سنت کی اشاعت کے لیے سفر کرتے، کبھی کسی دوسرے صحابی سے حدیث سننے کے لیے بھی یہ سفر ہوتا۔ چنانچہ ابوایوب انصاریؓ نے عقبہ بن عامرؓ سے حدیث سننے کے لیے مصر کا سفر کیا، اسی طرح جابر بن عبداللہ بن اُنیس کے پاس ایک حدیث کے لیے تشریف لے گئے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ نے سفر علمی فرمایا۔

تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں یہ اسفار بڑے پیمانے پر ہونے لگے، تاکہ وہ ثقات سے حدیث کو حاصل کریں۔ سنی ہوئی حدیثوں کا مذاکرہ کر کے صحیح طور پر یاد رکھ سکیں۔ چنانچہ ابودرداء سے دمشق جا کر حدیث سننے کے لیے بہت سے آمادۂ سفر ہوئے۔ جس طرح کہ ابن شہاب زہری نے عطاء بن یزید ابن محیریز اور ابن حیوہ کی خدمت میں شام پہنچ کر حدیث کی تحصیل کی۔ یحیٰی بن کثیر نے مدینہ کا سفر کیا تاکہ صحابہ کی اولاد میں جو لوگ رہ گئے ہیں ان سے مل کر حدیثیں حاصل کریں۔ محمد بن سیرین نے کوفہ کا سفر کیا کہ عبیدہ وعلقمہ و عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ سے حدیثیں سنیں۔ اور اوزاعیؒ نے یمامہ کا سفر یحیٰی بن ابی کثیر سے ملاقات کے لیے فرمایا اور بصرہ بھی آئے، اسی طرح سفیان ثوری نے یمن کا علمی سفر فرمایا۔ سعید بن مسیب کا کہنا ہے کہ ایک حدیث کی خاطر میں دن و رات سفر کرتا تھا اور زہری نے ابن المسیب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں تین تین سفر ایک حدیث کے لیے کیا کرتا تھا۔ اسی طرح مسروق طلب حدیث میں اور مذاکرات حدیث کے لیے کثرت سے سفر فرماتے۔ ایک بار امام شعبیؒ نے ایک حدیث بیان کی اور سامع سے فرمایا کہ لو تمہیں یہ بلا مشقت مل گئی، ورنہ حدیث کے لیے تو لوگ مدینہ کا دور دراز سفر کرتے۔

تابعین اور تبع تابعین حدیث کی تکرار کرتے رہتے، جو حدیث معروف و معلوم ہوتی اسے لے لیتے اور جو منکر ہوتی اسے ترک کر دیتے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ ہم حدیث کو سن کر اپنے زمانے کے محدثین کے سامنے پیش کرتے، جیسے درہم کو صراف کے سامنے پیش

کرتے ہیں کہ وہ کسوٹی پر جانچ کر بتلائے۔اس طرح محدثین جس حدیث کی تصدیق کرتے ہم اسے لے لیتے اور جسے ترک کرتے ہم بھی اسے رد کردیتے۔سعید ابو ہلال، شعبہ، قتادہ سے جب کسی بات میں مختلف ہوتے تو اسے ہشام دستوائی کے سامنے رکھتے اور شعبہ وسفیان میں اختلاف ہوتا تو کہتے کہ چلو ہماری ترازو مسعر ہیں، ان سے اپنی حدیثوں کا وزن معلوم کریں۔اعمش کہا کرتے کہ ابراہیم نخعی حدیث میں صراف تھے، میں لوگوں سے سن کران کے پاس جاتا، سنی ہوئی حدیثیں ان کو سناتا۔میں زید بن وہب کے پاس اوران جیسے دوسرے محدثین کی خدمت میں ایک ماہ میں ایک بار یا دو بار حاضری دیتا اور ابراہیم نخعیؒ تو قابل رشک تھے، میں کبھی ان سے غیر حاضر نہ ہوتا۔

اس زمانے کے محدثین بیداری اور باخبری میں نادرۂ روزگار تھے، انہیں صحیح، ضعیف، موضوع ہر قسم کی حدیثیں یاد رہتیں جس کی وجہ سے وہ حدیث میں کسی گھپلے کو سمجھنے پر پوری طرح قابو یاب تھے اور صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے متمایز کرنے کا ملکۂ تام رکھتے تھے۔اس سلسلے میں سفیان ثوری کی یہ ٹکسالی بات یاد رکھنی چاہیے کہ میں حدیث کی تین طرفہ روایت کا قائل تھا، ایک شخص سے حدیث لے کر اسے دین کا حصہ بنا لیتا، دوسرے سے حدیث سن کر اسے موقوف کر دیتا، تیسرے کی حدیث کو کوئی اہمیت نہ دیتا، اور اس شخص کی حقیقت دریافت کرتا۔ابو بکر بن اثرم روایت کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے صنعاء میں یحییٰ بن معین کو ایک کونے میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ معمر کا وہ صحیفہ جو ابان عن انس کی روایت پر مشتمل تھا، لکھ رہے ہیں۔جب کوئی ان کے پاس جاتا تو اسے چھپا لیتے۔احمد بن حنبل نے ان سے کہا کہ تم معمر کا صحیفہ جو ابان سے مروی ہے اسے لکھ رہے ہو، حالانکہ تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سراسر گھڑی حدیثوں پر مشتمل ہے، اگر تم سے کوئی یہ اعتراض کر بیٹھے کہ تم ابان پر اعتراض کرتے ہو پھر بھی اس کی حدیثیں لکھ رہے ہو۔انہوں نے جواب دیا ابو عبداللہ تمہارا خدا بھلا کرے میں اس صحیفہ کو عبدالرزاق عن معمر کی روایت سے لکھ رہا ہوں اور اسے محفوظ رکھتا ہوں، مجھے یہ پتہ ہے

کہ یہ حدیثیں موضوع ہیں پھر بھی اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے بعد کسی کو یہ ہمت نہ ہو کہ ابان کے بجائے ثابت کا نام لے، اور یوں کہے عن معمر عن ثابت عن انس بن مالک، تو میں اس حدیث کی فوری تردید کر کے اسے بتاؤں یہ طریق روایت جھوٹا ہے، معمر عن ابان ہے، معمر عن ثابت صحیح نہیں ہے۔

(۳) کذابین کی تلاش

علماء قبول حدیث میں ایک طرف محتاط تھے تو دوسری جانب بعض علماء کھلے طور سے کذابین سے نبرد آزما تھے، ان کو حدیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ ضرورت کے وقت طاقت کا استعمال بھی جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام عامر شعبی جو ابن الصالح صاحب التفسیر کے ہمراہ اس کا کان پکڑے گزر رہے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے، بے حیا قرآن تو صحیح پڑھ نہیں سکتا اور قرآن کی تفسیر کرتا پھرتا ہے۔ امام شافعیؒ بیان کرتے ہیں کہ اگر شعبی نہ ہوتے تو حدیث کا چلن عراق میں نہ ہوتا، وہ ایک شخص کے پاس آئے اور فرمایا کہ اب حدیث مت بیان کرنا ورنہ قانونی کاروائی کروں گا۔ شعبہ کذابین حدیث کے بارے میں نہایت متشدد تھے، عبدالملک بن ابراہیم جدی جو موثوق بہ اور امانت دار تھے نے بیان کیا کہ میں نے شعبہ کو غضبناک انداز میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھا تو میں نے کہا ابو بسطام ٹھیریئے، کیا بات ہے؟ انہوں نے مجھے اینٹ کا ٹکڑا دکھایا جو ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور فرمایا کہ جعفر بن زبیر کذاب کو سزا دینے جا رہا ہوں جو رسول خدا پر جھوٹ باندھتا رہتا ہے ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کی جانب بڑھ رہا ہوں اور مراد اس سے جعفر بن زبیر تھا جس نے چار سو جھوٹی حدیثیں رسولؐ خدا سے روایت کی تھیں۔

حماد بن زید بیان کرتے ہیں کہ میں نے اور عباد بن عباد جریر بن حازم نے شعبہ سے ایک شخص کے بارے میں گفتگو کی کہ اگر آپ اس شخص کے بارے میں خاموش رہتے تو بہتر ہوتا۔ وہ کچھ نرم پڑ گئے اور ہمیں جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد میں ایک دن جمعہ کے لیے

جا رہا تھا اور شعبہ میرے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے اعلان کر رہے تھے یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم نے سفارش کی تھی، مگر میرے یہاں اس کے لیے گنجائش نہیں ہے، شعبہ یہ سارے کام خدا کے لیے کرتے تھے۔

احمد بن سنان بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمان بن مہدی کو کہتے سنا کہ میں نے عیسیٰ بن میمون کی گرفت ان احادیث کے بارے میں کی جو وہ قسم سے بیان کرتا تھا، تو اس نے کہا کہ اب یہ غلطی نہ ہوگی۔

امام سفیان ثوری بھی کذابین حدیث کے بارے میں بہت سخت تھے، جھوٹوں کے عیب کی پردہ پوشی ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہ تھی۔ چنانچہ ابن ابی غنیہ بیان کرتے ہیں کہ "سفیان ثوری سے زیادہ خدا پر اعتماد رکھنے والا میں نے کسی کو نہ پایا۔ حماد مالکی نے جو کذاب تھا ایک حدیث بیان کی اور عمرو انماطی اس کے پاس آئے، انہوں نے اس سے کہا کہ میں جب تک تمہیں سزا نہ دلا دوں گا چھوڑوں گا نہیں، پھر اس نے اس کا اقرار کیا کہ میں نے اسے حسن سے نہیں سنا ہے اور قسم کھائی کہ حدیث نہ بیان کروں گا، عمرو انماطی بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے اس سے تحریر لکھوائی اور اس پر گواہیاں بھی لی۔ بعض محدثین تو حدیث میں غلط بیانی کرنے والوں کے خلاف بہت سخت رویہ رکھتے، جھوٹ کو برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا، فوراً جنگ و پیکار شروع کر دیتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے۔ امام مسلم نے سند متصل کے ساتھ حمزہ زیات سے روایت کیا کہ ہمدانی نے حارث سے کوئی بات سنی تو اس سے کہا کہ دروازہ پر بیٹھ جاؤ، وہ گھر میں گئے اور اپنی تلوار لے کر نکلے، حارث نے معاملہ کی نزاکت بھانپ لی اور بھاگ نکلا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھوٹے چھپتے پھرتے اور حتی الامکان بے موقع جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتے۔ عوام بھی اس طریق کار کو اچھی نظر سے دیکھتے وہ کم درجہ کی حدیث بیان کرنے والوں اور ثقات کے مابین تمیز کرنے لگے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ابن حجر نے یزید بن ہارون سے بیان کیا کہ جعفر بن زبیر اور عمران بن حدیر ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے، جعفر کے پاس بھیڑ لگی تھی، عمران کے پاس کوئی نہ تھا۔ شعبہ وہاں سے گزرے تو اس صورت حال پر تعجب کا اظہار فرمایا

اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تف ہے تم پر سب سے بڑے کذاب کے گرد جمع ہو اور صادق ترین کو چھوڑے بیٹھے ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھیڑ چھٹ کر عمران کے پاس آ گئی اور جعفر کے پاس کوئی نہیں رہا۔ سفیان ثوری کے زمانے میں لوگوں کو جھوٹ کی جسارت نہ ہوتی تھی اس لیے کہ وہ جھوٹوں پر بہت زیادہ متشدد تھے ان کے پول کھول دیتے، بخیے اُدھیڑ دیتے۔ قت یہ بن سعید نے اس سلسلے میں ہی یہ بات کہی کہ اگر ثوری نہ ہوتے تو پرہیز گاری، احتیاط فنا ہو چکا ہوتا۔

(۴) راوی کے حالات کی چھان بین

صحابہؓ و تابعینؒ، تبع تابعین رواۃ حدیث کی معرفت یقینی طور سے رکھتے، ان کی پوری ہسٹری، ان کے سچے جھوٹے ہونے کا علم پوری طرح حاصل کرتے تاکہ حدیث صحیح کو حدیث کذب سے پوری طرح متمایز کر سکیں۔ اس کے لیے ان کی زندگی ان کی تاریخی احوال اور زندگی کے تغیرات، ماحول و مزاج کی تبدیلیاں غرض ان کی پوری ہسٹری نظر میں رہتی، جس طرح کہ وہ (احفظ اور اضبط) زیادہ حفظ و ضبط والے اور صحبت و ہم نشینی کے بارے میں بھی مدارج رواۃ سے واقف ہوتے۔ اسی کو سفیان ثوری نے ان لفظوں میں بیان کیا کہ رواۃ نے جب دروغ بافی اختیار کی تو ہم نے ان کی تاریخ خوانی ضروری جانی۔ رواۃ کے حالات دریافت کرتے، اسے بیان کرتے، اس کی جانچ کرتے، ان کی تعدیل و جرح خدا کے لیے عمل میں لاتے، اس میں وہ کسی خوف کا گذر نہ ہونے دیتے، نہ کسی قسم کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ کسی محدث کو ایسا نہیں پایا گیا کہ وہ حدیث کے معاملہ میں اپنے بھائی باپ اولاد کی رعایت کرتا ہو۔ چنانچہ زید ابن ابی انیسہ کو ہی دیکھیے لوگوں کو روک رہے ہیں،

لاتاخذوا عن أخي، میرے بھائی سے حدیث نہ لو۔

علی بن مدینی سے ان کے والد کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے صاف کہا کہ ان کے حالات دوسروں سے دریافت کرو۔ لوگ نہیں مانے پھر آپ کے پاس آئے، دروازہ کھٹکھٹایا، آپ نے سر اٹھایا اور صاف کہہ دیا کہ خدا لگتی کہہ رہا ہوں، وہ ضعیف ہیں۔ وکیع بن

جراح جن کے والد بیت المال کے ذمہ دار تھے وہ جب اپنے والد سے روایت کرتے تو ان کے ہمراہ کسی اور کو بھی شریک کر دیتے۔

نقاد حدیث رجال کے حالات پر گفتگو کرنے کے لیے اوقات مقرر کرتے، دنوں کا تعین کرتے۔ چنانچہ ابوزید انصاری فرماتے ہیں کہ بارش ہو رہی تھی، ہم شعبہ کے پاس حاضر ہوئے، انہوں نے فرمایا کہ آج حدیث بیان کرنے کا دن نہیں ہے بلکہ آج غیبت کا دن ہے۔ ہم جھوٹوں کے پول کھولتے ہیں۔ اپنے شاگردوں اور رفقاء کو حکم دیتے کہ جن رواۃ سے غلطی ہوتی رہتی ہے ان کے حالات واضح کرتے رہو۔ عبدالرحمان بن مہدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے شعبہ، ابن مبارک، ثوری و مالک ابن انس سے ایک شخص کے بارے میں جو دروغ بافی کے لیے مشہور تھا دریافت کیا تو ان سب نے کہا کہ اس کے بارے میں خوب پروپیگنڈا کرو کہ یہ دین ہے۔ یحییٰ بن سعید نے بیان کیا کہ میں نے شعبہ، سفیان ثوری، مالک اور ابن عیینہ سے ایک شخص کے بارے میں جو حدیث میں معتبر نہ تھا دریافت کیا کہ وہ میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے حدیث معلوم کرتا ہے تو سب نے کہا کہ کہہ دو کہ تم معتبر نہیں ہو۔

طالبین علم حدیث ائمۂ حدیث سے دریافت کرتے اور ان کو لکھتے کہ وہ رواۃ کے اچھے برے ہونے کے بارے میں ہمیں مطلع کریں۔ چنانچہ اس کی شہادت امام مسلم کی یہ بات ہے جو انہوں نے عبداللہ بن معاذ العنبری سے نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے شعبہ کو ابوشیبہ قاضی واسط کے بارے میں معلومات کے لیے لکھا تو انہوں نے مجھے جواب دیا کہ ان کی حدیث نہ لکھا کرو اور میرے مکتوب کو چاک کر دو۔

ناقدین رجال، رجال حدیث پر نقد کرتے وقت بڑی گہری نگاہ رکھتے، محدثین کی پوری تاریخ سے واقف ہوتے، ان کے اچھے برے کو جانتے پہچانتے۔ چنانچہ شعبیؒ اپنے بارے میں فرماتے ہیں: واللہ لو أصبت تسعا وتسعین مرة وأخطأت مرة لعدوا علی تلك الواحدة، (اگر میری باتیں ۹۹ فیصد صحیح ہوتیں اور کہیں ایک فیصد میری بات غلط ہو جاتی تو ناقدین اس ایک کو میرے کھاتے میں ڈال دیتے)۔

ظاہری تڑاک بھڑاک سے وہ دھوکہ نہ کھاتے، یہ ساری باتیں اخلاص پر مبنی ہوتیں، خدا کے لیے عمل میں لائی جاتیں، اسی کو اختیار کرتے جس سے ان کا دل مطمئن ہوتا، تاکہ دین کی صحیح خدمت انجام دے سکیں اور شکوک کا خاتمہ کر سکیں۔ یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ

انا لنطعن على أقوام لعلهم قدحطوا رحالهم فى الجنة منذ أكثرمن مائتي سنة،

"ہم ایسوں پر بھی طعن کرتے جو ایسے معلوم ہوتے کہ انہوں نے جنت میں اپنا ٹھکانا دو سو سال پہلے سے بنالیا ہو"۔

سخاوی اس کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد صالحین کی جماعت ہے مگر وہ محدثین سے کوئی ربط نہ رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں ابوبکر بن خلاد کی یہ بات قابل ذکر ہے جو انہوں نے یحییٰ بن سعید القطان سے کہی کہ تم کو ان لوگوں کا کوئی ڈر نہیں ہے جن کی حدیثیں ترک کر کے تم نے اپنا دشمن بنالیا؟ آپ نے جواب دیا کہ مجھے ان کی دشمنی رسولِ خدا کی دشمنی کے مقابل قبول ہے، میں اس وقت سے ڈرتا ہوں جب آپؐ مجھ سے فرمائیں گے کہ تم نے جھوٹ جانتے ہوئے کیسے میری حدیث بنا کر بیان کر دی تھی۔

اس طرح جرح و تعدیل کی بنیادیں کبار صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے شریعت حنیفہ مرضی رسالتؐ کے مطابق رکھی تھی، اس لیے کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يا أيها الذين آمنوا ان جائكم فاسق بنباء فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين" (حجرات)

"اے قوت یقین کے مالک مسلمانو، اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اطلاع لائے تو اس کو خوب جانچو کہ کہیں کسی قوم پر اپنی ناواقفیت کی بناء پر چل پڑو پھر بعد میں کئے ہوئے پر پچھتاوا ہو"

پیمبر علیہ السلام نے بئس أخو العشيرة فرما کر جرح کی بنیاد استوار فرمادی اور إن عبدالله رجل صالح فرما کر تعدیل کی اساس رکھ دی، سخاوی نے لکھا ہے کہ رجال پر

گفتگو کرنے والے نجوم ہدایت میں تاریکیوں کے چراغ ہیں جن کی روشنی میں خراب چیزوں کو نکال کر الگ کر دیا گیا۔

دور صحابہ سے آج تک ان کی گنتی کرنا ممکن نہیں۔ ابن عدی نے اپنے مقدمہ کامل میں اپنے زمانے تک بہتوں کے نام بتلائے ہیں، صحابہ میں عمر و علی، ابن عباس، عبداللہ بن سلام، عبادہ بن الصامت، انس و عائشہ قابل ذکر ہیں، اور تابعین کی ایک بڑی جماعت جس میں شعبی ابن سیرین، سعید بن المسیب، ابن جبیر ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کمتر ہے، ان میں نقاد رجال کم تھے، اس لیے کہ ان کے متبوعین میں ضعف کم سے کم تھا، کیونکہ یہ متبوع سب کے سب صحابہ عدول تھے یا تابعین ثقات تھے۔ اسی وجہ سے پہلی صدی میں جب کہ صحابہ موجود تھے اور کبار تابعین کی خاصی تعداد تھی، ان میں خال خال ہی ضعیف تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے، سوائے ایک دو کے جیسے مختار کذاب و حارث اعور۔

البتہ پہلی صدی کے خاتمہ پر اور دوسری صدی کے آغاز پر جب کہ تابعین کی دوسری پیڑھی کے لوگ تھے اس وقت صف ثانوی کے نام سے ایک جماعت ضرور پیدا ہوگئی جنہوں نے ضبط حدیث کے سلسلہ میں کسی قدر نرم روی کا ثبوت دیا۔

جب تابعین کا دور بھی قریب الختم ہوگیا جو دوسری صدی کے نصف تک تھا اس وقت ائمۂ حدیث کی ایک جماعت نے جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے کھلے لفظوں میں فرمایا کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں پایا۔ اعمش نے پوری ایک جماعت ہی کو ضعیف قرار دیا اور بہتوں کی توثیق کی۔ ادھر شعبہ نے بھی رجال کو کھنگالا، ان کا مزاج تھا کہ وہ بجز ثقہ کے کسی سے روایت حدیث نہ کرتے۔ اسی طرح مالکؒ کا بھی حال تھا۔ اس دور کے لوگوں میں جن کی بات قابل قبول ہوئی معمر، ہشامؒ دستوائی، اوزاعیؒ، ثوریؒ، ابن الماجشون، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد وغیرہ ہیں، اس کے بعد دوسرا طبقہ سامنے آیا جس میں ابن المبارک، ہشیم، ابواسحاق الفزاری، معافی بن عمران موصلی، بشر بن المفضل، ابن عیینہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے بیان کر دیا کہ فلاں کی روایت قبول کی جائے اور فلاں کی رد

کردی جائے۔ چنانچہ عدالت اور اس کے شئون بیان کیے، اسی طرح جرح اور اس کے اسباب سے گفتگو کی۔ حضرت عمر کا مکتوب حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام عدالت کے لیے نص کا درجہ رکھتا ہے، اور اس فن کی پہلی بنیادی اینٹ بھی اسی کو کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جس کی شہادت قابل قبول ہوگی اور جن کی گواہی مردود ہوگی بیان کر دیا، اس لیے کہ شہادت کے بعد روایت کے بیان اور ادا پر حرف نہیں آسکتا۔ اسی بنا پر ہم کہا کرتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم نے قانون شہادت کا اجراء کر کے مسلمانوں کو اس انداز پر تربیت دینا سکھایا کہ اس سے ان کی شہادت و روایت قابل قبول ہو سکے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ مسلمان باہم دیگر صاحب عدل ہیں، ہاں اگر جھوٹی شہادت کا مجرم ہو جائے یا کسی جرم میں سزایاب ہو تو اس کی عدالت قابل قبول نہیں، اس لیے کہ بندوں کے خفیہ اعمال تو خدا ہی کو معلوم ہیں۔ آپ کے بعد صحابہ و تابعین نے اس پر گفتگو فرمائی اور جس کی روایت قطعی ناقابل قبول ہوگی، اس کی وضاحت فرمادی، اور جس کی روایت توبہ کے بعد بھی مردود ہوگی اس کو بھی بیان کر دیا، جیسے کہ وضاعین حدیث کذابین علی النبیؐ الکریم یا دین میں نئی بات پیدا کرنے والے اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے خوگر جب کہ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو، امام مالکؒ نے خوب کہا ہے کہ علم حدیث چار سے نہ لیا جائے، ان کے سوا دوسروں سے لیا جا سکتا ہے، ہوا پرست جو لوگوں کو برائیوں کی دعوت دیتا ہو، نہ کسی ایسے اناڑی سے جس کی بیوقوفی سے سبھی واقف ہوں، اگرچہ روایتیں خوب بیان کرتا ہو اور ایسا شخص جو بات بات میں جھوٹ بولنے کا عادی ہو، گو وہ حدیث رسول کے سلسلے میں جھوٹ بولنے کی تہمت سے بری ہو۔ چوتھا وہ شخص جو صاحب فضل بھی ہو صالح بھی ہو، عبادت گزار بھی ہو لیکن اسے حدیث کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ واقعی یہ حدیث ہے تو کس درجہ کی ہے۔ شعبہ سے دریافت کیا گیا کہ کسی سے حدیث کی روایت کس وقت ترک کی جائے گی؟ فرمایا کہ راوی ایسے لوگوں سے بیان کرے جسے لوگ عمدہ جانتے نہ ہوں، اگرچہ وہ روایت معروف ہی سے ہو، اور اس قسم کی روایتیں کثرت سے بیان کرے یا غلط بیانی کا تناسب زیادہ ہو یا متہم بالکذب ہو۔ اگر کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے غلط ہونے پر لوگوں کا اجماع ہو

مگر وہ اسے نہ تسلیم کرے بلکہ بیان کرتا ہی رہے، تو ایسی حدیث نہ لی جائے گی، اس کے علاوہ دوسری باتیں اس سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام شافعی نے کہا کہ ابن سیرینؒ، ابراہیم نخعیؒ اور طاؤسؒ کے سوا بہت سے تابعین کا کہنا ہے کہ حدیث صرف ایسے ثقہ راوی سے قبول کی جائے جو روایت کے بارے میں واقف ہو اور حافظ حدیث بھی ہو اور علمائے حدیث میں سے کسی کو اس کی رائے کی مخالفت کرتے نہ سنا گیا ہو۔

یہی انداز ہمیشہ سے اہل معیار کا تھا، اس کا سلسلہ صدر اسلام سے لے کر تدوین حدیث کے رواج تصنیف تک یکساں ہی رہا۔ کچھ راویوں کو قبول نصیب رہا، کچھ کو لوگوں نے ترک کر دیا، حتیٰ کہ علم الجرح والتعدیل کی تکمیل عمل میں آ گئی۔ لوگوں نے راویوں کے حالات میں بڑی بڑی کتابیں لکھیں اور ناقدین کے اقوال ان میں جمع کیے، جس سے ضعفاء وکذابین حدیث، عدول وثقات رواۃ سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے۔ ضعفاء ومتروکین حدیث کے حالات پر بھی موٹی موٹی کتابیں شائع ہوئیں، جس سے محدثین و طالبین کے لیے اچھے بُرے کی تمیز ہر زمانے میں آسان تر ہو گئی۔ ناقدین حدیث ورجال نے اپنے اقوال کے لیے ایسے عمدہ نادرۂ روزگار اصول وقواعد بنائے جس کی خوبیوں پر تمدن انسانی رہتی دنیا تک رشک کرتا رہے گا، اور مسلمانوں کو اس پر قیامت تک فخر کے مواقع ہاتھ آتے رہیں گے، اور امت اسلامی کی عزت کو چار چاند لگانے والے علماء کا نام ابد تک روشن رہے گا۔ چنانچہ مشہور جرمن مستشرق شپرنگر ابنِ حجر کی (الاصابۃ) کے تعارف میں لکھتا ہے۔

(طبع کلکتہ،۱۸۵۳-۱۸۶۴ء)

''تاریخ عالم میں نہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو یہ شرف حاصل ہوا، نہ موجودہ متمدن دنیا میں کسی کو یہ فخر نصیب ہوا کہ اسماء الرجال کے فن کو مسلمانوں کے انداز پر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ مسلمانوں نے اس علم سے دنیا کو روشناس کر کے اپنی مثال قائم کر دی، اس پر خطر اور عظیم علم (علم رجال) کے ذریعہ ۵ لاکھ (پانچ لاکھ) افراد کے حالات وسوانح باریک بینی کے ساتھ سامنے آ گئے۔''

علمائے اسلام نے اپنے اسفار کے ذریعہ جو انہوں نے صحابہ وتابعین سے ملاقات کے لیے کیا، جس میں انہوں نے بار بار حدیثوں کو دہرایا، ان کو یکسانیت کے ترازو میں تولا، اس کے طریق واسانید کی معرفت حاصل کی، راویوں کے حالات معلوم کیے، ان کے کردار وعمل کو کھنگالا، ثقات رواۃ ومجروحین رواۃ کو الگ الگ کر دکھایا، صرف سندوں اور ثبوت احادیث کا ہی اہتمام نہ کیا بلکہ انہوں نے اپنی جدوجہد واسفار سے ایک اور بات پیدا کی کہ حدیثوں کی درجہ بندی کر کے صحیح، حسن، ضعیف کو الگ الگ تحریر کر دیا۔ مقبول ومردود، قوی وضعیف کو لوگوں میں روشناس کرایا۔ حدیث حسن کا پتہ دوسری صدی ہجری تک محدثین کو نہ تھا، اس کے بعد ہی یہ درجۂ حدیث سامنے آیا اور ترمذی کو حسن حدیثوں کی معرفت میں اولین مقام حاصل رہا، ورنہ متفرق طور سے احمد وبخاری کے یہاں بھی یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ پھر ضعیف کی مختلف قسموں کا تعارف کرایا جس کی بنیاد سند ومتن میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا ضعف بنا، اس کی ابن حبان نے ۴۹ اقسام بیان کیں۔ ابن الصلاح نے بھی اس کی بہت سی قسمیں کی ہیں، قبولیت کی ۶ صفتوں میں سے کسی ایک صفت کے نہ ہونے کے اعتبار سے اور وہ ۶ صفتیں یہ ہیں:

ضبط، اتصال، عدالت، پوشیدہ کی دریافت، غیر شاذ، غیر معلول

ان صفات میں سے کسی کا فقدان یا اور بھی دوسری صفات کا فقدان یا ان چھ صفات میں سے ہر ایک کا فقدان، اس طرح عراقی کے بیان کے مطابق اس کی ۴۲ قسمیں بن گئیں، پھر ان اقسام کی بھی شاخ در شاخ قسمیں نکالی گئی جس کے ذکر کا موقع نہیں ہے۔

۵۔ موضوع احادیث کو پرکھنے کے قواعد کی بنیاد

جس طرح علماء نے صحیح حسن، ضعیف حدیثوں کی تمیز کے لیے بہت سے قواعد مرتب کیے ہیں وہیں موضوع حدیثوں کی معرفت کے لیے بھی کچھ اصول مرتب کیے۔ چنانچہ سند حدیث میں گھڑی حدیثوں کی معرفت اور متن میں گھڑی ہوئی حدیثوں کی علامات ونشانیاں الگ الگ بیان کیں، آگے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

(الف) سند میں وضع کی علامات

(۱) راوی حدیث کذب کا اعتراف کرے اور اپنی روایت کی خود سازی کا اقرار کرے جیسا کہ عبدالکریم وضاع حدیث نے اور ابوعصمت نوح ابن مریم نے کیا۔ اسی طرح ابوجزی نے اپنے بستر علالت میں اعتراف کیا کہ خدا نے اگر موت مسلط نہ کر رکھی ہوتی تو میں کیسے اعتراف واقرار کرتا مگر اسی نے مجبور کیا، میں تمھارے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے فلاں فلاں حدیث وضع کی تھی، اب میں استغفار کرتا ہوں اور گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ اب اس سے بڑی دلیل وضع حدیث میں اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۲) کوئی قرینہ جو وضع حدیث کے اعتراف میں شاہد ہو مثلاً ایسے شخص سے روایت جس سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو یا ایسے شخص سے روایت جو دوسرے شہر میں ہو اور وہاں تک راوی کا جانا ثابت نہ ہو، یا ایسے شخص سے روایت جو راوی کی موت کے بعد پیدا ہوا ہو یا شیخ کا انتقال اس وقت ہوا جب راوی اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی بات نہ سمجھتا ہو۔ شعبہ سے کسی نے دریافت کیا کہ عثمان بن ابی الیقظان سے تم کیوں روایت نہیں لیتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں ایسے شخص سے کیسے حدیث بیان کرسکتا ہوں کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کی عمر معلوم کر رہا ہوں، انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش بتادی، پھر اس نے ایسے شخص سے روایت حدیث کی جو اس کی ولادت سے پہلے مر چکا تھا۔ وضع حدیث کی یہ قسم اسی وقت معلوم ہوسکتی ہے جب کہ شیخ کی پیدائش اور وفات کا علم ہو یا وہ علاقے جہاں وہ سفر کرکے گئے یا وہ مقامات جہاں انہوں نے قیام کیا، اگر یہ نہ معلوم ہو تو وضاعین حدیث شیوخ ثقات کے مقابلہ میں روایتیں وضع کرکے دھوکہ دے سکتے ہیں۔ خدا نے علماء امت محمدیہ کو اس تحقیق کی توفیق عطا فرمائی، چنانچہ انہوں نے رواۃ کے طبقے بنائے اور ان کی ساری باتیں معلوم کیں، ان کے حالات بیان کرنے میں انہوں نے کسی خطرہ کی رعایت سامنے نہیں رکھی۔ چنانچہ حفص بن غیاث کہتے ہیں اگر کوئی شیخ ہو تو اس کی تاریخ پڑھ کر اس کو جانچنا چاہیے، یعنی اس کی عمر اور راوی جس نے کتابت حدیث کی ہے اس کی عمر معلوم کرو، حسان بن زید کہتے ہیں کہ ہم اس پر قابو تاریخ سے

پا سکتے ہیں، مثلاً شیخ کی عمر معلوم کریں، اس کی تاریخ ولادت دریافت کریں، اگر اس کی تاریخ ولادت معلوم ہو جائے۔ پھر اس کی سچائی اس کے کذب سے متمایز کرنا ممکن ہے۔

(۳) راوی جو کذب کے لیے معروف و مشہور ہو، اپنی روایت میں منفرد ہو، کسی دوسرے ثقہ سے یہ روایت نہ پہنچی ہو، ایسی روایت کو وضع کی ہوئی بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔ اور باریک بیں علماء نے امت کے کذابین کی فہرست تیار کر لی ہے اور جس انداز کا جھوٹ ان کذابین نے روایت میں بیان کیا ہے، اسے بھی واضح کر دیا ہے۔

(۴) وہ قرائن جن سے وضع کا پتہ لگایا جائے، راوی کے حالات سے استدلال کرتے ہیں۔ جیسا کہ مامون بن احمد کے ساتھ ہوا کہ اس کی موجودگی میں حسن کا ابو ہریرہ سے حدیثیں سننے کے بارے میں اختلاف ہوا اور اسی مجلس میں چند لمحہ بعد اپنی سند بلا کسی خدشہ کے رسول خدا سے ملا دی، اور کہا کہ حسن نے ابو ہریرہ سے سنا۔ اسی قسم کی حدیثوں میں وہ ہے جو ہم نے سیف بن عمر سے بیان کیا جنہوں نے سعد بن ظریف کی وضع حدیث کی خبر دی کہ معلمو صبیانکم شرارکم (تمہارے بچوں کے معلمین سب سے شر پسند ہیں)۔

(ب) متن میں وضع کی علامتیں

امام ابن قیم الجوزیہ نے بیان کیا کہ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ بلا سند پر نظر کئے ہوئے کسی ضابطہ سے موضوع کی معرفت ممکن ہے؟ یہ ایک اہم سوال تھا۔ یہ تو وہی شخص بتا سکتا ہے جس نے سنت صحیحہ کی معرفت میں ہڈی پسلی ایک کر دی ہو، اور سنت اس کا گوشت پوست بن گئی ہو اور اسے سنت کو جانچنے کا ملکہ حاصل ہو اور سنن و آثار کے جانچنے میں خصوصی ملکہ و پرکھ حاصل ہو، خود پیمبرؐ سے اس کی ایسی نسبت ہو کہ اس سے وہ حضورؐ کی سنت کو فوراً بھانپ جائے کہ حضور کس چیز کا حکم کر سکتے ہیں، اور کس چیز کی نہی فرما سکتے ہیں، کس کی خبر دے سکتے ہیں اور کس بات کی طرف بلا سکتے ہیں، آپ کیا پسند کرتے ہیں، کیا ناپسند فرماتے ہیں، اور امت کو شریعت کا کیا پیام دے سکتے ہیں جیسے وہ رسول کے ساتھ رات دن بیٹھنے والا

رہنے والا جیسے وہ آپ کا صحابی ہو۔ ایسا شخص رسول کے احوال، ان کی سنتوں اور ان کی گفتگو سے واقف ہو سکتا ہے۔ اسے اس کا بھی شعور ہوگا کہ کیا بیان کرنا چاہیے، کیا بیان نہ کرنا چاہیے۔ ہر عاشق اپنے محبوب کا اداشناس ہوتا ہے، ہر وقت وہ اس کی باتوں اور انداز و کردار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا ہے، اور اس کی طرف منسوب غلط و صحیح کی تمیز کرتا ہے۔ یہی حال مقلدین ائمہ کا بھی ہوتا ہے، ان کے اقوال نصوص اور مذاہب سے اور اسلوب و مشرب سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں، جن کی دوسروں کو ہوا بھی نہیں لگتی۔

ابن دقیق العید نے بیان کیا کہ بہت سے لوگ ایسا بلند ذوق رکھتے ہیں کہ وہ واضع حدیث سے حدیث سنتے ہی واقف ہو جاتے ہیں۔ وہ روایت و الفاظ حدیث کو سنتے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ نبی کریم کا قول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چونکہ ان کو دن رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتار و کردار کے سلسلے میں آنے والے الفاظ اور ان کے استعمال سے واقفیت ہوتی ہے اس لیے ان میں ایک ملکہ اور ہیئت نفسانیہ پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ پیمبر کے اقوال کی تمیز غیر اقوال پیمبر سے کر لیتے ہیں۔ اس لیے مرویات کے لیے قرائن کا تعین راوی کے حالات کے تعین سے زیادہ آسان ہے۔

وضع حدیث فی المتن پر دلالت کرنے والے قرائن

(۱) روایت کے الفاظ کا گھٹیا پن کہ اس کو سن کر رسول خدا کے لغت، ادب، فصاحت کے بارے میں غیر معمولی شد بد رکھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ یہ پیمبر کا کہا ہوا نہیں ہے۔ بہت سے فرسودہ اور بے معنیٰ الفاظ پر مشتمل احادیث موجود ہیں جو خود ہی اپنے وضع ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ ابن حجر نے فرمایا کہ معنیٰ میں گھٹیا پن اصل رکاکت ہے، جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ ہوں وضع کی دلیل ہوں گے، اگرچہ الفاظ سے خود رکاکت پر استدلال نہ ہو، اس لیے کہ دین کا ہر انداز کھرا ہے، کھوٹا پن تو روایت کو ہی گھٹیا پن تک لے جانے والی چیز ہے، رکاکت لفظ سے استدلال میں اتنی مدد نہیں ملتی، اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ اس کے لیے سپر

بن جاتی ہے، ممکن ہے معنیٰ الفاظ کا وہ جامہ نہ پہن سکے ہوں جو حدیث میں مقصود تھے اور راوی نے معنیٰ ادا کرنے کے لیے غیر فصیح لفظ استعمال کیا ہو، البتہ جو شخص روایت الفاظ کے ساتھ یہ دعویٰ کرے کہ یہ پیمبر کے الفاظ ہیں تو جھوٹا ہے۔

(۲) فساد معنیٰ، جیسے وہ احادیث جس کو عقل مسترد کر دے، جیسے حدیث بیگن اس کے لیے جو اسے کھائے، یا بیگن میں تمام بیماریوں سے شفاء ہے۔ یا حدیث کو برا انداز دینا، جیسے حدیث اگر چاول انسان ہوتا تو بردبار ہوتا، جب بھی کسی بھوکے نے استعمال کیا آسودہ ہوگیا۔ ابن قیم الجوزیہ نے کہا یہ ان بھدی باتوں میں سے ایک ہے جسے عقل تسلیم نہیں کرتی اور عاقل اس قسم کی لغویات منھ سے نہیں نکالتا، چہ جائے کہ سید الانبیاء اپنی زبان سے ایسی باتیں ادا کریں۔ اسی طرح یہ حدیث کہ جس نے سفید مرغی اپنے پاس رکھی نہ شیطان کا اس پر اثر ہوگا، نہ جادو کام کرے گا۔

اسی طرح ایسی حدیث جو مفاسد اور شہوت رانی کی طرف لے جانے والی ہو یا اس کی اباحت کا شائبہ اس میں پایا جاتا ہو، مثلاً حدیث، تین چیزوں سے نظر میں روشنی بڑھتی ہے، سبزہ دیکھنا، بہتے پانی پر نظر کرنا، حسین چہروں پر نظر جمانا۔ یا یہ حدیث کہ حسین کو دیکھنا عبادت ہے۔ ابن قیم جوزیہ نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ جس حدیث میں خوبصورت چہروں اور ان کی مدح و ثنا یا ان کی طرف نظر کرنا یا ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا، یا یہ کہ ان لوگوں کو جہنم کا عذاب نہ ہوگا، اس قسم کی ساری حدیثیں گھڑنت ہیں اور رسولؐ خدا پر افتراء محض ہیں۔

اسی طرح جو حدیثیں کہ روزمرہ اس پر شہادت دے کہ یہ جھوٹ ہے جیسے عوج بن عنق الطویل کی حدیث جس میں انبیاء پر طعن کا ارادہ کر کے واضع نے حدیث گھڑ لی۔ اس حدیث میں ہے کہ اس کا طول تین ہزار تین سو تینتیس اور تہائی گز یعنی ساڑھے تین کیلومیٹر تھا۔ اور یہ کہ نوح کو جب غرق ہونے کا خطرہ پیش آیا تو انہوں نے اس سے کہا کہ مجھے اپنے برتن میں رکھ لو اور یہ کہ طوفان نوح اس کے ٹخنہ تک بھی نہ تھا اور اس نے سمندر کو عبور کیا، وہ اس کی کمر تک تھا۔ مچھلیاں گہرے سمندر سے لے کر سورج کی روشنی میں بھون لیتا، اس نے ایک بڑی

چٹان کو بنیاد سے اکھیڑ دیا جسے موسیٰ کی پوری فوج بھی نہ اکھیڑ سکتی، اس قلعہ کو اکھیڑ کر پھینکنے والا ہی تھا کہ خدا نے اسی وقت اس کے گلے کا ہار بنا دیا۔

اسی طرح ایسی ساری حدیثیں جن میں ایسی باتوں کا ذکر موجود ہو، جو ذی عقل لوگوں سے بعید ہو۔ اسی طرح مومن میٹھا ہوتا ہے اور مٹھاس پسند کرتا ہے یا کہکشاں جو آسمان پر نظر آتی ہے اس اژدھے کی رگ ہے جو زیر عرش پایا جاتا ہے۔ یا حدیث دلیا سے پیٹھ بہت قوی ہوتی ہے۔ یہ ساری حدیثیں گھڑنت ہیں، رسول خدا پر افترا و بہتان کے درجہ میں ہیں۔ جنہوں نے ایسی حدیثیں وضع کیں جو شریعت کی مخالف نبوت کی منافی بلکہ نبوت کا سرے سے انکار پر دلالت کرنے والی ہیں تا کہ انبیاءؑ کے طبقہ کا خاتمہ کر گزریں، اس لئے کہ انبیاءؑ سلجھی باتوں کو پیش کرنے والے اور معقول باتوں کا حکم کرنے والے ہیں، ان کا کام یہ نہ تھا کہ دستر خوان کی خوبیاں بیان کریں، یا خواہشات نفسانی اور شہوت انسانی کو ابھارنے والے فارمولے پیش کریں، یا پرانوں کی دھن کتھا سنائیں اور ایسی باتیں جنہیں کوئی معقول انسان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو کہہ سنائیں۔ اس سلسلے میں ابن جوزی کی یہ بات کانٹے کی ہے کہ جب تم دیکھو کہ حدیث عقل سلیم کے مخالف یا پیمبر سے سنی ہوئی باتوں کی ضد یا اصول مسلمہ کے متناقض و منافی ہے تو سمجھ لو کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

(۳) کتاب یا سنت متواتر یا اجماع قطعی یا سنت کی صریح مخالف بات، ابن قیم جوزی کہتے ہیں کہ موضوعات میں وہ حدیثیں جو قرآن کے صریح مخالف ہوں، جیسے دنیا کی عمر کی حدیث کہ دنیا سات ہزار سال پرانی ہے اور ساتویں ہزار تک جائے گی، یہ کھلا جھوٹ ہے، اس لیے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا صاف مطلب ہے کہ قیامت کا وقت قریب ہے۔ ساتویں ہزار کے اختتام میں کل ڈھائی سو سال باقی ہیں اور خدا نے قرآن میں فرمایا یسألونك عن الساعة أيان مرساها، اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جو قیامت کے منعقد ہونے کے بارے میں خاموش ہیں، پھر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے قیام کے بارے میں سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

وہ موضوعات جو سنت کے قطعی مخالف ہیں مثلاً وہ حدیث جو احمد و محمد نام رکھنے والوں کے بارے میں ہے کہ جس کا یہ نام ہوگا وہ جہنم میں نہ جائے گا، یہ حدیث رسولؐ خدا کے دین کے بالکل مخالف ہے، اس لیے کہ آپ نے فرمایا کہ اسماء و القاب، جہنم کی آگ سے بچا نہیں سکتے، بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ مدار نجات ہے۔

اسی طرح حضرت علیؓ کے وصی ہونے کی حدیث یا ان کی خلافت کے استحقاق کی حدیثیں سب کی سب موضوع ہیں اس لیے کہ یہ حدیثیں اجماع امت محمدیہؐ کے مخالف ہیں، اس لیے کہ حضور سے کسی کی تولیت پر کوئی نص موجود نہیں ہے۔

(۴) اسی طرح سے ایسی حدیثیں جن سے صحابہ کے کتمان حق اور صحیح بات نقل نہ کرنے کا اثبات ہو وہ ساری حدیثیں گھڑی ہوئی ہیں، ان کا کوئی سر پیر نہیں۔ مثلاً یہ کہ رسول خدا نے حضرت علیؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر صحابہ کے مجمع میں جب کہ صحابہ حجۃ الوداع سے واپس آرہے تھے، حضرت علی کو ان کے درمیان کھڑا کیا تاکہ سبھی حضرت علی کو دیکھ لیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ میرے وصی اور میرے بھائی ہیں، میرے بعد خلیفہ ہوں گے اس لیے ان کی سننا اور ان کی اطاعت کرنا، پھر سارے صحابہ نے اس کو چھپائے رکھا، اور اس حکم کے علاوہ کر دکھایا۔ خدا کی لعنت کذابین پر ہو۔

(۵) ایسی حدیثیں جو تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتی ہوں اور رسول خدا کی زندگی کا ایک دوسرا ہی رخ بنا دیتی ہوں، یا کسی دوسرے قرینہ سے ان کی غلط بیانی و دروغ بافی ثابت ہو جائے۔ جیسے اہل خیبر سے جزیہ کے خاتمہ کی روایتیں مختلف وجوہ سے غلط بیانی ہے۔ پہلی غلط بیانی اس روایت میں سعد بن معاذ کی شہادت روایت کی گئی ہے، حالانکہ سعد اس واقعہ سے کئی سال پہلے غزوۂ خندق میں انتقال کر چکے ہیں۔

دوسری غلط بیانی جزیہ کا حکم ہی اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا نہ اسے صحابہ جانتے تھے، نہ یہ عربوں میں معروف تھا۔ جزیہ کا حکم جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا، جب کہ حضورؐ نے نصاری نجران اور یہود یمن پر اسے عائد کیا۔ ابن قیمؒ نے اس کی تکذیب دس قوی دلیلوں سے کی ہے۔

اس کی مثال وہ ہے جو مسلم نے ابووائل کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ ابن مسعودؓ جنگ صفین میں ہمارے سامنے آئے، حالانکہ ابن مسعود ۳۲ھ میں واقعہ صفین سے قبل انتقال فرما چکے تھے۔

(۶) حدیث کسی اہم معاملہ کی نشاندہی کرتی ہو مثلاً دشمنوں کا حج بیت اللہ سے روک دینا۔ اس روایت کا بجز ایک شخص کے کوئی دوسرا راوی نہیں ہے، حالانکہ یہ کوئی ذرا مرا معاملہ نہ تھا کہ اس کی روایت صرف ایک شخص کرتا۔ اس کی مثال یہی ہے، جیسے خطیب کو منبر پر قتل کرنے کی روایت کا صرف ایک ہی نقل کرنے والا ہے۔

(۷) راوی کے مذہب و خیال کی ترجمانی روایت سے ہوتی ہو اور وہ اپنے عقیدہ میں غالی متعصب بھی ہو، جیسے کوئی رافضی اہل بیت کے فضائل روایت کرے یا کوئی مرجئی ارجاء کے سلسلے میں کوئی حدیث لائے، جیسے حبہ بن جوین کی روایت کہ میں نے حضرت علی سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں نے خدا کی عبادت، رسول خدا کے ہمراہ پانچ سات برس تک اس وقت کی جب کوئی اس امت کا ابھی عبادت گزار نہ بنا تھا۔ ابن حبان نے کہا کہ حبہ کٹر شیعہ تھا اور واہی تباہی حدیث بیان کرتا تھا۔

(۸) حدیث میں کسی معمولی عمل پر لمبے ثواب اور بڑی بڑی نعمتوں اور بدلے کا ذکر مثلاً یہ حدیث جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس کلمہ کی برکت سے خدا ایک پرندہ جس کے ستر ہزار زبانیں ہوں گی پیدا فرمائے گا اور ہر زبان ستر ہزار زبانوں میں اس کے لیے استغفار کرے گی۔ یا جیسے جس کسی نے یہ عمل کیا خدا اسے جنت میں ستر شہر دیں گے اور ہر شہر میں ستر ہزار محل ہوں گے اور ہر محل میں ستر ہزار حوریں ہوں گی۔

اس قسم کی حدیثوں سے وضع حدیث کرنے والوں کی حماقت اور جہالت کا اندازہ ہوتا ہے یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ واضع اعلیٰ درجہ کا زندیق ایسی واہی تباہی باتیں بیان کرکے رسول خدا کی تنقیص کرنا چاہتا ہے۔

یہ تو خیر قواعد تھے، بہت سے علمائے حدیث کو خدا نے ملکۂ خاص عطا فرمایا تھا جو ان کی تعلیم حدیث کا نتیجہ تھا، اور حدیث کی حفاظت، اس سے رات دن لگاؤ و تعلق، حدیث کے طرق

روایت سے پوری طرح واقفیت، اس طرح وہ حدیث رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے عارف ہو گئے تھے، اس لیے ان میں احادیث رسول کے ساتھ رہتے رہتے وہ ذوق خدا نے عطا کر دیا تھا کہ کونسی حدیث صحیح اور غیر صحیح ہے، کیا رسول علیہ السلام کا کلام بن سکتی ہے، کیا کلام رسول بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، ان سب سے واقف ہو گئے تھے۔ چنانچہ ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ حدیث منکر کو سن کر ان حضرات کو کپکپی آجاتی اور دل بیدار ان سے نفرت کرنے لگتا۔ ربیع بن الخیثم جو گرامی تابعین میں ہیں اور عبداللہ بن مسعود کے مخصوصین میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ حدیث رسولؐ ہم دن کی روشنی کی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور بہت سی حدیثیں ایسی ہیں کہ سنتے ہی تاریکی چھا جاتی ہے ہم اسی تاریکی اور بے نوری سے اسے پہچانتے ہیں۔

یہ قواعد وضوابط تھے جنہیں گرامی و باریک بیں علماء نے جوامت میں علم کا معیار تھے موضوع حدیثوں کو صحیح حدیثوں سے ممتاز کرنے کے لیے بنائے تھے۔ مزید براں انہوں نے موضوع حدیثوں کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیے، ان موضوعات کو بھی مجلدات کثیرہ میں اکٹھا کر کے شائع کر دیا۔ یہ ضوابط سند ومتن حدیث دونوں میں برتے گئے۔ ان کی مساعی صرف سند تک ہی محدود نہیں تھیں، بلکہ متن کو بھی بڑی عرق ریزی سے الگ کر دکھایا۔

اور جیسا کہ بعض مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ علماء نے سند حدیث کی طرف تو توجہ کی لیکن متن حدیث کو نظر انداز کر گئے، اور صد افسوس کہ بعض مسلم مصنفین نے بھی مستشرقین کے اس دعوے کی تائید کی، ہم آگے ان کی بعض آراء کا تحقیقی جائزہ لیں گے تا کہ ان کے دعوے کا بطلان ہو سکے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔

فصل ثالث

سنت اور نقد کے سلسلہ میں بعض مستشرقین اور ان کے چیلوں کی رائے

(۱) پہلا مستشرق

جولڈ تیسیہر Johld Tesihar کا خیال ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر تحریر کرتے ہیں کہ وضع حدیث کے بعض مسائل نہایت اہم ہیں جن کا ذکر کرنا باعث خیر ہی ہے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ اس دور میں مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ احادیث نبوی کا بڑا ذخیرہ اسلام میں دینی سیاسی و اجتماعی تغیرات کے نتیجہ میں ہوا، جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں رونما ہوئے تھے۔ حدیثیں بکثرت روایت کی گئیں اور یہ کہنا کچھ زیادہ بصیرت پر مبنی نہیں ہے کہ یہ احادیث ابتداء اسلام میں ہی اسلام کا عظیم وثیقہ دین بن چکی تھیں بلکہ ان مسائی کے نتیجہ میں جو اسلام کی جدوجہد کے سلسلے میں پختگی کے زمانے میں کی گئیں۔ انہوں نے حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ جولڈ تیسیہر نے اپنی کتاب دراسات اسلامیہ میں ذکر کیا ہے جو بعد میں پوری علمی دنیا میں مستشرقین کی بحث کا دارومدار بن گئی۔ اسی جولڈ تیسیہر نے اپنی دوسری کتاب "العقیدة والشریعة فی الاسلام" میں سنت نبوی کے بارے میں اپنی واضح رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس میں اس نے تحریر کیا ہے کہ وضع احادیث کو صرف متاخرین کے کھاتے میں رکھنا ہمارے لیے مشکل ہے، بلکہ ایسی موضوعات

بھی موجود ہیں جن پر قدامت کی چھاپ ہے جسے یا تو خود رسول ؐ نے بیان کیا ہے یا یہ ان لوگوں کے مسائل کا نتیجہ ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اس لیے کچھ آسان نہیں ہے کہ ہم اس خطرے کی نشاندہی منبع اصلی سے الگ ہو کر بعد زمانہ اور بعد مسافت کو بنیاد بنا کر کر سکیں، کہ مختلف نظریات و اعمال کے حاملین نے ان احادیث کو گھڑ لیا ہے، پھر اسے رسول و اصحاب رسول کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر فکر، ہر جماعت، ہر صاحب مذہب اپنی رائے کو قوی بناتا اور دکھاتا ہے اور ان کا مخالف بھی اپنی رائے کو عمدہ دکھلانے کے لیے یہی جتن کرتا ہے، اسی وجہ سے عبادت ہو کہ عقیدہ یا قوانین فقہی ہوں یا سیاسی ضوابط ہوں، غرض کوئی مکتب خیال کوئی مدرسۂ فکر ہو، ہر ایک کی پشت پر احادیث موجود ہیں، جو فی نفسہ اس انداز کی ہیں کہ اس میں بظاہر کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے اس خطرہ کی ہمہ گیری کو پوری طرح محسوس کیا۔ اسی وجہ سے اس کے لیے ایک مخصوص فن کی بنیاد ڈالی جو بعد میں نہایت مفید ثابت ہوا، وہ ہے نقد حدیث کا علم، تا کہ صحیح و غیر صحیح کو معلوم کیا جا سکے۔ اگر متناقض احادیث و گفتار میں کوئی صورت توفیق نکل آئے تو کیا کہنا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہر ایک کے انداز نقد میں فرق ہوتا ہے وہ ہمارے انداز پر نقد نہیں کر سکتے اور نہ ہم ان کے انداز پر باتوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ ہمارے وہ نظریات جو ان احادیث میں فکر و نظر کے لیے بڑا میدان پاتے ہیں، جن احادیث کو نقد اسلامی کے ماہرین نے صحیح اور شک سے بالاتر گردانا اور اس سلسلہ میں چپکی سادھ لی اسی نقد کا نتیجہ تھا کہ لوگوں نے کتب ستہ کو اصول تسلیم کیا، یہ صورت ساتویں صدی ہجری میں پیش آئی، تیسری صدی ہجری میں کچھ علماء نے ایسی احادیث جو ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں احادیث صحیحہ سمجھ کر اکٹھا کر دیا (العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام ۴۹، ۵۰)۔

اصل میں اس مضمون نگار کا سوءظن کتاب کے مختلف ابواب پڑھنے سے نمایاں ہو جاتا ہے، اس کے بعض حصوں سے ہم نے بحث کی ہے اسے بطور اختصار ہم پیش کرتے ہیں۔

(۱) ان کے نزدیک حدیث نبوی کا ذخیرہ ان تطورات کا نتیجہ ہے جو اسلام میں سیاست و اجتماعیت کی بنیاد پر پیش آئے یعنی یہ حدیثیں موضوع ہیں۔

(۲) ان کے نزدیک صحابہ و تابعین جو اسلام کے متقدمین السابقون الأ ولون میں کہے جاسکتے ہیں ان کا بھی وضع احادیث میں کسی نہ کسی درجہ میں ہاتھ تھا۔

(۳) عہد رسالت سے بعد مکانی اور بعد زمانی نے اصحاب مذاہب کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے مذہب کی تقویت کے لیے حدیثوں کا سہارا لیں، بلکہ مسلمانوں کا کوئی مذہب نظری ہو کہ عملی اس میں عقائد و فقہ اور سیاست حتیٰ کہ عبادات کے لیے بھی ایسی احادیث موجود ہیں، جن میں بظاہر کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) مسلمان ناقدین حدیث کا طرز نقد اور طرز فکر غیر مسلم ناقدین حدیث کے طرز نقد وفکر سے علیحدہ ہے۔

(۵) صحاح ستہ میں جو احادیث منتشرہ اکٹھا کردی گئیں ہیں، وہ ان کے حامیین کے خیال کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔

یہ مستشرق جولڈ ٹیسیہر کے پانچ اہم نقطے ہیں جو اس نے وضع ونقد کے سلسلہ میں اپنے نظریے میں لکھے ہیں۔ اس کے سوا اور بھی بعض مباحث زیر بحث لائے ہیں جس کا یہاں موقع ذکر نہیں، ان نظریات پر ہم دفعہ وار مختصر روشنی ڈالیں گے۔

(۱) یہ دعویٰ کہ حدیث کا اکثر حصہ تطورات مذکورہ کی وجہ سے دنیا میں روشناش ہوا، صحیح نہیں، اس لیے کہ قرن اول کے مسلمان اور صحابہ دونوں ہی احادیث قبول کرنے میں درایت سے کام لیتے تھے اور انہیں وضاعینِ حدیث اور کذابین کی جستجو رہتی تھی اور وہ احادیث موضوعہ واحادیث صحیحہ میں پوری تمیز رکھتے تھے۔ پھر قرآن کریم میں ایسے کلی قواعد موجود تھے جو ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے مناسب سے مناسب تر تھے، ہاں جزئیات اور اس کے نفاذ کے طریقوں میں ضرور مختلف تھے۔ اس میں زمانے کے حالات کے مطابق تغیرات ممکن تھے۔ اسلام کے قواعد اور اس کے اعلیٰ اہداف پر زمانے کا کبھی کوئی اثر نہیں پڑا، خدا نے احکام ووسائل مطابقت اور اصول تنفیذ کو کتاب وسنت کی روشنی اور ان کے اصول کے پیش نظر علمائے امت کے حوالے کردیا تھا، اس لیے مسلمانوں کو اپنی زندگی گزارنے کے

لیے مزید کسی دوسری حدیث کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کے لیے تو وہی سب کچھ ہے جو خدا نے انھیں رہتی دنیا تک کے لیے بنیادی قواعد وضوابط عطا فرما دیے ہیں۔ خدا کے اسی قانون پر یہ لوگ راضی ہیں اور خدا کو بھی انہوں نے خود سے راضی کرلیا ہے۔ اسی سلسلے میں قرآن نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کردیا، ''الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔''

(۲) دوسری بات کہ اسلام کے ابتدائی ناصرین کا بھی وضع حدیث میں ہاتھ ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تابعین وصحابہ کے علاوہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کو اسلام کے ابتدائی قائلین میں شمار کیا ہے۔ اگر یہ لوگ مراد ہیں تو ہم اس سلسلہ میں بڑی وضاحت سے بیان کر آئے ہیں کہ صحابہ اس آمیزش سے قطعاً پاک تھے اور کبار تابعین بھی اس کیچڑ سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے، اس لیے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

(۳) اگر چند مفسدین و پرستاران ہوا وہوس نے رسول خدا پر کذب کا اختراع کیا ہے تا کہ وہ اپنے پر فریب مسلک ونظریہ کو زندگی دے سکیں تو اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی کہ مذاہب فقہیہ وسیاسی نظریات کے علمبردار اور عقائد کے قائلین نے اپنے دعوؤں کے اثبات کے لیے احادیث کا اختراع کیا۔ ان اصحاب مذاہب کو سوءِ ظن کا نشانہ کیوں بنایا جائے اور کیوں ان پر وضع حدیث اور جھوٹ کی تہمت باندھی جائے، جب کہ یہ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ صحابہ میں فقہی اختلاف کا سبب ہوائے نفسانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یا تعصب سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کے دوسرے اسباب تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم احادیث کا ایک حصہ کسی جگہ پہنچا دوسرا حصہ نہیں پہنچ سکا؛ جو جس کے پاس پہنچا اس نے اس کے مطابق حکم صادر فرمایا، یا سبھی کو یہ حدیثیں ملیں لیکن طریق استنباط میں اختلاف پیدا ہوگیا، اس لیے کہ سنت رسول کے اتباع پر تو سبھی متفق ہیں۔

اس کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ صحابہؓ نے اپنے مذہب کی تائید کے لیے رسولﷺ خدا پر افترا کیا ہوگا، ان کے مذاہب کی بنیاد قرآن کریم اور سنت مطہرہ ہے، انہوں نے رسولﷺ

خدا کی پاکیزہ صحبت سے پاکیزہ خیالات اخذ کیے تھے۔

جولڈ تیسیہر نے اپنے خیالات کی بنیاد اہل ہوا کی موضوع احادیث کو بنایا ہے۔ مذاہب فقہیہ و خیالات وعقائد کے لیے وضع کردہ احادیث سے اس کا استدلال نہیں ہے۔ اگر مذاہب فقہیہ کے ماننے والون میں اس قسم کی باتیں اس کی سمجھ میں آتی ہیں تو یہ وہی ہیں جن میں احادیث ضعیفہ یا احادیث موضوعہ کا سہارا لیا گیا ہے، پھر اس نے اپنی رائے کو مؤکد کرنے کے لیے انہی اصحاب ہوا کی باتوں کو بطور تائید پیش کیا ہے۔

(۴) رجال کے مسلم ناقدین کی تنقید و جرح ان اصول وقواعد کی پابند ہے جو انہوں نے فن تنقید کے لیے وضع کئے ہیں، اور دنیا کو اس کی اہمیت اور ندرت کا علم ہے۔ ظاہر ہے کہ غیروں کی تنقید ان مسلمانوں کی تنقید سے کس طرح میل کھا سکتی ہے جب کہ ہم حضورؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور غیر مسلم کو حضور کی رسالت سے کیا واسطہ؟ آپؐ کی باتیں وہ اپنے گوش گزار کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہمارا ان کا نقطۂ نظر الگ الگ ہے اور پہلے ہی دن سے وہ الگ ہیں، ہم الگ ہیں، اس لئے کہ عقائد کے سلسلے میں ہم کو حضورؐ نے جو باتیں بیان کیں ساری تسلیم ہیں، برخلاف غیر مسلم کہ ان کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

کتب ستہ کے بارے میں جولڈ تیسیہر کی رائے کہ احادیث کا وہ مجموعہ جو تیسری صدی میں اکٹھا کیا گیا، جب کہ احادیث پراگندہ اوراق کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور اصحاب ستہ نے اسے درست وصحیح سمجھ کر اکٹھا کر لیا، یہ ایک بے ہودہ خیال ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان علماء کی مساعی پر پانی پھیر دیا جائے، جنھوں نے پہلی اور دوسری صدی میں خون پسینہ ایک کر کے ان احادیث کو اکٹھا کیا، پھر ان کے جتن و حفاظت کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلے، یہ احادیث اوراق پراگندہ نہ تھیں بلکہ ان کے روز مرہ زندگی میں برتی جاتی تھیں، اور مسلمان خود اس پر عمل کر کے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اس طرح تعلیم رسول اکرمؐ کا ایک لامتناہی سلسلہ پہلی ودوسر ی صدی میں موجود تھا۔ یہ جدوجہد صرف صحابہ وتابعین تک قائم رہی ہو ایسا بھی نہ تھا، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدر اسلام اور مکہ ومدینہ تک ہی یہ جدوجہد باقی رہ گئی تھی، بلکہ آپؐ کی تعلیم پہلی و

دوسری صدی میں پوری طرح پھیل چکی تھی، اور قریب کے ملکوں اور دنیا کے ہر حصے میں اسلام کی حریت و آزادی کے سائے میں بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ سنت نبوی قولاً، عملاً اور تقریراً ایک جماعت سے دوسری جماعت تک برابر سینوں میں محفوظ رہی۔ پھر صحیفے کی صورت میں اور آخر میں مصنفات کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کی گئی۔ پھر دوسری صدی کے نصف آخر میں ان کتابوں میں مستقل ابواب قائم کئے گئے اور لوگوں کے ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اور جب بخاری و مسلم نے اسے جمع کیا ہے تو یہ پراگندہ اوراق کی صورت میں نہ تھی، بلکہ یہ ان ہزاروں احادیث صحیحہ سے جو حفاظ حدیث کے سینے میں محفوظ تھیں لی گئی ہے۔ تدوین سنت کی بحث کے موقع پر ہم اس کا ذکر کریں گے۔

(۲) دوسرا مستشرق

دوسرا مستشرق جس نے اپنی رائے اس سلسلے میں ظاہر کی ہے وہ Gastone Wieght گاسٹون ویٹ ہے جو تاریخ حدیث اور مذاہب کی تاریخ کا ایک اہم مصنف ہے۔ گاسٹون ویٹ نے بھی جولڈ ٹیسیہر کی رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ وہ اپنا نقد ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ محدثین نے سنت کی پوری چھان بین کے ساتھ تعلیم کا اہتمام کیا مگر یہ تدریس سند اور رجال کی معرفت تک محدود تھی، اس میں ایک دوسرے کی ملاقات اور ایک دوسرے سے سماع پر اکتفا کیا گیا۔ چونکہ رواۃ حدیث نے حدیثوں کو رسول خدا سے سن کر زبانی بیان کیا ہے، پھر اسے حافظین حدیث نے جمع کر کے مدون کیا، مگر انھوں نے متن کا اتنا لحاظ و جتن نہیں رکھا جتنا چاہئے تھا، اس لیے ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حدیثیں بالکل وہی ہیں جو حضور اکرمؐ نے بیان کی تھیں بلکہ حسن نیت کے ساتھ انہوں نے اس میں اضافے بھی روایات کے انتقال کے وقت کئے اور یہ فطری بات ہے کہ انہوں نے بہت سے تغیرات و اضافات روایات کے بیان کرتے وقت کئے۔ اس لیے کہ ساری روایتیں بالمشافہ تھیں۔ یہ خیال چاہے درست ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ نے ہر زمانے میں احادیث کو سچا کلام تسلیم کیا ہے۔

(۳) تیسرا محقق احمد امین ہے:

جس نے یہ بیان کیا کہ علماء نے جرح وتعدیل کے لیے قواعد مرتب کر رکھے ہیں، جن کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ بات تقریباً صحیح ہے کہ رواۃ نے جتنا اہتمام سند کا کیا اتنا اہتمام روایات کے متن کا نہیں کیا، اس لیے کہ ہمارے سامنے وہ نقد حدیث کے سارے گوشے ہیں۔ حضورؐ کی جانب جن باتوں کی نسبت کی گئی ہے ان میں ہمہ گیر اتفاق نظر نہیں آتا، یا جن حالات میں یہ اقوال وافعال پیش کیے گئے ان کے ظروف بھی مختلف ہیں۔ اسی طرح بہت سے تاریخی حقائق تناقض کی نذر ہو کے رہ گئے ہیں۔ حدیث کی عبارتوں کا وہ انداز ہے جیسے کسی فلسفی نے اپنی باتوں کی تعبیر کے لیے الفاظ کا انتخاب کیا ہو، حالانکہ یہ تو حضورؐ کی تعبیرات نبوی کے انداز پر ہونا چاہیے۔ بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فقہ کے متون کی تعبیر کے لیے حدیثوں کے متون کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمارے سامنے اس سلسلہ میں جرح وتعدیل کے جو حصے ہیں ان میں دسواں حصہ بھی اس حقیقت حدیث سے میل نہیں کھاتا، حتی کہ بخاری بھی باوجود اپنی جلالت علم و دقت نظر کے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جو حادثات زمانہ اور مشاہدات وتجربات کی نگاہ میں غلط ثابت ہوتی ہیں، اس لیے کہ ان حدیثوں کے بیان کرنے میں انہوں نے رجال حدیث پر نگاہ رکھی، متن میں کیا ہے اس سے بحث نہیں کی۔ جیسے یہ حدیث کہ اس سطح زمین پر ایک صدی کے بعد کوئی متنفس نہ رہے گا اور حدیث ''جو شخص ہر صبح عجوہ کے سات دانے لیتا ہے اسے رات تک کوئی زہر یا سحر اثر نہیں کرے گا''۔

گاسٹون ویٹ اور احمد امین نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت میں ان مساعی پر جو علمائے سنت نے حدیث کی حفاظت اور اس کو شکوک وغیرہ سے الگ کرنے کے لیے کی ہیں، ایک طرح کا پردہ ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ علمائے رجال نے سند کی چھان بین بالکل اسی انداز میں کی ہے جس انداز میں ان حدیثوں کے متون کی چھان بین کی ہے۔ اسی طرح ان کی دونوں سمت نقد کا توازن یکساں رہا۔ اس کا اندازہ ان قواعد سے ہوتا ہے جو انہوں نے موضوعات کو صحیح حدیثوں سے ممتاز کرنے کے لیے وضع کیے ہیں، اور ان قواعد وحقائق کی روشنی میں ہم

یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مساعی سند و متن کے سلسلہ میں یکساں تھی، اس لیے کہ سند ضعیف کو معلوم کرنے کے لیے جو قواعد انہوں نے بنائے اس کے پہلو بہ پہلو متن کو بھی متمایز کرنے کے اصول وضوابط مرتب کیے۔ وہ علامات متن کے سلسلے میں آٹھ ہیں اور سند کے بارے میں چار ہیں۔ اب اس کے بعد بھی کوئی دلیل رہ جاتی ہے جو اس سلسلے میں پیش کی جائے۔

گاستون ویٹ کا یہ کہنا ہے کہ راویوں نے بہت سی زیادتیاں کردی ہیں، اس زیادہ میں ان کی حسن نیت شامل ہے تو ان مباحث دقیقہ سے جو علماء نے زیادت راوی کے لیے متعین کیے ہیں، حدیث اصلی اور زیادت پوری طرح ہمارے سامنے ہے، متن میں اضافات و تغیرات کو انہوں نے ادراج کے لفظ سے واضح کیا ہے۔ اس پر مستقل کتابیں لکھ کر مخالفین کو خاموش کر دیا ہے، اور علمائے حدیث نے مدرج حدیثوں میں سے ہر ایک کو جان لیا ہے۔

عموماً ادراج ایسی صورت میں پیش ہوا کہ محدث نے حدیث بیان کی، اس کے ساتھ ہی کوئی تفصیل و تشریح بھی بیان کردی جنہیں مستفیدین نے حدیث جان کر نقل کر دیا۔ علماء نے ایسی تمام صورتوں کو ذوق نظر سے پرکھ لیا اور اس کو نمایاں کر دیا کہ راوی سے جو غلطی عمل میں آئی وہ عمداً نہیں تھی، اس لیے خطا کار کی کیا غلطی ہے۔ البتہ اگر اس کی اغلاط و خطیات غیر معمولی ہوں تو اس کی یادداشت اور احتیاط پر حرف گیری ہوگی جو ادراج راوی نے کیا ہے خود اس کے اقرار سے واضح ہو جائے گا، یا خبر کے دوسرے ذرائع اس کا سبب بنیں گے۔ اس مقارنت سے راوی کے ادراج کا واضح طور سے پتہ چل جائے گا۔ ناقدین حدیث نے ان میں سے ہر ایک کی کھوج لگالی ہے اور اس کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

رہ گیا احمد امین کا یہ اعتراض کہ خود بخاری نے باوجود اپنی جلالت علم کے اور بے پایاں جستجو کے ایسی حدیثیں ذکر کی ہیں جن کو زمانہ کے حوادث اور تجربہ نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے رجال پر تنقید کو سامنے رکھا ہے۔ ہم احمد امین کی اس بات کو نہیں مانتے اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی رائے کو قوی کرنے کے لیے اس نے جو کچھ کیا ہے اس سے اس کے دعویٰ کا اثبات تو دور کی بات ہے دعویٰ کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ یہ حدیث

لا يبقى على ظهر الأرض بعد مائة سنة نفس منفوسة صحیح ہے۔ استاذ امین سے سمجھنے میں لغزش ہوگئی ہے اور اس کی غیر ضروری تاویل میں لگ گئے ہیں جن کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ محل۔ بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے سے سو سال کے بعد حضور کے زمانہ میں جو موجود تھا ان میں سے کوئی موجود نہ ہوگا۔ یعنی آپ نے جب یہ بات فرمائی اس دن سے لے کر سو سال کے بعد حضور کے سامنے موجود لوگوں میں سے کوئی نہیں رہے گا۔ یہ حضور کی پیشن گوئی میں سے ہے اور عملاً یہ بات پیش بھی آئی۔ اس لیے کہ حضور کے زمانے کے تقریباً ایک صدی بعد آپ کے عہد مبارک کا کوئی شخص باقی نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اپنی امت کی عمر بیان فرمارہے ہیں کہ امم سابقہ کی طرح سے اس امت کا کوئی شخص طویل عمر نہ پائے گا، لہٰذا اس بات کو ذہن سے نکال کر عبادات وطاعات میں پوری طرح مصروف رہیں، اس لیے کہ یہ مشاہدات و تجربے کے بالکل خلاف بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے کہا کہ حقیقت میں یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ چونکہ جدید ناقدین کی نگاہیں اس طرف نہیں پہنچ سکیں اسی وجہ سے صاحب فجر الاسلام کو یہ غلط بیانی اور افتراء محض معلوم ہوا۔

رہ گئی وہ حدیث جس میں یہ ہے کہ جو شخص صبح کو سات عدد کھجوریں کھالے اس کو اس دن صبح سے شام تک نہ جادو کا اثر ہوگا نہ زہر کا۔ اسے امام بخاری نے کتاب الطب میں ذکر کیا ہے۔ اس کا ذکر امام مسلم و امام احمد نے بھی کیا ہے۔ پھر علماء نے اس کی وضاحت فرمائی کہ مدینہ پاک کی کھجور مراد ہے، بعضوں نے اسے مطلق ہی رکھا ہے اور اکثر لوگوں نے اس کو مدینہ کی کھجور عجوہ ہی میں محدود رکھا ہے۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ کھجور عمدہ غذاء اور صحت کی نگراں ہے بالخصوص اس کے لیے جو اس کے کھانے کا عادی ہو جائے، اس شہر اور علاقے کی کھجور کا مخصوص عدد اور بھی نفع بخش ہے، اس کے کھانے سے جادو، زہر کے اثرات مندفع ہو جاتے ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ اگر انہی خواص کو بقراط و جالینوس وغیرہ اطباء بیان کرتے تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس کے ساتھ یقین و اعتقاد کا انداز اختیار کرتے،

جب کہ یہ اپنی اٹکل، عقل اور تخمین سے لوگوں کے سامنے یہ باتیں کہتے، برخلاف پیمبر خدا کے کہ آپ کی بات یقین وحقیقت بزبان وحی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنا چاہیے تھا اور اعتراض کے بجائے عقیدت کا اظہار ہونا چاہیے تھا۔

یہ صحیح ہے کہ کسی حدیث کی تکذیب اور اس کے انکار میں عجلت نہیں کرنی چاہیے، ہاں ایسی صورت میں کہ حدیث کا طریق کمزور ہو یا عقل وضمیر اس کی حمایت میں نہ ہوں بلکہ اس کی تکذیب و بطلان کا قطعی فیصلہ کرتے ہوں تو خیر سوچا جا سکتا ہے۔ مگر اس حدیث کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ مختلف طرق ائمہ حدیث سے مستند ہے، اس کی روایت ثقات اور عادل اشخاص نے کی ہے۔ پھر اس کے تکذیب کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اس میں جو معنی ہے وہ اجمالی طور سے درست بھی ہے۔ عجوہ کے لیے فائدہ ثابت ہے اور اس کے کھانے پر تشویق وتحریض کی گئی ہے، اور یہ چیز پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، بالخصوص طب میں اسے مغذی، ملین معدہ، جسم کے لیے نشاط آور کہا گیا۔ جراثیم کش بھی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ امعاء کی عفونت اور کیڑوں کے پھیلاؤ سے جو اندرونی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ زہر ہی ہیں جو جسم انسانی میں پہنچ کر انسانی زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اگر یہ امراض پیچیدہ ہو جائیں تو لازمی طور سے باعث موت ہوں گے، اس طرح معالجۂ سموم کے لیے عجوہ کا استعمال ایک ثابت شدہ امر ہے۔ رہ گیا جادو تو یہ ایک نفسانی بیماری ہے، اس کے لیے علاج بھی اسی انداز کا ہونا چاہیے، طبیعت کی آمادگی اس کی گواہی شفاء مرض میں خاص مقام رکھتی ہے، خصوصیت سے ایسی بیماریوں میں جب ہم نے مان لیا کہ کھجور مغذی ہے، مفید بدن انسانی ہے، انسان کی قوت بحال کرتی ہے، دیدان کش ہے اور مانع عفونت ہے، اور یہ کہ مدینہ کی پیدا شدہ کھجور ہے یعنی شہر حبیب کا میوہ ہے، اور اس کے معالجہ ہونے کا بیان خود پیمبرؐ نے کیا ہے اور آپ غلط بیان نہیں ہیں، بلکہ حقائق بیان کرتے ہیں، اس لیے اس کا مسحور کی طبیعت میں مؤثر ہونا بھی دور کی بات نہیں۔

فجر الاسلام کے مصنف نے اس حدیث کی تکذیب کر کے بہت بڑی جسارت کی ہے، جسے علمی حلقوں میں کسی صورت میں پسند نہ کیا جائے گا، جب تک اس کی سند میں کوئی خرابی

نہیں نکلتی اور جب کہ اتنی بات اجمالی طور سے ثابت ہو چکی ہے کہ اس میں ضرر کا پہلو نہیں ہے، اس لیے یہ بات بھی ہے کہ طب کے ذریعہ اس کے سارے گوشے ضرر و نفع کے ہمارے سامنے نہیں ہیں، اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر حجاز میں معروف طبی ادارے ہوتے یا اعلیٰ قسم کی کھجوریں مغرب میں موجود ہوتیں تو طبی تحقیقات کے ذریعہ موجودہ زمانے میں یہ چیز ثابت ہو جاتی کہ اس میں اور خاصیات کے ساتھ ساتھ یہ عجیب خاصیت بھی موجود ہے۔ اگر آج اس کا علم نہیں ہو سکا تو ممکن ہے مستقبل میں انشاء اللہ تحقیق ہو جائے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی یہ بات ہم نے آپ کے سامنے من وعن رکھ دی۔

استاذ احمد امین نے صرف اسی بات پر جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سی ایسی حدیثیں بھی ثبوت میں لائے ہیں جن پر ناقدین نے سند سے بحث کی ہے نہ کہ متن سے۔ لیکن ان کی حرماں نصیبی وہ شہادتیں جو اثبات مدعا کے لیے وہ لائے تھے اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی حدیث استشہاد ایسی نہیں ہے جس میں علماء نے طرح طرح سے گفتگو نہ کی ہو اور اس کا پول نہ کھولا ہو اور اس کے سارے طرق سامنے نہ لائے ہوں اور اہل ہوا مناظرین نے جو اشکالات کیے ان کا ازالہ نہ کیا ہو۔

فصل رابع

رجال وموضوعات پر مشتمل مشہور تصنیفات
(حفاظتِ حدیث کے سلسلہ میں علماء کا زبردست کارنامہ)

وضعِ حدیث کے چلن نے علماء کے اندر ایک گہرا اثر چھوڑا اور وہ سنت کی حفاظت کے لیے تن، من، دھن سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وضعِ حدیث ہی وہ اہم سبب ہے جس نے علماء کو حدیث کی جمع وتدوین اور تصنیف پر مجبور کیا۔ چنانچہ امام زہری کا اس بارے میں کہنا ہے کہ اگر جانب مشرق سے ہم تک ایسی احادیث نہ آتیں جو ہمارے لیے غیر معروف ومنکر تھیں تو نہ میں حدیث لکھتا نہ ہی اس کے لکھنے کی اجازت دیتا۔

باب چہارم میں میں نے احادیث کے جمع کے سلسلہ میں مفصل طور سے بیان کیا ہے، جس سے علماء کی کوششوں اور ان کے اہتمام وحرص برائے احادیث صحیحہ کا پتا چلتا ہے۔

اب ہم علماء کی ان تصنیفات کا جائزہ لیں گے جن کا حدیث نبوی کی حفاظت کے سلسلہ میں زبردست رول رہا ہے۔ ہمارے اس موضوع بحث میں شامل چیزیں یہ ہیں، رجال ورواۃ کی تاریخ واحوال، ان کی کنیت والقاب وانساب اور اسمائے گرامی اور ثقہ وضعیف حضرات کا بیان، اور موضوع احادیث پر لکھی ہوئی کتابیں جن کا حفاظت حدیث میں زبردست اثر تھا۔ اور یہ تالیفات ایسے ناقابل تسخیر قلعہ کے مانند ہیں جہاں دشمنانِ سنت کے نیزے ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ مسلمانوں کے سنت نبوی کے اہتمام کے سلسلہ میں بڑی قوی دلیل ہے جس سے انسانیت کی وراثتِ علمی کی بنا ہوئی۔

میں نے ان تالیفات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا اور مطبوعات ومخطوطات کے احاطہ کی

کوشش کی اور سید محمد کتانی نے اپنی کتاب (الرسالة المستطرفة لبيان مشهور کتب السنة المشرفة) میں حدیث وعلوم حدیث پر مشتمل بہت ساری کتابوں کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح استاد عمر کحالہ نے اپنی کتاب (معجم المؤلفين) اور استاد خیر الدین زرکلی نے (الأعلام) میں ان تالیفات ومؤلفین کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح بہت ساری کتابیں جو تراجم واحادیث پر مشتمل تھیں جن کی تعداد دو سو پچاس سے زائد ہے ان سب کا احصاء اس کتاب میں ناممکن ہے اس لیے ہم نے اس موضوع سے متعلق مشہور ومعروف کتابوں کے ذکر پر اکتفا کیا۔

صحابۂ کرام پر لکھی ہوئی مشہور کتابیں:

اول:

صحابۂ کرامؓ تابعینؒ واتباع تابعینؒ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اللہ کے رسولؐ سے روایت کرنے والے کن کن لوگوں کو شرف صحبت حاصل ہے اور وہ ان بیشتر لوگوں کے ناموں کو یاد رکھتے تھے۔علماء نے انؓ کے ناموں کا احاطہ، ان کی مرویات کا بیان، ان کے احوال، مقامات، ان سب کی تاریخ وفات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔اس باب میں صحابۂ کرام سے متعلق مجھے تقریباً چالیس کتابیں ملیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱۔"معرفة من نزل من الصحابة سائر البلدان" پانچ جلدوں میں امام ثقہ صاحب تصانیف کثیرة ابوالحسن علی بن عبداللہ المدینی (۱۶۱۔۲۳۴ھ) کی تصنیف کردہ ہے۔

۲۔"کتاب المعرفة" یہ کتاب صحابۂ کرام کے بارے میں ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کے مصنف مرو کے مفتی وعالم امام ابو محمد عبداللہ بن عیسی المروزی (۲۲۰۔۲۹۳ھ) ہیں۔

۳۔"کتاب الصحابة" پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب امام محمد بن حبان ابوحاتم البستی (۲۷۰۔۳۵۴ھ) کی ہے۔

۴۔"الاستيعاب في معرفة الأصحاب" أبوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد

بن عبدالبر النمری القرطبی المالکی" (۳۶۸-۴۶۳ھ) کی ہے۔ ہندوستان میں ۱۳۱۸ھ و ۱۳۱۹ھ میں دو جلدوں میں دو مرتبہ شائع ہوئی بعد میں مصر سے چار جلدوں میں شائع ہوئی، اس کتاب میں تین ہزار پانچ سو (۳۵۰۰) صحابہ کے حالات قلم بند ہیں۔

۵۔ "أسد الغابة فی معرفة الصحابة" پانچ جلدوں میں معروف مؤرخ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد ابن الأثیر (۵۵۵-۶۳۰ھ) کی ہے، یہ کتاب ۱۲۸۶ھ میں مصر میں چھپی، اس میں سات ہزار پانچ سو چون صحابۂ کرام کے حالاتِ زندگی ہیں۔

۶۔ "تجرید أسماء الصحابة" دو جلدوں میں امام حافظ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الذھبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی ہے، ۱۳۱۰ھ میں ہندوستان میں چھپی۔

۷۔ "الاثابة فی تمییز الصحابة" امام شہاب الدین احمد بن علی الکنانی العسقلانی (ابن حجر) (۷۷۳-۸۵۲ھ) کی اپنے موضوع پر سب سے جامع کتاب ہے، ۱۸۵۳ء میں ہندوستان میں طبع ہوئی پھر مصر میں ۱۳۲۳ھ میں آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کی پہلی چھ جلدیں اسمائے رجال پر مشتمل ہیں جس میں ۹۴۷۷ سوانح ہیں، اور ساتویں جلد کنیات پر مشتمل ہے، اس میں ۱۲۵۷ کنیتیں ہیں، آٹھویں میں ۱۵۴۵ عورتوں کی سوانح ہیں۔

۸۔ "الریاض المستطابة فی جملة مَن روی فی الصحیحین من الصحابة" شیخ یحییٰ بن ابوبکر العامری الیمنی (۸۱۶-۸۹۳ھ) کی ہے، ۹۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں ہندوستان میں چھپی۔

۹۔ "دُرّ الصحابة فی من دخل مصر من الصحابة" حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر السیوطی (۸۴۹-۹۱۱ھ) کی کتاب ہے، ۱۳۲۷ھ میں مصر سے چھپی۔

۱۰۔ "البدر المنیر فی صحابة البشیر النذیر" شیخ محمد قائم بن صالح سندھی حنفی قادری کی کتاب ہے، جو ۱۱۴۵ھ سے پہلے تک زندہ تھے۔ اس کتاب میں ان اصحاب رسول کا ذکر ہے جن کی صحبت بذریعہ روایت یا کسی طریق سے ثابت ہے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر بہت ساری کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، بعض علماء نے ان کتابوں میں شرح وبسط سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ابن عبدالبر کی "الاستیعاب" میں اضافہ ہے۔اسی طرح ابن فتحون اندلسی (م ۵۱۷ھ) اور ابوالحجاج یوسف ابن محمد بن مقلد (م ۵۵۸ھ) کی کتابوں میں اضافے و مختصرات ہیں۔

اسی طرح امام سیوطی نے "الاصابة" کو مختصر کر کے اس کا نام "عين الاصابة في معرفة الصحابة" رکھا۔

راویوں کی تاریخ واحوال پر لکھی مشہور تصنیفات

دوم:

جب ہم راویوں کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سلسلہ میں مختلف انداز کی تصنیفات ملتی ہیں۔

بعض محدثین و مؤرخین ایسے ہیں جنہوں نے سنوں کی ترتیب پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ بعضوں نے شہروں کی بنیاد پر اور بعضوں نے اپنی کتابوں کو حروف کی بنیاد پر مرتب کیا جیسا کہ سوانحی کتابوں کا انداز ہے، اور بعض دیگر محدثین نے راویوں کو طبقات و نسل کی بنیاد پر مرتب کیا۔

یہ تصنیفات اختصار وطوالت، ایجاز و اطناب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ ہم تراجم کی کتابوں میں ایجاز پائیں گے تو تواریخ کی کتابوں میں تفصیل پائیں گے جیسے تاریخ دمشق، تاریخِ بغداد، تاریخ اسلام۔ میں نے اس باب کی زائد از ۹۰ کتابوں کو جمع کیا لیکن صرف معروف کتابوں کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

سب سے پہلے تاریخ وسوانح سے متعلق مشہور کتابوں کا جائزہ لیں گے۔

الف:- رجال کی سوانح پر مشتمل تالیفات:

ا۔ امام یحیٰ بن معین (۱۵۸۔۲۳۳ھ) کی کتاب "تاریخ الرواۃ" جسے حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے، ان کی دیگر کتابیں "معرفۃ الرجال اور التاریخ والعلل" بھی ہیں۔

۲۔ "التاریخ" دس جلدوں پر مشتمل یہ کتاب مشہور محدث ماہر انساب خلیفہ بن خیاط الشیبانی العصفری کی ہے۔

۳۔ امام احمد بن حنبل (۱۶۴۔۲۴۱ھ) کی کتاب "التاریخ"۔

۴۔ امیر المومنین فی الحدیث، صدر نشینِ حفاظ حدیث امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴۔۲۵۶ھ) کی عظیم و معروف کتاب "التاریخ الکبیر" اس کتاب میں انہوں نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن سے روایت لی ہے اور اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ صحابہؓ اور ان کے بعد کے راویوں کا احاطہ اپنے شیوخ تک کریں۔ اس طرح ان راویوں کی تعداد بشمولِ مرد و زن اور ضعیف و قوی تقریباً چالیس ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے شیوخ اور ہم عصر لوگوں نے اس تاریخ کو بہت سراہا، یہاں تک کہ امام بخاری کے شیخ اسحاق بن ابراہیم ابن راھویہ نے جب اس تاریخ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اس کتاب کو لے کر امیر عبداللہ بن طاہر کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ "اے امیر! میں تجھے ایک جادو دکھلاتا ہوں (اس جادو سے مراد یہی کتاب تھی)۔ یہ کتاب چار بڑی جلدوں میں ہے، اور حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ اسی کتاب کے بارے میں التاج سبکی نے کہا "اس سے ماقبل اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، بعد کے لوگ جو فن اسماء الرجال و تاریخ و کنیات پر تالیف کریں گے وہ اس پر تکیہ کریں گے"۔

التاریخ الکبیر حیدر آباد میں ۱۳۶۱ھ اور ۱۳۶۲ھ میں آٹھ جلدوں میں چھپی، امام بخاری کی اس سلسلہ میں اور بھی کتاب "التاریخ الوسط والصغیر" ہے۔ "التاریخ الصغیر" ہندوستان میں ۱۳۲۵ھ میں چھپی، اس کے آٹھ چھوٹے اجزاء ہیں جو ایک ہی جلد میں ہیں۔

۵۔"التاریخ الکبیر" اندلسی مورخ احمد بن سعید بن حزم الصدفی ابوعمر (۲۸۴۔ ۳۵۰ھ) کی کتاب ہے جو محدثین کی سوانح پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے بارے میں ابن الفرضی کا کہنا ہے کہ اپنے مقصد میں پوری اترتی ہے اور ابن خیر نے کہا کہ اس کے ۸۵ اجزاء ہیں۔

۶۔ "الهداية والارشاد في معرفة أهل الثقة والسداد" یہ ابوالنصر احمد بن محمد بن حسین الکلاباذی (۳۰۶۔۳۹۸ھ) کی کتاب ہے،اس کتاب میں انھوں نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی تخریج امام بخاری نے اپنے جامع میں کی ہے۔

۷۔ "تاريخ نيسابور" یہ محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوری (۳۲۱۔۴۰۵ھ) جو ابن البیع کے نام سے مشہور ہیں کی کتاب ہے،اس کے بارے میں سبکی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب فقہاء کی تواریخ پر سب سے بہتر اور مفید کتاب ہے۔اس کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ صاحب کتاب تمام علوم میں مہارت رکھتے تھے،ان کی اور بھی کتابیں "تراجم الشيوخ وتسمية من أخرجهم البخاري و مسلم" ہیں۔

۸۔"تاريخ بغداد" یہ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد البغدادی الشافعی (۳۹۲۔۴۶۳ھ) جو خطیب بغدادی کے نام سے معروف ہیں،کی کتاب ہے۔یہ بہت اہم اور بے پناہ مفید کتاب ہے۔صاحب کتاب نے اس میں راویوں کا ذکر کے ساتھ ہی دیگر مفید چیزوں کو بھی شامل کر لیا ہے اور اس کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر ہے اور اس میں قوی ضعیف اور مطروق کو بھی ذکر کیا ہے۔یہ کتاب قاہرہ میں ۱۳۴۹ھ بمطابق ۱۹۳۱ء میں چودہ جلدوں میں شائع ہوئی،جو سات ہزار آٹھ سو اکتیس سوانح پر مشتمل ہے۔

۹۔ "السابق واللاحق في تباعد ما بين وفاة الراويين عند شيخ واحد" یہ بھی خطیب بغدادی کی کتاب ہے۔

۱۰۔ "الجمع بين رجال الصحيحين" یہ امام حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر المقدسی (۴۴۸۔۵۰۷ھ) جو ابن القیسرانی الشیبانی کے نام سے مشہور ہیں،کی کتاب ہے۔ اس میں ابونصر الکلاباذی اور ابوبکر احمد بن علی الاصفہانی کی "رجال البخاري و مسلم"

پر مشتمل دونوں کتابوں کا نچوڑ ہے، یہ کتاب ہندوستان میں ۱۳۲۳ھ میں ۶۳۸ صفحات میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ مصنف کی دیگر کتابیں جیسے "تاریخ أهل الشام ومعرفة الائمة منهم والأعلام" دو جلدوں میں اور ایضاح الاشكال فيمن أبهم اسمه من النساء والرجال اور المغني في أسماء رجال الحديث جو تقریب التہذیب کے آخر میں ہندوستان میں ۱۳۲۰ھ میں طبع ہوئی۔

۱۱۔ تاريخ دمشق اسی سے زائد جلدوں میں ہے، یہ حافظ مورخ ابوالقاسم علی بن الحسین دمشقی (ابن عساکر) (۴۹۹۔۵۷۱ھ) کی عظیم کتاب ہے، اس کا اختصار شیخ عبدالقادر بدران نے کیا ہے اور اس سے اسانید و مکررات کو حذف کر دیا ہے اور اس مختصر کا نام تہذیب تاریخ ابن عساکر رکھا ہے، اس کے سات اجزاء دمشق سے ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئے۔ ابن عساکر کی دیگر کتابیں بھی ہیں مثلاً تاریخ المزة، معجم النسوان، معجم الشيوخ و النبلاء، المعجم المشتمل على أسماء الكتب الستة۔ مقدمۂ کتاب میں فرمایا کہ "جب میں نے ائمۂ سابقین کی کتب سنن کی احادیث کی تخریج کی تو انہیں ایسے انداز پر ترتیب دیا کہ قاری کو اکتاہٹ نہ ہو۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے ثقہ شیوخ کے اسماء کا ذکر کروں، ساتھ ہی میں نے بخاری و مسلم کے شیوخ کے اسماء کا بھی اضافہ کیا۔

۱۲۔ الكمال في أسماء الرجال، یہ دو جلدوں میں حافظ ابو محمد عبدالغنی بن عبدالواحد بن علی بن سرور المقدسی الجماعیلی الحنبلی الدمشقی (۵۴۱۔۶۰۰ھ) کی تالیف کردہ ہے۔

۱۳۔ جامع الأصول لأحاديث الرسول، یہ مجدالدین ابوالسعادات مبارک بن محمد (۵۴۴۔۶۰۶ھ) جو ابن الاثیر کے نام سے معروف ہیں کی لکھی ہوئی ہے۔

۱۴۔ المعجم، یہ محدثین کی تاریخ پر مشتمل ہے، ۱۸ جلدوں میں یہ کتاب ابوالمظفر عبدالکریم بن منصور السمعانی (متوفی ۶۱۵ھ) کی ہے۔

۱۵۔ التدوين في ذكر أخبار قزوين، یہ ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد الرافعی القزوینی (۵۵۷۔۶۲۳ھ) کی تالیف کردہ ہے جس میں وہاں کی خصوصیات کو ذکر کیا ہے

اوران صحابہ وتابعین کا ذکر کیا ہے جو وہاں قیام پذیر ہوئے۔نیز وہاں کے ساکنین میں سے جنہوں نے علم ودرس میں کمال پیدا کیا یا وہ لوگ جو یہاں آکر بس گئے ان تمام لوگوں کا ذکر اس کتاب میں حروف کی ترتیب پر ہے،اور رسول اللہ کے نام کی برکت کے لیے محمد نام کے لوگوں سے ابتدا کی ہے،یہ کتاب چار جلدوں میں دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔

۱۶۔التقیید لمعرفة رواة السنن والمسانید،حافظ محمد بن عبدالغنی بن ابوبکر معین الدین (ابن نقطہ) حنبلی البغدادی (متوفی ۶۲۹ھ) کی کتاب ہے۔اس پر تقی الدین محمد بن احمد الحسینی الفاسی المکی المالکی (متوفی ۸۳۲ھ) کا اضافہ ہے۔

۱۷۔تهذيب الكمال في أسماء الرجال،حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف بن عبدالرحمن المزی الدمشقی (۶۵۴۔۷۴۲ھ) کی کتاب ہے۔یہ حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی کی کتاب الكمال في أسماء الرجال کی تہذیب ہے،جس میں بخاری،مسلم،ابوداؤد،ترمذی،نسائی،ابن ماجہ کے راویوں کو جمع کیا ہے۔المزی نے اپنی تہذیب میں عام رواۃ علم،حاملین آثار اور طبقۂ اہل علم سے مشہور لوگوں کو حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے،پھر عورتوں کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔اس کی تالیف میں ۷۰۵ھ سے ۷۱۲ھ تک کا عرصہ صرف ہوا،اس کے پچاس اجزاء ہیں جو ۱۲ جلدوں میں ہیں۔

۱۸۔تذهيب تهذيب الكمال: حافظ محمد بن احمد بن عثمان الذھبی (۶۷۳۔۷۴۸ھ) کی تالیف کردہ ہے،اور یہ المزی کی تهذيب الكمال کا اختصار ہے،اس کا مزید خلاصہ الكاشف عن رجال الكتب الستة کے نام سے ہے،اس میں صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی روایتیں ان کتابوں (کتب ستہ) میں ہیں،اور کتب ستہ کے افراد کے لیے رموز مقرر کیا اوران کی تاریخ وفات نوٹ کی،اس کتاب کو حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا،اور حرف الف میں احمد نام کے لوگوں کا پہلے ذکر کیا،اسی طرح حرف میم میں محمد نام کے لوگوں کا پہلے ذکر کیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی عظمت وبرکت حاصل ہوسکے۔

۱۹۔امام ذہبی کی تاريخ الاسلام و طبقات المشاهير والأعلام جس میں

انہوں نے حوادث و وفیات کا ذکر سالوں کی بنیاد پر کیا ہے، ابتدا ہجرت نبوی سے کی اور اواخر ۷۰۰ھ تک پہونچایا۔ ستر طبقے بنا کر ہر طبقہ دس سال کا مقرر کیا، اور ہر طبقہ کے اسماء کو حروف تہجی اور حوادث زمانہ کی بنیاد پر مرتب کیا، یہ کتاب ۳۶ جلدوں میں مکمل ہوئی، مصر سے اس کے پانچ اجزاء ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئے۔

ذہبی نے اپنی تاریخ کو مختصر کر کے سیر أعلام النبلاء کے نام سے ۱۴ جلدوں میں لکھا۔ جس کی دو جلدیں ۱۹۵۷ء میں مصر سے شائع ہوئیں اور تیسری جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔

۲۰۔ "التذکرۃ برجال العشرۃ" محمد بن علی بن حمزہ الحسینی الدمشقی (۷۱۵-۷۶۵ھ) کی کتاب ہے۔ اپنی اس کتاب میں اپنے شیخ المزی کی کتاب "تہذیب الکمال" میں موجود راویوں کے ساتھ کتب اربعہ مؤطا، مسند شافعی، مسند احمد، مسند ابوحنیفہ کے راویوں کو شامل کیا۔ اس کی تخریج حسین بن محمد بن خسرو نے ابوحنیفہ کی احادیث سے کی ہے، اور کتب ستہ میں پائے جانے والے راویوں پر اکتفا کیا ہے علاوہ اس بات کے کہ ان کے مصنفین نے اپنی دیگر تصنیفات میں کچھ تخریج کی ہے جیسے بخاری کی الادب المفرد۔

۲۱۔ "تہذیب التہذیب" حافظ شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی ابن حجر عسقلانی (۷۷۳-۸۵۲ھ) کی معروف کتاب ہے۔ یہ المزی کی "تہذیب الکمال" کی تلخیص ہے اور اس پر بہت مفید اضافات ہیں۔ ۱۳۲۵ھ و ۱۳۲۷ھ میں ہندوستان میں ۱۲ جلدوں میں شائع ہوئی۔ "تہذیب التہذیب" فی زمانا حلقۂ علماء میں راویوں کے سوانح کے سلسلہ میں سب سے معروف و مشہور اور نادر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ابن حجر نے اس کی تلخیص ایک جلد میں کر کے اس کا نام "تقریب التہذیب فی أسماء الرجال" رکھا، جس کی اشاعت ہندوستان میں ۱۳۲۰ھ میں ہوئی اور ۱۳۵۶ھ میں مولوی امیر علی کی تعقیب کے ساتھ شائع ہوئی۔

۲۲۔ "اسعاف المبطأ برجال الموطأ" یہ حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب ہے جو ہندوستان میں ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوئی۔

ب۔ کتب طبقات:

یہ وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین نے راویوں کو طبقات کی بنیاد پر ذکر کیا اور ان کے حالات کو طبقہ کے حساب سے اپنے زمانے تک پہنچایا۔ میں نے اس سلسلہ میں ۲۰ سے زیادہ کتابوں کو جمع کیا لیکن صرف مشہور کتابوں کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ "الطبقات الکبریٰ" یہ ثقہ مؤرخ محمد بن سعد بن منیع الحافظ کاتب واقدی (۱۶۸۔۲۳۰ھ) کی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو قلم بند کیا، پھر صحابۂ کرام کا ان کے طبقات کی بنیاد پر ذکر کیا، اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا ذکر اپنے زمانہ تک کیا۔ انہوں نے بہت بہتر اور نفیس انداز میں کام کیا۔ یہ کتاب فن تاریخ ورجال کے سلسلہ میں سب سے اہم اور موثوق بہ تصور کی جاتی ہے۔ طبقات کی اشاعت ۱۳۲۲ھ میں لیدن شہر میں ۱۳ جلدوں میں شائع ہوئی، اس کی آخری جلد نسائیات پر مشتمل ہے، ۱۴ویں جلد میں ابن سعد نے ان تمام لوگوں کی ایک عام فہرست بنائی جن کی سوانح اس کتاب میں ہے جس سے اس کتاب سے استفادہ آسان ہوگیا۔ ابن سعد کے دوسرے طبقات صغریٰ ثانی و ثالث (دوم، سوم) ہیں۔

۲۔ "طبقات الرواۃ" آٹھ حصوں میں حافظ ابوعمرو خلیفہ بن خیاط العصفری (م ۲۴۰ھ) کی کتاب ہے، یہ بخاری کے شیوخ میں سے تھے۔

۳۔ "طبقات التابعین" یہ امام مسلم بن حجاج القشیری (۲۰۴۔۲۶۱ھ) کی تصنیف ہے۔

۴۔ "کتاب التابعین" یہ ۱۲ جلدوں میں حافظ محمد بن حبان ابوحاتم البستی (۲۷۰۔۳۵۴ھ) کی ہے، ان کی دیگر کتابیں مثلاً "أتباع التابعین و تباع التبع" ۱۵ حصوں میں اور "الطبقات الأصبهانية" ہیں۔

۵۔ "طبقات المحدثین والرواۃ" یہ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن احمد الاصبہانی (۳۳۶۔۴۳۰ھ) کی کتاب ہے۔

۶۔ "طبقات الحفاظ" حافظ شمس الدین ذہبی (۶۷۳۔۷۴۸ھ) کی کتاب ہے، جس میں حدیث کے راویوں کا ذکر صحابۂ کرام وتابعین اور تبع تابعین سے لے کر اپنے ہم عصر لوگوں تک کیا ہے اور ان کے اکیس طبقے بنائے ہیں۔ ۴ جلدوں میں یہ کتاب ہند میں چھپی، فنِ طبقات میں سب سے نفیس کتاب تصور کی جاتی ہے۔

۷۔ "طبقات الحفاظ" یہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹۔۹۱۱ھ) کی کتاب ہے، جس میں حفاظ حدیث کی سوانح ایجاز کے ساتھ مذکور ہے، ۱۸۳۳ء میں غوطا سے شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ بھی فن طبقات میں دیگر بہت سی کتابیں ہیں جیسے "كتاب المحدثين بأصبهان والواردين عليها" عبداللہ محمد اصبہانی کی اور "طبقات علماء أفريقيا" ابوالعرب محمد بن احمد بن تمیمی المغربی کی۔

سوم: اسماء رجال وکنیات، القاب وانساب پر مشتمل کتابیں

علماء نے جس طرح راویوں کی سوانح اور حالات پر کتابیں تصنیف کیں انہوں نے مناسب سمجھا کہ اسمائے رجال پر بھی کتابیں لکھی جائیں تاکہ شبہ اور خطا کی گنجائش نہ رہے، کیوں کہ بہت سارے نام، کنیت اور انساب ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کنیات، القاب وانساب پر مشتمل بہت ساری کتابیں تصنیف کر ڈالیں جو احاطہ سے باہر ہیں۔ میں نے اس باب میں زائد از تیس کتابوں کو جمع کیا، لیکن اسماء والقاب وکنیات کی صرف مشہور کتابوں کا ذکر کروں گا، پھر راویوں کے نسب کے سلسلہ کی مشہور کتابوں کا ذکر کروں گا۔

(الف) اسماء والقاب اور کنیات کی کتابیں:

۱۔ الأسامي والكنى: آٹھ جلدوں میں یہ علی بن عبداللہ بن جعفر المدینی (۱۶۱۔۲۳۴ھ) کی کتاب ہے۔

۲۔ الأسماء والكنى: امام احمد بن حنبل (۱۶۴۔۲۴۱ھ) کی۔

۳۔ الکنی: اس نام سے ائمۂ حدیث نے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں جیسے امام بخاری، نسائی، عبدالرحمن بن ابو حاتم وغیرہ۔

۴۔ کتاب الکنی والأسماء: امام مسلم بن حجاج النیسابوری (۲۰۴۔۲۶۱ھ) کی کتاب ہے۔

۵۔ الکنی والأسماء: ابو بشر محمد بن احمد بن حماد بن سعد انصاری دولابی (۲۲۴۔۳۲۰ھ) کی نہایت جامع ومعروف کتاب ہے، ۱۳۲۲ھ، ۱۳۲۳ھ میں ہندوستان سے شائع ہوئی۔

۶۔ الأسماء والکنی: چودہ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب حاکم کبیر ابو احمد محمد بن محمد بن احمد نیساپوری حافظ محدث (۲۸۵۔۳۷۸ھ) کی کتاب ہے۔

۷۔ فتح الباب فی الکنی والألقاب: ابو عبداللہ محمد بن اسحٰق بن مندہ اصبہانی (۳۱۰۔۳۹۵ھ) کی کتاب ہے، وی دونج نے ۱۹۲۷ء میں اپنی تعلیق کے ساتھ جرمنی سے شائع کی۔

۸۔ المؤتلف والمختلف فی أسماء نقلة الحدیث والمشتبه فی النسبة: یہ مصر کے اپنے زمانہ کے حافظ حدیث امام نسّاب ابو محمد عبدالغنی بن سعید الأسدی المصری (۳۳۲۔۴۰۹ھ) کی تالیف کردہ ہے، یہ دونوں کتابیں ایک ہی جلد میں ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہیں اور ۱۳۲۶ھ میں ہندوستان سے شائع ہوئیں۔

۹۔ خطیب بغدادی (۳۹۲۔۴۶۳ھ) کی تکملة المؤتلف والمختلف، الأسماء والألقاب، الأسماء المبهمة فی الأنباء المحکمة، تلخیص المشابه فی الرسم فی أسماء الرواة۔

۱۰۔ الاکمال فی رفع الارتیاب عن المؤتلف والمختلف من الأسماء والکنی والأنساب" حافظ ابو نصر علی بن ھبة اللہ بن جعفر ابن ماکولا البغداد

ی (۴۲۱-۴۸۶ھ) کی بلند پایہ کتاب ہے۔ یہ علامہ بغدادی کی کتابوں اور عبدالغنی بن سعید الازدی کی دونوں کتابوں کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ابن خلکان کا کہنا ہے کہ اس جیسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

۱۱۔ "كشف النقاب عن الأسماء والألقاب" ابوالفرج عبدالرحمن بن علی ابن الجوزی (۵۰۸-۵۹۷ھ) کی تالیف کردہ ہے۔

۱۲۔ "المستدرك على الاكمال لابن ماكولا" حافظ محمد بن عبدالغنی البغدادی (ابن نقطہ) کی کتاب ہے جن کی وفات ۶۲۹ھ میں ہوئی۔

۱۳۔ "المشتبه في أسماء الرجال" یہ حافظ محمد بن احمد بن عثمان ذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی کتاب ہے۔ یہ کتاب ذہبی سے پہلے کے علماء کی اس باب میں کوششوں کا ثمرہ ہے جو ازدی، ابن ماکولا، ابن نقطہ، ذہبی کے شیخ ابویعلیٰ الفرضی وغیرہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ مزید برآں ذہبی کے اس پر اضافات ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء و ۱۸۸۱ء میں لیدن سے شائع ہوئی، یہ ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی تقدیم ڈاکٹر دی دونج نے کی ہے۔ ذہبی کی دوسری کتاب "المقتنى في سرد الكنى" کے نام سے ہے، یہ الحاکم الکبیر کا اختصار ہے، اس پر ذہبی کے کچھ اضافات ہیں، اس کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر ہے۔

۱۴۔ "تحفة ذوي الأرب في مشكل الأسماء والنسب" ابن خطیب محمود بن احمد الھمذانی الفیومی (۷۵۰-۸۳۴ھ) کی یہ کتاب ۸۰۴ھ میں تصنیف ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں لندن میں شائع ہوئی جس کا مقدمہ جرمنی زبان میں لکھا گیا۔

۱۵۔ "نزهة الألباب في الألقاب" یہ کتاب حافظ ابوالفضل شہاب الدین ابن حجر الکنانی العسقلانی (۷۷۳-۸۵۲ھ) کی ہے، دیگر لوگوں کی طرح اسماء والقاب کو جمع کیا ہے اور جو چیزیں اسلاف سے چھوٹ گئی تھیں ان کا مفید اور بہتر اضافہ کیا ہے۔

(ب) مشہور نسب نامے:

۱۔ "ما اتفق من أسماء المحدثين وأنسابهم غير أن في بعضه زيادة حرف واحد" ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی (۳۹۲۔۴۶۳ھ) کی کتاب ہے۔

۲۔ الأنساب المتفقة في الخط المتماثلة في النقط والضبط" شیخ محمد بن طاہر المقدسی (۴۴۸۔۵۰۷ھ) کی کتاب ہے۔ اس پر ان کے شاگرد محمد بن ابوبکر عمر بن ابوعیسیٰ الأصبهانی (م ۵۸۱ھ) کا اضافہ ہے۔ دونوں کتابیں ایک ہی جلد میں ۱۸۶۵ء میں لیدن سے شائع ہوئیں۔

۳۔ "اقتباس الأنوار والتماس الأزهار في أنساب الصحابة ورواة الآثار" یہ ابومحمد عبداللہ بن علی اللخمی الاندلسی جو الرشاطی کے نام سے معروف ہیں کی کتاب ہے۔ ان کی وفات ۵۴۲ھ میں ہوئی۔ یہ بہت ہی عمدہ اور مفید کتاب ہے اور لوگوں میں مقبول ہے۔

۴۔ الأنساب: یہ کتاب صاحب تصانیف کثیرۃ تاج الاسلام سعید عبدالکریم بن محمد بن ابوالمظفر التمیمی السمعانی (۵۰۶۔۵۶۲ھ) کی ہے۔ اس میں راویوں کا نسب نامہ ہے اور جن کی سیرت وسوانح لکھی گئی ہے ان کے سلسلہ میں لوگوں کے اقوال کو جرح وتعدیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، نیز اپنے شیوخ اور جن سے روایت کی ان کا بھی ذکر کیا ہے اس کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر ہے، اس کی تقدیم مستشرق مارج لیوس نے کی اور یہ ۱۹۱۲ء میں لیدن شہر سے شائع ہوئی۔

۵۔ اللباب: تین جلدوں میں یہ کتاب علی بن محمد الشیبانی الجزری (۵۵۵۔۶۳۰ھ) کی ہے۔ اس میں سمعانی کے نسب نامہ کا اختصار ہے ساتھ میں کچھ اضافہ بھی ہے، یہ ۱۳۵۶ھ و ۱۳۵۹ھ میں مصر سے تین حصوں میں شائع ہوئی۔

۶۔ "نسبة المحدثين الى الآباء والبلدان" یہ کتاب محمد بن محمود محب الدین ابن نجار (۵۷۸۔۶۴۳ھ) کی ہے۔

۷۔ "الاکتساب فی تلخیص کتب الأنساب" یہ کتاب قاضی قطب الدین محمد بن محمد الخیضری الشافعی (۸۲۱۔۸۹۴ھ) کی ہے یہ سمعانی کی کتاب الانساب کا اختصار ہے، اس میں ابن اثیر اور رشاطی کے نزدیک پائے جانے والے اسباب کی معلومات کا اضافہ ہے۔

جرح وتعدیل کی کتابیں

چہارم:

اس قسم کی تصنیفات کا معرض وجود میں آنا ناقدین کی کوششوں کا ثمرہ تھا، جنہوں نے راویوں کے حالات کا ان کی احادیث کے قبول وعدم قبول کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ ہم نے ان قوانین کو ملاحظہ کیا جس کی تطبیق ناقدین نے ہر راوی کے حالات کے جاننے کے لیے کی اور ہم نے ان ناقدین کی عظمت اور پاکبازی کو جانا۔ ذہبی کا قول ہے "حفاظ حدیث نے جرح وتعدیل میں بے شمار تصنیفات لکھیں جن میں کچھ مختصر ہیں کچھ مطول"۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جنہوں نے کلام کو جمع کیا وہ امام یحییٰ بن سعید القطان ہیں جن کے بارے میں احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ میری آنکھوں نے یحییٰ بن سعید القطان جیسا شخص نہیں دیکھا۔ اور اس باب میں ان کے بعد ان کے تلامذہ نے لب کشائی کی جیسے یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، احمد بن حنبل، عمرو بن علی الفلاس، اور ابو خیثمہ اور ان حضرات کے شاگرد جیسے ابو زرعہ، ابو حاتم، بخاری، مسلم، ابو اسحاق الجوزجانی السعدی اور ان کے بعد کے لوگ جیسے نسائی، ابن خزیمہ، ترمذی، دولابی، عقیلی۔ یحییٰ بن سعید القطان کی کتاب معرفت ضعفاء کے سلسلہ میں بہت مفید تصنیف ہے۔ اسی طرح ابو حاتم، ابن حبان کی بھی ضخیم کتاب ہے اور ابو احمد بن عدی کی کتاب الکامل ہے۔

اس فن میں مصنفین کے مختلف طریقے ہیں، بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنے مصنف میں کذابین اور ضعفاء کا ذکر کیا ہے اور بعض نے اس پر اضافہ کر کے بعض موضوعات کا بھی ذکر کیا ہے۔

بعض مصنفین نے صرف ثقات کے بارے میں لکھا اور بعض نے ضعفاء اور ثقات دونوں کو ملا کر تصنیف کی، چنانچہ ہم یہاں ان تصنیفات کا جائزہ لیں گے جو ضعفاء یا ثقات کے بارے میں یا دونوں کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور الگ سے موضوعات پر لکھی ہوئی تصنیفات کا بھی جائزہ لیں گے۔ میں نے جرح و تعدیل کے موضوع پر زائد از تیس کتابوں کو جمع کیا لیکن صرف مشہور کتابوں پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ ”الجرح و التعدیل“ امام احمد بن محمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی کتاب ہے۔

۲۔ ”الضعفاء“ محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی الزھری (م ۲۴۹ھ) کی کتاب ہے۔

۳۔ ”الجرح و التعدیل“ اور ”الضعفاء“ ابو اسحاق ابراہیم بن یعقوب السعدی الجوزجانی (م ۲۵۹ھ) کی ہے۔

۴۔ ”الضعفاء“ امام محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴۔۲۵۶ھ) کی یہ کتاب ہندوستان میں ان کی تاریخ صغیر کے ساتھ ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوئی نیز نسائی کی کتاب الضعفاء والمتروکین بھی ساتھ میں طبع ہوئی۔

۵۔ ”تاریخ فی الثقات و الضعفاء“ یہ احمد بن ابوخیثمہ النسائی البغدادی (۱۸۵۔۲۷۹ھ) کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خطیب بغدادی کا کہنا ہے کہ ”میں نے اس سے زیادہ مفید تر کوئی کتاب نہیں دیکھی“۔

۶۔ ”تاریخ الضعفاء والمتروکین“ امام حافظ ابوعبدالرحمن احمد بن علی النسائی (م ۳۰۳ھ) کی تالیف کردہ ہے، اس کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر ہے، اس کی اشاعت ہندوستان میں ۱۳۲۵ھ میں ہوئی۔

۷۔ ”الجرح و التعدیل“ عبدالرحمن بن ابو حاتم بن ادریس الحنظلی الرازی (۲۴۰۔۳۲۷ھ) کی یہ کتاب جرح و تعدیل کے باب میں عظیم تر و مفید تر کتاب ہے اور ناقدین رواۃ سے مضبوط ربط رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں قدرِ تفصیلی گفتگو مناسب ہوگی۔

ابن ابو حاتم نے اپنے والد ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی اور ابوزرعہ، عبیداللہ بن عبدالکریم

الرازی جن کا تعلق طبقۂ بخاری سے ہے کے پاس زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان دونوں حضرات سے علم جرح و تعدیل میں بڑا کسب فیض کیا اور اپنی کتاب کی تصنیف میں ان دونوں کے بہت سارے افادات کو شامل کیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ راویوں کی تعدیل و جرح کے سلسلہ میں ائمۂ علم کے اقوال کا احاطہ کریں، اور ساتھ میں تراجم کے باب میں بہت سارے ایسے مفید اضافے کئے جن کا وجود ان کے ماسبق لوگوں میں نہیں پایا جاتا، جیسا کہ بعض تراجم میں بخاری پہ بھی استدراک کیا ہے۔ جرح و تعدیل کے باب میں اپنے والد اور ابوزرعہ اور بخاری کے نصوص کو جمع کیا ہے اگر چہ بخاری کے نصوص سے مستغنی نظر آتے ہیں کیونکہ بیشتر احکام میں ان کے والد بخاری کے موافق ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ائمہ کے نصوص کا پتہ لگایا اور اپنے والد محمد بن ابراہیم بن شعیب سے وہ روایتیں لیں جو ان دونوں نے عمرو بن فلاس سے روایت کی ہیں جو بقول ان کے ان کا اجتہاد ہے۔ اسی طرح عبدالرحمن بن مہدی (متوفی ۱۹۸ھ) اور یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۸ھ) سے جو روایت کی ہے جس کے بارے میں ان دونوں کا کہنا ہے کہ وہ ان کا اجتہاد ہے، اسی طرح امام احمد اور یحییٰ بن معین کے تمام اصحاب سے ان کا اتصال ہے، اور اپنے والد کے واسطہ سے ان دونوں سے روایت کی ہے، اور اسی طرح اپنے والد سے بواسطۂ اسحاق بن منصور یحییٰ بن معین سے روایت کی اور دیگر لوگوں سے بھی روایت کی ہے، نیز عباس الدوری (متوفی ۲۷۱ھ) سے بھی روایت کی ہے۔

ان اسباب کی وجہ سے ابن ابی حاتم کی کتاب ان تمام احکام سے پُر ہے جسے جہابذۂ جرح و تعدیل نے صادر کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب الجرح و التعدیل بخاری کی التاریخ الکبیر پر بھی فائق نظر آتی ہے، کیونکہ بخاری نے اپنی تاریخ میں بہت کم جرح و تعدیل کا ذکر کیا ہے، اگر چہ اس سے بخاری کی کتاب کی قیمت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ انہوں نے قصداً ایسا کیا کیونکہ انہوں نے باب ضعفاء میں ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے۔

ابن ابی حاتم نے اپنی اس کتاب کو حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے، اور اس میں ناموں کا اعتبار کیا ہے، جیسے باب الف میں ہم باب احمد دیکھیں گے پھر باب ابراہیم پھر باب اسماعیل پھر باب ایوب پھر باب آدم، اسی طرز پر سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک ہی باب میں تراجم کی کثرت

ہے تو انہیں باپ کے نام کی بنیاد پر ذیلی ابواب پر مرتب کیا ہے، مثلاً احمد نام کے لوگوں میں ان لوگوں کو مقدم رکھا جن کے باپ کا نام الف سے شروع ہوتا ہے پھر با سے شروع ہونے والے نام کو لیا اور اگر اس باب میں بھی تراجم کی کثرت پائی گئی تو باپ و دادا دونوں کے ناموں کا اعتبار کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں لکھی گئی جو ۱۸۰۵۰ راویوں کی سوانح پر مشتمل ہے۔ ہر راوی اور ان کے بارے میں اقوال کو صحیح سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے، کتاب پر ایسا مقدمہ لکھا جو اس کی کنجی ہے، اس کا نام تقدمة المعرفة لكتاب الجرح والتعديل رکھا۔ یہ بڑا ہی قیمتی مقدمہ ہے جس میں اس فن کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ماہرین فن کی مکمل سوانح بھی لکھ دی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی منفرد کتاب ہوگئی ہے جس سے علوم حدیث کا کوئی عالم مستغنی نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنے زمانہ میں پائی جانے والی تالیفات کی سچی تصویر ہے، اگرچہ ان تالیفات کی تعداد کا ہمیں علم نہیں ہے، اور ان کا ہم تک پہنچنا مقدر نہیں تھا۔ ہندوستان میں یہ کتاب ۱۳۷۳ھ میں ۹ جلدوں میں شائع ہوئی، مقدمہ مستقل ایک جلد میں ہے اور چاروں اجزاء میں سے ہر جزء دو جلدوں میں چھپا ہے۔

۸۔ "الثقات" ابو حاتم بن حبان البستی (متوفی ۳۵۴ھ) کی کتاب ہے۔ اس میں مذکور بعض افراد کی توثیق میں انہوں نے تساہل سے کام لیا ہے، اس لیے یہ دھیان میں رہے کہ ابن حبان کی توثیق دیگر لوگوں کی توثیق سے کمتر درجہ کی ہے۔

۹۔ "الکامل" ضعیف محدثین اور کمزور حدیثوں کے بارے میں ہے۔ یہ حافظ کبیر ابو احمد عبداللہ بن محمد بن عدی الجرجانی (۲۷۷۔۳۶۵ھ) کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ان تمام لوگوں کو ذکر کیا ہے جن کے بارے میں انہیں کلام تھا، اگرچہ وہ صحیحین کے راویوں ہی میں سے کیوں نہ ہوں، اور ہر ایک کی سوانح کے ساتھ ان کی غریب و منکر حدیث کو بھی ذکر کیا ہے۔ یہ فن جرح میں ایک مکمل اور قابل اعتماد کتاب سمجھی جاتی ہے۔

۱۰۔ "تاريخ أسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم" یہ ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان بن شاہین (۲۹۷۔۳۸۵ھ) کی کتاب ہے جسے حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔

۱۱۔ "المدخل" یہ امام حاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ نیساپوری (متوفی ۴۰۵ھ) کی

کتاب ہے۔ کتاب کے معتدبہ حصہ میں مجروحین کے بارے میں مفصل کلام کیا ہے۔

۱۲۔ "کتاب الضعفاء المتروکین أو أسماء الضعفاء الواضعین" یہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی ابن الجوزی (۵۱۰۔۵۹۷ھ) کی کتاب ہے۔ اس میں واضعین حدیث اور ضعفاء کا ذکر کیا ہے اور جن ائمہ کبار و حفاظ حدیث نے ان واضعین کے بارے میں جرح کیا ہے ان کا بھی ذکر ہے، اس کی ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر ہے۔

۱۳۔ "میزان الاعتدال" تین جلدوں میں یہ کتاب امام شمس الدین محمد بن احمد ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی ہے۔ انہوں نے ابن عدی کے طرز تالیف کو اختیار کیا ہے اور ان تمام لوگوں کو ذکر کیا ہے جن پر کلام کیا ہے، اگر چہ وہ ثقہ ہی کیوں نہ ہوں، اور ہر راوی کی سوانح کے ساتھ ان کی غریب و منکر حدیث کو بھی بطور ثبوت و مثال پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۵ھ میں مصر سے شائع ہوئی، اس میں ۱۰۹۰۷ لوگوں کی سوانح ہے۔ راویوں کے سلسلہ میں بھی ذہبی کا ایک رسالہ ہے جس کا نام "رسالة فی الرواة الثقات المتکلم فیهم بما لا یوجب ردهم" ہے۔

۱۴۔ "الاغتباط بمعرفة من رمی بالاختلاط" یہ ابن العجمی کے نواسے برہان الدین ابراہیم بن محمد الحلبی (متوفی ۸۴۱ھ) کی کتاب ہے۔ ان کی دیگر کتابیں التبیین لأسماء المدلسین اور الکشف الحثیث علی من رمی بوضع الحدیث، کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

۱۵۔ "لسان المیزان" حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ کی کتاب ہے۔ اس میں میزان کی تضمین کے ساتھ اس پر اضافہ بھی ہے۔ اس میں تقریباً ۱۴۳۴۳ راویوں کی سوانح ہے۔ ۱۳۲۹۔۳۱ھ میں ہندوستان میں شائع ہوئی، یہ ۶ جلدوں میں ہے۔ ابن حجر کی طبقات المدلسین بھی ہے جو ۱۳۲۲ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

۱۶۔ "الثقات ممن لم یقع فی الکتب الستة" چار جلدوں میں یہ کتاب زین الدین قاسم بن قطلو بغا (متوفی ۸۷۹ھ) کی ہے۔

طوالت کے خوف سے اس باب کی بہت ساری تالیفات کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

موضوع احادیث سے متعلق کتابیں

پنجم:

اس باب میں تقریباً چالیس کتابوں کو جمع کیا گیا ہے جن میں سے مشہور کتابوں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ "تذکرۃ الموضوعات" ابوالفضل محمد بن طاہر القدسی (۴۴۸-۵۰۷ھ) کی کتاب ہے، جسے حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اس میں حدیث کے ساتھ راوی حدیث سے متعلق ائمہ کے جرح کو ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

۲۔ "الموضوعات فی الأحادیث المرفوعات" ابو عبداللہ الحسین بن ابراہیم ہمدانی جوزقی (متوفی ۵۴۳ھ) کی کتاب ہے۔ اس میں موضوع احادیث پر کلام کیا ہے، اور صحاح احادیث کے ذریعہ واہی تباہی احادیث کے تاروپود بکھیرے ہیں۔

۳۔ "الموضوعات الکبری" چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی (۵۰۸-۵۹۷ھ) کی ہے۔ اس میں ابن عدی کی کتاب الکامل میں وارد احادیث نیز ابن حبان کی ضعیف احادیث پر بحث کی ہے۔ ساتھ ہی عقیلی، ازدی، تفسیر ابن مردویہ، معاجم الطبرانی، تصانیف خطیب، تصنیفات ابی نعیم اور دیگر کتب میں وارد احادیث پر بحث کی ہے، اور بہت سی مرویات کو موضوع کے خانہ میں ڈالنے میں تساہل سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ ضعیف کے ساتھ ساتھ حسن اور سنن ابوداؤد کی صحیح روایتوں کو بھی اسی خانہ میں ڈال دیا ہے۔ علماء نے اس کتاب پر بڑی تنقیدیں کی ہیں۔

۴۔ "المغنی عند الحفظ والکتاب بقولهم لم یصح شئی فی هذا الباب" حافظ ضیاء الدین ابوحفص عمر بن بدر الموصلی الحنفی (متوفی ۶۲۳ھ) کی کتاب ہے۔

۵۔ "الأحادیث الموضوعة التی یرویها العامة والقصاص" یہ عبدالسلام بن عبداللہ (ابن تیمیہ) حرانی (متوفی ۶۵۲ھ) کا رسالہ ہے۔ یہ امام احمد بن عبدالحلیم (ابن

تیمیہ) کے دادا تھے۔ موضوعات کے سلسلہ میں ان کے دو اور رسالے بھی ہیں جس میں ابن جوزی کی طرح متشدد نظر آتے ہیں۔

۶۔ "الباعث علی الخلاص من حوادث القصاص" یہ حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی (متوفی ۸۰۶ھ) کی کتاب ہے۔

۷۔ اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة" حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کی کتاب ہے۔ ابن جوزی کی کتاب کا اختصار ہے اور اس پر استدراک بھی کیا ہے۔ تاریخ ابن عساکر، ابن النجار، مسند الفردوس اور تصانیف ابو الشیخ میں وارد شدہ اشیاء پر اضافات بھی شامل کتاب ہے۔ ان کی دیگر کتابیں "ذیل اللآلی المصنوعة" التعقبات علی الموضوعات "النکت البدیعات" قابل ذکر ہیں۔

۸۔ "تنزیه الشریعة المرفوعة من الأخبار الشنیعة الموضوعة" ابوالحسن علی بن محمد (ابن عراق) الکنانی (متوفی ۹۶۳ھ) کی کتاب ہے۔ یہ ایک جامع کتاب ہے، اس میں سیوطی کی اللآلی پر اضافہ واستدراک ہے۔ کتاب ایک مقدمہ اور دو قسموں پر مشتمل ہے۔ قسم اول میں وضاعین حدیث اور ان حضرات کے نام ہیں جو اصحابِ نقد کے نزدیک متہم بالکذب ہیں۔ قسم ثانی میں موضوع احادیث اور ان راویوں کا ذکر ہے جو وضع حدیث میں متہم ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۷۸ھ میں مصر سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۹۔ "تذکرة الموضوعات" یہ کتاب ہندوستان کے محدثین کے سرخیل جمال الدین محمد بن طاہر بن علی پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی ہے۔ ان کی دیگر کتاب "قانون الأخبار الموضوعة والرجال الضعفاء" ہے، یہ دونوں ۱۳۴۳ھ میں قاہرہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئیں۔

۱۰۔ "الکشف الالهی عن شدید الضعف والموضوع الواهی" یہ محمد بن محمد الحسینی السندروسی (متوفی ۱۱۷۷ھ) کی تصنیف کردہ ہے جس میں بہت زیادہ ضعیف، واہی تباہی اور من گھڑت احادیث کو ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ "الفوائد المجموعة فی الأحادیث الموضوعة" یہ قاضی ابوعبداللہ

محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) کی ہے، اسلاف کی کتابوں سے اخذ کیا ہے، لیکن بعض احادیث پر موضوع ہونے کا حکم لگانے میں تساہل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ بعض صحیح اور حسن احادیث کو بھی موضوع کے درجہ میں ڈال دیا ہے، اس کی تنبیہ عبدالحیٔ لکھنوی نے اپنی کتاب ظفر الأماني میں کی ہے جو ۱۹۶۰ء میں مصر سے شائع ہوئی۔

۱۲۔ "تحذیر المسلمین من الأحادیث الموضوعة علی سید المرسلین" عبداللہ محمد البشیر ظافر المالکی (متوفی ۱۳۲۵ھ) کی کتاب ہے۔ حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اس میں ان موضوع احادیث کو ذکر کیا ہے جو زبان زد عام ہیں۔ کتاب میں ایک جامع اور مفید تمہید بطور تقدیم کتاب ہے جس میں ان تالیفات و کتب و رسائل کا تذکرہ ہے جو موضوعات سے بھری پڑی ہیں، ۱۹۰۳ء میں یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ بہت سارے ایسے رسائل و کتب ہیں جن میں عبادات و معاملات سے متعلق موضوع احادیث کا ذکر ہے، جو بے شمار ہیں لیکن میں نے طوالت کے خوف سے ان سے چشم پوشی کر لی۔

اس کے علاوہ بہت ساری تصنیفات بھی سامنے آئی ہیں جو عوام الناس میں زبان زد ہیں، اور ان کتابوں میں ان احادیث کے درجات قوت وضعف کے اعتبار سے بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ التذکرة في الأحادیث المشتهرة" بدرالدین زرکشی (۷۴۵۔۷۹۴ھ) کی کتاب ہے۔

۲۔ "اللآلی المنثورة في الأحادیث المشهورة مما ألفه الطبع ولیس له أصل في الشرع" حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی (۷۷۳۔۸۵۲ھ) کی کتاب ہے۔

۳۔ "المقاصد الحسنة في بیان کثیر من الأحادیث المشتهرة علی الألسنة" یہ حافظ مورخ محمد بن عبدالرحمن السخاوی (۸۳۱۔۹۰۲ھ) کی تالیف کردہ ہے، اسے حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے، نیز ابواب کی ترتیب بھی ہے۔ یہ نہایت مفید

کتاب ہے، جو ۱۳۷۵ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

بہت ساری ایسی کتابیں جو احادیث مشہورہ پر مشتمل ہیں اور جو سلف کی کتابوں کا خلاصہ ہیں، میں نے ان سے چشم پوشی کی یہاں تک کہ سیوطی، سہودی، متوفی، خلیلی، غزی عامری، عجلونی، جراحی، ابن جاراللہ، بیروتی وغیرہ کی کتابوں کو ذکر نہیں کیا اور صرف امہات کتب کے ذکر پر اکتفا کیا۔

ہمارے موضوع سے متعلق یہ مشہور و معروف تصنیفات ہیں، اگرچہ اصطلاح وعلوم حدیث اور آرائے علماء، مقبول و مردود احادیث پر مشتمل کتابیں جو نظم ونثر کی شکل میں پائی جاتی ہیں وہ بے حد و بے شمار ہیں، کیونکہ شاذ ونادر ہی ایسا ہوا ہے کہ کوئی محدث ہو اور اس نے حدیث اور علوم حدیث میں کوئی رسالہ نہ لکھا ہو۔

اسی طرح غریب وکمزور اور مختلف فیہ احادیث کے سلسلہ میں بھی بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جو شخص دارالکتب المصریۃ، اور دمشق کے مکتبہ ظاہریہ کے مخطوطات یا دیگر اسلامی لائبریریوں کا مطالعہ و جائزہ لے گا، تو اسے ایسا نادر علمی خزانہ دستیاب ہوگا جس نے حدیث کی سندوں، متنوں کی حفاظت میں نہایت اہم کارنامہ انجام دیا ہے، اور صحیح وکمزور احادیث کی وضاحت کی ہے۔ یہ تالیفات ہمارے علمائے کرام کی ان مخلصانہ کوششوں کا ثمرہ ہیں جو گردش ایام کے ساتھ وجود پذیر ہوئیں، اور ان شاء اللہ انہیں بقاء ودوام حاصل ہوگا، کیونکہ ان کی حیثیت سنت مطہرہ (جو کتاب اللہ کی تفسیر ہے) کی حفاظت وصیانت کے سلسلہ میں ایک مضبوط قلعہ کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول کی مصداق کہ "انا نحن نزّلنا الذکر وانا له لحافظون"۔

چوتھا باب
فصل اوّل

(۱) فن کتابت عربوں میں

تحقیقات علمی سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عرب اسلام سے پہلے بھی فن کتابت سے واقف تھے، چنانچہ وہ تاریخ کے اہم واقعات پتھروں پر کندہ کر لیتے تھے۔ آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو سے بھی اس کا پختہ ثبوت مل چکا ہے کہ تیسری صدی میں بھی مکاتبات کا سلسلہ عربوں میں تھا۔ آثار قدیمہ کے یہ ثبوت جن سے عربوں کی کتابت کا اندازہ لگتا ہے جزیرۃ العرب کے شمالی حصہ میں تھا جہاں فارسی اور رومی تمدن عربوں کے دوش بہ دوش موجود تھے اور ان دونوں ثقافتوں سے عربوں کے تعلقات گہرے تھے۔ چنانچہ عدی بن زید عبادی (جو ہجرت سے ۳۵ سال پہلے وفات پا گیا) جب جوان ہوا تو اس کے والد نے اسے کتابت کی ڈگر پر لگایا اور اس نے عربیت میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی۔ پھر وہ کسریٰ کے سکریٹریٹ میں ملازم ہو گیا۔ کسریٰ کے سکریٹریٹ میں یہ پہلا شخص تھا جس نے عربی زبان کو مروج کیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ دور جاہلیت میں بہت سے کاتب موجود تھے اور ان کی درس گاہیں تھیں جن میں بچے کتابت کا فن حاصل کرتے تھے۔ انہیں کتابت کے ساتھ اشعار عرب اور حروب جاہلیت کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدارس کی نگرانی اعلیٰ درجہ کے ماہرین کتابت کے ہاتھ میں ہوتی، مثلاً ابوسفیان بن امیہ بن عبدشمس، بشر بن عبدالملک الکوفی، ابوقیس بن عبدمناف بن زہرہ، عمرو بن زرارہ جو کاتب کے نام سے مشہور تھے۔ ابوحفینہ کو مدینہ کتابت سکھانے

کے لیے لایا گیا۔ بعض یہود بھی اس کے عالم تھے اور مدینہ میں رہ کر بچوں کو کتابت سکھاتے تھے۔ یہ قبل اسلام کے دور کی بات ہے، پھر اسلام آیا تو اوس وخزرج میں بہت سے اہل کتابت پیدا ہو گئے۔

عرب لفظ کامل سے اسی کو مخاطب کرتے جو فن کتابت سے واقف ہو، تیر اندازی کا ماہر ہو، تیراکی میں طاق ہو۔ مگر بہت سے شعراء حافظہ کی قوت پر فخر کرتے، اپنی یادداشت پر ڈینگ مارتے۔ بعض فن کتابت سے واقفیت کو لوگوں میں عام نہ ہونے دیتے اور اپنی اس خوبی کو چھپائے رکھتے، اور ڈرتے رہتے کہ کوئی یہ بات جان نہ لے۔ اگر کسی کے بارے میں علم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ بھائی اس کا ذکر نہ کرو کہ کتابت ہمارے یہاں بڑے عیب کی بات ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو بعض مؤرخین کا قول عقل لگتی بات نہیں معلوم ہوتا کہ اسلام کے ظہور کے وقت مکہ معظمہ میں دس کاتب موجود تھے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ضرور ہے کہ عرب قبل اسلام بھی کتابت سے واقف تھے، لیکن ان کی تعداد اور گنتی کا کا تعین قابل تیقن نہیں، کچھ لوگ ضرور تھے، اس میں غلو کی کوئی ضرورت نہیں کہ عربوں کی کتابت کو خواہ مخواہ بڑے پیمانے پر تسلیم کریں۔ اور جن مستشرقین نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ عربوں میں کتابت وسیع پیمانے پر مروج تھی اور پڑھے لکھے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے، درحقیقت مستشرقین کی اس رائے کے پس پردہ ان کا وہ ادعا کام کر رہا ہے کہ قرآن نے عربوں کو امی کہا ہے جو ایک حقیقت نہیں ہے بلکہ عرب پڑھے لکھے تھے، قرآن کا دعویٰ اور یہ اعلان کرنا غلط ہے هوالذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة، وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين (الجمعة)

یہاں امیت سے مراد کتابت وقرأت نہیں ہے بلکہ امیت دینی مراد ہے، یعنی قرآن کریم سے پہلے ان کے یہاں دینی کتاب نہ تھی اور یہ لوگ دین کے اعتبار سے امی تھے، اہلِ کتاب کی طرح عربوں کے پاس توریت وانجیل نہ تھی۔ اس لیے اس کا ترجمہ بے موقع یہ کرنا کہ پڑھے لکھے نہ تھے، مقتضائے آیت کے خلاف ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو امیین

کی تفسیر میں تفریق کرنی ضروری ہے کہ یہاں جهلة الشريعة عرب مراد ہیں اور قرآن نے حضور کی جو صفت امیت بیان کی، الذين يتبعون النبي الأمي سے مراد یہ ہے کہ آپ قرأت و کتابت سے ناواقف تھے، اور اس تفریق معنیٰ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اس لفظ امی سے صرف ایک ہی معنیٰ مراد لینا بہتر ہے، یعنی قرأت و کتابت سے ناواقفیت، کیونکہ حضورؐ نے خود امیت کی تعریف اپنے لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حدیث موجود ہے اور دوسری کتابوں میں بھی ہے، آپ نے فرمایا انا أمة أمية لانكتب ولا نحسب الشهر هكذا يعني مرة تسعةً و عشرين و مرة ثلاثين۔

(ہم امی قوم ہیں حساب و کتاب نہیں جانتے ،ماہ ایسے اور ایسے یعنی انتیس اور تیس کا ہوتا ہے)

(۲) ابتداء اسلام و عہد نبوی میں فن کتابت

یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ فن کتابت رسول خداؐ کے زمانے میں جاہلیت کے زمانے کے مقابل بڑے وسیع پیانے پر عربوں میں مروج ہو گیا تھا۔ ایک طرف قرآن کریم نے اس فن کے حصول کی ترغیب دی، دوسری طرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر ابھارا اور خود رسالت کا مزاج بھی یہی تھا کہ تعلیم دینے والے، پڑھنے والے، کتابت کرنے والے زیادہ سے زیادہ ہوں، اس لیے کہ وحی محتاج کتابت تھی۔ اسی طرح سرکاری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے فرامین، معاہدات، دستاویزات بغیر کاتبوں کے تکمیل پذیر نہ ہوتے، اس لیے اسلام کے آغاز ہی سے کاتبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، تا کہ وہ نئی نئی سلطنت کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ خود رسول کریمؐ کے کاتبین وحی کی تعداد چالیس ہوگئی تھی۔ صدقہ کے کاتبین، لین دین کے وثیقہ نگار، معاملات کے منشی، ڈاک منشی جو مختلف زبانوں میں مراسلات تحریر کرتے، مورخین نے رسول خدا کے جن کاتبین کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد متعین نہ تھی بلکہ مورخین نے اکثر کتابت کے فرائض انجام دینے والوں ہی کا ذکر کیا ہے۔

جو لوگ وقتی اور عارضی تھے وہ ان کے سوا تھے جن کا ذکر تاریخ نگاروں نے کیا ہے، چنانچہ مسعودی کے اس بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی۔

''ہم نے انہی کاتبان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے جو ہمیشہ کار کتابت پر اور اپنے اسی ڈیوٹی پر حاضر باش رہے اور ان کی مدت کتابت بھی خاصی رہی اور جن کے بارے میں روایت سے بھی تصدیق ہوگئی، برخلاف ان کے جنھوں نے ایک دو تین بار کتابت کی ڈیوٹی انجام دی ان کو کاتب کہلانے کا حق نہیں ہے، انہیں فہرست کاتبین میں شامل نہیں کیا جا سکتا''۔

اور ہجرت کے بعد تو کاتبین کی بھرمار ہوگئی، بالخصوص جب سلطنت اسلامی کی بنیاد پڑ گئی اس وقت تو مدینہ کی نو مسجدیں مسجد نبوی کے علاوہ مسلمانوں کا مرکز توجہ بن گئیں۔ ان میں قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی، اسلامی تعلیمات سکھائی جاتیں، اور قرأت و کتابت کا سلسلہ رہتا۔ خود مسلمان کاتبوں نے بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو نوشت و خواند سکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان معلمین میں سر فہرست سعد بن ربیع خزرجی تھے جو بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے، اور بشیر بن سعد بن ثعلبہ اور ابان بن سعید بن العاص اور دوسرے بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

ان مساجد کے پہلو بہ پہلو مدرسے تھے جن میں بچوں کی تعلیم کتابت و قرأت کا نظم ہوتا، ساتھ ہی ساتھ قرآن کریم کی تعلیم بھی لازمی طور سے دی جاتی۔ ہمیں جنگ بدر کے اثرات و نتائج کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس جنگ نے مدینہ کے بچوں کی تعلیم کی راہ ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ رسول خداؐ نے بدر کے جنگی قیدیوں کو ان کا فدیۂ جنگ ہی مقرر کر دیا کہ ہر وہ قیدی جو فن کتابت کا ماہر ہو دس آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو اس کو پروانۂ آزادی دے دی جائے گی۔ کتابت کی تعلیم صرف مردوں کے حلقہ تک محدود نہ تھی بلکہ عورتیں بھی اپنے گھروں میں اس کی تعلیم حاصل کرتی تھیں، چنانچہ یہ روایت:

''روى أبوبكر بن سليمان بن أبي حثمة عن الشفاء بنت عبد الله

أنها قالت دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و أنا عند حفصة فقال لی ألاتعلمین هذه رقیةالنملة کما علمتها الکتابة" (ابوداؤد صفحہ ۳۳۷ ج ۲)

"ابوبکر سلیمان بن ابی حثمہ شفاء بنت عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ رسولِ خدا ہمارے پاس تشریف لائے اور میں اس وقت حضرت حفصہ زوجۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھی، آپ نے حفصہ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم نے جس طرح ان کو لکھنا سکھایا ہے اسی طرح یہ رقیہ (ڈنک کی جھاڑ) بھی سکھا دو"۔

پھر اس کے بعد حلقۂ تعلیم وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور تمام ممالک اسلامی میں ہر طرف تعلیم و تعلم کا چرچہ ہوگیا، اس لیے کہ صحابہ دنیا کے بہت سے حصوں میں آباد ہوچکے تھے، علم کے حلقے بڑھتے چلے گئے تھے اور اس کا خصوصی نظم مسجدوں میں تھا۔ بعض بعض درس گاہوں میں تو طلباء کی ایسی بھیڑ بھاڑ تھی کہ ان کی تعداد ہزار سے بھی متجاوز تھی۔ اسی طرح معلمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور مدرسوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی ممالک اسلامیہ میں ہوتی گئی۔ طلباء تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے حتیٰ کہ جگہ تنگ پڑ جاتی و گنجائش ختم ہوجاتی۔ رش کا یہ عالم تھا کہ لکچر دینے والا سواری کا استعمال کرتا، چنانچہ ضحاق بن مزاحم بچوں کی تعلیم کے لیے اور ان کی پوری طرح نگرانی کے لیے گدھے پر سوار ہوکر چاروں طرف گھومتے رہتے تھے۔ رش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ طلباء کی تعداد تین ہزار سے متجاوز تھی اور کمال یہ تھا کہ اپنی اس محنت شاق کی کوئی اجرت وصول نہ کرتے۔

پہلی صدی کے آخر میں علمی ترقیات بیش از بیش ہوچکی تھیں اور ایسی سوسائٹی وجود میں آئی جس نے علم کی اشاعت کو ایک تحریک بنا دیا، چنانچہ عبدالحکم بن عمرو بن عبداللہ بن صفوان الجمحی نے ایک ہال بنایا جس میں شطرنج، کیرم اور بچوں کے کھیل کی گوٹ ہوتی اور ہر علم کا رجسٹر موجود تھا، دیواروں میں کھونٹیاں تھیں جو آتا اپنے کپڑے اس پر ٹانگ دیتا، پھر رجسٹر اٹھا کر اسی سے علمی رپورٹیں پڑھتا، اور جن کو کھیل کا ذوق ہوتا وہ اپنے کسی ساتھی کے ساتھ کھیل میں مشغول ہوجاتے۔

اتنی ترقیات علمی کے باوجود جب ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث نبویؐ کی باقاعدہ تدوین رسولؐ

خدا کے زمانے میں نہیں ہوئی جس طرح کہ قرآن کریم کو مدون و مرتب کیا گیا تو ایسی صورت میں ان اسباب کو دریافت کرنا چاہیے جن کی بنیاد پر عہد نبویؐ میں احادیث کی تدوین نہ ہو سکی۔ ہم اس مسئلہ میں تقلیدی انداز اختیار نہ کریں تو بہتر ہے، اس لیے مصنفین نے تدوین حدیث میں تاخیر کی جو بات کہی وہ ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہونی چاہیے۔ عہد نبوی میں عدم تدوین کے بارے میں جو باتیں وہ بیان کرتے ہیں وہ ہماری حلق سے نہیں اترتیں کہ حضورؐ کے زمانے میں کتابت کے وسائل کم تھے، لکھنے والے بھی کم تھے اور ان کا طرز تحریر بھی ناشگفتہ تھا۔ اس لیے کہ حضور کے زمانے میں کاتبین وحی کی تعداد تیں سے چالیس تک تھی جو کتابت وحی کے فرائض میں لگے ہوئے تھے، اسی طرح آپؐ کے دوسرے امور قابل تحریر بھی تحریر کرتے۔ ہم کاتبین کی مختصر تعداد پر یقین نہیں کر سکتے، یا ان کی بے نگاہی بھی تسلیم نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ان کاتبوں میں بہت اعلیٰ دل و دماغ کے لوگ تھے، مثلاً زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کتابت کے وسائل کم تھے اور حدیثوں کی صحت کی ضمانت بھی کم تر تھی تو یہ بات خود اس دعویٰ کا رد ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو مدون کر لیا اور اس میں ان کو کوئی زحمت نہیں ہوئی تو اگر وہ حدیث کی تدوین بھی چاہتے تو اس کے وسائل بھی پیدا کر لیتے اور کسی قسم کی دشواری نہ ہوتی، اس لیے کہ رسول خدا کی اجازت سے جن لوگوں نے احادیث کی کتابت کر لی ان کو کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ اور ہی اسباب ہیں، یہ اسباب خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعین کے آثار ثابتہ ہی سے ماخوذ ہیں۔ آگے آپ کو معلوم ہوگا کہ تدوین حدیث چند مراحل سے مرتب طور سے گزری جس سے اس کی حفاظت کا بھی ثبوت پیدا ہو گیا اور تدوین حدیث کو بے ضرورت باتوں سے محفوظ و مصون بنا دیا گیا۔ یادداشتیں اور قلم ایک دوسرے کے ہمنوا تھیں اور پہلو بہ پہلو خدمت حدیث میں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ہم ان شہادتوں کا ذکر کریں گے اور ان پر روشنی ڈالیں گے تاکہ تدوین حدیث کے مخفی گوشے آپ کے سامنے آ جائیں۔

رسول خدا سے کتابت کے بارے میں احادیث

(ا) کتابت کی ناپسندیدگی کا ماخذ:

ا۔ابوسعید خدریؓ نے بیان کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری باتوں کو قلم بند نہ کرو، قرآن کے سوا جس نے مجھ سے کوئی بات سن کر قلم بند کی ہو تو اسے مٹا دے"۔ یہ سب سے زیادہ صحیح روایت ہے جو حضورؐ نے اس سلسلے میں فرمائی ہے۔

۲۔دوسری حدیث میں ہے، ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتری کوشش کی کہ ہمیں آپ لکھنے کی اجازت دے دیں مگر آپؐ نے انکار فرمایا۔ اور ایک دوسری روایت جو ابوسعید ہی سے ہے، اس میں ہے کہ ہم نے رسول خدا سے کتابت کی اجازت چاہی مگر آپؐ نے ہمیں اجازت نہ دی۔

۳۔حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز ہم میں آئے، ہم لوگ احادیث نبیؐ لکھ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا آپؐ سے سنی ہوئی حدیثوں کو لکھ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا کی کتاب کے سوا کسی اور کتاب کی ضرورت کیا تمہیں پتہ بھی ہے کہ پہلی امتیں بے راہ ہوئیں، اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کتاب خدا کے ساتھ دوسری تحریریں بھی قید کتابت میں لا کر اسے بھی کتاب بنا دیا۔

(ب) اباحت کتابت کی احادیث:

ا۔عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ سے جو بھی سنتا لکھ لیتا، میں اسے یاد کرنا چاہتا تھا۔ قریش کے لوگوں نے مجھے روک دیا، اور کہنے لگے کہ تم جو بھی رسول خدا سے سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حضور انسان ہیں ان پر کیفیت غضب و رضا آتی رہتی ہوگی۔ ان کی بات سن کر میں رک گیا، اور اس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ پھر آپؐ نے اپنی انگلی

سے دہن مبارک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، لکھ لیا کرو، اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میرے منھ سے سوائے حق کے کوئی دوسری بات نہیں نکلتی۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اصحاب نبی میں سب سے زیادہ حدیثیں میرے پاس تھیں۔ کوئی مجھ سے بیان حدیث میں آگے نہ تھا البتہ عبداللہ بن عمرو ضرور بعض حیثیت سے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے، جب کہ میں ان کو لکھتا نہ تھا۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انصار کا ایک شخص حضورؐ کی مجلس میں حاضر ہوتا مگر اسے حدیث یاد نہ رہتی۔ وہ ابو ہریرہ سے دریافت کرتا۔ اس نے اپنے یادداشت کی شکایت سرکار کے سامنے گزاری، آپؐ نے فرمایا کہ اپنی یادداشت میں اپنے دائیں ہاتھ کو بھی شریک کرلیا کرو۔

(۴) رافع بن خدیج بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضور علیہ السلام سے ذکر کیا کہ آپ سے بہت ساری باتیں ہم سنتے ہیں، کیا ہم انہیں قید تحریر میں لائیں؟ آپؐ نے فرمایا لکھ لیا کرو کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵) انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو قید تحریر میں لاؤ۔

(۶) رسول خداؐ سے روایت کی گئی کہ آپ نے عمرو بن حزم وغیرہ کو کتاب الصدقات، کتاب الدیات، فرائض وسنن کی تحریری کاپیاں عنایت فرمائی تھیں۔

(۷) حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے جب فتح مکہ کی مہم سر کرلی تو آپؐ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطاب کیا۔ یمن کے لوگوں میں سے ایک شخص جسے ابوشاہ کہتے تھے، اسی خطبہ کے درمیان کھڑا ہوا اور عرض کیا حضور ہمارے لیے لکھ دیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اسے لکھ کر دے دیا جائے۔ ابوعبدالرحمان، عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کے سلسلے میں اس سے زیادہ مستند کوئی حدیث نہیں ہے، اس لیے کہ حضورؐ نے اس بھرے مجمع میں فرمایا کہ ابوشاہ کے لیے لکھ کر دے دیا جائے۔

(۸) ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ حضورؐ پر جب درد کا غلبہ ہوا (مرض وفات میں) تو آپؐ نے فرمایا، میرے سامنے بیاض لاؤ کہ اس میں تم لوگوں کے لیے ایک دستاویز لکھ دوں تاکہ اس کے بعد بے راہی سے بچے رہ سکو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا حضور علیہ السلام شدید تکلیف میں ہیں، ہمارے پاس کتاب اللہ موجود ہی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ صحابہ اس میں مختلف الرائے ہوئے حتیٰ کہ شور وشغب بڑھ گیا۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ میرے سامنے سے چلے جاؤ میرے سامنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں حضور کی خواہش واضح ہے کہ آپؐ قرآن کے سوا ایک دستاویز لکھ کر دینا چاہتے تھے، آپ جو تحریر کرنا چاہتے تھے وہ بجز سنت کے اور کوئی چیز تو تھی ہی نہیں، اگرچہ آپ علالت کی وجہ سے وہ لکھا نہ سکے، اس لیے یہ حکم جس کا آپ ارادہ کر چکے تھے، قابل تنسیخ نہیں اور پھر یہ حکم زندگی کے آخری لمحات میں پیش آیا۔ اب اس سے کتابت کی اباحت کھلے طور پر ثابت ہوگئی کہ آپ وقت، مقام اور دوسرے مواقع پر خصوصی وعمومی طور پر کتابت کا اہتمام فرماتے تھے۔

اس طرح احادیث سے خاص اشخاص کے لیے کتابت کی اباحت کا ثبوت آپ کے سامنے ہے، جیسے کہ ابو شاہ کے لیے آپؐ نے حکم فرمایا کہ ان کو لکھ کر دے دیا جائے۔ بالکل اسی طرح آپ نے عمومی اجازت بھی کتابت کے سلسلے میں عطا فرمائی، جیسا کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کو اور ایک انصاری صحابی کو جنہوں نے اپنے سوئے حفظ کا شکوہ حضور سے کیا تھا، آپؐ نے عام اجازت فرمائی۔ اور حضرت انس ورافع بن خدیج کی روایات بھی ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ اگرچہ ان کی روایات میں محدثین نے بحثیں کی ہیں مگر اس کے طرق بیان واستناد بہت ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ علماء کے خیالات بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، جس کا ہم اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔

علمائے اسلام نے کوشش کی ہے کہ کتابت کی ممانعت اور کتابت کی اباحت کے سلسلے میں جو احادیث مختلفہ آئی ہیں ان میں توافق پیدا کر دیا جائے، چنانچہ انھوں نے اس کی سعی کی ہے اس سلسلے میں ان کی آراء چار اقوال پر مشتمل ہیں۔

(۱) بخاریؒ کی رائے یہ ہے کہ ابو سعید خدریؓ کی روایت موقوف ہے اس لیے اسے سند نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن بخاریؒ کی رائے کے تسلیم کرنے کے سلسلے میں ایک دقت یہ ہے کہ یہ حدیث امام مسلمؒ کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، اس لیے یہ صحیح ہوئی۔ اس رائے کی تائید ابو سعیدؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ میں نے حضورؐ سے حدیث کی کتابت کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دینے سے انکار فرمایا۔

(۲) کتابت سے ممانعت ابتدائے اسلام میں تھی کہ قرآن و حدیث گڈمڈ نہ ہو جائیں، لیکن جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور انھوں نے قرآن کریم کو پوری طرح جان لیا تو جہالت ختم ہوگئی اور قرآن و حدیث ممتاز ہو گئے، پھر یہ خطرہ باقی نہیں رہا۔ اس لیے پہلا حکم جس کا ترتب اُس پر تھا منسوخ ہوگیا اور جواز کتابت کا حکم کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں رام ہرمزی کی بات قابل غور ہے کہ ابو سعیدؓ کی حدیث ''کہ ہم کو بڑا شوق تھا کہ حضورؐ ہمیں کتابت کی اجازت دے دیں مگر آپؐ نے انکار فرمایا'' میرے نزدیک اگر صحیح ہو تب بھی یہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا جب کہ قرآن کی حفاظت کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اور نسخ کی جو بات ابن قتیبہ نے سمجھی ہے وہ احادیث سے صحیح ہے، وہ سنت کا سنت کے ذریعہ نسخ کے ہم معنیٰ ہے کہ آپؐ نے ابتداءً منع فرمایا کہ آپ کی باتیں قید تحریر میں لائی جائیں، پھر بعد میں جب آپؐ کو اس کا اندازہ ہوا کہ احادیث کثیر ہیں جو لوگوں کی یادداشت پر موقوف نہیں رکھی جاسکتیں تو آپؐ نے کتابت و تحریر کا حکم فرمایا۔ اس رائے کی ہمنوائی بہت سے علماء نے کی۔ علامہ احمد محمد شاکر بھی اسی خیال کے ہمنوا ہیں، مزید برآں آپ کی رائے میں اس وقت اور قوت پیدا ہوگئی ہے جب کہ کتابت کی اجازت پر مشتمل احادیث سامنے آئیں، تو آپ نے کھلے لفظوں میں فرمایا کہ اس سے اس بات کا پتہ چلا کہ ابو سعیدؓ کی حدیث لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه (میری باتیں نہ لکھو، قرآن کے علاوہ جس نے کچھ لکھا ہے اسے چاہیے کہ مٹا دے) منسوخ ہیا گرچہ یہ ابتداء ہی تھی جب کہ قرآن و حدیث کے گڈمڈ

ہونے کا خطرہ تھا اور ابو شاہ والی حدیث حضورؐ کی زندگی کے آخری دنوں کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات آپ کی زندگی کے آخری دنوں کی مرویات ہیں کہ عبداللہ بن عمرو لکھا کرتے تھے اور ابو ہریرہؓ لکھتے نہ تھے۔ اس حدیث سے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی کہ عبداللہ بن عمرو کی کتابت کا زمانہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قبول اسلام کے بعد کا ہے۔ اگر حدیث ابو سعیدؓ متاخر ہوتی اور یہ احادیث اس سے سابق ہوتیں تو صحابہ جو پیمبر کے سب سے زیادہ اداشناس تھے، انہیں ضرور اس کا علم ہوتا۔

مزید برآں اس رائے کے ساتھ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے، کتابت حدیث سے نہی کا مقصد یہ رہا ہو کہ ایک ہی صحیفہ میں حدیث اور قرآن نہ لکھے جائیں کہ اس سے اشتباہ بڑھ جانے کا خطرہ اور زیادہ تھا، اس لیے کہ صحابہ قرآن کی آیات کی تفسیر بھی سنا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک ہی ساتھ لکھ لیا، اس وقت کتابت کی ممانعت کی گئی تا کہ اشتباہ کا کلی طور پر خاتمہ ہو جائے۔

(۳) نہی کتابت ان کے لیے تھی جن کا حافظہ عمدہ اور قابل اعتماد تھا صرف کتابت پر ان کو زیادہ بھروسہ نہ تھا، اور کتابت کی اجازت ان کو تھی جن کا حافظہ نا قابل اعتماد تھا جیسے ابی شاہ۔

(۴) یہ بھی ممکن ہے کہ نہی عام ہو اور اجازت صرف ان لوگوں کے لیے خاص تھی جو قاری، کاتب، جید الحفظ تھے کہ کتابت میں غلطی کا اندیشہ نہ تھا، جیسے عبداللہ بن عمرو بن العاص جن کو ہر طرح حضور کا اعتماد حاصل تھا، آپؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ اسی بات کو ابن قتیبہ نے بھی ان احادیث کی روشنی میں سمجھا۔

ہمارے نزدیک احادیث میں جو باتیں ہیں وہ ابو سعید کی روایت نہی کی تائید کرتی ہیں، اور اس کی تصدیق بھی کرتی ہیں، جو اباحت کتابت کے بارے میں احادیث میں مذکور ہے، اس لیے ابو سعید کی حدیث کو موقوف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح رائے اول قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ ممکن ہے یہ تینوں آراء درست ہوں کہ حضور نے کتابت حدیث کو صحیفۂ قرآن کے ساتھ ساتھ لکھنے سے روکا ہو کہ ایک ہی جگہ قرآن اور

حدیث کے جمع ہونے سے خوف التباس پیدا ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے ابتداء اسلام میں قرآن کریم کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں حدیث کی کتابت سے اس لیے منع فرمایا ہو کہ اس سے مسلمانوں کا قرآن سے صرف نظر کرنے اور احادیث کے ساتھ مشغول ہو جانے کا خطرہ درپیش تھا، اور آپؐ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن کو سینوں میں سمو لیں، تختیوں پر لکھ لیں، صحیفہ میں مکتوب کر لیں اور ہڈیوں پر ان کی نوشت کر لیں تا کہ پوری طرح یاد ہو جائے اور حدیث کو علمی ممارست کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس لیے کہ صحابہ موازنہ کرتے تھے رسول خدا کو دیکھ کر اسی انداز پر چلتے، آپ سے حدیثیں سنتے پھر اتباع کرتے، مگر آپ نے جن کو دیکھا کہ وہ سنت و قرآن کو گڈمڈ نہیں کرتے انھیں بڑی کشادہ دلی سے اجازت دے دی کہ وہ سنت کی تدوین کر لیں جیسے عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں اور اسے اجازت کا پروانہ دیا جسے دیکھا کہ سوء حفظ کی وجہ سے یہ سنت کو کھو دے گا، لیکن جب قرآن کا حفظ عام ہو گیا ہر طرف اس کا چرچہ بڑھ گیا، جس سے قرآن و حدیث میں وجہ امتیاز پیدا ہو گیا تو آپ نے اپنے پرانے حکم کو منسوخ کر کے اجازت کتابت کا عمومی حکم فرمایا۔ اس طرح نہی کتابت کی علت سے اس کے مخالف حکم کا وجود منتفی نہیں ہوتا اور نہ ان دونوں احکام میں تعارض ہی پیدا ہوتا ہے، جس طرح کہ علت نہی کا وجود اس نہی کے مخصوص ہونے کی نفی نہیں کرتا کہ بعضوں کو آپ نے خوشی سے اجازت دے دی تھی۔ اس طرح امر و نہی میں کوئی تعارض و تخالف نہیں۔ ابتدائے اسلام میں نہ تو نہی کتابت کا حکم عمومی تھا نہ اباحت کتابت کا حکم عام تھا۔ جب علت موجود تھی کتابت روک دی گئی اور جب زائل ہوگئی کتابت کی اجازت دے دی گئی۔

حضرت ابو شاہ اور حدیث ابن عباس ایتونی بکتاب میں اذن عام اور اباحت کتابت مطلق انداز میں موجود ہے، اس لیے ان روایات میں کوئی تعارض نہیں۔ ان دونوں میں توافق نہایت آسان ہے اور صحیح رخ کا تعین بھی سہل ہے۔ الغرض حضورؐ نے کتابت کو جائز قرار دیا۔ اب آپؐ کے دور کے بعد ہمارے سامنے آنے والے بزرگوں کا زمانہ ہے۔

کتابت حدیث دور صحابہؓ میں

حضورؐ کی جانب سے اباحت کتابت ہوتے ہوئے اور صحابہؓ کی وہ جماعت جن کو حضور نے اجازت کتابت عنایت فرمائی ان کی احادیث بھی صحابہ کے سامنے تھیں، پھر بھی ہم صحابہ کو کتابت کے سلسلے میں محتاط دیکھتے ہیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں انھوں نے کوئی پیش قدمی نہیں کی، جس کا مقصد قرآن کریم کو اور سنت نبی کریم کو یکساں طور پر باقی رکھنے کے جذبہ کی کارفرمائی تھی۔ اس لیے صحابہ ہی میں بعض لوگ کتابت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے، بعض اسے بہ نظر استحسان دیکھتے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد کتابت کے جواز کے قائلین کثیر تعداد میں پیدا ہو گئے بلکہ بعض ایسے بھی تھے جو ابتداء کتابت کو ناپسند کرتے مگر بعد میں اس کی اباحت کے قائل ہو گئے تھے، یہ اس وقت ہوا جب کہ کراہت کتابت کی علت باقی نہیں رہ گئی۔

حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کیا کہ میرے والد (حضرت ابوبکر صدیقؓ) نے حضورؐ سے پانچ سو روایتیں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک رات بے چینی میں صبح تک کروٹیں بدلتے رہے۔ جب صبح ہوئی فرمایا، بیٹی! احادیث کا وہ مجموعہ جو تمھارے پاس ہے لاؤ۔ میں لائی آپ نے آگ منگائی اور اسے نذر آتش کر دیا۔

عمر بن الخطابؓ ہی کو دیکھئے کہ سنت کو جمع کرنے کی سوچتے رہے، مگر کچھ ہی دن کے بعد اس سے پھر گئے۔ چنانچہ عروہ بن الزبیر بیان کرتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے سنت کے جمع کرنے کی سوچی، آپؓ نے صحابہ سے رائے طلب کی، سبھوں نے کتابت حدیث کا مشورہ دیا۔ حضرت عمر اس رائے پر مہینہ بھر تک استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک صبح کو خدا نے ان کے دل میں ڈالا، آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ سنن نبوی کو قید کتابت میں لاؤں، مگر معاً مجھے یاد آیا کہ تم سے پہلے بھی جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی کتابیں لکھیں، پھر انہی نوشتوں کے ہو کر رہ گئے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا، اب میں نے قسم کھائی کہ کسی چیز سے کبھی بھی کتاب اللہ کو گڈمڈ نہ ہونے دوں گا۔ ایک دوسری روایت بھی انس بن مالک سے ہے کہ حضرت عمر نے جب کتابت سنت کو مسترد کیا، فرمایا "لا کتاب مع کتاب اللّٰہ"

اصل میں حضرت عمر کو کتابت سنت پر خطرہ تھا کہ اگر مسلمان غیر قرآن کی تعلیم و تعلم پر لگ جائیں گے تو کتاب اللہ کی حفاظت کا جذبہ فروتر ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حضرت عمر کے تشدد کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دوسری کسی نوشت کو کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ رکھنے سے روکتے تھے، اور جو کوئی بھی کوئی نوشتہ اپنے پاس رکھتا تو اس سے شدید انکار کرتے، اس کو سزا بھی دیتے۔ فرماتے کہ ساتھ آؤ اسے مٹاؤ، اب نہ تو خود پڑھنا نہ کسی کو پڑھنے دینا۔ اگر مجھے اطلاع ملی کہ تم نے کسی کو پڑھایا یا خود پڑھا تو کڑی سزا دوں گا۔ چنانچہ آپ خطبہ میں فرماتے لوگو! مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمھارے ہاتھوں میں نوشتے نظر آتے ہیں، ان نوشتوں میں خدا کو سب سے عمدہ اور مضبوط نوشتہ ہی پسند ہے، اپنے پاس کوئی نوشتہ نہ رکھیں، مجھے لاکر دکھائیں، پھر میں اسے دیکھ کر رائے قائم کروں گا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اسے دیکھ کر صرف انہیں باتوں تک باقی رہنے دیتے، جن میں اختلاف کی بو نہ ہوتی، لوگ اپنے اپنے نوشتے لائے، آپ نے انھیں جلا دیا کہ یہ مفروضات ہیں جیسے کہ اہلِ کتاب کے مفروضات تھے۔ آپ نے دوسرے مقامات میں آرڈر بھی روانہ فرمائے کہ جس کے پاس اس قسم کی تحریر ہو اسے تلف کر دیا جائے۔

اس سے حضرت عمر کے غایت احتیاط اور خشیت الٰہی کا اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں قرآن کریم کو ان نوشتوں سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ خود اپنے بارے میں ان کا یہی انداز تھا، وہ اپنی رائے کو بھی مکتوب نہیں دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ اسے مٹا دینا پسند کرتے تھے، حتیٰ کہ جب آپ کو تیر لگا اور ڈاکٹر طلب کئے گئے، آپ نے اپنی موت کا وقت قریب ہونا سمجھ لیا، اس وقت آپ نے اپنے صاحب زادے کو پکارا، اے ابن عمر! مجھے بقچہ دو اگر خدا اس میں سے کوئی چیز باقی رکھنا چاہے گا تو باقی رکھے گا۔ ابن عمر نے کہا کہ میں اسے مٹا دوں گا، آپ زحمت نہ فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ بخدا ایسا نہ ہوگا، میرے سوا اسے کوئی دوسرا نہ مٹائے گا۔ پھر حضرت عمر نے خود اپنے ہاتھ ہی سے اسے مٹا کے چھوڑا۔ اس میں دادا کے بارے میں احکام تھے۔

حضرت عمرؓ حفظ قرآن کے سلسلے میں جب مطمئن ہو گئے تو بہت سی احادیث اپنے عمال و

اصحاب کولکھ کر بھیجیں۔ چنانچہ ابوعثمان نہدی بیان کرتے ہیں کہ ہم عتبہ بن فرقد کے پاس تھے کہ حضرت عمر نے کچھ باتیں آپ کے پاس سنت نبویؐ کی لکھ کر بھیجیں۔ ان میں سے جو باتیں لکھیں تھیں وہ یہ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا میں ریشم وہ شخص پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر یوں آپ نے اپنے سبابہ اور وسطیٰ سے اشارہ فرمایا۔ ابوعثمان کہتے ہیں کہ ہم نے طیالسہ کو دیکھا کہ ریشم کی بنی ہوئی ازاریں وہ پہنے ہوئے تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی کتابت حدیث کی ناپسندیدگی کی روایت مروی ہے۔ عبدالرحمان بن اسودؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علقمہ کے پاس مکہ یا یمن سے ایک نوشتہ صحیفۂ احادیث نبوی اہل بیت سے متعلق لایا گیا۔ ہم نے اجازت چاہی کہ عبداللہ کے پاس حاضر ہوں۔ اجازت ملنے پر ہم اندر داخل ہوئے اور آپ کے سامنے صحیفہ رکھ دیا گیا۔ آپ نے اپنی جاریہ کو بلایا اور پانی بھرا طشت منگایا۔ ہم نے اس وقت عرض کیا اے ابوعبدالرحمان اس صحیفہ پر نظر ڈالئے، اس میں عمدہ حدیثیں ہیں۔ آپ نے پانی میں ہاتھ ڈال کر اسے صاف کرتے ہوئے فرمایا نحن نقص عليك أحسن القصص بما أوحينا اليك هذا القرآن (الآیة ۳ یوسف) انسانی قلوب ظرف ہیں، اسے قرآن سے بھرتے رہو، اور اسی میں خود کو مشغول رکھو، دل کو قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں مشغول نہ کرو۔

ایک روایت ہمارے پاس ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں حضرت ابودرداء صحابی کی باتیں اور ان کے قصے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کسی راوی نے کہا کہ یہ صحیفہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے ماخوذ ہو، اس بنیاد پر حضرت عبداللہ نے اس صحیفہ کو دیکھنا پسند نہیں فرمایا۔ ہمارے پاس اس بات کے متعین کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے کہ اس صحیفہ میں قصے تھے یا اہل کتاب سے ماخوذ باتیں تھیں۔ اس لیے کہ اسود بن ہلال کی روایت میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں کہ عبداللہ کے پاس صحیفہ پیش کیا گیا اس میں حدیثیں تھیں۔ آپ نے پانی طلب کیا اور اس سے انھیں مٹا دیا، پھر دھویا، پھر ان کو جلانے کا آرڈر فرمایا اور جلا دیا گیا۔ جلانے کے بعد آپ نے فرمایا میں اس شخص کو خدا کی یاد دلاتا ہوں جو یہ بتادے کہ کس کے پاس کوئی نوشتہ ہے،

بخدا اگر مجھے پتہ چلتا کہ ایسا شخص ہندوستان کے کسی خطہ میں ہے تو میں اس تک پہنچتا۔ اسی وجہ سے تم سے پہلے اہلِ کتاب تباہ ہوئے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو اس طرح چھوڑ دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا تصرف اس سلسلے میں اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو خطرہ تھا کہ لوگ کتابت حدیث میں مشغول ہو کر قرآن کو چھوڑ بیٹھیں گے، یا غیر قرآن ان کا مطمح نظر بن جائے گا، پھر بعد کو عبداللہ بن مسعود خود احادیث کی کتابت فرمانے لگے جب انھوں نے ممانعت کے اسباب کو ناپید دیکھا۔ مسعر نے معن سے روایت کی ہے کہ عبدالرحمان بن عبداللہ بن مسعود ہمارے سامنے ایک نوشتہ لائے اور قسم کھا کر کہا کہ یہ پدر بزرگوار کا لکھا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا انداز بھی یہی تھا۔ آپ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس کوئی نوشتۂ حدیث ہو تو اس سے اس کے تلف کرنے کی ذمہ دارانہ بات کرتا ہوں، اس لیے کہ علماء کی حدیث کا اتباع کرنے اور کتاب اللہ کو ترک کرنے کی وجہ سے پہلے کے لوگ برباد ہوئے۔

زید بن ثابتؓ نے مروان بن الحکم کی اس درخواست کو کہ وہ آپ سے سن کر لکھ لیں، رد فرمایا اور کہا کہ ساری باتیں جو تم سے بیان کی ہیں ممکن ہے اس انداز پر نہ ہوں جس طرح میں نے بیان کیں۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ مروان سے آپ نے فرمایا کہ حضورؐ نے ہم سے فرمایا کہ ہماری حدیث کی کتابت نہ کرو۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی مروان بن الحکم کے کاتب سے انکار فرمایا، کبھی یہ فرماتے کہ ابو ہریرہ نہ تو کوئی بات چھپاتا ہے نہ تحریر میں لاتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تحریر ہم نہ لکھتے ہیں نہ لکھاتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم نہ تو کتابت علم کرتے نہ کسی کو کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ سعید بن جبیرؒ کی روایت میں ہے کہ ابن عباس کتابت علم سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ کتابت ہی کی بنیاد پر تمھارے پہلے گمراہ ہوئے۔

ابو سعید خدریؓ نے حدیث رسولؐ سے استدلال کیا جو آپ نے غیر قرآن کی کتابت سے

منع فرمایا آپ نے ابونضرہؓ کو کتابت کرانے سے انکار فرمایا، جب کہ آپ سے انھوں نے کہا کہ لکھوا دیں کہ ہمیں یاد نہیں رہتا۔ ابوسعید نے ان کا جواب دیا کہ ہم آپ کو لکھا نہیں سکتے، حدیث کو قرآن نہیں بنائیں گے، یاد کرلو جس طرح ہم نے حضور اکرمؐ سے یاد کیا۔

عبداللہ بن عمر سے بھی روایت ہے کہ آپ کتابت حدیث ناپسند کرتے تھے۔ سعید بن جبیر کی روایت میں ہے کہ بعض چیزوں میں ہمیں اختلاف ہوتا اس لیے ہم ایک نوشتہ میں لکھ لیتے، پھر ہم اسے ابن عمر کے پاس لاتے اور ان کے سامنے اس طرح رکھتے کہ ان پر ظاہر نہ ہوتا، اگر اس کو وہ بتلا دیتے تو پھر وہی بات درست ہوتی ہمارے اور ان کے مابین۔

ابوموسیٰ اشعریؓ نے اپنے بیٹے کو لکھانا پسند نہیں کیا کہ کہیں کم وبیش ہو جائے اور ان کے نوشتہ کو پانی سے مٹا دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہماری طرح یاد کرلو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ بنو اسرائیل نے نوشتہ تیار کیا اور اسی کے پابند ہو گئے توریت کو ترک کر دیا۔

یہ وہ بیشتر لوگ ہیں جنھوں نے صدر اسلام میں کتابت حدیث کو ناپسند کیا۔ میرا مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر انداز فکر کی رائے آپ کے سامنے پیش کردوں، تاکہ ناپسندیدگی اور کراہت کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر آپ کے سامنے کھل کر آجائے اور آپ کو اس ناپسندیدگی کے اسباب کی روشنی میں نتائج کا نکالنا آسان ہو جائے۔ اس لیے کہ صدر اول میں کتابت سے نفرت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ کتاب اللہ میں گڈمڈ نہ ہونے پائے یا قرآن کو چھوڑ کر لوگوں کا رخ کسی دوسری جانب نہ ہو جائے۔ کتب قدیمہ کے مطالعہ سے روک دیا گیا کہ ان میں حق وباطل کی تمیز ممکن نہیں رہ گئی تھی، نہ صحیح کو سقیم سے پرکھنا ممکن تھا، جب کہ قرآن کریم ان تمام کتب قدیمہ کی جگہ پر تکمیل کرنے کے لیے کافی تھا، بلکہ تلافی مافات کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ علمی کتابوں کے مطالعہ سے صدر اسلام میں روکنے کی خاص وجہ فقہاء علم کی کمی، اسی طرح وحی اور غیر وحی کے مابین فرق کرنے والے علماء کی کمی تھی اس لیے کہ سارے عرب فقیہہ فی الدین نہ تھے۔ نہ اپنی نجی ضرورت کی وجہ سے انھیں سمجھدار علماء کی صحبت ہی کے مواقع حاصل تھے۔ اس لیے اس

بات کا خطرہ تھا کہ جو بھی ان کو ملتا وہ قرآن ہی سمجھ بیٹھتے اور ان ساری چیزوں کو کلام رحمانی ہی سمجھ بیٹھتے۔ اس کے ساتھ صحابہؓ کی احتیاط اور ان کا خوف خدا بھی مانع تھا کہ وہ ایسی چیزوں کو جنھیں انھوں نے رسول خدا سے سنا اور پھر انھیں اس انداز پر باقی نہ رکھ سکے۔

اسی بنیاد پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اولین کوشش یہی رہی کہ صحف و مصاحف قرآنی کو سینہ میں محفوظ کرا دیں۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ کے زمانے میں اسے جمع کروایا اور عہد عثمانی میں اس کی باقاعدہ کتابت کر لی گئی، اور اسے تمام دنیا میں روانہ کیا گیا تاکہ شریعت کے ابتدائی مصدر کی حفاظت ہو سکے اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جائے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے سنت کی حفاظت اس کی تعلیم کے ذریعہ کرنی شروع کی، اس کی یادداشت کے لیے مجلس مذاکرہ منعقد کی جاتی۔ کراہت کتابت کے اسباب ناپید ہونے کے بعد اس کی کتابت کا نظم فرمایا، اس لیے کہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد سے کتابت حدیث اور اس کی تدوین کی ہمت افزائی تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

ہمیں ان باتوں کے بارے میں کوئی شبہ نہیں، برخلاف اس کے کہ بہتوں کو اس میں شک و شبہ موجود ہے، اس لیے کہ ہمیں اس میں وہ تعارض بھی نظر نہیں آتے جو مستشرقین نے پیدا کیے ہیں یا بیان کیے ہیں۔ انھوں نے وضع حدیث اور اس کی گھڑنت کا بہانہ کرکے کوئی تیر نہیں مارا۔ آگے ہم مختصراً اس کا بھی جائزہ لیں گے جس سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ صحابہ نے حدیث کو قید کتابت میں لانے کی اجازت دے دی تھی اور ہمارے اس مختصر جائزے سے آپ کو ساری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

ان اخبار کے بیان سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان تطورات کی طرف مڑ کر دیکھیں جو حضرت فاروق اعظم نے سنت کی تدوین اور اس کو جمع کرنے کے سلسلے میں اختیار فرمائی تھیں، جس طرح قرآن کریم کے جمع کرنے میں ان کی مساعی ہمارے سامنے ہیں کہ ابتداء آپ کا منع کتابت حدیث کی جانب تھا اور اس کے لیے بہت کچھ کیا بھی، مگر بعد میں اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں سنت اور کتاب اللہ مختلط نہ ہو جائیں اور مسلمان ان دونوں

کے مابین کوئی مابہ التمیز حد نہ قائم کرسکیں، اس سے ہم کو اس بات کے ثابت کرنے میں بڑی مدد ملے گی کہ آپ کے یہ دونوں عمل کتابت حدیث کے منافی نہیں ہیں اور یہ وہی بات ہے جو حضور کے حکم کی انتہاء کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ کے نزدیک کتابت حدیث ممنوع نہ تھی، بلکہ جو حالات پیدا ہوگئے تھے اس کے پیش نظر آپ نے اس سے روکا تھا۔ اگر خدا کے رسول نے اس سے روک دیا ہوتا تو پھر فاروق اعظم اس کو کیسے کر گزرتے۔ اس لئے فاروق اعظم کی ممانعت کتابت کسی ناپسندیدگی کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ اصل وجہ وہ مصلحت تھی جو تدوین حدیث کے مسئلہ کو ٹھپ کئے ہوئے تھی، ورنہ ہم خود فاروق اعظم کو کتابت کرتے ہوئے پاتے ہیں یا ہر اس شخص کو آپ کی جانب سے کتابت کی اجازت ہوتی ہے جس کے بارے میں یقین ہوتا ہے کہ وہ سنت اور کتاب میں گڈمڈ نہ کرے گا۔ اور جب قرآن کے محفوظ ہونے کا مکمل نظم ہوگیا تو آپ نے کتابت حدیث کی پوری چھوٹ لوگوں کو دے دی اور اس کی بھرپور تائید عمرو بن ابوسفیان کی روایت سے ہوتی ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کو یہ فرماتے سنا کہ علم کو کتابت کے ذریعہ محفوظ کرو۔

مزید برآں بعض صحابہ نے خود کتابت کی اور بعض نے کتابت کرنے کی اجازت دی اور ان کی رائے منع کتابت اس وقت بدل گئی جب اسباب منع کتابت حدیث ختم ہوگئے، بالخصوص جب قرآن مصاحف کی صورت میں دنیا کے اکثر حصہ میں پہنچ گیا۔

ہماری اس رائے کو جو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس روایت سے کوئی دھکا نہیں پہنچتا جو حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے حضرت انسؓ کو فرائض صدقہ تحریر فرما کر ارسال کیا تھا حالانکہ مصاحف قرآنی کی کتابت مکمل نہیں ہوئی تھی اسی بنا پر ہم نے التباس کتاب وسنت کو ہی منع کتابت کا واحد سبب نہیں گردانا، بلکہ اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے جن کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ پھر حضرت انسؓ ان صحابہ میں سے ہیں جن میں التباس کا شائبہ بھی نہیں سوچا جاسکتا، اس لیے کہ آپ نے رسول خدا کی دس سال تک خدمت کی اور آپ کو خوب اچھی طرح پہچانا اور آپ سے دس سال کے طویل عرصہ تک تعلیم

حاصل کرتے رہے۔ یہی بنیاد ہے ہمارے اس قول کی کہ حضرت ابو بکرؓ سے حدیث کی کتابت اسی انداز میں مرقوم ہے جس طرح حضرت عمرؓ سے۔

اور عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت کہ ہم عہد نبوی میں بجز استخارہ و تشہد کے کچھ نہ لکھتے تھے، خود اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ غیر قرآن کی کتابت عہد نبوی میں کیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود کے نزدیک کتابت مکروہ نہ تھی۔ اس سے پہلے ہم اس روایت کو ذکر کر چکے ہیں کہ آپ کے صاحب زادے نے آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوشتۂ حدیث ہمیں دکھایا تھا۔

حضرت علیؓ طلب علم اور کتابت پر زور دیا کرتے تھے، چنانچہ ان کا قول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک درہم میں مجھ سے کون علم خریدنا چاہتا ہے؟ ابو خیثمہ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک صحیفہ ایک درہم میں لیا جس میں علم مکتوب تھا اور حضرت علی کے صحیفہ کے بہترین ہونے کی روایت مشہور ہے، یہ صحیفہ آپ کی تلوار کے ساتھ لٹکا رہتا جس میں اونٹ کے دانت اور زخم کے اندمال کی کچھ دوائیں تھیں۔

یہ حسن بن علی ہیں جو اپنے بچوں اور بھائی کے بچوں کو ہدایت کرتے ہیں، سیکھ لو سیکھ لو آج تم قوم کے چھوٹے ہو، کل بڑے ہو گے، جو یاد نہ کر سکے لکھ لو۔ ایک روایت میں ہے کہ لکھ کر گھر میں محفوظ کر لو۔

اور ام المومنین عائشہؓ کو تو دیکھئے آپ اپنے بھانجے عروہ بن الزبیر سے فرماتی ہیں صاحبزادے! مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم حدیث کو سن کر لکھ لیتے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سنتا ہوں پھر اور کسی دوسرے سے وہی بات سنتا ہوں مگر الفاظ بدلے ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ معنیٰ میں گڈمڈ تو نہیں ہوتی؟ جواب میں کہا نہیں۔ اب آپ خود سوچیں کہ اگر حضرت عائشہؓ کتابت ناپسند کرتیں تو عروہ کو روک دیتیں مگر آپ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی بلکہ ان کے اس عمل کتابت میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔

آیئے ابو ہریرہؓ راوی حدیث ہی کو دیکھئے کہ وہ بشیر بن نہیک کو کتابت حدیث کی

اجازت دیتے ہیں کہ "مجھ سے سنی ہوئی روایات لکھ لو" اور اس کی روایت کی بھی اجازت عنایت فرمائی۔ ایک روایت میں بشیر بن نہیک کہتے ہیں کہ میں ابوہریرہ کے پاس اپنے اس نوشتہ کو لے کر آیا۔ میں نے ان کو پڑھ کر سنایا اور ان سے کہا کہ یہ وہ روایتیں ہیں جو میں نے آپ سے سنی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں وہی ہیں سن لیا۔ اور عمرو بن امیۃ الضمری نے بیان کیا کہ میں نے ابوہریرہؓ کے پاس بہت سے حدیث کے نوشتے دیکھے تھے۔

معاویہ بن ابوسفیان نے مغیرہ بن شعبہؓ کے پاس یہ تحریر بھیجی کہ وہ باتیں جو آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں مجھے لکھ بھیجو۔ اس پر مغیرہ نے آپ کو تحریر کیا کہ حضور اگر مگر سے بچنے کو کہتے، اس طرح کثرت سوال سے روکتے اور مال کے ضائع کرنے سے روکتے۔

زیاد بن ابی سفیان نے حضرت عائشہؓ سے تحریری طور پر یہ دریافت کیا کہ حاجی کے بھیجے ہوئے ہدی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا اس پر بھی اسی طرح سے ساری باتیں حرام ہیں جس طرح حاجی پر قربانی کرنے تک حرام ہوتی ہیں جیسا کہ ابن عباس کا فتویٰ بھی ہے؟ حضرت عائشہ نے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدی کے بارے میں بتلایا اور فرمایا کہ رسول خدا نے کوئی چیز جسے خدا نے حلال کیا ہو حرام نہیں قرار دیا، حتیٰ کہ ہدی کی قربانی بھی۔

یہ ابن عباسؓ ہیں، ابورافع صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کون کاتب ہوتا، جو لکھتا تھا؟ دوسری روایت میں ہے کہ کیا آپ کے ساتھ پلیٹیں ہوتی تھیں جن پر لکھا جاتا؟ ابن عباس حصول کتابت پر لوگوں کو ابھارتے اور فرماتے کہ علم کو کتابت کرکے قابو میں کرلو اور کون ہے جو مجھ سے علم ایک درہم میں خریدتا؟ کبھی فرماتے کہ ہم صحیفہ میں خطوط اور قرآن کے سوا کچھ دوسری بات نہ لکھتے مگر ہم نے خود ابن عباس کو رسائل کے سوا بھی لکھتے دیکھا ہے۔ مجاہد بن جبیر کو آپ تفسیر املا کراتے تھے اور ان سے فرماتے لکھ لیا کرو۔ حجاج نے آپ کے پاس فتویٰ دریافت کرنے کے لیے لکھا کہ کسی شخص نے اپنی بہن پر دباؤ ڈالا اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں ابن عباس نے حدیث رسول اکرم تحریر کردی۔

اس سے پہلے ہم عبداللہ بن عمرو بن العاص کے نوشتۂ حدیث کا ذکر کر چکے ہیں، آگے ہم اس صحیفہ پر گفتگو کریں گے۔ یہ ابوسعید خدری صحابی رسول اکرمؐ ہیں جنھوں نے حضور سے روایت حدیث کی من کتب عنی غیر القرآن فلیمحه (جس نے قرآن کے علاوہ میری باتوں کو لکھا ہے اسے مٹادے) وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم قرآن وتشہد کے سوا کچھ نہ لکھتے براء بن عازب صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث بیان کرتے اور جو لوگ آپ کے حلقۂ حدیث میں ہوتے لکھتے۔ عبداللہ بن خنیس اس کی تائید کرتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب کے پاس لکھنے والوں کے ہاتھ میں سرکنڈے کا قلم دیکھا اور یہ وراد جو مغیرہ بن شعبہ کے منشی تھے ان کے سامنے ہی کتابت کرتے۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ وہ اپنے گھر سے اس وقت تک نہ نکلتے جب تک کہ صبح کو نوشتۂ حدیث نہ دیکھ لیتے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول خدا کے خادم رہے، دس سال آپ کے گھر کے رات ودن کے ملازم تھے وہ اپنے بیٹے سے کہتے کہ مُنے علم کو قید کتابت میں لاکر محفوظ کرلو، اور حدیث کا املا کراتے۔ جب لوگوں کا ازدحام آپ کے پاس حدیث لکھنے کے لیے بڑھ گیا تو آپ مجلۂ حدیث لاتے، یہ ان نوشتوں میں سے ایک ہوتا جو آپ کے پاس محفوظ تھے۔ پھر اس کو املا کراتے اور فرماتے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے خود حضورؐ سے سنیں اور ان کو لکھ بھی لیا، پھر اس کو آپ کے سامنے پیش کرکے اس کی تصدیق بھی کرلی۔

یہ مضبوط دلائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صحابہؓ نے کتابت کو جائز قرار دیا تھا اور احادیث خود اپنے لئے لکھی تھیں، پھر ان کے سامنے ہی طالبان علم حدیث نے ان حدیثوں کو تحریر کیا اس طرح صحابہ کتابت حدیث اور اس کو یاد کرنے کی وصیت ایک دوسرے کو کرتے رہتے، جیسا کہ ابھی حضرت علی، ابن عباس، حسن وانس بن مالک رضی اللہ عنہم کی روایات سے آپ کے سامنے یہ بات آچکی، حالانکہ ان میں سے بعض صحابہ نے کتابت کو اس وقت ناپسند کیا تھا جب کہ اسباب منع حدیث موجود تھے۔

کتابت حدیث کو ممنوع سمجھنے والوں نے اپنی اس رائے سے کھلے طور پر رجوع کرلیا، جیسا

کہ ہم ابن مسعودؓ وابو سعید خدریؓ صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے لکھ چکے۔ انھوں نے قرآن کے صحیفہ میں تشہد واستخارہ کی کتابت تسلیم کرلی ہے۔ یہ روایت خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماسوا قرآن کی کتابت کی ممانعت کا مقصد قرآن کے دوسرے نوشتوں کے ساتھ مختلط ہونے کے خطرہ کے پیش نظر تھی کہ اس سے مسلمان قوم غیر قرآن کو قرآن سمجھ بیٹھتی۔ اس سلسلے میں خطیب بغدادی کی بات تاریخی حیثیت سے بڑی وزن دار ہے کہ جب اس خطرہ کا خوف جاتا رہا اور علوم کی کتابت کا تقاضا درپیش تھا تو لوگوں نے کتابت کو ناپسند نہیں کیا، جس طرح کہ صحابہ نے تشہد کی کتابت کو بڑے شوق سے جاری رکھا۔ اب آپ خود سوچیں کہ تشہد کی کتابت اور دوسرے علوم کی کتابت میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اس لیے کہ تشہد کی طرح یہ علوم بھی غیر قرآن ہی ہیں۔ صحابہ نے کتابت حدیث بھی احتیاط کے پیش نظر کی اور اس کو ناپسند بھی احتیاط ہی کی بنیاد پر کیا۔

تدوین عہد تابعین میں

تابعین نے تحصیل علوم صحابہ سے کی، انہی سے ان کا گہرا تعلق رہا اور ساری چیزیں ان کے علم میں انہی صحابہ سے آئیں، رسول خدا کی پاکیزہ احادیث کا بڑا حصہ انہی سے حاصل کیا۔ کتابت حدیث سے روکنے اور اس کی اجازت کے مواقع سے بھی بخوبی واقفیت انہی صحابہ سے حاصل ہوئی۔ انہی سے ہدایت حاصل کی، اس لیے کہ صحابہ ہی کا گروہ وہ پیش رو دستہ تھا جنھوں نے قرآن اور سنت کی حفاظت کی۔ اس لیے فطری طور پر تابعین اور صحابہ کے خیالات میں یکسانیت موجود تھی اور نظریہ تدوین حدیث میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جن اسباب کے پیش نظر خلفائے راشدینؓ اور صحابہ نے کتابت حدیث کو کراہت کی نظر سے دیکھا، انہی اسباب کی بنا پر تابعین نے بھی کتابت حدیث کو اسی نگاہ سے دیکھا۔ اس طرح ان تمام لوگوں کا ایک ہی موقف تھا۔ کتابت کو اس وقت تک برا سمجھتے رہے جب تک کہ اسباب کراہت موجود تھے، پھر ان اسباب کے خاتمہ کے بعد اس کی کتابت پر بھی متفق نظر آئے، بلکہ اکثر تابعین تدوین حدیث پر لوگوں کو ابھارتے، ان کی ہمت افزائی کرتے۔ اس لیے ہمیں اس خبر پر کوئی تعجب نہ

ہوگا، اگر کوئی تابعی کتابت سے روکتا ہے اور دوسرا اس کی اجازت دیتا ہے، اور ہمیں اس پر بھی کوئی حیرت نہیں کہ تابعین کا مختلف گروہ کتابت حدیث کو مکروہ سمجھتا تھا خواہ یہ کبار تابعین ہوں یا اواسط تابعین ہوں یا صغار ہی کیوں نہ ہوں۔ ان ساری چیزوں کو ہم ایک ایسے رخ پر رکھ کر جانچتے ہیں جو اسباب کے شیشوں میں مختلف نظر آتی ہیں، ورنہ حقیقت میں ایک ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کبار تابعین اور متاخرین صحابہ نے کتابت حدیث کا جواز ہی اختیار کیا ہے۔

کتابت کو کبار تابعین میں جن حضرات نے ناپسند کیا ان میں عبیدہ بن عمرو السلمانی (-۷۲ھ)، ابراہیم بن یزید التیمی (-۹۲ھ) جابر بن زید (-۹۳ھ) ابراہیم نخعی (-۹۶ھ) عبیدہ کو یہ پسند نہ تھا کہ کوئی ان سے حدیث سن کر کتابت کرے یا کوئی حدیث پڑھ کر سنائے حضرت ابراہیم نے نصیحت فرمائی کہ میرے بعد کوئی مجموعہ حدیث باقی نہ رکھنا اور واقعات میں ہے کہ آپ نے اپنی وفات سے پہلے اپنے نوشتوں کو منگایا اور انھیں سپرد آتش کر کے فرمایا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کوئی جماعت ان کو بیجا طور پر بیان نہ کرے ابراہیم نخعی کتابت حدیث کو ناپسند کرتے تھے کہ یہ مصاحف کے قائم مقام معلوم ہوتی ہے، حتیٰ کہ انھوں نے حماد بن سلیمان کو اطراف حدیث کی کتابت سے منع فرمایا، مگر بعد میں اپنی اس روش میں نرمی پیدا کر لی۔ چنانچہ ابن عون نے بیان کیا کہ میں نے حماد کو دیکھا کہ وہ ابراہیم کی بیان کردہ احادیث لکھ رہے ہیں اس پر ابراہیم نے کہا کہ تمھیں تو میں نے اس سے روک دیا تھا، اس پر حماد نے کہا کہ یہ مختصر نوٹ ہیں۔

امام عامر شعبی (۱۷-۱۰۳ھ) کی بات آج بھی کان میں گونج رہی ہے "میں نے کبھی کاپی قلم کا استعمال نہیں کیا" کسی سے حدیث سن کر دوبارہ بیان کرنے کی درخواست نہیں کی۔

تابعین نے کتابت کو اس وقت اور بھی ناپسند کیا جب کہ محدثین کی آراء بھی زبان زد عوام ہو گئیں۔ اس وقت یہ خطرہ ہوا کہ طالبین حدیث ان شخصی آراء کو کہیں ان حدیثوں کے ساتھ بیان نہ کردیں یا لکھ نہ دیں اور لوگ اسے اٹھائے اٹھائے پھریں، پھر تمیز باقی ہی نہ رہے۔

جن لوگوں نے کتابت کا انکار کیا اور ان کا اصرار بھی جاری رہا، ان کو اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں ان کی رائے بھی حدیث کے ساتھ مدون نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف

عش کی بات بڑی حد تک وزن دار ہے" تابعین ومحدثین کے عظیم جرگہ میں سے جن لوگوں سے حدیث کی کتابت پر اظہار ناگواری پایا جاتا ہے ان کے اس مخالفت کی تاویل کی جائے گی۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب فقیہ تھے، تابعین میں کوئی محدث ایسا نہ تھا جو فقیہ نہ ہو اور فقیہ حدیث اور رائے دونوں ہی سامنے رکھتا ہے، اس لیے اپنی رائے کے قید کتابت میں آنے کے بعد یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں یہ بھی حدیث رسول کا جزء نہ بن جائے ہم چند مثالیں آپ کے سامنے رکھتے ہیں جس سے بات واضح ہو جائے گی۔ چنانچہ ہمارے سامنے اہم واقعات ہیں جن کی بنا پر انھوں نے اپنی رائے کی کتابت ناپسند فرمائی، مثلاً زید بن ثابت نے مروان کے منشی کو لکھانے سے معذرت کی۔ اسی طرح سعید بن المسیب کے پاس ایک شخص آیا (سعید بن المسیب ان محدثین میں سے ہیں جو کتابت کو ناپسند کرتے تھے) اس نے آکر کچھ پوچھا۔ آپ نے املا کرایا۔ پھر اس نے ان کی رائے معلوم کرنا چاہی۔ آپ نے اپنی رائے ظاہر کی۔ اس نے اس کو بھی تحریر کرلیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے سعید سے کہا کہ ابو محمد اب تمھاری رائے بھی لکھی جانے لگی۔ سعید بن المسیب نے کتاب مانگی، جب اس نے دیا، آپ نے اسے پھاڑ دیا۔ عامر بن زید سے کہا گیا کہ لوگ آپ کی رائے لکھتے ہیں، تو اس پر انھوں نے کہا میں دوسری صبح کو اسے باقاعدہ دیکھ لیتا ہوں۔

ابھی جن روایات کا ہم نے ذکر کیا ہے یہ علمائے محدثین کی روایات ہیں جو مورخین کی زبانی ہم تک پہنچی ہیں۔ ان ساری روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے اقوال اور ان کے نوشتوں کی نقل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا مگر ان سے اس بات کا اندازہ نہیں لگتا کہ انھوں نے کتابت حدیث کو بھی ناپسند کیا بلکہ ان کی ناپسندیدگی صرف فقہاء ومحدثین کے اجتہادات وآراء کی کتابت سے متعلق تھی۔ اور جہاں بلا کسی تخصیص کے عمومی ممانعت ہے وہاں بھی مراد یہی اجتہاد وآراء ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اسی نقش قدم پر تھے جو صحابہ نے کتاب اللہ اور حدیث کے التباس کے خطرے سے کتابت حدیث کو ناپسند فرمایا تھا، یا اس توجہ کی جو قرآن سے ہٹ کر حدیث تک رہ جاتی کی اصلاح بھی مقصود تھی۔ تابعین نے صحابہ

ہی کی طرح التباس رائے وحدیث کے خطرے کے پیش نظر کتابت کی مخالفت کی تھی۔

ہماری اس رائے میں تابعین کے حالات سے جان آگئی ہے کہ وہ کتابت کی پوری ہمت افزائی فرماتے تھے، اور طالبین حدیث کو اپنی روایات تحریر کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی، اور کتابت کا عروج اس وقت بڑی تیزی سے ہوا جب طالبین علم نے کتابت رائے اور کتابت حدیث مع الرائے میں فرق کو جان لیا۔ ہم تو تابعین کو حلقۂ درس صحابہ میں کتابت کا خوگر دیکھتے ہیں، بلکہ بعض تابعین تو کتابت کے شیفتہ تھے۔ سعید بن جبیر (۹۵ھ) ہی کو دیکھئے جو ابن عباس سے سنی حدیثیں لکھتے تھے۔ جب صفحہ بھر جاتا، کاغذ نہ ہوتا تو جوتے کے اندرونی تلے پر لکھ لیتے۔ ان کی روایت ہے "میں ابن عمر و ابن عباس کے ساتھ چل رہا تھا، میں ان دونوں سے حدیثیں سنتا اور کجاوہ کی کاٹھی پر لکھ لیتا، جب میں اس سے اترتا پھر اسے بیاض میں منتقل کر لیتا۔ سعید بن المسیب (۔۹۴ھ) نے عبدالرحمان بن حرملہ کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ لکھ لیا کریں، اس لیے کہ انھوں نے اپنے حافظہ کے کمزور ہونے کی شکایت کی تھی۔ عامر شعبی ہی کو دیکھئے کہ وہ ماکتبت سوداء فی بیضاء میں نے کبھی کسی کاپی میں کچھ نہیں لکھا اور بار بار اسے نقل کرتے رہتے کتابت علم کو پابند کرتا ہے" اس کے باوجود ترغیب فرماتے اور کتابت پر لوگوں کو ابھارتے، فرمایا کرتے "کہ مجھ سے سنی ہوئی بات لکھ لیا کرو خواہ دیوار ہی پر کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد کتاب الفرائض اور کتاب الجراحات کے سوا کوئی چیز نوشتہ میں نہیں ملی، ان کی مکتوب کتابیں بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ وہی ان کا بے پناہ حافظہ تھا کہ کبھی ایک بار سنی ہوئی بات دہرانی نہ پڑی، اس لیے کہ وہ کتابت سے زیادہ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے اور یہ چیز کچھ فرض نہیں کہ آپ اعتراض کریں، یہ آپ کے املا کرانے اور کتابت پر ابھارنے کے منافی نہیں ہے۔ ضحاک بن مزاحم (۱۰۵ھ) کو آپ نے اذا سمعت شیئا فاکتبہ ولوفی حائط (جب تم کوئی چیز سنو تو اسے لکھ لو اگرچہ دیوار ہی پر کیوں نہ ہو) کا املا کرایا تھا، مزید برآں آپ نے حسین بن عقیل کو مناسک حج کا املا کرایا تھا۔

تصنیف کتب مروج ہو چکی تھی، جیسا کہ حسن بصری (م ۱۱۰) کہتے ہیں کہ ہمارے پاس

کتابیں تھیں جن کو ہم برتتے تھے، اور عمر بن عبدالعزیز (۶۱-۱۰۱ھ) کتابت حدیث کرتے۔ ابوقلابہ کی روایت میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیز ظہر کی نماز کے لیے آئے آپ کے پاس کاپی تھی، پھر عصر ادا کرنے کے لیے آئے تب بھی بیاض ساتھ تھی۔ میں نے ان سے کہا امیرالمومنین یہ کون سا دفتر آپ کے ساتھ ہے؟ فرمایا کہ حدیث ہے جسے عون بن عبداللہ نے مجھ سے بیان کیا، مجھے بھلی لگی میں نے انھیں نقل کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے آخری دنوں میں کتابت حدیث عام ہو چکی تھی، ہر حلقہ کے لوگ اس کو لکھنے لگے تھے اور کوئی برا نہ مانتا تھا۔ پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے آغاز میں تو اس کا بڑا چرچا ہو گیا تھا۔ بہت سی کتابیں، رسالے، نوشتے دیکھنے میں آ رہے تھے اور کتابت کے سلسلے میں اتنی چھوٹ بڑھ گئی تھی کہ مجاہد بن جبیر (۱۰۳ھ) نے اپنے اصحاب کو اس کی اجازت دے رکھی تھی، وہ ان کے بالا خانہ پر جا کر ان کی کتابیں نکالتے اور اسی سے نقل کر لیتے۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے عامل کو رجاء بن حیوۃ (م ۱۱۲ھ) کے پاس بھیجا کہ وہ حدیث لکھا دیں۔ رجاء نے کہا کہ میں اس کو لکھنا بھول گیا تھا، کاش وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوتی۔

عطاء بن ابی رباح (م ۱۱۴ھ) اپنے لیے لکھا کرتے، کبھی اپنے لڑکے کو لکھنے کے لیے ہدایت فرماتے۔ ان کے تلامذہ ان کے سامنے لکھتے ہوتے، وہ اپنے شاگردوں کی ہمت افزائی بھی کرتے کہ علم سیکھو اور کتابت کا فن جانو۔ چنانچہ ابوحکیم ہمدانی کہتے ہیں کہ "میں عطاء بن ابی رباح کے پاس آتا اور کئی دوسرے لڑکے بھی آتے، ہم لوگ ابھی نوخیز لڑکے تھے، آپ نے ہم سے کہا لڑکو آؤ اور لکھو، جو تم میں کا عمدہ نہ لکھ سکے گا ہم اس کو خود لکھ دیں گے، اور جس کے پاس کاغذ نہ ہوتا ہم اسے اپنے پاس سے کاغذ دیتے۔"

علم پوری طرح پروان چڑھ رہا تھا، اس کے ساتھ کتابت کا بھی فروغ ہو رہا تھا، اور علماء کی دونوں ہی مشغولیتیں پوری طرح ترقی پذیر تھیں۔ ولید بن ابو سائب کی روایت سے اس کا اندازہ لگایئے کہ میں نے مکحول نافع، عطاء بن ابی رباح کو دیکھا کہ ان کے سامنے احادیث پڑھی جاتیں۔ عبیداللہ بن ابو رافع سے مروی ہے کہ میں نے دیکھا کہ

کوئی اعرج کو حدیث پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اعرج جو عبدالرحمان بن ہرمز (م ۱۱۷ھ) ہیں وہ ابو ہریرہ کے واسطہ سے رسول اللہ کی حدیث بیان کرتے پھر کہتے کہ ابوداؤد یہ تمھاری حدیث ہے، انھوں نے جواب دیا ہاں۔ اور انہیں نافع مولیٰ ابن عمر (۱۱۷ھ) کو دیکھو اپنے شاگردوں کو حدیث کا املا کراتے اور تلامذہ سامنے بیٹھے لکھتے ہوتے۔ اور قتادہ بن دعامۃ سدوسی (۱۱۸ھ) سے جب کبھی کتابت حدیث کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ تابعین کے پورے گروہ کا پورا نقشہ ہی کھینچ دیتے، کہ کس طرح علم ان میں پھیلا، اشاعت پذیر ہوا کہ ہر طالب کی زندگی کتابت بن گئی، اور یہ فرماتے کہ کتابت سے کیا مانع ہے کہ لکھتے نہیں، خود باری تعالیٰ نے اس کی گنجائش کی ہے کہ لکھا جائے، چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا:

"قال علمها عند ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسی"

"اس کا علم میرے رب کے پاس ریکارڈ بک میں ہے جو نہ کھوئی جا سکتی ہے نہ بھلائی جا سکتی"

صحائف مدونہ کی تعداد ان گنت تھی کہ خالد کلاعی (م ۱۰۴ھ) کو کہنا پڑا کہ میں نے علم کو ایسے صحیفہ کی شکل دے دی ہے جس میں گھنڈیاں ہیں اور وہ مکشوف و مضبوط ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ اور خدمت حدیث

عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک علمی فضا میں آنکھ کھولی، پھر وہ امیر المومنین ہو کر بھی علماء سے دور نہیں رہے بلکہ خود احادیث کی کتابت کرتے اور علماء کی ہمت افزائی فرماتے۔ ان کے سامنے حفاظت حدیث رسول اکرمؐ کا مسئلہ تھا، اسے پوری طرح اکٹھا کرنے کی بات تھی۔ ادھر تابعین میں بھی اس کی امنگ موجود تھی اور انھوں نے کتابت کو موانع کے زوال کے بعد جائز قرار دے دیا تھا۔ اس نے بھی عمر بن عبدالعزیز کو اس طرف متوجہ کیا، اس لیے کہ ہم اس کو ایک حقیقت جانتے ہیں کہ احادیث نبوی کو جمع کرنا اور اس کی تدوین کی راہ پر لگانا اگر علماء کو ناپسند ہوتا تو وہ ہرگز عمر بن عبدالعزیز کی اس درخواست پر تو لبیک نہ کہتے اور سچی بات تو یہ

ہے کہ عشق رسول نے آپ کو ضیاع حدیث پر تنبہ کیا اور آپ نے جمع حدیث کا بیڑا اٹھایا اور اس کی حفاظت کی ممکن صورتیں پیدا کی۔

اور ایک بڑا سبب اور بھی ہوا جس کی بنا پر علماء نے احادیث کو جانچنا اور محفوظ کر دینا ضروری سمجھا، اس لیے کہ پہلی صدی کی ساتویں دہائی سے مذہبی اختلافات اور سیاسی گٹ بندیوں نے وضع احادیث کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کی تائید ابن شہاب زہری کے بھائی کی روایت سے ہوتی ہے کہ ''اگر ہمارے پاس روایت حدیث کا ابتدائی ذریعہ نہ ہوتا تو ہم اس سے انکار کرتے اور ان کو نہ جاننے کی بات دہراتے اور ایک حدیث بھی اپنی ڈائری میں نہ لکھتے نہ اس کی کسی کو اجازت دیتے''۔ اور زہری کی اس رائے سے اس زمانے کے اکثر علماء متفق تھے، اس لیے کہ جس طرح وہ احادیث رسول پاک سے عشق رکھتے تھے انھیں اس کا بھی عشق تھا کہ اسے جھوٹ اور وضع کی گندگی سے بھی پاک رکھیں۔ یہ دو عوامل ان بہت سے عوامل میں سے سب سے زیادہ اہم تھے جن کی بنیاد پر علماء نے حفاظت حدیث کا بیڑا اٹھایا۔ مزید براں حکومت اسلامی نے بھی اس کی باقاعدگی سے جمع و حفاظت کے لیے آرڈر جاری کیا۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک اہم اور تیز رفتار قدم اٹھا کر تمام ممالک کو احکام حفظ حدیث رسول جاری کیے، مختلف ممالک کے گورنروں کو فرمان بھیجا:

''أنظروا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجمعوه''

''رسول خداؐ کی احادیث کا جائزہ لے کر انھیں جمع کرو''

چنانچہ اہلِ مدینہ کو خصوصیت سے یہ حکم روانہ فرمایا:

"أنظروا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبوه فاني خفت دروس العلم و ذهاب أهله"

''رسول خدا کی احادیث کا جائزہ لے کر انھیں جمع کرو، اس لیے کہ علم کے مٹ جانے اور اہل علم کے فنا ہونے کا خطرہ بڑھتا ہی جا رہا ہے''

پھر اسی پر بس نہیں کیا، آپ نے عامل مدینہ ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم (۱۱۷ھ) کو یہ

فرمان الگ سے روانہ کیا:

"أكتب الى بما ثبت عندك من الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم و بحديث عمرة فانى خشيت دروس العلم و ذهابه"

جو احادیث رسول تم کو مل چکی ہیں ان کی کاپی مجھے روانہ کرو اور عمرہ بنت عبدالرحمان کی حدیثیں بھی لکھو، مجھے علم کے کم ہو جانے اور علماء کے ختم ہونے کا خطرہ کھائے جا رہا ہے"

ایک دوسری روایت میں عمرہ بنت عبدالرحمان (۹۸ھ) اور قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) کی احادیث کو لکھ بھیجنے کا حکم فرمایا تھا، وہ لکھ کر آپ کو بھیج دی گئیں، ایک اور آرڈر میں لکھا:

"فانى خفت دروس العلم و ذهاب العلماء ولاتقبل الا حديث النبى صلى الله عليه وسلم وليُفشوا العلم، وليجلسوا حتى يعلم من لايعلم فان العلم لا يهلك حتى يكون سراً"

"سوائے حدیث رسول کے دوسری بات نہ قبول کرنا علم کی اشاعت کرو، اس کے لیے مجلس جماؤ تا کہ ناواقف بھی واقف ہو جائے اس لیے کہ علم جب راز بنا دیا جائے تو ختم ہو جاتا ہے"

اسی طرح آپ نے امام زہری (۱۲۴ھ) کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے ممالک محروسہ اسلامیہ میں ذمہ داروں کو خطوط روانہ کیے اور ان کو اشاعت علم کے لیے خواہ وہ کتابت کے ذریعہ، خواہ تدریس کے ذریعہ، احیاء سنت کے اس مبارک کام کی طرف توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں عکرمہ بن عمار کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو یہ کہتے سنا:

"أما بعد فأمروا أهل العلم أن ينتشروا فى مساجدهم فان السنة كانت قد أميتت"

"سن لو، اہل علم کو حکم کرو کہ وہ اپنی مسجدوں میں علم پھیلائیں، اس لیے کہ میں سنت کو مردہ ہوتے دیکھ رہا ہوں"

ایک دوسرا حکم بھی جاری فرمایا:

"انه لارأى لأحد فى كتاب و انما رأى الأئمة فيما لم ينزل فيه

کتاب ولم تمض به سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا رأى لأحد في سنة سنها رسول الله صلى الله عليه وسلم"

"قرآن کے ہوتے ہوئے کسی کی رائے کچھ نہیں، ائمہ کی رائے بس وہیں تک ہے جس میں قرآن خاموش ہو اور سنت رسول سے بھی کوئی بات نہ معلوم ہو، رسول خدا کی کسی سنت کے ہوتے کسی کی رائے کوئی وزن نہیں رکھتی"

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے علماء کے ساتھ جمع شدہ احادیث کے سلسلے میں علمی گفتگو فرمائی۔ اس کی تائید ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان القرشی کے اس قول سے ہوتی ہے:

"رأيت عمر بن عبدالعزيز جمع الفقهاء فجمعوا له أشياء من السنن فاذا جاء الشئى الذى ليس العمل عليه قال: هذه زيادة، ليس العمل عليها"

"میں نے دیکھا کہ عمر بن عبدالعزیز نے فقہاء کی مجلس بلائی: اس مجلس میں لوگوں نے مختلف احادیث پیش کیں، جب کوئی ایسی چیز سامنے آتی جس پر عمل نہ ہوتا، آپ فرماتے کہ یہ اضافہ ہے اس پر عمل نہیں"

عمر بن عبدالعزیز نے باوجود مدت خلافت کے مختصر ہونے کے حفاظت سنت میں پوری جد وجہد کی۔ نانچہ ابو بکر بن حزم کو جمع حدیث کے کام پر لگایا۔ ابو بکر اپنے زمانے کے مشہور ترین محدثین میں سے تھے۔ چنانچہ امام مالک کی شہادت موجود ہے "میں نے ابو بکر بن حزم سے زیادہ بامروت اور خوش اوقات کسی کو نہیں پایا۔" مدینہ کی گورنری، قضا اور موسم حج میں نگراں مقرر ہوئے۔ اور آپ نے ہی ایک دوسرے موقع پر فرمایا "میرے نزدیک مدینہ میں کوئی قضا میں اتنا ماہر نہ تھا جتنے ابو بکر بن حزم تھے۔ آپ سے ہی عمرہ بنت عبدالرحمان کی حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے درخواست کی گئی تھی۔ عمرہ بنت عبدالرحمان آپ کی خالہ تھیں جن کی تربیت آغوش ام المومنین عائشہ میں ہوئی تھی، اور آپ حدیث عائشہ میں سب سے اہم اتھارٹی ہیں۔

قاسم بن محمد بن ابوبکر (۳۷۔۱۰۷ھ) جن کا بعض روایات میں ذکر آتا ہے مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ایک تھے، اپنے زمانے کے بڑے پائے کے عالم تھے۔ آپ نے علم حدیث حضرت عائشہ اپنی پھوپھی سے حاصل کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ ام المومنین کے علم و فضل و حدیث پر عبور کے بارے میں کیا کہنا، آپ کی تعریف آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

ابن شہاب زہری جمع حدیث و کتابت حدیث میں پیش پیش تھے، اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ آپ نے احادیث لکھیں اور صحابہ کی مرویات جو آپ کو اپنی جستجوئے علم حدیث کے وقت معلوم ہوئیں اُن کو بھی آپ نے اکٹھا کیا۔ آپ ایک بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔ اس سلسلے میں ابو الزناد عبدالرحمان بن ذکوان قرشی کی شہادت کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم حلال و حرام ہی لکھ رہے تھے اور ابن شہاب جو بات سن لیتے لکھ لیتے۔ جب اس کی ضرورت سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ سب سے زیادہ عالم حدیث تھے۔

پانچویں خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کا وصال اس وقت ہوا کہ ان کی نگاہ سے وہ کتابیں جو ابوبکر بن حزم نے جمع کی تھیں نہیں گزر سکیں، جیسا کہ بعض علماء کی روایت ہے اس سے ابن شہاب زہری کی مساعی حدیث کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ خود زہری کہتے ہیں کہ ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے سنت جمع کرنے کے لیے ہدایت کی تھی، ہم نے اس کی پوٹ لی پوٹ لکھا، ان میں سے ایک دفتر ہر اس علاقے میں بھیجا گیا جو خلیفہ کے زیر سلطنت تھا۔ اس چیز کو سامنے رکھ کر علماء مورخین نے کہا: أول من دون العلم ابن شهاب (ابن شہاب نے سب سے پہلے علم حدیث مدون کی) اور ان کو حق پہنچتا تھا کہ وہ فخریہ انداز میں بیان کریں: لم يدون هذا العلم أحدٌ قبل تدويني (مجھ سے پہلے کسی نے اس علم حدیث کی تدوین نہیں کی)۔

علمائے حدیث نے تدوین حدیث کا سہرا عمر بن عبدالعزیز کے سر باندھا کہ سب سے پہلے انھوں نے تدوین حدیث کی، اور اپنی کتابوں میں یہ عبارت بار بار لائے کہ ابتداء تدوین حدیث پہلی صدی کے اختتام پر خلافت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں عمل میں آئی، یا اسی قسم کی کوئی اور عبارت۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسمی طور پر عہد عمر بن عبدالعزیز میں تدوین کا کام ہو چکا تھا، لیکن حدیث کی حفاظت اور صحیفوں میں تحریر کرنا اور کاغذ کے پرزوں ہڈیوں کے ٹکڑے پر اس سے بہت پہلے صحابہ خود عہد نبوی میں انجام دے چکے تھے۔ اور حدیث کی کتابت حضورؐ کی وفات کے بعد بھی جاری رہی، بلکہ قرآن کی حفاظت کے پہلو بہ پہلو اس کی حفاظت کا بھی اہتمام رہا۔ مگر بڑی بڑی کتابیں مدون کرنا آنے والوں کا مقدر تھا۔

آگے آپ کو معلوم ہوگا کہ عمر بن عبدالعزیز کے والد نے اپنے صاحب زادے سے پہلے تدوین حدیث کی فہمائش کی تھی اور جو شائقین حدیث تھے وہ پہلی صدی کے پورے عرصے میں تدوین حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی رکے نہیں۔ انھیں اس کا انتظار نہ تھا کہ خلیفہ انھیں اجازت دیں تو یہ کام انجام دیں۔ ہم اس سے پہلے اس کا بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ اور تابعین نے خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اس کی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ خود لکھ لیں یا ان کے لیے لکھ کر لائیں۔

اس طرح پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے آغاز میں کتابت کی کراہت و اباحت کا مسئلہ سرے سے ختم ہو گیا، اور احادیث صحیفوں، کاپیوں اور رجسٹروں میں لکھی گئیں اور طالبین حدیث کے ہاتھ میں حدیث کے دفتر ہر جگہ نظر آنے لگے۔

ممکن ہے کوئی صاحب علم کہے کہ کتابت کی ناپسندیدگی کے دن بیت گئے تھے اور اس کے جواز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے، یہ اباحت صرف رائے نہیں رہ گئی تھی بلکہ رائے عمل کی راہ اختیار کر چکی تھی، اور حکومت کی کتابت حدیث پر نگرانی جاری تھی اب کوئی ایسا نہ تھا جو کتابت کے خلاف اپنی آواز نئے سرے سے اٹھاتا، مگر کچھ لوگ تبع تابعین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور صغار تابعین میں شمار ہوتے تھے ان کو اس بات کا کھٹکا لگ گیا تھا کہ وہ احادیث کو دفتر اور کاپی میں دیکھیں، علماء اور طالبین حدیث صرف کتابوں پر اعتماد کر لیں اور حفظ کو کار عبث تسلیم کر لیں، اس لیے وہ لوگ ان آثار پر سختی سے عمل پیرا رہے جو کتابت حدیث کے منافی ہیں۔ اور اس سے ان کو چڑھ ہوتی کہ اہل علم دفاتر کی طرف رخ کریں اور اس کو اپنا سرمایۂ علم سمجھیں۔ ان کو صحابہ کی

روش حفظ واعتماد نہایت درجہ پسند تھی۔ ان کو کتابوں پر بھروسہ کرنے کو پسند نہ کرنے کا حق تھا، اس لیے کہ نوشتوں پر اعتماد سے یادداشت کمزور ہوجاتی ہے اور آدمی میں قوت عمل گھٹ جاتی ہے۔

ضحاک مزاحم جنھوں نے ابتداء کتابت کو پسند کیا تھا، اور مناسک حج کا املا کرایا تھا، جب اسباب کراہت کا خاتمہ ہوگیا تھا وہ اپنے خیال کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"يأتي على الناس زمان يعلق فيه المصحف حتىٰ يعشعش عليه العنكبوت لاينتفع بما فيه وتكون أعمال الناس بالروايات والأحاديث" (جامع بیان العلم ج ۲ صفحہ ۱۲۶)

"وہ دن بھی آئے گا کہ قرآن کھونٹی سے لگا ہوگا جن پر مکڑیوں نے جالے تنے ہوں گے، کوئی انھیں ہاتھ لگانے والا نہ ہوگا، اور روایات اور احادیث پر ہی اعمال کا دارومدار ہوگا"

انھوں نے کتابت حدیث اور اسے کاپیوں میں قلم بند کرنے کی طرف لوگوں کی توجہات کا نتیجہ اور آخر کار کا اندازہ لگایا۔ چنانچہ کھلے الفاظ میں اس کا انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ لاتتخذوا للحديث كراريس ككراريس المصاحف (مصاحف سماوی کی طرح احادیث کے لیے بیاض ودفاتر کا استعمال نہ کیا جائے)۔

زہری کے اس قول كنا نكره كتاب العلم حتى أكرهنا عليه هولاء الأمراء فرأينا ألا نمنعه أحداً من المسلمين (تقیید العلم صفحہ ۱۰۷) (کہ ہم کتابت کو ناپسند کرتے رہے تا آنکہ ان ارباب حکومت نے ہمیں مجبور کردیا، پھر اس کے بعد ہم نے کسی مسلمان کو کتابت سے نہیں روکا) اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ کتابت کے عموم سے لوگوں کی قوت حافظہ ختم ہوجائے گی اور مکتوبات کا وزن کم ہوجائے گا۔ اس لیے کہ زہری ان لوگوں میں ہیں جو کتابت کو پسند کرتے تھے، حالانکہ ابھی وہ طلب علم میں لگے ہوئے تھے اپنے احباب کو کتابت پر ابھارتے، اور یہاں تک کتابت کے شائق تھے کہ جوتے کے تلوں میں لکھ لیتے کہ کہیں حدیث ضائع نہ ہوجائے۔ جب ان کو خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے طلب کیا کہ وہ ان کے صاحبزادے کے لیے حدیث کا املا کرادیں تو آپ نے اس کی تعمیل کی، اور سبھی لوگوں کو اس کا املا کرایا اور یہ فرمایا کہ

سلاطین نے مجھ سے کتابت حدیث کرانے کی خواہش ظاہر کی، میں نے ان کو لکھ کر دے دیا، یہ چیز مجھے بے شرمی کی معلوم ہوئی کے سلاطین کو تو لکھا دوں مگر عوام کو محروم رکھوں۔

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے کہ وہ احادیث کی تنقیح (چھان بین) میں ایسے حریص تھے کہ یہی رغبت بعد میں تدوین حدیث کا باعث بنی، خود ان کے لیے اور ان کے معاصرین کے لیے۔ سعید بن عبدالعزیز کو اپنے حافظہ پر ناز تھا وہ کہتے کہ میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی۔ دوسری طرف امام اوزاعی اپنے شاگردوں کو املا کراتے، پھر ان کے لکھے ہوئے کی تصحیح کرتے، تاکہ انھیں ان روایت کی اجازت دے سکیں۔ صرف کتابت پر بھروسہ نہ کرتے اور اسے برا جانتے کہ کہیں یہ چیز حافظہ کی تباہی کا باعث نہ بن جائے۔ ان کو اسلاف کا وہ طریقہ جس میں وہ لوگ احادیث کو لوگوں کی زبان سے سن کر یاد کرتے اور یہ کہا کرتے کہ یہ علم بڑے پایہ کا تھا جب تک کہ زبان سے سنا جاتا رہا اور اس کو یاد کرنے کی سعی کی جاتی رہی، ہاں کتابوں میں آنے کے بعد سے اس کا نور مدھم پڑ گیا اور جو اہل نہ تھے وہ بھی اس کے رسیا ہو گئے۔

ایسا بھی ہوتا کہ جو کتابت کو ناپسند کرتا اور حافظہ پر اعتماد کرتا وہ احادیث کو یاد کرنے کے بعد مکتوب حصوں کو مٹا دیتا۔ یہ کچھ ایک دو کا واقعہ نہیں ہے بلکہ سلف صالحین میں بہتوں نے اس طریقہ پر عمل کیا، مثلاً سفیان ثوری (۱۶۱ھ) حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) وغیرہ۔ خالد حذاء (۱۴۱ھ) نے بیان کیا کہ میں نے کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی، ہاں اگر حدیث طویل ہوتی تو لکھا، یاد کیا، مٹا دیا۔

بہت سے تابعین نے بھی اس پر عمل کیا کہ موت سے پہلے اپنے لکھے ہوئے کو مٹا دیا، یا کسی اہل کو وصیت کر جاتے کہ انھیں یہ دے دی جائے تاکہ وہ اس سے نفع اندوز ہو سکے اور یہ کہ کوئی بیجا طور سے اس کو استعمال نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ابو قلابہ نے اپنی کتابوں کو ایوب کو دینے کی وصیت کی تھی، شعبہ بن الحجاج نے اپنے بیٹے کو اپنی لکھی کتابوں کو دھو کر مٹا دینے کی ہدایت کی تھی۔

کتابت سے روکنے والوں کا برتاؤ کتابت کی ترقیات میں مانع نہ ہو سکا، اس لیے کہ کتابت کے جواز کی امنگ کتابت ناپسند کرنے والوں کی امنگ سے زیادہ تھی۔

ایوب سختیانی جو لوگ کتابت کو ناپسند کرتے ان کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے اور فرماتے کہ

ہماری کتابت کو ناپسند کرنے والے خدا کی کتابت میں یہ آیت بھی تلاوت کرتے ہیں:

"علمها عند ربي في كتاب" (اس کا علم ہمارے پروردگار کے پاس مکتوب صورت میں ہے)

چند عرصہ نہ گزرا تھا کہ دونوں رخ (کتابت، منع کتابت) ایک ہو گئے اور کتابت کی ضرورت نے اپنی حقیقت ثابت کر دیا کہ تمھارا جوش ِ جرح کتابت نا قابل عمل ہے اور اب حافظہ اور کتابت دونوں پر اعتماد یکساں ہو گیا۔

اس سلسلے میں ابن صلاح کہتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد یہ اختلاف بھی ختم ہو گیا اور مسلمانوں کے اجماع نے اس تبدیلی کو بڑی خوش گواری سے قبول کر لیا اور سبھی نے اس کو جائز قرار دیا۔ اگر حدیث کی کتابیں مکتوب نہ ہوتیں تو انجام کار اس کا آگے خاتمہ ہی ہو جاتا۔

رامہر مزی نے بھی لکھا ہے کہ حدیث کتابت، مقابلہ تدریس، ذمہ داری کا احساس، ذاکرہ کی خوبی، دریافت ناقلین، حدیث کی جستجو اور مرویات کو بنظر تفقہ معلوم کرنا دیکھنا ان سب کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔ کتابت کو صدر اول میں ناپسند کیا گیا دور نبوت اور اسناد کی قربت کی بنا پر اور یہ بھی خیال تھا کہ کہیں سب کچھ کتابت ہی کو سمجھ کر دوسرے انداز کو برا نہ سمجھیں اور اس کی یادداشت سے بے رغبت نہ ہو جائیں، پھر عمل سے بھی جی چرانے لگیں۔ مگر اب عہد نبوت کے اسناد کے عدم قربت اور طرق روایت کے اختلاف اور نقل کرنے والوں میں تشابہ کی کثرت، یادداشت کا ضعف، وہم کا چلن بازار، ایسے میں کتابت سے علم کی حفاظت نہایت ضروری اور بڑی حیثیت کی چیز ہے، لوگوں کو اس سے نفع بھی زیادہ متوقع ہے۔

اس ظاہری اختلاف سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ علماء میں دو گروہ ہو گئے، یا دو مکتب فکر بن گیا تھا، بلکہ یہ دونوں انداز ان اسباب کی بنا پر پیدا ہوئے تھے جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ جب تک اسباب منع رہے علماء نے کتابت سے روکا، جونہی یہ اسباب ختم ہو گئے پھر انہی علماء نے اس کو جائز قرار دیا۔ اور جب صرف کتابت ہی پر بھروسہ ہونے لگا اور یادداشت کا کوئی مقام نہیں رہا تو پھر لوگوں نے کتابت پر روک کا آوازہ اٹھایا۔ مگر اب امت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ کتابت واجبات دین میں سے ہے، بغیر اس کے حفاظت حدیث ممکن نہیں۔

حدیث کے اولین مصنفین

علمی جوش وخروش اسی انداز پر باقی رہا، اور حدیث کی کتابت میں بھی روز افزوں ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ پوری دنیا نے دوسری صدی کے نصف میں حدیث کے مدونات مخطوطات و مکتوبات کی اشاعت ہر طرف دیکھی، اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ مصنفات ونوشتے عام ہو گئے، اور سلطنت اسلامی کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ پھر محدثین نے جو احادیث مختلفہ کو صحیفوں، بیاضوں میں جمع کرتے تھے اب ان حدیثوں کو ابواب کے ماتحت جمع کرنے لگے۔ یہ مجموع سنن ہوتے یا اس کے متعلقات ہوتے، بعض ان میں سے مصنف بعض جامع یا مجموعہ کے نام سے پکارے جاتے۔ سب سے پہلے جس نے حدیث کی تصنیف کی وہ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج بصری (م ۱۵۰ھ) تھے، انہوں نے مکہ میں اور مالک بن انس (۹۳۔۱۷۹ھ) محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) نے مدینہ میں اور یہیں محمد بن عبدالرحمان بن ابی ذئب (۸۰۔۱۵۸ھ) نے امام مالک کی موطا سے کہیں ضخیم موطا تصنیف کی۔ ربیع بن صبیح (۱۶۰ھ) سعید بن ابی عروبہ (۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) نے بصرہ میں تصنیف کا کام کیا، اور سفیان ثوری (۱۶۱ھ) نے کوفہ میں اور معمر بن راشد (۹۵۔۱۵۳ھ) نے یمن میں، امام عبدالرحمان بن عمرو اوزاعی (۸۸۔۱۵۷ھ) نے شام میں، عبداللہ بن مبارک (۱۱۸۔۱۸۱ھ) نے خراسان، ہشیم بن بشیر (۱۰۴۔۱۸۳ھ) نے واسط میں، جریر بن عبدالحمید (۱۱۰۔۱۸۸ھ) نے رے میں اور عبداللہ بن وہب (۱۲۵۔۱۹۷ھ) نے مصر میں تصنیف وترتیب وتدوین حدیث کا کام کیا۔ پھر ان کے بعد تو ایک دنیا ہی تھی جو اپنے معاصرین کے انداز میں تدوین کا کار بلند انجام دیتی رہی۔ ان سب کی تصنیف ابواب کی بنیاد پر ایک مؤلف یا جامع میں ہوتی تھی، یا حدیث کو صرف ایک ہی باب میں جمع کر دینے کا رواج تھا۔ عامر شعبی (۱۹۔۱۰۳) اس طریقہ کے پیش رو تھے۔ ان کی تبویب کا انداز یوں تھا "ھذا باب من الطلاق اذا اعتدت المرأة ورثت" (یہ باب طلاق ہے، ایام عدت میں عورت وارث ہوگی) پھر اس کے بعد حدیثیں پیش کرتے۔

ان مصنفات اور مجامیع میں احادیث نبوی کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے فتاوی بھی

موجود ہوتے، جس کی بولتی تصویر امام مالک کی موطا ہے۔ پھر اس کے بعد لوگوں نے احادیث نبوی کو فتاویٰ سے الگ بیان کرنا شروع کیا، اور صرف احادیث نبوی پر مشتمل مجموعے تصنیف ہونے لگے، چنانچہ مسانید کا رواج اسی بنیاد پر پیدا ہوا۔ مسانید احادیث کے وہ مجموعے ہیں جن میں سندوں کے ساتھ حضورؐ کی احادیث ہوتی اور صحابہ و تابعین کے فتویٰ سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ اس میں ایک صحابی کی جملہ مرویات بیان کی جاتی اگر چہ وہ مختلف مواضع میں پہلے سے ہی ہوں، اسی وجہ سے مسند فلاں مسند فلاں کے نام سے پکاری جاتی۔

سب سے پہلے جس نے مسند تحریر کی وہ ابوداؤد سلیمان بن جارود الطیالسی (۱۳۳-۲۰۴) ہیں، آپ کے ہی انداز پر آپ کے معاصر، تابعین اور تبع تابعین نے بھی مسانید تحریر کیں، چنانچہ اسد بن موسیٰ اموی (۲۱۲)، عبیداللہ بن موسیٰ العبسی (۲۱۳)، مسدد بصری (۲۲۸) اور نعیم بن حماد خزاعی مصری (۲۲۸) نے مسانید تحریر کیں، اور پھر ائمہ نے ان آثار کی پیروی کی جیسے احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ)، اسحاق بن راہویہ (۱۶۱-۲۳۸) اور عثمان بن ابی شیبہ (۱۵۶-۲۳۹) وغیرہ۔

مسند امام احمد بن حنبل کو ان مسانید کے سلسلے میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوا، حالانکہ آپ تبع تابعین میں سے ہیں۔ آپ کی مسند تمام مسانید سے زیادہ وسیع اور قبول عام کی حامل رہی۔

حدیثوں کے ان دفاتر کی تدوین سندوں کے ساتھ کی گئی، اور موضوع احادیث سے ان مجموعوں کو پاک رکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا اور حدیث کی روایت کے بہت سے طریق بیان کیے گئے، اس کے لیے ماہرین علم حدیث اور ناقدین کی خدمات حاصل کی گئیں کہ صحیح وضعیف، قوی و معلول احادیث کو الگ الگ کر دکھائیں تاکہ تمام طالبین حدیث کے لیے جن کو اس تفصیلی مطالعہ کا موقع نہ ہو آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اس لیے بعض مصنفین نے صرف احادیث صحیحہ کو مدون کر کے ابواب کے ساتھ تحریر کیا۔ اسی زمانہ میں صحاح ستہ منظر عام پر آئی۔ اس صحاح ستہ میں امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴-۲۵۶)، امام مسلم بن حجاج قشیری (۲۰۴-۲۶۱)، ابوداؤد سلیمان بن الاشعث سجستانی (۲۰۲-۲۷۵) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی (م ۲۶۷ھ)، اور احمد بن شعیب خراسانی نسائی

(۲۱۵-۳۰۳)، پھر ابن ماجہ نے جنھیں عبداللہ بن محمد بن یزید بن عبداللہ بن ماجہ قزوینی کہتے ہیں (۲۰۷-۲۷۳) اور ان مصنفین کے بعد آنے والے علماء نے ان کتابوں کی شرح و تہذیب کی، مختصر کیا اور ان کے استخراج کو نمایاں کیا۔

چند قابل ذکر باتیں

(۱) عہد نبوی میں سنت کو باقاعدہ کتابت کی قید میں نہ لانے کا سبب کچھ مسلمانوں کا کتابت وقرأت سے ناواقف ہونا نہ تھا، ان میں کاتب بھی تھے، قاری بھی تھے، جنہوں نے قرآن کریم کی تدوین کی تھی، بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہی تھا، جس میں سب سے اہم قرآن و احادیث کے گڈمڈ ہونے کا خطرہ اور کہیں کتابت حدیث کی وجہ سے مسلمانوں کی توجہ قرآن کی حفاظت وتعلیم سے ہٹ کر دوسرے رخ پر نہ لگ جائے۔

(۲) اس لیے حضور کی ممانعت کتابت اور اباحت کتابت والی حدیثوں میں کوئی خاص تعارض نہیں ہے۔ کتابت کی ممانعت اس کو تھی جو عمدہ تحریر نہ جانتا ہو اور اس کا حافظہ قوی ہو۔ اور جو حفظ پر قادر نہ تھا اسے کتابت کی اجازت تھی۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ ممانعت کتابت اول اسلام میں محض قرآن کے حدیث کے ساتھ التباس کے خوف کی بنیاد پر تھی، پھر حضورؐ نے کتابت حدیث کی مطلقاً چھوٹ عطا فرمائی، اس کا خصومت اور اختلاف مذاہب سے کوئی تعلق نہیں۔

(۳) صحابہ اور تابعین، تبع تابعین نے کتابت کی ممانعت اور جواز کتابت کے سلسلے میں جو باتیں تحریر کیں یہ دو محارب جماعتوں کے قیام کا نتیجہ نہ تھیں کہ ایک اباحت کی دوسری کراہت کی قائل تھی، بلکہ دونوں ہی نے اسباب منع کتابت ختم ہونے کے بعد اباحت کتابت کی نمائندگی کی، اور جس زمانے میں کراہت کتابت کے اسباب تھے روکنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ ان اسباب میں قرآن وحدیث کے التباس کا خطرہ تھا۔ دوسرے قرآن کے ساتھ مسلمانوں کا اشتغال وانہماک کم ہو جانے کا ڈر تھا، یہ بھی خوف تھا کہ کہیں ایک ہی کاپی میں قرآن وحدیث کے الفاظ اکٹھا ہو کر پیچیدگیاں نہ پیدا کر دیں، جب کہ اباحت ان سے بھی مروی ہے جنھوں

نے کتابت کو ناپسند جانا تھا۔ ہر ایک کا مقصد ایک تھا، قرآن وسنت کی کما حقہ حفاظت، کہ دونوں آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ پھر اسباب کراہت کے ختم ہوتے ہی اباحت عام ہوگئی۔

(۴) عمر بن عبدالعزیز کو سنت کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوا اور وضع حدیث کا مخفی عمل بڑھ جانے کے خوف نے آپ کو کبار تابعین کے ذریعہ سنت کو جمع کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ اس طرح ذمہ داروں کو اسلامی ممالک کے مختلف حصوں میں آپ نے حدیث جمع کرنے کی ہدایت جاری کی اور علماء کو اپنے حلقۂ درس حدیث وعلوم اسلامیہ مساجد میں قائم کرنے کی صلاح دی اور خود عمر بن عبدالعزیز نے بنفس نفیس اس کام میں شرکت کر کے علماء کو بیدار کردیا، چنانچہ امام زہری نے جو کچھ بھی لکھا تھا اسے اپنی وفات سے پہلے پورے ملک میں پھیلا دیا۔ اس طرح عمر بن عبدالعزیز نے سلطنت کو حفاظت سنت کی ذمہ داری سونپ کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔

انفرادی تدوین کا سلسلہ تو عہد نبوی ہی میں شروع ہوگیا تھا جس طرح عہد صحابہ وتابعین میں۔ اس طرح سنت کو پورے دور خلافت میں پہلی صدی سے لے کر عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا، بلکہ سینہ بسینہ یہ علم آگے بڑھتا رہا اور مختلف بیاض ومصاحف سے نقل کرنے کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔

(۵) دوسری صدی ہجری کے آغاز میں علماء کا رخ بدل گیا، انھوں نے جمع حدیث و کتابت حدیث کے سلسلے میں ایک دوسرا پہلو اختیار کیا، اور اب تصانیف کا انداز ابواب کی ترتیب پر شروع ہوگیا۔ اس طرح مصنف اور جامع کی تصنیف عمل میں آئی۔ اس لیے ہم یہ کہیں گے کہ دوسری صدی تدوین حدیث کی صدی نہیں ہے بلکہ اس صدی میں ابواب کی بنیاد پر تصنیف شروع ہوئی۔ یہ مصنفات اسلامی حکومت کے مختلف مراکز سے قریبی زمانے میں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہوئیں۔

پھر مسانید کا دور آیا اور صحاح کی اشاعت ہوئی۔ اس طرح تدوین حدیث کی تاریخ مختلف مربوط مراحل سے گزر کر اب ہمارے سامنے صحاح ومسانید کی صورت میں موجود ہے۔

فصل ثانی

ابتدائے اسلام کے مدونات

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بعض صحابہؓ نے رسولؐ خدا سے بعض احادیث کے کچھ حصے سن کر لکھ لیے تھے اور اس کے لیے حضور سے خاص طور پر اجازت بھی حاصل کر لی تھی، جیسے عبداللہ بن عمرو اور انصاری نے جو حفظ حدیث نہیں کر پاتے تھے۔ آپ کے سوا بھی کئی صحابہ نے رسولؐ خدا کی اجازت سے حدیثیں قلم بند کر لی تھیں، جب کہ آپ نے سبھی کو اجازت مرحمت فرمائی۔ اس سلسلے میں مکتوبات حدیثی جو صحابہ نے اپنے مصاحف میں نقل کیے ان کی تعداد کافی و وافی ہیں۔

ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ ان صحیفوں میں کیا کیا چیزیں مرقوم تھیں اس لیے کہ بعض صحابہ و تابعین اپنے صحیفوں کو اپنی موت سے پہلے نذر آتش کر دیتے، یا انھیں دھو کر مٹا دیتے، بعض کسی ایسے معتبر کو ہدایت کرتے جو ان کے نزدیک ان کی ہدایت کا پابندی کرنے والا سمجھ میں آتا، جس کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا کہ کہیں یہ ایسے نا اہل کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے جس سے احادیث و سنن نبوی کو کسی قسم کی گزند آ پہنچے۔ تاریخ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کے صحائف میں سے بہت بڑی تعداد خود عہد نبوی ہی میں قلم بند کر لی گئی تھی اور ان مکتوب مصاحف کا اکثر حصہ خود صحابہ کی زندگی ہی میں یا ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادوں، پوتوں، نواسوں کے ذریعہ دوسروں تک منتقل ہو گیا تھا۔ ابن عبدالبر نے اپنی سند سے ابوجعفر محمد بن علی سے روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے روایت کیا کہ رسول خدا کی تلوار کی نیام میں ایک صحیفہ تھا جس میں لکھا تھا "ملعون ہے جس نے زمین کی حد بندی کو چرا لیا، ملعون ہے جس نے غیر موالی کو اپنا والی بنایا، ملعون ہے جس نے منعم کی نعمت کا انکار کیا۔"

عہد نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام میں ہی جو دستاویز مشہور زمانہ ہوگئی تھی یہ وہی دستاویز تھی جس کی تدوین کا حکم حضور علیہ السلام نے ہجرت کے پہلے سال میں ہی فرمایا تھا۔ اس دستاویز میں مسلمان مہاجر و انصار کا، اور مدینہ کے عربوں اور یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کا ذکر تھا۔ اس دستاویز میں اہل صحیفہ کا لفظ پانچ بار لکھا تھا۔ اس کے مقدمہ میں ہے کہ یہ دستاویز ہے محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مومنان و مسلمانان قریش و اہل یثرب اور جوان کے ساتھ ہو گئے، اور انہیں کے ہو کر رہے اور جہاد کیا، انہیں کے ساتھ ہو کر یہ ایک امت ہیں، لوگوں سے ہٹ کر۔ یہ دستاویز اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دستور نومولود سلطنت اسلامی کا ایک صحیفہ میں مدون تھا جس کی خبر مشہور تھی اور اس کی نقل بھی سب کے پاس تھی۔ اکثر آپؐ نے اپنے عمال کو احکام مکتوب شکل میں روانہ فرمایا۔ ان میں سے یہ مکتوب بھی ہے جسے ابن أبی لیلی عن عبداللہ بن حکیم نے روایت کیا ہے کہ ہمارے سامنے حضور کا پروانہ پڑھ کر سنایا گیا کہ مردار سے کسی قسم کا نفع نہ لے، نہ تو اس کے گوشت سے نہ پٹھے سے۔

حضرت ابوبکرؓ نے انس بن مالکؓ کو ایک پروانہ بھیجا جس میں صدقات کا حکم تحریر تھا جو مسلمانوں پر فرض کیا گیا تھا اور اس مکتوب پر رسول خدا کی مہر نبوت ثبت تھی۔

نافع نے ابن عمر سے روایت کیا کہ عمر بن خطاب کے تلوار کے قبضہ میں ایک صحیفہ تھا جس میں چرنے والوں جانوروں کی زکوٰۃ کے احکام تھے۔ یہی نسخہ وراثت میں سالم بن عبداللہ بن عمر کو ملا تھا جس کو امام زہری نے حضرت سالم سے پڑھا تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو محمد بن عبدالرحمان انصاری نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں مدینہ میں اپنا پیام بھیجوایا جس میں آپ نے صدقات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مکتوب کی نشاندہی کے لیے لکھا تھا، اور عمر بن خطاب کے صحیفہ کے بارے میں بھی درخواست کی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے خانوادے کے لوگوں سے حضرت عمرؓ کی لکھی ہوئی کتاب الصدقات مل گئی جو رسول خدا کے فرمان کے بالکل مطابق تھی، پھر ان دونوں کی نقل لی گئی اور عمر بن عبدالعزیز کو روانہ کی گئی۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب کا صحیفہ جو آپ اپنی تلوار میں لٹکائے رہتے تھے اس میں اونٹ کے دانت اور دیت و جراحت کے مسائل تھے، مدینہ کی حرمت کا ذکر تھا اور یہ کہ مومن کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا تحریر تھا۔

ابن حنفیہ محمد بن علی بن ابی طالبؓ (۸۱ھ) کی روایت میں ہے کہ میرے والد نے مجھے بلایا کہ میں ان کی وہ دستاویز جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کے احکام تحریر کرائے تھے لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس جاؤں۔

مسعر نے ابن معن سے روایت کیا کہ میرے سامنے عبدالرحمان بن عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک کتاب نکالی اور قسم کھا کر کہا کہ یہ میرے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔

سعد بن عبادہ انصاری (۱۵ھ) کے پاس ایک نوشتہ تھا جس میں احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا حصہ مکتوب تھا اور اس صحابی کے صاحب زادے نے اپنے والد کے نوشتے سے بعض اعمال جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روایت کئے، اور امام بخاریؒ کا یہ قول ہے کہ یہ صحیفہ عبداللہ بن ابی اوفی کے نوشتے سے نقل کیا گیا تھا، جو احادیث کو خود اپنے ہاتھ سے قلم بند کرتے اور لوگ آ کر آپ کے پاس ان روایات کو جو آپ کے اپنے نوشتہ میں لکھے ہوتے، پڑھتے تھے۔

حضورؐ کے غلام ابو رافع (۳۵ھ) کے پاس ایک نوشتہ تھا جس میں نماز کے طریقے مندرج تھے۔ آپ نے اسے ابو بکر بن عبدالرحمان بن الحارث (۹۴ھ) کو جو فقہائے سبعہ مدینہ میں سے ایک تھے دے دیا تھا۔

اسماء بنت عمیس (۳۸ھ) کے پاس ایک نوشتہ تھا جس میں آپ نے آنحضورؐ کی کچھ حدیثیں جمع کر رکھی تھیں۔

محمد بن سعید فرماتے ہیں کہ جب محمد بن مسلمہ انصاری (۴۲ھ) کی وفات ہوگئی تو ہم نے ان کی تلوار کی نیام میں ایک نوشتہ پایا جس میں لکھا ہوا تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سمعت النبی صلی اللہ علیہ

وسلم يقول ان لربكم فی بقية دهر كم نفحات فتعرضوا له"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، میں نے رسولؐ اللہ سے کہتے ہوئے سنا کہ تمھاری بقیہ زندگی اللہ کی پھونک کی مرہون منت ہے، لہٰذا تم اس کے در پے اور طلب گار بن جاؤ"

سبیعہ اسلمیہ نے عبداللہ بن عتبہ کے پاس لکھا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کرنے کا حکم وضع حمل کے تھوڑے دن بعد دیا تھا جو میرے شوہر کی وفات کے بعد تھا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وائل بن حجرؓ (۵۰ھ) کے نام ایک مکتوب لکھا تھا کہ وہ اپنی قوم کو حضر موت میں پہنچادیں۔ اس میں اسلام کی طرف رہنمائی کے وسیع تر خطوط تھے، اور زکوٰۃ کے نصاب واجبہ، زنا کی حد، حرمت شراب اور ہر مسکر کی حرمت مرقوم تھی۔

حضور علیہ السلام نے عمرو بن حزم (۵۳ھ) کو یمن کی گورنری سپرد فرمائی اور آپ کو ایک نوشتۂ فرمان دیا جس میں فرائض، سنن اور خون بہا کے متعلق تحریر تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ (۵۹ھ) کے پاس ایسے نوشتے تھے جن میں حضور کی احادیث مرقوم تھیں۔

فضیل بن حسن بن عمرو بن امیہ ضمری نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ میں نے ابو ہریرہؓ کے پاس ایک حدیث روایت کی، ابو ہریرہؓ نے اس کا انکار فرمایا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو آپ ہی سے میں نے سنا ہے۔ آپ نے کہا کہ اگر تم نے اسے مجھ سے سنا ہوگا تو وہ میرے یہاں مکتوب ہوگی، پھر مجھے پکڑے ہوئے اپنے گھر لے گئے۔ ہمیں آپ نے بہت سے نوشتۂ احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دکھلائے، اسی میں یہ حدیث بھی مل گئی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر یہ حدیث میں نے بیان کی ہوگی تو میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی۔ اور بشیر بن نہیک نے اس نوشتہ کو جو آپ سے سن کر لکھ لیا تھا ان کے جدا ہونے سے پہلے ان کو پڑھ کر سنا دیا۔

سمرہ بن جندب (۶۰ھ) نے بہت سی احادیث ایک نسخہ میں جمع کر رکھی تھی جن کی روایت ان کے بیٹے سلیمان نے بعد کو بیان کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہی نسخہ ہو جو سمرہ بن جندب نے اپنے صاحب زادے کے لیے لکھا تھا، اور اسی نسخہ کے بارے میں محمد بن سیرین نے فرمایا کہ سمرہ بن جندب کے مکتوب بنام صاحب زادہ میں بڑا علم تھا۔

صحیفۂ صادقہ عبداللہ بن عمرو بن العاص (۷ ق ھ۔۶۵ھ)

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو کتابت حدیث کی اجازت دے رکھی تھی اس لیے کہ آپ عمدہ کاتب تھے۔آپ نے بہت کچھ تحریر کرلیا تھا جو صحیفۂ ابن عمرو (صحیفۂ صادقہ) کے نام سے مشہور تھا۔صحیفۂ صادقہ انھوں نے بالارادہ اس کا نام رکھا، اس لیے کہ اسے آپ نے حضورؐ سے براہ راست سن کر تحریر کیا تھا،اس لیے حضور سے دیگر مرویات کی بہ نسبت یہ صادق ترین مرویات تھیں۔اس کو مجاہد بن جبر (۲۱۔۱۰۴ھ) نے خود عبداللہ بن عمرو کے پاس دیکھا تھا، چنانچہ اسے حاصل کرنے کے لیے گئے۔عمرو بن العاص نے فرمایا اے غلام بنی مخزوم ٹھیر جاؤ۔مجاہد نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس میں سے کچھ لکھا نہیں ہے۔آپ نے فرمایا یہ سچ مچ وہ صحیفہ ہے جو میں نے حضورؐ سے سن کر لکھا ہے،اور یہ براہ راست حضور سے سنا ہوا ہے میرے اور ان کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا۔یہ صحیفہ عمرو بن العاصؓ کو جان کی طرح عزیز تھا۔وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے زندگی سے پیارا یہ صحیفہ اور زمین ہے۔اسے آپ ایک صندوق میں محفوظ رکھتے تھے کہ کہیں ضائع نہ ہوجائے۔آپ کے خانوادے کے لوگوں نے اس کی حفاظت آپ کے بعد کی۔غالباً عمرو بن شعیب آپ کے پوتے اسی سے روایت کرتے تھے۔

عبداللہ بن عمرو کے صحیفہ میں ایک ہزار حدیثیں مکتوب تھیں۔ابن اثیر کی روایت اسی طرح کی ہے،مگر ہم تک جو بات پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ عمرو بن شعیب نے جو حدیثیں اپنے والد کے واسطہ دادا سے روایت کی ہے،ان کی تعداد غالباً پانچ سو (۵۰۰) کے قریب ہے۔ اگر ہمارے پاس یہ صحیفہ ان کے اپنے نوشتے کے مطابق نہیں پہنچا،تو امام احمد بن حنبل نے اپنی سند میں اس کو نقل کیا ہے جس پر یہ صحیفہ مشتمل تھا۔اسی طرح حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی عمرو بن العاص کے صحیفہ کا بڑا حصہ شامل ہے۔

اس صحیفہ کو غیر معمولی علمی حیثیت حاصل ہے،اس لیے کہ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ رسول خداؐ کی موجودگی میں آپؐ کی اجازت سے خود آنحضرتؐ کی زبان سے سن کر کتابت حدیث کا عمل صحابہ نے انجام دیا۔

حضرت عبداللہ نے اپنے تلامذہ کو اس صحیفۂ حدیث کا املا کرایا، چنانچہ آپ کے شاگرد حسین بن یشفی ابن ماتع الاصبحی نے مصر میں دو کتابیں املا کی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس میں حضور کا حکم و قول ہے، اور دوسری میں قیامت تک وقوع پذیر حادثات سے متعلق ہے۔

ہماری گفتگو یہاں صرف صحیفۂ صادقہ سے ہے۔ ورنہ عبداللہ بن عمروؓ کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو آپ نے مختلف حدیث نویسوں سے حاصل کیا تھا جن کا وزن دو اونٹ کے بار کے برابر تھا، اور جنگ یرموک میں وہ ضائع ہوگیا۔ بشر مریسی نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو ان حدیثوں کو نبی کریم علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے تھے۔ لوگ آپ سے کہتے کہ آپ ان کثیر الوزن احادیث سے نہ بیان کریں۔ بشر مریسی کی بات یونہی سی ہے، اس لیے کہ ہم ثابت کر چکے کہ عبداللہ بن عمرو امین تھے نقل حدیث میں بھی اور روایت حدیث میں بھی، وہ اہل کتاب کے لیے نہ حیلہ کرتے اور نہ اہل کتاب کی روایت حضور کی جانب نسبت کرتے۔ ابن عمرو کے لیے تو یہ فخر کافی ہے کہ سب سے پہلے مدون حدیث آپ تھے، جنھوں نے حضور کے سامنے تدوین حدیث کا عمل انجام دیا جو حضور کی زندگی کے مختلف انداز، غضب و رضا دونوں ہی کی آئینہ دار ہے۔

ابن عباس (۳ق — ۶۸ھ) کے نوشتے

ابن عباس جستجوئے علم اور علم مائگی کے لیے مشہور تھے۔ حضورؐ کے بعد صحابہؓ آپؓ سے دریافت کرتے اور لکھتے۔ حضور علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا فرمائی (اللهم ألهمه الحكمة و علمه التأويل)۔ حضرت ابن عباس کی وفات کے بعد آپ کے نوشتوں کا پتہ چلا جو اونٹ کے بار کے برابر تھا۔

عبداللہ بن عمر (۱۰ق۔ ۷۳ھ) کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ جب وہ بازار کے لیے نکلتے تو اپنی کتب حدیث پر نظر ڈال لیتے، یہاں کتابوں سے مراد کتب حدیث ہے۔

صحیفۂ جابر بن عبداللہ الانصاری (۱۶ق ھ-۷۸ھ)

ممکن ہے آپ کا یہ صحیفہ اس صحیفہ کے سوا ہو جسے مسلم نے کتاب الحج میں المنسک الصغیر کے نام سے بیان کیا ہے اور مجاہد نے ابن سعد کے ترجمہ میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ آپ اسی صحیفہ سے حدیثیں بیان کرتے۔ مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ السدوسی (۱۱۸ھ) اس صحیفہ کے بلند پایہ ہونے کو ان الفاظ میں بیان کرتے کہ ہم صحیفۂ جابر بن عبداللہ کو سورہ بقرہ سے زیادہ یاد کیے ہوئے تھے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ قتادہ سلیمان یشکری کے صحیفہ سے بیان کرتے تھے، انہوں نے حضرت جابرؓ کا صحیفہ نقل کرلیا تھا۔ سلیمان یشکری جابر کے شاگردوں میں تھے۔ ابن حجرؒ نے اس کی شہادت دی ہے کہ سلیمان جابر کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور ان کا صحیفہ لکھتے۔ اور بہت ممکن ہے کہ قتادہ نے جابر بن عبداللہ کا صحیفہ سلیمان یشکری سے روایت کیا ہو، اس لیے کہ سلیمان کی والدہ نے سلیمان کا نوشتہ پیش کیا جو قتادہ اور ثابت اور ابو بشر کے سامنے پڑھا گیا، پھر ان لوگوں نے اس کی روایت کی۔ ثابت نے صرف ایک حدیث روایت کی۔ اس طرح جابر بن عبداللہ کا صحیفہ مشہور زمانہ تھا اور سلیمان یشکری کا نوشتہ بھی مشہور تھا۔ اس سلسلے کی پشت پر بہت سی روایات ہیں۔ اس میں سے ایک وہ ہے جو سعد سے مروی ہے کہ وہ ابو سفیان طلحہ بن نافع عن جابر والی روایت کو سلیمان یشکری کے نوشتے سے شمار کرتے تھے۔ حضرت جابر کا علمی حلقہ مسجد نبوی میں ہوتا، اور آپ اپنے شاگردوں کو یہاں حدیث کا املا کراتے۔ آپ سے یہاں بہتوں نے املا کیا، ان میں سے وہب بن منبہ (۱۱۴ھ) قابل ذکر ہیں اور ابو زبیر، ابو سفیان اور شعبی نے بھی جابر سے روایت بیان کیا ہے، ان کی روایات صحیفہ سے املا شدہ حدیثوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

عروۃ بن زبیر (۲۲ھ-۹۳ھ) سے مروی ہے کہ میں نے بہت سی حدیثیں لکھیں پھر انھیں مٹا دیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ان احادیث مکتوب کے بدلے اپنا مال اولاد کو صدقہ کردیتا مگر انھیں مٹاتا نہیں تو یہ میرے لیے آسان تھا۔ اور بھی بہت سے نوشتے اس کے سوا

تھے جس میں سے کچھ مسودہ جلادیا، اس کا انھیں رنج ہوا اور کہا کرتے کاش کتابیں رہ جاتیں اہل وعیال مال ومتاع کے بدلے۔

خالد بن معدان الکلاعی الحمصی (۱۰۴ھ) کے پاس بھی ایک مصحف تھا جس میں ان کا اپنا علم سمویا ہوا تھا۔ بحیر بن سعید کے پاس خالد بن معدان کے نوشتہ کا ایک نسخہ موجود تھا۔

ابو قلابہ عبداللہ بن زید الجرمی (۱۰۴ھ) نے اپنی کتابوں کو ایوب سختیانی کو دینے کی وصیت کی تھی، چنانچہ یہ نوشتے اونٹ پر لادکر لائے گئے جن کا کرایہ ایوب نے دس درہم سے کچھ زیادہ ادا کیا۔

اعمش نے بیان کیا کہ حسن بصری (۲۱۔۱۱۰ھ) نے بیان کیا کہ ہمارے پاس کتابیں ہیں جن کی ممارست کرتے ہیں۔ باقر بن علیؒ بن حسین (۵۶۔۱۱۴ھ) کے پاس بھی بہت سی کتابیں تھیں، ان میں سے بعض ان کے صاحب زادے جعفر صادق نے خود ان سے سنا اور بعض کو خود پڑھا۔

مکحول شامی کے پاس بھی بہت سی کتابیں تھیں، حکم بن عتبہ کے پاس بھی، اور بکیر بن عبداللہ بن الاشج (م ۱۱۷ھ) عالم مدینہ کے پاس بھی کتابیں تھیں جو ان کے بیٹے مخرمہ بن بکیر کے حصہ میں آئیں۔

قیس بن سعد مکی (۱۱۷ھ) کے پاس بھی ایک کتاب تھی جو حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) کے پاس منتقل ہوئی، اس میں دو رائے تھیں کہ دوسری صدی کے آغاز میں علمائے حدیث نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور کتابوں کا چلن عام ہوگیا، حتی کہ امام زہری کی کتابیں بہت زیادہ تھیں، جو ولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان (۸۸۔۱۲۶ھ) کے قتل میں اس کے خزانہ سے بہت سی سواریوں پر منتقل کی گئیں۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں تدوین حدیث اور اشاعت حدیث پر گفتگو سے پہلے اور اسی دور کی تصانیف وکتب سے بحث کرنے سے پہلے ہم صحیفۂ ہمام بن منبہ پر جس کی تاریخی اہمیت تدوین حدیث میں مسلم ہے، گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

صحیفۂ ہمام بن منبہ (۴۰ــــ ۱۳۱ھ)

ہمام بن منبہ جلیل القدر تابعی ہیں جنھوں نے صحابی رسول راوی حدیث ابو ہریرہؓ سے ملاقات کی اور آپ سے احادیث رسول اکرمؐ کا ایک بڑا حصہ تحریر کیا جو مختلف صحیفوں میں یا ایک ہی صحیفہ میں جو "الصحيفة الصحيحة" کے نام سے مشہور ہے، موجود ہے۔ غالبًا "صحیفہ صادقہ" کے انداز پر اس کا نام "صحیفۂ صحیحہ" رکھا گیا، اور اس کا نام صحیفہ رکھنا درست ہے، اس لیے کہ آپ نے یہ صحیفہ ایک ایسے جلیل القدر صحابی سے نقل کیا ہے جو کم و بیش چالیس سال صحبت رسولؐ سے فیضیاب ہوئے اور آپ سے بہت ساری روایات کیں۔ ہم تک یہ مخطوطہ بلا کسی کمی بیشی کے پہنچ چکا ہے، اس میں وہی انداز تدوین ہے جس کو ہمام بن منبہ نے حضرت ابو ہریرہ سے سن کر مرتب کیا تھا۔ محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے صحیفہ دمشق کے کتب خانوں میں ہم شکل مخطوطہ کی شکل میں پایا۔

اور اس صحیفہ کی قدر اس سے اور بڑھ جاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے پورا صحیفہ اپنی مسند میں جوں کا توں نقل کر دیا ہے، اسی طرح بخاری نے بھی صحیح بخاری میں اس کا بڑا حصہ مختلف ابواب میں نقل کیا ہے۔

اس صحیفہ کو تاریخ تدوین حدیث میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ کھلی دلیل ہے بلکہ روشن دلیل ہے کہ حضورؐ کی احادیث ابتداء عصر صحابہ میں ہی مدون ہو چکی تھیں اور اس غلطی کا ازالہ ہو گیا کہ حدیث دوسری صدی کی اوائل میں مدون کی گئی، اس لیے کہ ہمام نے حضرت ابو ہریرہ سے ملاقات کی اور انہی سے یہ حدیثیں بھی تحریر کیں، ظاہر ہے کہ یہ آپ کی زندگی میں ہوا ہوگا، اور ابو ہریرہ کی وفات ۵۹ھ میں ہوئی، گویا یہ صحیفۂ حدیث پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی یا نصف اول کے آخر میں مدون ہو چکا تھا، اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے اپنا صحیفۂ صادقہ عہد نبوی میں ہی مدون کیا تھا۔ اس طرح سے حدیث کا ایک بڑا حصہ پہلی صدی ہجری کے نصف ہی تک مدون ہو چکا تھا۔ اس طرح علمائے امت نے عملاً تدوین حدیث کا کام حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے بہت پہلے

ہی شروع کر دیا تھا۔ حقیقت میں بہتر تو یہ تھا کہ یہ صحیفہ ابو ہریرہ کے نام سے پکارا جاتا، لیکن مشتہر چونکہ ہمام بن منبہ کے نام سے ہو چکا ہے اس لیے اسی طرح رہنے دیا گیا۔ اس صحیفہ کی روایت آپ کے تلمیذ معمر بن راشد نے کی پھر عبدالرزاق نے معمر سے اور یہ سلسلۂ روایت جاری رہا۔

اس صحیفۂ ہمام میں ۱۳۸ حدیثیں ہیں۔ ابن حجر نے ذکر کیا کہ ہمام نے ابو ہریرہ سے تقریباً ایک سو چالیس (۱۴۰) حدیثیں ایک ہی سند سے سنی ہیں۔ اس روایت سے اس صحیفہ کا وزن اور بڑھ جاتا ہے اس لیے کہ اس صحیفہ کی حدیث اور علماء کی روایت میں مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ علماء میں دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں تدوین کا کام چل پڑا تھا کہ ہر محدث کے پاس کوئی نہ کوئی اپنی تصنیف ہوتی خواہ وہ جامع ہو یا مسند یا کچھ اور جس میں حدیث کے ابواب موجود ہوتے۔

بلاد اسلامیہ میں سب سے پہلے کار تصنیف کرنے والوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اور بہتوں نے اس کار خیر میں حصہ لیا اور تصنیفی خدمات انجام دیں، ان میں یحییٰ بن ابی کثیر (۱۲۹ھ) معاصر امام زہری، محمد بن سوقہ (۱۳۵ھ) کے پاس بھی ایک کتاب موجود تھی۔ اسی طرح زید بن اسلم (۱۳۶ھ) کی کتاب التفسیر جس میں احادیث نبوی کا ایک بڑا حصہ تھا۔ اسی طرح موسیٰ بن عقبہ (۱۴۱ھ) نافع مولی ابن عمر کی احادیث ایک صحیفہ میں مکتوب تھیں۔ اسی طرح اشعث بن عبدالملک حمرانی (۱۴۲ھ) کے پاس بھی ایک کتاب تھی جو سلیمان صاحب البصری کے پاس آ گئی تھی۔ عقیل بن خالد بن عقیل (۱۴۲ھ) نے بہت سی حدیثیں امام زہری سے لکھ رکھی تھیں، اور احادیث زہری کا سب سے زیادہ واقف یہی شخص تھا۔ یحییٰ بن سعید انصاری (۱۴۳ھ) کے پاس بھی ایک کتاب تھی جو حماد بن زید کے پاس منتقل ہوگئی۔

عوف بن ابی جمیلہ العبدی (۱۴۶ھ) نے حسن بصری کے اطراف حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تحریر کئے جو بعد میں یحییٰ بن سعید قطان (۱۲۰۔۱۹۸ھ) کے ہاتھ آ گئے تھے۔ جعفر صادق بن محمد باقر (۸۰۔۱۴۸ھ) کے پاس رسائل، نوشتے اور حدیثیں تھیں اور وہ ثقات محدثین میں

شمار ہوتے تھے۔یونس بن مزید بن ابی نجاد (۱۵۲ھ) کے پاس ایک کتاب تھی جس کی صحت کی تصدیق ابن مبارک نے فرمائی۔عبدالرحمان بن عبداللہ بن عتبہ المسعودی (۱۶۰ھ) کے پاس وہ کتابیں تھیں جنھیں شعبہ بغداد سے لے کر آئے تھے۔زائدہ بن قدامہ (۱۶۱ھ) کے پاس کئی کتابیں تھیں جنھیں آپ نے سفیان ثوری کو پیش کی تھیں، زائدہ شعبہ ہی کی طرح کے محدثین میں سے تھے۔سفیان ثوری کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جن میں جامع کبیر اور جامع صغیر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ابن مبارک نے ابراہیم بن طہمان (۱۶۳ھ) اور سکری یعنی ابوحمزہ کے بارے میں کہا کہ دونوں کی کتابیں صحیح تھیں۔

شعبہ بن حجاج (۱۶۰ھ) کے پاس کتاب الغرائب فی الحدیث تھی، اور عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون (۱۶۴ھ) کی بہت سی تصنیف کردہ کتابیں تھیں جن کی روایت ابن ماجشون سے ابن وہب نے کی ہے۔اسی طرح عبداللہ بن عبداللہ بن اویس (۱۶۹ھ) مالک کے چچازاد بھائی اور ان کی بہن کے داماد کے پاس بھی بہت سی کتابیں تھیں جو ان کے بیٹے اسماعیل کے ترکہ میں آئیں۔سلیمان بن بلال (۱۷۲ھ) نے اپنی کتابوں کو عبدالعزیز بن ابوحازم کو دیئے جانے کی وصیت کی تھی۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ (۱۷۴ھ) محدث دیار مصر کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جو ایک حادثہ میں جل کر راکھ ہوگئیں، یہ ۱۶۹ھ کا واقعہ ہے۔آپ کی کتابیں ساری کی ساری صحیح تھیں۔ابن لہیعہ کا ایک مجموعہ حدیث کے مکتوب مجموعوں میں سب سے پرانا تسلیم کیا جاتا ہے جو اب بھی اوراق البردی کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔اسی طرح لیث بن سعد (۱۷۵ھ) جو مصر کے عظیم شیوخ حدیث میں ہیں اور وہاں کے گرامی علماء میں شمار ہوتے ہیں ان کی بھی بہت سی تصانیف ہیں۔

اسی طرح ہمارے پاس مصنفین اور ان کے مصنفات کے بارے میں خاصی اطلاعات ہیں جن کا ذکر کتاب کی حیثیت کے پیش نظر نہیں کیا جاتا، اور ان مصنفات کی تعداد تو دوسری صدی کے آخر میں قابل ذکر حد تک بڑھ گئی تھی۔علی بن عبداللہ المدینی (م۲۳۴ھ) نے ابواب حدیث اور رجال حدیث، غرائب وشواذ وعلل حدیث ان سب موضوعات پر ایک سو

سے زیادہ مصنفات تیار کی ہیں، ان میں سے محمد بن صالح ہاشمی نے ۲۵ سے کچھ زیادہ مصنفات کا ذکر کیا ہے، اور ان میں سے ہر کتاب کئی کئی جز پر مشتمل ہے، بعض کتابیں تو تیس جلدوں پر مشتمل ہیں۔

غرض علمائے اسلام نے سینوں اور سفینوں دونوں سے ہی حدیث کو محفوظ کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ علی بن مدینی کی یہ بات صحیح ہے کہ میں نے جب سند حدیث پر غور کیا تو وہ چھ محدثین میں دائر و سائر معلوم ہوئی، اہل مدینہ کے لیے ابن شہاب (۱۲۴ھ)، اہل مکہ کے لیے عمرو بن دینار (۴۶۔۱۲۶ھ)، اہل بصرہ کے لیے قتادہ بن دعامۃ السدوسی (۱۱۷ھ) اور یحییٰ بن ابی کثیر (۱۲۹ھ)، اہل کوفہ کے لیے ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی (۳۳۔۱۲۷ھ) اور سلیمان بن مہران الاعمش (۱۴۸ھ)۔ علی نے کہا کہ انہی چھ کا علم اصحاب مصنفات میں پھیل گیا۔

تدوین کے سلسلے میں مختلف خیالات و آراء

ا۔ علامہ محمد رشید رضا کی رائے (۱۲۸۲۔۱۳۵۴ھ)

آپ کا کہنا ہے کہ غالباً قرن اول میں تابعین میں سے سب سے پہلے جس نے کتابت حدیث کی اور اپنے نوشتے کو مصنف کی صورت و شکل میں پیش کیا وہ خالد بن معدان الحمصی ہیں۔ ان سے لوگوں نے بیان کیا کہ انھوں نے ستر صحابہ سے ملاقات کی۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ بحیر نے بیان کیا کہ میں نے ان سے زیادہ علم سے تعلق رکھنے والا کسی کو نہیں پایا۔ آپ کی معلومات کا پلندہ ایک تھیلے میں رہا کرتا، اس میں ہی وہ اپنے نوشتے رکھتے، اور اس پر کانٹے کے بٹن ہوتے کہ کہیں گر نہ جائے، یہ پہلی صدی کی بات ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ یا ۱۰۴ میں ہوئی، ویسے شہرت یہی ہے کہ حدیث کے پہلے کاتب ابن شہاب زہری ہیں۔ غالباً امراء بنو امیہ کے استاذ حدیث کی حیثیت ان کو حاصل تھی، اس لیے ان کو شہرت بھی نصیب ہوئی۔

پہلی صدی اور دوسری صدی کے نصف اول میں کتابت حدیث کے بارے میں علماء کا مطمحِ نظر دیکھنے کے بعد اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی تدوین حدیث کا قطعی ثبوت ملنے اور دورِ صحابہ و تابعین میں اس کا شیوع ہونے کے بعد استاذ گرامی کی رائے قبول کرنے سے ہمیں دو وجوں سے تامل ہے۔

انفرادی طور سے تدوین کو اگر مان لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ خالد سے پہلے بھی صحابہ و تابعین اس میدان میں آگے نکل چکے تھے۔ انھوں نے اپنی نوشتوں کی پوری پوری حفاظت کی۔ ابن عمرو کو لیجیے وہ اپنے نوشتوں کو ایسے صندوقوں میں رکھتے تھے، اس کے علاوہ جس میں خانے بنے ہوئے تھے، ان خانوں میں یہ دفتر حدیث چمڑے کے تھیلوں میں بند رکھتے تھے، جیسے ہمام بن منبہ اور ابن شہاب نے اپنے نوشتوں کو کاپیوں میں محفوظ رکھا، اس لیے خالد بن معدان کی بات سے کہ ان کے نوشتے ایسے مصحف میں تھے جو گھنڈی دار تھیلے میں بند رہتے، اس سے ابتداء تدوین حدیث پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

دوسرے باقاعدہ تدوین حدیث کو اگر عمر بن عبدالعزیز کی اپیل کا جواب کہا جائے تو پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ابوبکر بن حزم اور ابن شہاب خالد سے پہلے یہ کام انجام دے چکے ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابن شہاب نے عمر بن عبدالعزیز کے لیے حدیث کے بہت سے دفتر تحریر کیے، جن کی کاپیاں ان ممالک کو بھیجی گئیں جہاں کہیں سلطنت اسلامی کے حکمراں موجود تھے، اس لیے خالد پہلے مصنف نہیں ہو سکتے، خواہ یہ تصنیف خاص ہو یا حکومتی ہو۔ اس سے پہلے دوسرے مصنفین گزر چکے ہیں۔ یہ تسلیم کیا جانا ممکن ہے کہ خالد کا صحیفہ ان اولین صحیفوں میں ہے جو اس صدی میں مدارِ علم رہا۔

ویسے شہرت یوں ہی ہے کہ امام زہری پہلے آدمی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے کتابت حدیث کی۔ اس شہرت کا تعلق اس بنیاد پر ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے مسند خلافت سنبھالتے ہی انھیں حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ امراء بنوامیہ نے آپ سے حدیثیں روایت کیں، اس لیے کہ امراء کا اخذ حدیث کچھ ایسی بات نہیں ہے، جس کی وجہ سے

امام زہری نے تدوین حدیث کی بات قبول کی۔ ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام زہری نے طلب حدیث کے دور میں ہی حدیث رسول کا بڑا حصہ لکھ لیا تھا، اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تدوین حدیث میں امام زہری سب سے پیش ہیں۔ باایں ہمہ ہمیں اس کے مان لینے میں کوئی باک نہیں کہ آپ سے پہلے بھی غیر رسمی طور پر لوگوں نے تدوین حدیث کی تھی، آپ کے علوم کو صحیفوں میں منضبط کر لیا تھا، اس کی صحت پر توجہ دی اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کی تدبیر کی۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ ابن شہاب زہری سے اور خالد بن معدان سے پہلے بھی لوگوں نے حدیث کی کتابت کی تھی، اور جو کچھ ان کے پاس تھا اس کی حفاظت کا نظم کیا، اس لیے کہ ان کو رسولؐ کی احادیث سے صرف لگاؤ نہیں عشق تھا کہ اس کو ضیاع و تحریف سے بچانے کی انتھک کوشش کرتے رہے۔

۲۔ تدوین حدیث میں شیعہ کا نقطۂ نظر:

سید حسن الصدر (۱۲۷۲-۱۳۵۴ھ) نے بیان کیا کہ حافظ جلال الدین سیوطی کو واہمہ ہوا ہے کہ آپ نے اپنی کتاب "تدریب الراوی" میں کہا کہ تدوین حدیث کا آغاز پہلی صدی کے آخری دنوں میں ہوا، چنانچہ انھوں نے کہا کہ تدوین حدیث کی ابتداء پہلی صدی کے اواخر میں خلافت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں ان کے حکم سے ہوئی۔ صحیح بخاری کے ابواب علم میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو تحریر کیا، ابن حجر نے یہ بات پیدا کی کہ اس سے ابتداء تدوین حدیث مستفاد ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی لکھا کہ سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر عمل جس نے کیا وہ ابن شہاب زہری ہیں۔ سید حسن الصدر کا کہنا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کا دور دو سال پانچ مہینے رہا، جس کا آغاز ۱۰؍صفر ۹۹ھ سے ہوا اور ۱۰۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا انتقال پانچ یا چھ رجب ۱۰۱ھ کو ہوا۔ آپ کے آرڈر کا دن تاریخ معلوم نہ ہو سکا اور نہ کسی نے یہ لکھا کہ آپ کے حکم کے امتثال میں حدیث کی تدوین آپ کے رہتے ہو گئی تھی۔ ابن حجر نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ ان کی عقلی اور فکری بات

ہے، اس سے کھلے طور پر باشہادت عمل ہونے کا علم نہیں ہوتا، اور اگر ان کا علمائے حدیث کے نزدیک کوئی اثر ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ حدیث کے ساتھ توجہ دوسری صدی کے اخیر میں ہوئی، جیسا کہ شیخ الاسلام نے اعتراف کیا ہے کہ ابن حجر کا یہ کہنا کہ بعض ائمہ کا خیال ہے کہ احادیث نبوی کی تدوین خصوصی دوسری صدی ہجری کے آخری دنوں میں ہوئی اور پھر ایک جماعت کا شمار کرایا۔ اسی طرح حافظ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں تحریر کیا کہ تصنیف وتدوین کا ابتدائی زمانہ اور جزئیات وسنن پر کتابوں کی تصنیف حکومت بنوامیہ کے خاتمہ پر اور عباسی حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہوئی، اور ذہبی کی رسائی تاریخی معاملات میں خصوصیت سے ان باتوں میں سب سے زیادہ فوق ہے۔ چنانچہ سیوطی کی ذکر کردہ باتوں کو انھوں نے ذکر نہیں کیا، بلکہ اس نے تو علمائے اہل سنت کی بھی ساری کتابوں کو قابل اعتبار نہیں جانا، بجز اس کے کہ اتنی بات مان لی جا سکتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم والی بات زیادہ وزن دار نہیں ہے۔ غالباً آپ کے بعد ہی جمع حدیث کا سلسلہ شروع ہوا، اس لیے پہلی صدی کے اختتام پر جمع حدیث کی بات کچھ زیادہ جچاؤ نہیں، خدا ہمیں سخن سازی سے بچائے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ سیوطی نے جو کچھ لکھا وہ واہمہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت علمی ہے، ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ عمر بن عبدالعزیز کا زمانۂ خلافت بہت مختصر رہا، اور حکم کی تاریخ بھی مذکور نہیں، اتنی مختصر مدت میں اتنا اہم معاملہ کیسے نپٹ جائے گا، اس کا کسی نے ذکر نہیں کیا، اس لیے یہ حکم دلیل کے مخالف ہے، اس لیے کہ ناقلین بہت زیادہ ہیں، حافظ ابن عبدالبر نے اس کی تصریح کی ہے کہ خلیفہ کے حکم کی بجا آوری ابن شہاب نے فوراً ہی کی اور حدیث کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور خلیفہ نے اپنی سلطنت کے تمام حدود میں ان کی ایک کاپی روانہ کر دی۔ ابن حجر کی لکھی ہوئی بات گمان اور تخمینہ پر مبنی نہیں ہے، علمائے حدیث کا یہ کہنا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوین دوسری صدی کے اختتام پر ہوئی، عمر بن عبدالعزیز کے آرڈر کی تعمیل کر کے تدوین حدیث میں لگ جانے کے منافی کب ہے؟

یہ صحیح ہے ابتدائی حدیث کے مدونات خود حضورؐ کے زمانے اور صحابہؓ کے دور کے فتاوی سے خالی تھے، اور اس کی کھلی دلیل صحیفۂ صادقہ عبداللہ بن عمرو اور صحیفہ ہمام بن منبہ ہیں۔ بعض مصنفین نے صحابہ کا عمل بھی کتابوں میں لکھ لیا تھا جو حدیث کے پہلو بہ پہلو تھے اس لیے پہلی صدی کے اواخر میں تدوین حدیث کیے جانے کے منافی نہیں ہے۔

حافظ ذہبی کا حوالہ بے کار ہے اس لیے کہ انھوں نے پہلی صدی کے حالات پیش کیے ہیں، تدوین کے موضوع پر انھوں نے کوئی باقاعدہ گفتگو نہیں کی۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے تراجم بیان کرتے ہوئے لکھ دیتے ہیں کہ علماء میں سے یہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے علاقے میں تصنیف حدیث کی، اور ذہبی کا میدان یہ نہ تھا کہ وہ تدوین حدیث کی تفصیلات پر گفتگو کرتے، اس لیے کہ ان کی کتاب کا موضوع رجال حدیث تھا، علم حدیث اور مصطلحات حدیث نہ تھا۔

جلال الدین سیوطی نے جو کچھ کہا ہے اس کا ذکر ان لوگوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے جنھوں نے علوم حدیث اور حدیث پر سب سے پہلے لکھا ہے، اس لیے اس کے بار بار ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کو رامہرمزی نے ذکر کر دیا ہے کہ صدر اول میں کتابت کے ناپسند کیے جانے کا سبب کیا تھا، اور ان احادیث کو بھی ذکر کیا ہے جن میں کتابت کی اجازت یا گنجائش پائی جاتی ہے، یا اس سے روک دیا گیا۔ جب رامہرمزی نے کوئی صریح بات سیوطی کی طرح نہیں ذکر کی اس لیے اس سے اندازہ ہو گیا کہ بعض علماء نے تدوین حدیث پہلی ہی صدی میں کر لی تھی، جس طرح کہ عمر بن عبدالعزیز کے حفاظت سنت اور اشاعت سنت سے متعلق تصریحات مذکور ہیں۔ اور خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "تقیید العلم" کو صدر اول میں تدوین حدیث کے چلن کے لیے ہی لکھا ہے، اور ان تمام باتوں کو اجاگر کیا جو لوگوں کی نگاہ سے اوجھل تھیں، اور اس کا ثبوت دیا کہ بعض طالبین حدیث نبوی نے تدوین حدیث کا کام بڑی تندہی سے عہد نبوی علیہ السلام میں انجام دیا، چنانچہ ابو عبدالقاسم بن سلام (۲۲۴ھ) نے اپنی سند سے ذکر کیا، عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ حکم بھیجا

کہ فرمودات رسولؐ بسلسلۂ صدقات کی کاپی روانہ کردی جائے، اسی طرح عمر بن خطاب کا فرمان بھی اس سلسلے میں جو تھا اسے بھی ارسال کیا جائے، چنانچہ دونوں کی کاپیاں نقل کرکے روانہ کی گئیں۔ اب اس حکم کے ہوتے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا حکم پہنچے اور اس کا نفاذ عمل میں نہ آئے، نہ اس کو دستور بنایا جائے۔ اس لیے علماء کا یہ کہنا کہ تدوین حدیث پہلی صدی میں واقع ہوئی، گمان وتخمین کے قبیل سے نہیں ہے نہ سخن سازی کہی جاسکتی بلکہ ان کا یہ قول اس پر محمول کیا جائے گا کہ باقاعدہ حکومت کی نگرانی میں تدوین کا کام عمر بن عبدالعزیز کے دور سے ہوا مگر انفرادی اور شخصی تدوین کا سلسلہ عہد نبوی سے ہی جاری وساری تھا۔

سید حسن الصدر نے آگے بیان کیا کہ جب آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ جان لیجئے کہ شیعوں نے آثار واخبار جمع کرنے میں سب سے زیادہ پیش روی اختیار کی۔ وہ دور رسول خدا کے خلفاء کا تھا جن کی امامت حضرت علی امیر المومنین علیہ السلام کو حاصل تھی۔ پھر ایک ضخیم کتاب کا ذکر کیا جو حضرت علی کے پاس تھی جس میں ساری باتیں مندرج تھیں، پھر اس صحیفہ کا ذکر کیا جو حضرت علی کی تلوار میں لٹکا رہتا، پھر ایک اور کتاب کا ذکر کیا جو حضرت ابو رافع مولی رسول اکرمؐ کے پاس تھی جس کا نام "کتاب السنن والأحکام و القضایا" تھا۔ حضرت ابو رافع کا وصال حضرت علی کی خلافت کے آغاز میں ہوگیا، حضرت علی کی خلافت کا آغاز ۳۵ھ سے ہے اس لیے ابو رافع سے زیادہ کوئی قدیم التصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ حضرت ابو رافع نے دور صحابہ میں تدوین حدیث کی، جب کہ ہم نے آپ کو بتلایا کہ آپ سے پہلے عبداللہ بن عمرو بن العاص گزرے ہیں، جنہوں نے عہد نبوی ہی میں تدوین حدیث کا کام کرلیا تھا۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے تو یہ بھی مان لیجئے کہ آپ کی کتاب ابواب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قضایا پر مرتب تھی۔ جیسا کہ سید حسن الصدر نے لکھا ہے کہ ابو رافع کو تالیف میں

اولیت حاصل تھی تدوین میں نہیں، اس صداقت کے بعد تاریخی حقائق کو نہیں جھٹلایا جاسکتا کہ تدوین عہد عمر بن عبدالعزیز میں عمل میں آئی۔

تدوین کے سلسلہ میں شیعی نقطۂ نظر پر گفتگو کرتے وقت ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم زیدیہ کے اصول سے بحث کریں کہ ان کی تدوین قرن ثانی کے آغاز میں عمل میں آئی، اور یہ اصل امام زید کا ہی جمع کردہ ہے، جس میں تین خاص پوائنٹ سے بحث کی ہے، مجموعہ کے مصنف کی تعریف، اس کے راوی کا تعارف پھر خود مجموعہ کی حیثیت۔

ا۔ امام زید:

زید بن علی زین العابدین بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم، آپ کی پیدائش ۸۰ھ کے اردگرد ہوئی اور علم و جہاد اسلامی کے لیے معروف گھرانے میں تربیت کے دن پورے کیے۔ آپ نے اپنے والد سے علم حاصل کیا، پھر اپنے بھائی حضرت محمد باقر سے جن کی منزلت علمی کا علمائے زمانہ نے پوری طرح اعتراف کیا، انھوں نے کبار تابعین سے حدیث کی سماعت کی اور عراق وحجاز میں رہا کرتے۔ امام زید کی پختگی علم کے بعد بڑے بڑے اہل علم نے آپ کے فضل وکمال کا اعتراف کیا۔ جعفر صادق سے مقام علم زید کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا بخدا وہ ہم میں سب سے زیادہ خواندہ اور کتاب اللہ کے علم کے ماہر تھے، اور دین خداوندی کے سب سے بڑے فقیہہ تھے اور صلۂ رحم میں سب سے برتر تھے، ان جیسا دنیا وآخرت میں کوئی نہ تھا۔ چنانچہ امام شعبی بھی فرماتے ہیں کہ کسی ماں کے بطن سے زید بن علی سے زیادہ عالم دین اور دنیا گریز کوئی پیدا نہیں ہوا۔ باقر سے زید کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ زید علم میں بحر ناپیدا کنار تھے۔

امام زید کی ہشام بن عبدالملک اور ان کے کارندوں کے بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں جن میں ان کا ملک بدر کیا جانا اور ناچار ہوکر خلیفہ کے خلاف خروج کے

واقعات درج ہیں۔ مزید برآں یہ خبریں بھی آپ سنیں گے کہ ابن العماد حنبلی نے روایت کیا کہ امام زید ایک دن ہشام بن عبدالملک کے پاس گئے، اس نے آپ سے کہا کہ تمہی ہو جو خلافت کے بارے میں دعویدار ہو، حالانکہ تم باندی کے بطن سے پیدا ہوئے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ نسب عورتوں سے شمار نہیں کیا جاتا اور مائیں مردوں کو اپنے حصول مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی ہیں۔ حضرت اسماعیل کی والدہ ام اسحاق کی باندی تھیں، اس کے باوجود خدا نے آپ کو نبوت عطا کی اور عربوں کا ابوالآباء قرار دیا، اور آپ ہی کے صلب سے حضرت خاتم النبیین خیر البشر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ تم میرے بارے میں یہ کہتے ہو حالانکہ میں فاطمہ اور علی دونوں ہی کا بیٹا ہوں۔ آپ شعر پڑھتے ہوئے باہر آئے۔ آپ سے اس موقع پر پندرہ ہزار اشخاص نے بیعت کی، پھر رات میں آپ سے غداری کی اور بھاگ نکلے، صرف تین سو نو جوان رہ گئے۔ جب آپ کی شہادت ہوگئی تو آپ کا سر شام بھیجا گیا، پھر مدینہ روانہ کیا گیا، یہ واقعہ ۱۲۲ھ کا ہے۔

امام زید کی ایک مسند مجموع فقہی کے نام سے پائی جاتی ہے اور آپ کا ایک مجموعہ حدیثی بھی ہے اور دونوں عمرو بن خالد واسطی نے جمع کیا ہے۔ آپ کی ایک تصنیف غریب القرآن میں اور اثبات امامت اور مناسک حج میں موجود ہے۔

مجموع حدیثی و فقہی کے راوی ابو خالد عمرو بن خالد الواسطی الہاشمی ہیں جو کوفی الولاء ہیں۔ انہوں نے امام زید کا مجموعۂ حدیث و فقہ کی روایت کی، اور یہ کہا کہ میں امام زید کی صحبت میں حاضر ہوا، ان سے وہی حدیثیں لیں جو ایک یا دو یا تین یا چار یا پانچ یا چھ بار سنیں، اور کسی ہاشمی کو میں نے زید بن علی جیسا نہیں پایا، اس وجہ سے سب پر انہی کی صحبت کو ترجیح دی۔ ابو خالد کا دوسری صدی کی پانچویں دہائی میں انتقال ہوا۔

ابو خالد کے بارے میں اختلاف ہے، زیدیہ نے ان کی روایت قبول کیا، اس سلسلے میں قاسم بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ:

"عمروبن خالد الواسطي أبوخالد حدث عنه الثقات وهو كثيرالملازمة لزيد بن علي عليه السلام وهوالذي أخذ عنه أكثر الزيدية، مذهب زيد بن علي عليهما السلام و رجحوا روايته على رواية غيره"

"عمرو بن خالد واسطی ابوخالد سے ثقات نے حدیث لی ہے وہ زید بن علی کے ساتھ اکثر و بیشتر رہے اور آپ ہی سے زیدیہ فرقہ کے اکثر لوگوں نے روایت کی ہے، اور آپ کی روایت کو دوسروں کی روایت پر ترجیح دی ہے"

امامیہ وغیرہ نے اس پر جرح کی ہے، مجموعہ کے شارحین نے عمرو پر جرح کرنے والوں کے تارو پود بکھیر دیئے ہیں، اور علماء کے اقوال عمرو کے بارے میں پیش کئے ہیں۔ استاذ ابوزہرہ نے پھران مطاعن کی تکذیب کی ہے اوران سے مناقشہ کرکے علماء کی آراء بھی تحریر کی ہے، اور یہ لکھا ہے کہ ابوخالد کی روایات قبول کرنے کے دلائل اس کو رد کرنے کے دلائل سے کہیں قوی ہیں۔

۳۔ رہی مجموع کی بات تو خود مجموع ہی کے بارے میں اختلاف ہے، آیا امام نے ہی اس کو وضع کیا ہے اور اس کی موجودہ ترتیب بھی خود انہی کی ہے یا آپ نے اپنے طلبہ کو املا کرایا ہے، یا ابوخالد کی اپنی کوشش ہے؟ اس سلسلے میں ابوخالد نے خود ابراہیم زبرقان کو ان کے سوال کا جواب دیا ہے، جب انھوں نے ابوخالد سے دریافت کیا کہ زید بن علی سے آپ نے یہ کتاب کس طرح سنی؟ ابوخالد نے جواب دیا کہ میں نے ان کی اس کتاب سے سنا جن کی تیاری اور جمع کرنے کی سعادت خود ان کو تھی، زید بن علی سے جن لوگوں نے میرے سوا سنا تھا سب ہی شہید کردیئے گئے، میں بچارہ گیا۔ مگر یہ بھی سنئے کہ امام محمد بن مطہر مجموع کی پہلی شرح منہاج میں لکھا ہے کہ آپ کا مذہب عزیز تھا، اس لیے کہ آپ نے ضبط کی تھی، اس لیے کتاب جامع میں اسے جمع کرلیا تھا، صرف وہی حصہ جس ابوخالد نے جمع کیا وہ قابل ذکر نہیں ہے۔ آپ نے دو مجموعے عمدہ قسم کے ایک حدیث میں دوسرا فقہ میں جمع کیا تھا۔ ان دونوں خبروں کے مابین توافق ممکن ہے، وہ اس طرح کہ ابوخالد نے امام سے حدیث لکھ لی

تھی، اور فقہ کا املا بھی کرلیا تھا، اور آپ سے سنا بھی تھا، اس بنیاد پر اس نے یہ دو مجموعے مرتب کئے تھے اور یہ کچھ مستبعد نہیں، اس لیے کہ ابو خالد نے حضرت زید کی خدمت میں مدینہ طیبہ میں کوئی پانچ سال گزارے تھے، اس کے بعد کوفہ آئے اور ابو خالد امام زید ہی کے پاس ہر سال حج کے مہینوں میں قیام فرماتے تھے اور امام زید کا زمانہ تصنیف و تالیف کا دور بن چکا تھا۔ اور اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مجموع جو ان دونوں موجود ہے، جمع و ترتیب دونوں کے لحاظ سے امام زید کی ہی تصنیف ہو، اس لیے کہ مجموعہ کے متن کا ناقل بہت سی حدیثوں میں یوں بیان کرتا ہے حدثني زيد بن علي اور فقہ میں کہتا ہے قال زيد بن علي۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابو خالد نے ان روایات کو امام سے بالمشافہ سن کر جمع کیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ امام نے اپنی بعض احادیث و علوم املا کرائی ہوں خواہ نہ کرائی ہوں پھر بھی ان کی کتاب میں موجود رہی ہوں۔ میرے نزدیک یہی عمدہ اور منقح معلوم ہوتا ہے کہ ابو خالد نے امام سے حدیث و فقہ دونوں ہی لکھی تھی، پھر اسے دو مجموعوں میں مرتب کر دیا، اس سے مجموعے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ یہ مجموع زید بن علی کا نہیں ہے۔

یہ مجموعہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو گیا تھا۔ ہم نے جو کچھ تصانیف اور مصاحف کے بارے میں عرض کیا ہے اس سے بھی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی دوسرا مجموعہ نہیں ہے جسے ہم دوسری صدی کی اولین تصنیف کہہ سکیں، البتہ امام مالکؒ کی موطا جس کی تصنیف دوسری صدی کے نصف اول کے قریب عمل میں آئی، اس طرح یہ تصنیف موطا سے ۳۰ سال پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔

اب جو مجموعہ چھپ کر ہمارے سامنے ہے جس میں فقہ و حدیث دونوں ہی ہیں، وہ فقہی اور حدیثی مجموعوں پر مشتمل ہے لیکن دونوں الگ الگ نہیں ہیں، اس لیے کہ ابو خالد ایک ہی بات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مرفوعہ کا ذکر کرتا ہے اور آثار علی کا بھی بیان ہوتا ہے، امام زید کی فقہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں ۲۲۸ حدیثیں مرفوع جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور حضرت علی کے آثار ۳۲۰ ہیں اور امام حسین سے صرف دو حدیثیں مروی ہیں۔

پورا مجموعہ فقہی ترتیب پر ہے۔ اس میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلاۃ، کتاب الجنائز، کتاب الزکاۃ، کتاب الصیام، کتاب الحج، کتاب المبیوع وغیرہ ہیں۔ کتاب مختلف أبواب پر مرتب ہے اور ہر باب کا آغاز باب ہی کے مناسب حدیث سے ہے جو مرفوعاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے یا امام علی پر موقوف ہے۔ اب ہم بعض نمونے بیان کرتے ہیں تاکہ مجموعہ کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

۱۔ من باب ما ينبغي أن يجتنب في الصلاة
(نماز میں جن چیزوں سے بچنے کا حکم ہے)

"قال حدثني زيد بن علي عن أبيه عن جده عن علي عليه السلام، قال: أبصر رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا يعبث بلحيته في الصلاة، فقال أما هذا فلو خشع قلبه لخشعت جوارحه"

"زید بن علی نے بواسطہ اپنے والد و دادا سے انہوں نے حضرت علی سے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کو نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے دیکھا، فرمایا اگر اس کا دل خاشع ہوتا تو اس کے جوارح بھی خاشع ہوتے"

"وقال زيد بن علي عليه السلام اذا دخلت في الصلاة فلاتلتفت يمينا ولا شمالا ولا تعبث بالحصى ولاترفع أصابعك ولا تنقض أناملك ولاتمسح جبهتك حتى تفرغ من الصلاة" (مسند الامام زید ص ۳۶۔۳۷)

"زید بن علی علیہ السلام نے فرمایا کہ جب نماز میں مشغول ہو جاؤ تو دائیں بائیں نہ متوجہ ہو، نہ کنکری سے کھیلو اور نہ انگلیاں اٹھاؤ، نہ پوروے چٹخاؤ، نہ چہرے کو پونچھو، تا آنکہ تم نماز سے فارغ ہو جاؤ"

۲۔ من کتاب البیوع، باب الکسب من الید

(کتاب البیوع کا باب، کسبِ ید)

"قال حدثنی زید بن علی عن أبیه عن جده عن علی علیه السلام قال: جاء رجل إلی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: یارسول الله أی الکسب أفضل؟ فقال صلی الله علیه وسلم عمل الرجل بیده وکل بیع مبرور فان الله یحب المؤمن المحترف ومن کد علی عیاله کان کالمجاهد فی سبیل الله عزوجل"

"زید بن علی نے بواسطہ اپنے والد و دادا حضرت علی سے بیان کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہا اے رسول خدا کون سی کمائی افضل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے کمانا بہترین کسب ہے، اور ہر سچائی کے ساتھ کی گئی خرید و فروخت، خدائے پاک صاحب حرفت مسلمان کو محبوب رکھتا ہے، جو اپنے عیال کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے"

زید بن علی نے اپنی سند سے حدیث بیان کی کہ میں نے علی علیہ السلام کو کہتے سنا کہ جس نے دنیا کو اپنایا اور حلال کمایا اور اپنے والدین، اہلیہ اور بچوں پر کرم فرمایا، خدائے پاک اسے قیامت کے دن اٹھائیں گے اور اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔

(مسند امام زید ص ۱۰۳)

۳۔ باقاعدہ تدوین

تدوین سنت کے مباحث پر لکھتے پڑھتے مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی، بالخصوص دور صحابہ و تابعین میں حدیث کی تعلیم دینے والوں کے سلسلے میں کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم اموی (۸۵ھ) نے احادیث نبوی کو جمع کرنے کا قصد کیا۔ لیث بن سعد محدث دیار مصر کی زبانی یہ بات میرے علم میں آئی کہ عبدالعزیز بن مروان نے کثیر بن مرہ حضرمی کے پاس لکھا، ابن مرہ نے ستر بدری صحابی رسول سے ملاقات کی تھی اور انھیں سند مقدم کہتے تھے،

آپ کے پاس لکھا کہ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو آپ سے مسموع ہے میرے پاس لکھ بھیجیں، بجز احادیث ابو ہریرہؓ کے وہ ہمارے پاس موجود ہیں، اس لیے کہ ابو ہریرہ کی حدیثوں کو عبدالعزیز بن مروان نے خود ابو ہریرہ سے سن رکھا تھا۔ امیر مصر نے کتابت حدیث کا اس شخص کو حکم دیا جو حمص کا بڑا عالم اور امام تھا، دوسرے طلب حدیث کا شائق حافظ اور ثقہ تھا، یہ اس دور کی بات ہے جب کہ وہ خود مصر کے گورنر تھے، (۶۵۔۸۵ھ) کے مابین۔ اور یہ بات قرین عقل و دانش بھی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ کثیر بن مرہ کا انتقال (۷۰۔۸۰ھ) کے مابین ہوا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیں کہ ان کی موت (۷۵) میں ہوئی تھی تو یہ مطالبہ کتابت حدیث اس سے پہلے ہی ہوا ہوگا۔ میری تحقیق یہ ہے کہ امیر عبدالعزیز بن مروان نے کتابت حدیث کی طلب امارت کے ابتدائی سالوں میں ہی کی تھی اس لیے کہ امیر مذکور میں علم اور اہل علم سے لگاؤ کا جذبہ تھا اور خدمت دین کی لگن تھی، البتہ تاریخ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ کثیر بن مرہ نے امیر عبدالعزیز کی باتوں کا ہاں میں جواب دیا یا نا میں۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کثیر نے وہ حدیثیں لکھ بھیجیں جو انھوں نے طلب کی تھی اور اگر لکھ بھیجا تو لکھی ہوئی احادیث کا ذخیرہ کتنا تھا، پھر یہ دفاتر مدون کر کے ہی رہ گئے، یہ سارے سوالات ہمارے سامنے ہیں جن پر بحث و تمحیص کی ضرورت ہے۔ جب حالات تاریخ کے اوراق سے ہوکر ہمارے سامنے آجائیں گے اس وقت ہم ان سوالوں پر روشنی ڈالیں گے، مگر جو کچھ ہے وہ درج ذیل ہے۔

ان ذمہ داروں کی حدیث کی حفاظت اور اس سے اشتغال کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے دیجیے کہ امیر کی طلب کا حسب خواہ اثر کثیر بن مرہ پر پڑا ہوگا، اگر امیر کو اس کا شبہ ہوتا کہ حمص کا امام اور محدث میری گزارشات پر دھیان نہ دے گا تو پھر وہ انھیں کہتا ہی کیوں؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کثیر بن مرہ نے والی مصر کی بات کا پرتپاک خیر مقدم کیا، اس لیے کہ خود کثیر کو اشاعت علم سے غیر معمولی لگاؤ تھا، اور ہم یہ مشکل سے باور کر سکتے ہیں کہ کثیر نے کچھ لکھا ہی نہیں، اس لیے کہ اس کی شہادت کسی معتبر ذریعہ سے نہیں مل سکی۔ ہمیں خدا سے توقع ہے کہ وہ حقیقت سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے اور ہمیں صحیح علمی معلومات بہم پہنچانے میں مدد دیں گے۔

اب اس کے بعد کہ کثیر بن مرہ نے والیِ مصر کی خواہشات کو پورا کرنا تسلیم کرلیا، ہمیں کہنے دیجئے کہ دوسری صدی کے نصف کے قریب ہی احادیث نبوی کا کچھ حصہ باقاعدہ مدون کرلیا گیا تھا۔ اس کی تائید امیر مصر کے اہتمام حفظ حدیث وتدوین حدیث سے ہوتی ہے اور اس کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے کہ زبانی یاد کرنے کے ساتھ ساتھ تدوین حدیث کا معاملہ بھی جاری رہا، اور عمر بن عبدالعزیز کی حکمرانی تک تدوین کا معاملہ پوشیدہ نہ رہا۔ اس سلسلے میں امیر مصر اور ان کے والد محترم دونوں کی بات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے اور ان دونوں کا حدیث کی باقاعدہ کتابت وحفاظت وتدوین میں بڑا ہاتھ تھا۔

اس لیے اس شہرت کی ہم تردید نہیں کرسکتے کہ حدیث کی تدوین پہلی صدی ہجری کے آخری دنوں میں عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں عمل میں آئی، بلکہ ہم اس بحث کی تاریخی حیثیت کی کلید آپ کے ہاتھوں دینا چاہتے ہیں کہ تدوین حدیث پہلی ہی صدی میں ہوگئی تھی۔ اس شہرت کی مخالفت وموافقت دونوں یکساں ہے، یہ کلید حدیث کے ذخیرہ میں موجود ہے جسے اس بات کا انتظار ہے کہ دیکھیں کب اس کا چہرہ سامنے آتا ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نئی بات نہیں کہہ رہے ہیں نہ کوئی نئی چیز پیش کررہے ہیں، بلکہ ماضی کے مخفی جواہرات پر جو گرد چڑھ گئی ہے اسے جھاڑنا چاہتے ہیں اور یہ خیال ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کا مسئلہ اب آپ کے سامنے واضح انداز میں آگیا ہوگا۔

تدوین حدیث کے بارے میں مستشرقین کی آراء

آپ نے ابھی پڑھا کہ مسلمانوں نے حدیث نبوی علیٰ صاحبہ السلام کو سینوں اور سفینوں دونوں میں محفوظ رکھا۔ اس طرح سنت مطہرہ کی حفاظت میں حافظہ، قلم، صحیفے اور دفاتر سب برابر کے شریک رہے اور حدیث کی حفاظت کو اپنا سب کچھ بنا کر سینوں کے پہلو بہ پہلو سفینے بھی رہے۔ انفرادی رسمی تدوین کے مراحل بھی ہمارے سامنے ہیں اور عہد نبوی میں ہی تدوین حدیث کا آغاز اور صحابہ وتابعین کے دور میں اس کی تکمیل بھی ہماری نگاہ میں ہے یہ

ایک ثابت شدہ امر ہے، جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں بلکہ گمان وشبہ تو اس کے پاس بھی پھٹک نہیں سکتا۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ حفظ حدیث خلافت عمر بن عبدالعزیز اور اجازت سرکاری کی محتاج نہ تھی بلکہ ان ادوار سے کہیں پہلے تدوین کا کام شروع ہو چکا تھا البتہ عمر بن عبدالعزیز کا بحیثیت حکمراں کے اس کار خیر میں شریک ہونا اور اس کی نگرانی کا بار اٹھانا اور علماء کو جمع حدیث وتصنیف حدیث پر ابھارنا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ تصنیف کا یہ سلسلہ دوسری صدی کے نصف اول ہی میں شروع ہو چکا تھا، اور اس سرپرستی کے ثمرات کثیر مصنفات کی صورت میں جسے اوائل مصنفین نے سلطنت اسلامی کے مختلف خطوں میں شروع کر رکھا تھا ہمارے سامنے آئے۔

ہمیں اس سے کوئی تعجب نہیں اگر مستشرقین نے اس کا اعلان کیا کہ سنت اسلامی سلطنت کے ابتدائی دنوں میں ہی مدون ہو چکی تھی، ان میں سے بعض نے اس میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی ہے، اور بعض نے بہت عمدہ انداز میں اس کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ جولڈ تیسیہر نے اپنی کتاب ''دراسات اسلامیہ'' میں ایک خاص باب باندھا ہے اور اس میں تدوین حدیث دوسری صدی کی ابتدا میں ہی ثابت کیا ہے۔ اس کی کتاب کی فصل اول جس میں بعض اخبارات کی سندیں پیش کی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض صحیفے خود عہد نبوی میں مرتب ہو چکے تھے، مگر اس سلسلے میں شکوک کا ایک جال اور شبہات کی ایک فصیل کھڑی کر دی ہے اور اس سے اس کی دو غرضیں ہیں، ایک یہ ہے کہ ان ثقات کو کمزور گردانا جائے جنھوں نے سنت کو ابھارنے اور سفینوں میں محفوظ کرنے کا نظم کیا، اس طرح کے دوسری صدی ہجری میں لوگوں نے کتابت پر اعتماد کر لیا تھا اور دوسرے حدیث کو مدون کرنے والوں کو گھڑنت اور خود ساختگی کا الزام دینا کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات ومقتضیات ہی گھڑ لیا اور ان کی زندگی کے بارے میں جو خیالات وآراء تھیں انہی کی ان حدیثوں میں ترجمانی کی۔

سوفاجیہ۔ مستشرق نے کتابت حدیث پر اپنی کتاب ''الحدیث عندالعرب'' میں جو کچھ لکھا ہے کہ زبانی روایات سے سنت کی صحت تک نہیں پہنچا جا سکتا، اور بہت سی دلیلیں

احادیث کے جمع وغیرہ کرنے کے سلسلے میں لکھیں ہیں کہ گو حدیث کی تدوین ابتداء اسلام میں ہوگئی تھی، مگر خود حضور کے زمانے میں ایسا نہیں ہو سکا تھا، اس کی زہر آمیز بات بھی جولڈ ٹیسیہر سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔

ڈاکٹر صبحی الصالح نے لکھا ہے کہ دوزی اپنی معتدل رائے سے بہت سے کبار علماء کو فریب دے دیتا ہے چہ جائے کہ متوسط درجے کے متعلمین۔ یہ مستشرق اس بات کا قائل ہے کہ رسول خدا کی احادیث کا بڑا حصہ سینوں میں محفوظ تھا، اور سفینوں میں بھی اسے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ جمع کیا گیا، جس کی مثال نہیں، مگر موضوعات اور اکاذیب حدیثی کی تعداد بھی خاصی تھی جو ان کتابوں میں لکھی ہوئی تھی، گویا ان کے جمع کئے جانے کا انداز بھی فطری ہی تھا، کہ اچھی خراب بھی طرح کی چیزیں جمع کر لی گئیں۔ ان میں بہت سی ایسی روایات ہیں جن کی صحت کا وثوق کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے اور شک کا کوئی پہلو نہیں نکلتا اور بخاری کی نصف حدیثیں بھی اس معیار نقد پر پوری اترتی ہیں، خواہ تنقید کرنے والے کتنے ہی سخت و متشدد ہوں، اس کے باوجود بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے ذکر سے ان کتابوں کو خالی ہونا چاہیے تھا۔ اس مستشرق کی بحث کا مقصد خالص علمی جستجو سے متعلق نہیں ہے، جب اس نے حدیث کے ایک بڑے حصے کی صحت کا اعتراف کر لیا بلکہ اول و آخر امر میں وہ کون و مکان، انسان و زندگی سے متعلق سنت مطہرہ کے مستقل نظریات پر غور و خوض کرتا ہے اور یہ نظریات ایسے ہیں جن کے استقلال کو مستشرقین کی تنقید و تجریح دفع نہیں کر سکتی، کیونکہ ان نظریات کا سوتا نہ ہی عاجز مغربی دماغ سے ملتا ہے اور نہ ہی یہ مغرب کی بے مہار زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

مستشرق شبرنجر نے خطیب بغدادی کی کتاب "تقیید العلم" کہیں سے پالی اور اس میں سے ایسے شواہد و دلائل نکالنے میں کامیاب ہوگیا کہ مسلمانوں کی تدوین حدیث بعد کے زمانہ کی ہے اور اس پر ایک مقالہ لکھ مارا۔

جولڈ ٹیسیہر نے اپنے پیشرو شبرنجر کی اتباع حرف بحرف کی اور اس نظریہ کی تائید کی کہ مسلمانوں نے حدیث بعد کے زمانہ میں جمع کر لیا ہے، مگر وہ اپنے پیشرو کی رائے کی پاسداری

میں رہا اور وہی بات شروع کی جو خطیب بغدادی سے اس کے پیشرو نے نقل کی تھی۔ کبھی کہتا ہے کہ رسول خدا نے کتابت کی اجازت دے دی تھی، کبھی اس کے منع کیے جانے کا دعویٰ کرتا ہے، کبھی صحابہ کے کتابت پر ابھارنے کی بات کرتا ہے، کہیں ایسی روایتیں لاتا ہے، جس سے کتابت کی ممانعت ہوتی ہے، اور بعض تابعین کے مخطوطوں کا ذکر کرتا ہے، پھر ایک دوسرے کے انکار کا شکوہ بیان کرتا ہے۔ ان باتوں سے بجز ذہن بگاڑنے کے کچھ دوسرا مقصود نہیں ہوتا اور کسی جگہ وضع حدیث اور فریب کاریٔ رواۃ کے ذکر سے بھی باز نہیں آتا۔ گویا دو نبرد آزما جماعتیں ہیں جنہوں نے اخبارات کو اپنا ہتھیار بنالیا ہے، ہر ایک اس کے ذریعہ سے اپنی رائے کو وقیع بناتا ہے اور دوسرے کا کاٹ کرتا ہے اور شکست و فتح کے میدان میں ایک دوسرے پر بازی مارنے میں لگا رہتا ہے۔ آگے اس نے کہا کہ اہل الرائے جنہوں نے فروع شریعت کو اپنی عقل و اجتہاد سے وضع کیا اور حدیث رسول کو کمتر سمجھا، ان کی دلیل یہی تھی کہ حدیث رسول ایک عرصہ تک قلم بند نہیں کی گئی، اس سے اس کی اصل ساکھ مجروح ہو گئی ہے، اور اس کی حیثیت بحالہ باقی نہیں رہی، پھر اپنی اس رائے کی انہی احادیث سے تائید کی جن کے خالق خود وہی ہیں، اور یہ بات ثابت ہے کہ وہ لکھی نہیں گئیں اور ان کے مخالف اہل حدیث اپنی تائید میں حدیثیں گھڑنی اور کتابت کی اباحت میں حدیث رسول بیان کرنی شروع کر دی۔

جولڈ ٹیسیہر بھی کہتا ہے کہ جو لوگ کتابت کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اپنی تائید میں حدیثیں لاتے ہیں، اور دیگر علوم کے لکھنے کے جواز کے قائل ہیں، پھر ایسی باتیں رکھتے ہیں جو ان کے دعویٰ کا ثبوت بن جائیں تاکہ اختلاف فقہی میں ان کی روایات قابل حجت سمجھی جائیں۔ گویا جولڈ ٹیسیہر ان دو گروپوں کو متحارب ثابت کرنا چاہتا ہے اور مفکرین اسلام کو دو متضاد ٹولیوں میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اپنے دعوؤں کے اثبات کے لیے یہ دونوں گروپ جھوٹ بولنے سے بھی ابا نہیں کرتا۔ اس کے یہ بدترین تخیل، برے تصور اور گندے خیالات ہیں۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تقیید العلم کتاب کی اشاعت دمشق سے ہوئی اور وہیں سے اس پر

باریک تحقیقی نوٹ پورے آب وتاب سے ڈاکٹر یوسف العش کے قلم سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب پر ایک فاضلانہ محققانہ نوٹ لکھا جس میں جولڈ ٹیسیہر کی اغلاط کی نشاندہی کی اور اس کے ڈھول کا پول کھولا۔ وہ الفاظ یہ ہیں کہ جواز کتابت کے امتناع کے قائلین اہل الرائے ہیں اور جواز کتابت کے تسلیم کرنے والے محدثین ہیں۔ ڈاکٹر یوسف نے اس رائے کو سامنے رکھ کر لکھا کہ ان دونوں گروہوں میں باہم اختلاف نہ تھا، اس لیے کہ اہل الرائے میں جو لوگ کتابت کے عدم جواز کے قائل تھے ان میں عیسیٰ بن یونس (۱۸۷ھ) حماد بن زید (۱۷۹ھ) عبداللہ بن ادریس (۱۹۲ھ) سفیان ثوری (۱۶۱ھ) ہیں اور انہی اہل الرائے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کتابت کے جواز کے قائل ہیں، جیسے حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ) لیث بن سعد (۱۷۵ھ) زائدہ بن قدامہ (۱۶۱ھ) اور یحییٰ بن الیمان (م ۱۸۹ھ) وغیرہ ہیں، اور محدثین میں سے جنہوں نے کتابت کو ناپسند کیا وہ ابن علیہ (۲۰۰ھ) ہشیم بن بشیر (۱۸۳ھ) عاصم بن ضمرۃ (۱۷۴ھ) وغیرہ ہیں، اور جن محدثین نے کتابت کی اجازت دی جیسے بقیۃ الکلاعی (۱۹۷ھ) عکرمہ بن عمار (۱۵۹ھ) مالک بن انس (۱۷۹ھ) وغیرہ ہیں۔

ان براہین قویہ کی روشنی میں ڈاکٹر یوسف نے جولڈ ٹیسیہر کی رائے کے تار و پود بکھیر دیے اور انھوں نے جو خیالی خاکہ بنایا تھا اسے تتر بتر کر دیا اور پورے غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ صرف ایک ہی گروہ کے پلے باندھی جاتی، بلکہ اس میں دونوں فریق یکساں طور پر حصہ دار ہیں، اس لیے کہ ہر دھڑا الگ الگ نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے افراد ایک دوسرے میں گُتھے ملتے ہیں، ہر فریق کے کچھ افراد دوسرے فریق کے ساتھ ہیں، اور مسئلہ کی حقیقت پر غور کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ہر ایک کی رائے ذاتی خیال کی بنیاد پر ہے یا انفرادی میلانات اس کا سبب ہیں۔ کسی ذوق خاص کی بنیاد پر یا کسی راسخ عادت کی وجہ سے ہر ایک ایک دوسرے سے الگ بھی ہے اور ایک دوسرے سے مختلط بھی ہے، دونوں فریق کا ایک ہی نقطۂ نظر ہے۔ اگر دونوں کا فرق بنیادی ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کے دفاع میں لگ جاتے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے۔

ہمارے سامنے جو حالات ہیں اور امت محمدیہ نے جس طرح احادیث نبوی کو اپنی اصل پر باقی رکھنے کی کوشش کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے مستشرقین کی باتوں کا تسلیم کرنا ہمارے لیے مشکل ہے، خصوصیت سے ان کی آراء کا جو پوسٹ مارٹم ہم کر چکے ہیں اس کی روشنی میں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم ان کی رائے کو تسلیم کر لیں۔ سنت نبوی عہد نبوی ہی سے سینوں میں سموئی جا چکی تھی اور اس کے کچھ حصے مکتوب ہو کر کتابچے کی صورت میں بھی تھے، اور ان صحائف پر ہمیشہ اور ہر دور کے مسلمانوں نے توجہ کی اور یکے بعد دیگرے نقل کرتے رہے۔ اس کی حفاظت کی صورت تدریس اور کتابت دونوں ہی تھی۔ اپنی سکت بھر ان لوگوں نے اس کی حفاظت کی کوشش کی، ان کی سندوں کو پرکھا، اور مسانید و مصاحف کی صورت میں اہل علم کے سامنے پیش کیا کہ وہ قوی و ضعیف حدیثوں کی نشاندہی کریں تاکہ حدیث نبوی میں دروغ بیانی کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔ پھر محدثین نے حفظ حدیث کے لیے جو قواعد بنائے تھے ان کی روشنی میں حدیث صحیح کے جمع کرنے کی مہم شروع کی، اس کے لیے انھوں نے خود سفر کیے اور خود اپنے کانوں سے حدیث سنی، اور سکت بھر حدیث کی حفاظت میں لگ گئے، اپنے ہاتھوں سے لکھا، اور اس کے نتیجے میں ایسی کتابیں سامنے آئیں جو ضعف سے خالی حدیثوں پر مشتمل تھیں، اور امت اسلامیہ نے اس کی صحت پر اجماع کیا، اس کو اپنا لائحۂ حیات بنانے کی بھی سعی جاری رکھی، اور بخاری و مسلم کی صحت پر تو اپنے تو اپنے تھے غیروں نے مہر تصدیق ثبت کی۔ اس طرح مستشرقین نے بعض حقائق علمی کو تسلیم کیا اور مصادر اسلامی نے جن حقائق کو ثابت کیا تھا اس کا ایک حصہ انھوں نے بھی خواہی نخواہی مان ہی لیا۔ اس لیے ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ ہم صحاح ستہ کے بارے میں کسی طعن و تشنیع کو برداشت کریں، خواہ روایات میں کتنے ہی تطورات کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح ہم ان کی اس بات کو بھی کہ وہ حدیث کے اثبات کے ذرائع کو کمزور کرنے کی سعی کریں تو اسے ہم کیسے برداشت کر لیں، جب کہ ہم کو بہ وثوق سے معلوم ہے کہ عہد نبوی میں ہی بعض احادیث کی کتابت ہو چکی تھی۔ اس لیے حفظ حدیث اور کتابت حدیث میں کوئی تعارض نہیں رہا کہ ایک کے موجود ہونے سے دوسرے کی نفی کی ضرورت پیش آئے۔

خلاصہ بحث تدوین

۱۔ رسول خداؐ کی احادیث خود آپؐ کے زمانے ہی میں اور عہد صحابہ و تابعین میں مدون ہو چکی تھیں۔ ہمیں یہ مدون شدہ احادیث مسانید صحاح اور بعض انفرادی حیثیتوں سے پہنچیں۔ ان مکتوب صحائف میں سب سے زیادہ شہرت رسول خدا کے ان صحیفوں کو ہوئی جو عہد نبوی میں مسلمانوں اور یہود مدینہ کے پاس تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے صحیفہ صادقہ اور حضرت جابر کے بعض نوشتے اور سب سے قدیم دستاویز جو ہم کو ملی ہے، ہمام بن منبہ کا صحیفہ ہے جو عہد صحابہ ہی میں پہلی صدی کی چھٹی دہائی میں انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سن کر لکھ لیا تھا اور پھر اسے سنا کر اس کی تصحیح بھی کر لی تھی۔

۲۔ تفتیش و جستجو سے پتہ چلا کہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی زمانے ہی میں کثرت سے کتابیں اور مصنفات منظر عام پر آ چکی تھیں۔

۳۔ اگر مجموع زید کی نسبت امام زید کی طرف صحیح ہے جو ہمارے نزدیک بھی تقریباً پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے تو یہ مضبوط دلیل ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی مصنفات حدیثی موجود تھے۔

۴۔ امیر مصر کا پہلی صدی ہجری کی آٹھویں دہائی میں حدیث جمع کرنے کا اہتمام اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ مسلمان حکمراں غیر معمولی طور سے جمع حدیث نبوی پر متوجہ تھے اور انھوں نے اس کا خاص اہتمام کیا اور باقاعدہ حدیث جمع کرنے اور اس کی کتابت کرنے میں خود بھی لگے رہے اور دوسروں کو بھی اس پر ابھارا، اور وہ بھی اس دور میں جسے چوتھائی صدی سے پہلے کہنا درست ہے۔

۵۔ مستشرقین کی غیر ضروری بحثوں اور اس کا طریقۂ تحقیقات غلطیوں سے پاک نہ رہ سکا، چاہے یہ غلطیاں جان بوجھ کر ہوئی ہوں یا لغزش قلم کے نتیجہ میں ہی کیوں نہ ہوئی ہوں۔ مستشرقین نے یہ گمان کر کے کہ کتابت وعدم کتابت کے قائلین دو متحارب قوتیں تھیں، اپنی

اصابت فکر کا ثبوت نہیں دیا اور ہر طرح کی غلط اندیشی انھوں نے خود اپنے اوپر مسلط کی کہ جو لوگ تدوین حدیث کے منکر ہیں یعنی اہل الرائے انھوں نے اپنے میلان و رجحان کے مطابق حدیثیں گھڑ کر ثبوت فراہم کر لیا اور اہل حدیث نے ایسی حدیثیں وضع کیں جن سے تدوین حدیث کا ثبوت بہم پہنچ جائے، اس طرح وہ اپنی منزل مقصود پانے کے لیے ہاتھ پیر مارتے رہ گئے، اس کے لیے انھوں نے ایسی حدیثیں ڈھونڈھ نکالیں جو ان کو منزل مقصود تک لے جانے میں حارج نہ ہوں، حالانکہ فقہائے اسلام، محدثین امت محمدیہ ان مستشرقین کے غلط تصور سے کہیں بالاتر ہیں جنھوں نے شریعت اسلامی کی حفاظت کے لیے وہ وسائل اور طریقے استعمال کیے تاکہ حفاظت حدیث میں آسانی ہو سکے۔

اب جب کہ تاریخ احادیث نبوی ہمارے سامنے ہے کہ رسول خداؐ کے عہد سے لے کر دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک کتابت حدیث کی تاریخ و تدوین حدیث کی تاریخ پیش کر دی، ان لوگوں نے حفاظت حدیث، کتابت حدیث اور روایت حدیث کا بار گراں ایک گروہ سے دوسرے گروہ، ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل کیا، اور احادیث نبوی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو کر ہم تک پہنچی۔ اب آگے ان رواۃ سے واقفیت کی ضرورت ہے جو دور صحابہ و تابعین میں اس عمل روایت حدیث وغیرہ سے لگے ہوئے تھے، تاکہ ان حضرات کی مساعی کی قیمت معلوم ہو جائے جنھوں نے سنت کی حفاظت ہر زمانے میں کی اور ہم تک اس کو پہنچانے میں پوری امانت داری کا مظاہرہ کیا، اس لیے کہ یہی لوگ رسول خدا تک پہنچنے کی سند ہیں اور ذریعہ بھی۔

پانچواں باب
فصل اوّل

صحابہؑ کرام وتابعین عظام میں جلیل القدر راوی حضرات

صحابی کی تعریف:

صحابی لغت میں صحبت سے مشتق ہے، صحبت کے لیے وقت مقررہ کی قید نہیں، بلکہ زیادہ دنوں تک صحبت میں رہنے والے اور تھوڑی مدت صحبت میں گزارنے والے دونوں پر ہی صحبت کا لفظ یکساں بولا جاتا ہے۔ جس طرح کہ مکالم، مخاطب اور ضارب مشتق ہیں، مکالمہ، مخاطبہ اور ضرب سے اور ان کا اطلاق کم وبیش سب پر ہوتا ہے، اسی طرح تمام اسماء مشتقہ جو کسی فعل سے مشتق ہوتے ہیں کا حال ہے۔

چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سال بھر، ایک عرصۂ دراز، پورے مہینہ، یا دن بھر، یا گھنٹہ بھر، صحبت میں رہا، ان سب پر صحبت کا لفظ یکساں بولا جاتا ہے اس میں کم وبیش کا کوئی لحاظ نہیں۔

محدثین کے نزدیک صحابی کی تعریف:

ہر وہ مسلمان جس نے بحالت ایمان رسولؐ خدا کو دیکھ لیا، چنانچہ بخاری نے صحیح میں بیان کیا کہ جو خدا کے رسول کی صحبت میں رہا یا آپ کو بحالت اسلام دیکھا وہ آپؐ کے اصحاب میں ہے۔
احمد بن حنبل نے اصحاب نبی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ بدر کے شرکاء کے بعد حضور کے دوسرے صحابہ افضل الناس ہیں، جس کسی نے آپ کی صحبت سے ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن، یا چند گھنٹے فیضیاب ہوا، یا آپ کی زیارت ہی کر لی ہو وہ صحابی ہے۔ اس کو صحبت کی فضیلت اس کی صحبت کے زمانے کے مطابق حاصل رہے گی۔ یا آپ سے اس کا کوئی معاملہ

رہا، یا آپ کی کوئی بات سنی، آپ کو دیکھ لیا ان سب صورتوں میں اسے فضل علی قدر صحبت نصیب رہے گا۔ ابن الصلاح نے لکھا ہے کہ ابو مظفر سمعانی مروزی سے یہ روایت ہے کہ محدثین لفظ صحابی کا اطلاق اسی پر کرتے تھے جس نے آپؐ سے کوئی حدیث روایت کی یا ایک کلمہ ہی آپؐ سے نقل کیا، پھر اس میں اس حد تک توسع کیا کہ اسے بھی صحابی شمار کرتے جس نے آپؐ کو صرف اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور یہ آپ کی قدر افزائی کی بنا پر ہے کہ جس نے بھی آپؐ کی زیارت کر لی اس پر صحابی کا لفظ بولا جانے لگا۔

دوسروں کا کہنا ہے کہ روایت کی تصدیق ایک حدیث یا دو حدیث کی روایت سے زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔ واقدی نے بیان کیا کہ میں نے اہل علم کو یہ کہتے سنا کہ جس نے رسولؐ خدا کی زیارت بلوغ عمر کے ساتھ کی، اسلام لایا اور دین کے امور کو سمجھنے کی بات کی اور اس سے راضی رہا، پھر ایسا شخص ہمارے نزدیک ان لوگوں میں ہے جس نے صحبت رسول کا شرف حاصل کر لیا، خواہ یہ صحبت پورے دن کے چند گھنٹے ہی رہی ہو۔

واقدی کی اس تعریف سے صحابہ کی ایک جماعت جس نے آپ کو دیکھا مگر بالغ نہ تھے، نکل جاتی ہے گو انھوں نے آپؐ سے روایت کی ہو جیسے عبداللہ بن عباس، حسن و حسین، ابن الزبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اسی بنا پر عراقی نے کہا کہ صحبت کے لیے بلوغ کی قید زیادہ پسندیدہ نہیں۔

امام التابعین سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ ہم اسی کو صحابی تسلیم کرتے ہیں جو حضورؐ کے ساتھ سال دو سال رہا اور کسی ایک یا متعدد جنگوں میں شریک ہوا۔

ابن صلاح نے یہ نقد کیا کہ آپ کی مراد اگر آپ کی طرف اس روایت کی نسبت صحیح ہے تو یہ اہل اصول کا انداز فکر ہے، آپ کی اس عبارت میں تنگی کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جریر بن عبداللہ البجلی اور آپ جیسے لوگ صحابہ میں شمار نہ ہوں۔

عراقی نے اس کی تردید کی ہے، اور کہا ہے کہ اس مقولہ کی سعید بن المسیب کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس روایت میں محمد بن عمر واقدی جیسا ضعیف الحدیث موجود ہے۔

ابن جوزی نے کہا کہ عام طور سے علماء ابن مسیب کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر چکے، اس

لیے کہ انہوں نے جریر بن عبداللہ البجلی کو صحابہ میں شمار کیا ہے جو ۱۰ھ میں لائے، اور انھیں بھی صحابہ میں شمار کیا جو اسلام لائے مگر کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئے، اور جو حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت کم سن تھا کہ آپؐ کی صحبت اور آپ کے ساتھ سفر سے محروم رہا، اسے بھی صحابہ کے ساتھ ملحق کرنا درست ہے، اگرچہ اس کو حقیقت میں صحبت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

ابن حجرؒ نے لکھا کہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ صحابی جس نے حضورؐ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو، اور اس پر اس کی موت ہوئی وہ صحابی ہے۔ اس کی صحبت کا وقت کتنا ہے، اس سے کوئی بحث نہیں، نہ اس سے کہ اس نے روایت کیا یا روایت نہیں کیا، آپ کا شریک غزوات رہا کہ نہیں رہا، جس نے آپ کی زیارت کر لی گو صحبت نہ اٹھائی ہو یا کسی عارض کی وجہ سے مثلاً اندھاپن کی بنا پر نہ دیکھ سکا وہ صحابی ہے، جمہور علمائے محدثین کے نزدیک یہی صحیح ہے۔

حضرت انسؓ صحابی کے نزدیک حضور علیہ السلام کی رویت محض سے مشاہدہ کرنے والا صحابی نہیں بن جاتا۔ شعبہ نے موسیٰ السلانی سے روایت کیا اور آپ کے قصیدے پڑھے، آپ نے انس بن مالک سے دریافت کیا کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا صحابی بھی باقی رہ گیا؟ فرمایا کہ بہت سے اعراب نے آپؐ کی زیارت کی مگر آپ کی صحبت نصیب ہوا ایسا نہیں ہے، مسلم نے ابوزرعہ کی مجلس سے اسے نقل کیا۔

ابوبکر باقلانی (۳۳۸-۴۰۳ھ) نے صحابی کی لغت کی رو سے تعریف کرنے کے بعد یوں نقل کیا کہ اسی طرح لغت میں کہا جاتا ہے کہ میں فلاں کی صحبت میں رہا پورے سال، ایک عرصۂ دراز، ایک ماہ، ایک دن یا ایک گھنٹہ۔ غرض لغت میں اس لفظ کا اطلاق اس کے لیے ہے جس نے جناب نبی کریمؐ کی صحبت اختیار کی گو دن کا مختصر حصہ ہی سہی، اور اشتقاق اسم کی اصل بھی یہی ہے، مگر امت کا مروج عرف یہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال محض اس شخص کے لیے کرتے ہیں جس کی صحبت زیادہ ہو، اور اکثر ملاقاتیں رہی ہوں، تھوڑی دیر کسی کی صحبت میں رہنے والے کے لیے اس لفظ کا استعمال بہتر نہیں سمجھا گیا ہے، یا چند قدم کسی کے ساتھ چلنے والے یا کوئی بات سننے والے کو صاحب نہیں کہتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ لفظ

اسی شخص کے لیے استعمال کیا جائے جس کی صحبت لمبی اور ملاقاتیں زیادہ رہی ہوں۔ ان سب کے باوجود ثقہ کی خبر مقبول و معمول بہ ہے، خواہ اس کی ملاقاتیں لمبی نہ رہی ہوں اور ایک حدیث کے سوا کوئی دوسری حدیث نہ سنا ہو، اس لیے حضرت انس کا قول عرف امت کے مخالف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صحابہ کے درجات اسلام لانے میں تقدم اور مصائب انگیز کرنے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

میرا اپنا رجحان جمہور کے ساتھ ہے اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ جس صحابی نے حضورؐ سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی اس کی عدالت اہل علم کے نزدیک مسلم ہے۔ اس میں اہل نقد کا کوئی اختلاف نہیں ہے جن کی تنقید سے رواۃ میں سے کوئی نہیں بچ سکا۔ یہ بحث عدالت صحابہ کے وقت اور واضح ہو جائے گی۔

اہل اصول کے نزدیک صحابی وہ ہے جس کی مجالست حضور اکرمؐ کے ساتھ لمبی رہی ہو، پھر اس میں آپؐ کی اتباع اور آپؐ سے علم لینے کی شرط بھی ملحوظ ہے۔ اصولیین سے قریب تر سعید بن المسیب اور انس بن مالک کا قول ہے۔

طبقات صحابہ:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اصحاب حدیث صحبت کا لفظ ہر اس شخص پر بولتے ہیں جس نے حضورؐ سے کوئی حدیث، کوئی کلمہ روایت کیا ہو، اس میں اور وسعت دے کر انھوں نے ہر اس شخص کو جس نے آپؐ کو دیکھ لیا، صحابی شمار کرتے ہیں، اس لیے کہ آنحضورؐ کی منزلت کا شرف اس بات کا طالب ہے۔ ہاں صحابہ کے مختلف طبقات و درجات ہیں۔ انہی صحابہ میں وہ ہیں جو پہلے مرحلے میں اسلام لائے، ان کی صحبت حضورؐ کے ساتھ عرصہ طویل تک رہی، دعوت اسلامی کے لیے اپنے مال اپنی جان کی قربانی دی۔ انہی صحابہ میں وہ شمار ہوتے ہیں جو حجۃ الوداع کے موقع پر صرف ایک بار آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ پھر ان میں بھی مختلف طبقات و درجات ہیں، ہر ایک کے مرتبے الگ الگ ہیں۔ انہی صحابہ میں وہ بھی ہیں جنھوں نے آپؐ

کی صحبت دن ورات کے ہر حصہ میں یکساں حاصل کی، آپ کے ہم صحبت رہے، عام حالات میں، حج کے موقع پر، آپؐ کے دکھ سکھ کے ساتھی رہے، آپؐ کی تکلیف وراحت میں ہم نشیں رہے، جہاد ومبارات میں جلیس رہے، آپ سے اعمال کی حقیقت معلوم کی اور سنتوں کی گہرائیاں علم میں لائے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام صحابہ ایک ہی درجہ کے ہیں، انصاف وعقل بھی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اس پر اجماع امت ہے کہ صحابہ مختلف طبقات ودرجات کے حامل تھے۔ البتہ مصنفین نے صحابہ کو مختلف طبقوں میں منقسم کرنے پر ضرور اختلاف کیا ہے، چنانچہ ابن سعد نے صحابہ کے پانچ طبقات متعین کئے، جب کہ حاکم نے صحابہ کو بارہ طبقوں میں تقسیم کیا، بعض نے اس سے بھی زائد طبقات شمار کیے ہیں۔

حاکم کی بات زیادہ قرین انصاف ہے، اس طرح یہ طبقات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ پہلا طبقہ وہ صحابہ جو مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں سرفہرست رہے، جیسے خلفائے اربعہ۔
۲۔ صحابہ کی وہ جماعت جو دارالندوہ میں کفار مکہ کی سازش بندی سے پہلے ایمان لائی۔
۳۔ ہجرت حبشہ کے شرکاء صحابہ۔
۴۔ عقبۂ اولیٰ کے شرکاء۔
۵۔ عقبۂ ثانیہ کے شرکاء جن میں سے اکثر انصار مدینہ تھے۔
۶۔ مہاجرین کا وہ طبقہ جو حضور علیہ السلام کے پاس قباء میں مدینہ کے داخلہ سے پہلے پہنچ گیا تھا۔
۷۔ شرکاء غزوۂ بدر۔
۸۔ مہاجرین کا وہ گروہ جو بدر وحدیبیہ کے درمیانی وقفہ میں ہجرت کر گیا۔
۹۔ بیعت رضوان کے وہ شرکاء جو حدیبیہ کے موقع پر شریک بیعت ہوئے۔
۱۰۔ فتح مکہ وحدیبیہ کے درمیانی وقفہ میں ہجرت کرنے والے جیسے خالد بن الولید، عمرو بن العاص وابو ہریرہ۔

۱۱۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والے صحابہ۔
۱۲۔ کمسن بچے، نابالغ لوگ جنھوں نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ صحابہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر وحضرت عمر ہیں۔ان دونوں حضرات کی افضلیت پر صحابہ وتابعین کا ہر طبقہ متفق ہے۔ پھر ان دونوں کے بعد حضرت عثمان پھر حضرت علی کا درجہ تسلیم کیا گیا ہے۔خطابی نے کوفہ کے اہل سنت کا قول، حضرت علی کی افضلیت، حضرت عثمان پر لکھا ہے۔ابن خزیمہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پھر ان چاروں کے بعد عشرۂ مبشرہ، پھر شرکاء بدر، پھر شرکاء غزوۂ احد، پھر شرکاء بیعت رضوان اور دونوں عقبوں میں سے انصار کی قربت وفضیلت کے بھی قائل ہیں۔اسی طرح السابقون الاولون اور یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے قبلتین کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ شرکت کی۔ابن مسیب ابن سیرین وقتادہ اسی کے قائل ہیں۔امام شعبی کے قول کے مطابق بیعت رضوان کے شرکاء سابقون اولون میں ہیں۔محمد بن کعب عطاء بن یسار، اہل بدر کو اس شرف سے نوازتے ہیں، بعض نے کہا کہ سابقون اولون میں وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، اور یہی حسن بصری کا بھی قول ہے۔

صحابی کی پہچان:

صحابی حسب ذیل نشانیوں سے پہچانے جاتے ہیں:

۱۔ بذریعہ خبر متواتر جیسے ابوبکر وعمر بقیہ عشرۂ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔
۲۔ خبر مشہور یا خبر مستفیض جو متواتر کی حد سے کم تر ہو، جیسے عکاشہ بن محصن، ضمام بن ثعلبہ۔
۳۔ کوئی صحابی کسی دوسرے صحابی کے بارے میں اطلاع دے کہ یہ صحابی ہیں جیسے حممہ الدوسی جن کا انتقال اصبہان میں بمرض اسہال ہوا، ان کے بارے میں ابوموسیٰ اشعری کی شہادت ہے کہ انھوں نے حضورؐ سے حدیث سنی تھی۔

۴۔ کسی کا خود کو حضورؐ کا صحابی بیان کرنا جب کہ اس کی عدالت اور حضور کے ہم زمانہ ہونے کا ثبوت مل جائے۔

۵۔ کوئی تابعین میں سے اس کی خبر دے کہ وہ صحابی ہیں اور اس کی چھان بین ہو چکی ہو۔

اس طرح تیسری اور پانچویں دلیل ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں۔ ہمارا کہنا ہے کہ اس کی خبر وہ دے جن کی شہادت قبول کی جا چکی ہے، اس لیے کہ صحبت ایک درجۂ عالی ہے جو بلا دلیل بلا اثبات دعویٰ کے قابل قبول نہیں، بلکہ اس کی ساری شرائط کی تکمیل ضروری ہے، اور جب اس درجہ کی دلیل سامنے آجائے تو اسے شرف صحبت سے محروم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

عدالت صحابہ:

صحبت نبوی سب سے بڑا شرف ہے۔ صحبت نبوی کی وجہ سے انسان کو خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل سنت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو بھی صحابی ہوگا اسے عدول کہیں گے، خواہ ان کو فتنہ سے دوری رہی ہو یا فتنہ سے قربت، ہر حالت میں وہ عدول ہیں۔ ایک قوم کا کہنا ہے کہ ان کی عدالت کا حکم آنے والوں کے اعتبار سے ہے کہ وہ روایت حدیث کے سلسلے میں عدول ہیں۔ بعض نے کہا کہ ان کی عدالت ہر حالت میں ایک امر ثابت ہے، جب تک کہ اختلاف و فتنہ کے اندھیرے کھڑے نہ ہوئے مگر اختلاف و فتنہ کے بعد ان کی عدالت ایک زیر غور مسئلہ بن جاتی ہے۔

بعض کا کہنا ہے جن کا تعلق اعتزال سے ہے کہ جس نے حضرت علی سے جان بوجھ کر مقاتلہ کیا وہ فاسق مردود الروایۃ ہے، اس کی شہادت نا قابل قبول ہے، اس لیے کہ وہ امام برحق کے باغی ہیں۔

ایک جماعت ان اختلافات و فتنہ کے شرکاء کی روایت اور ان کی شہادت سرے سے تسلیم نہیں کرتی، اس لیے کہ ان دونوں گروہوں میں ایک گروہ فاسق ہے جس کا نہ تو ہمیں علم ہے نہ ان کی تعیین کی کوئی صورت ہے۔

ایک جماعت ہر ایک کی روایت وشہادت کے قبول کرنے کے حق میں ہے، اس لیے کہ صحابی میں بنیادی جز عدالت ہے، ان کی تفسیق مقام تشکیک میں ہے جو مخالف کی موجودگی میں قابل قبول نہیں، اس لیے کہ ان دونوں میں سے ایک گروہ کا فسق ثابت ومعلوم ہے۔

جمہور کا مذہب پسندیدہ مذہب ہے کہ جب ان کی عدالت پاکیزگی اور تمیز پر دلائل موجود ہوں تو کوئی وجہ ان کی عدالت سے انکار کی نہیں، وہ اپنی صفت خاص میں متمایز ہیں تمام آنے والے طبقہ مسلمین پر۔

ابن حزم کا کہنا ہے مہاجرین اولین کی افضلیت حضرت عمر بن الخطاب کے بعد مسلم ہے، اس کے بعد اہل عقبہ ہیں، یعنی انصار کی وہ جماعت جو بیعت عقبہ میں شریک رہی، پھر اہل بدر کا مقام ہے، پھر اس کے بعد مختلف غزوات میں شریک ہونے والے درجہ بدرجہ جو ابتدائی جنگ میں شریک رہے بعد کی جنگ میں شریک ہونے والے سے افضل ہیں، تا آنکہ حدیبیہ تک نوبت پہنچی۔ اس طرح مہاجرین وانصار کا وہ طبقہ جو بیعت رضوان تک ان کے ساتھ ہوتا گیا، ان سب کے مومن صالح ہونے اور صفائے قلب کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان سب کا ہدایت، ایمان اور بھلائی پر ہی انتقال ہوا، یہ سارے کے سارے جنتی ہیں ان میں سے کوئی جہنم میں داخل نہ ہوگا۔

ابن حزم کے اس خیال کے پیش نظر اصحاب رسول اکرم غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں شریک ہونے والے سب کے سب جنتی ہیں، یہ بات قرآن وسنت سے مستفاد ہے، اس کے بعد میں آنے والوں کو اہل جنت ہونے کی قطعیت زیر بحث رہے گی۔

''مسلم الثبوت'' کے شارح نے یہ بات لکھی ہے کہ صحابہ کی عدالت ایک قطعی مسئلہ ہے، بالخصوص اصحاب بدر وشرکاء بیعت رضوان۔ اور کیوں نہ ہو خدا نے متعدد مواقع پر ان حضرات کی تعریف فرمائی ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فضائل بارہا بیان کیے۔

ایک دوسرے مقام پر لکھا کہ صحابۂ بیعت رضوان واہل بدر کی عدالت ایک قطعی مسئلہ

ہے، اس میں کسی مومن کو شک کرنے کی گنجائش نہیں، بلکہ فتح مکہ سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے بھی صاحب عدل ہیں۔ بلا شک وشبہ وہ مہاجر ہوں کہ انصار بھی عدول ہیں۔ شک کی گنجائش فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں کے بارے میں ہے، اس لیے کہ ان میں سے بہت سے مؤلفۃ القلوب ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اختلاف نے راہ پائی، مگر ہم پر ان کے عدول ہونے کی بات قبول کرنا واجب ہے، ہماری مجال نہیں کہ ان کے بارے میں کوئی بات کہیں یا سوچیں۔ جب بھی ان کا ذکر کریں تو خیر کے الفاظ دل و زبان سے ادا ہونے چاہئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں کی عدالت پر کوئی نص قطعی نہیں ہے پھر بھی ان کی عدالت پر دلائل و براہین موجود ہیں جن کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

صحابہ کے بارے میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ان کی عدالت پر دلیل محکم ہیں، ان کی امانت وثقاہت کا اعلان کرتی ہیں، خدا اور رسول خدائے پاک نے ان کا تزکیہ فرمادیا ہے، اور پوری امت مسلمہ نے بالا جماع ان کی عدالت تسلیم کرلی ہے، اس لیے اکابر صحابہ کے سلسلے میں طعن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعض اغراض پرست، نفس کے غلام لوگوں کی حماقتیں ہیں کہ انھوں نے اکابر صحابہ پر لعن طعن کی۔

قرآن میں عدالت صحابہ:

قرآن کریم کی متعدد آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ صحابہ عدول ہیں، ان کی عدالت کبھی زیر بحث نہیں لائی جاسکتی۔ قرآن کریم سورہ فتح میں فرماتا ہے:

"محمد رسول الله و الذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجداً يبتغون فضلا من الله و رضوانا سيماهم في وجوههم من أثر السجود، ذلك مثلهم في التوراة و مثلهم في الانجيل كزرع أخرج شطأه فآزره فاستغلظ فاستوى على سوقه

يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة و أجرا عظيما" (سورہ فتح:۲۹)

"محمدؐ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں، تو انھیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال توریت میں ہے، اور ان کی مثال انجیل میں ہے، مثل اس کھیتی کے جس نے اپنا آنکھوا نکالا، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا ہو گیا اور کسانوں کی خوشی کا اور کفار کے غصہ کا باعث بن گیا۔ ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے"

سورہ توبہ میں فرماتا ہے:

"والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم باحسان رضي الله عنهم و رضوا عنه وأعد لهم جنات تجري تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا ذلك الفوز العظيم" (توبہ:۱۰۰)

"مہاجرین وانصار کے پہلے پہلے لوگ اور جو ان کی اتباع اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ لوگ اللہ سے راضی ہو گئے، اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے"۔

سورہ انفال میں فرماتا ہے:

"والذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله و الذين آووا ونصروا اولئكَ هم المؤمنون حقا لهم مغفره ورزق كريم" (انفال:۷۴)

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد پہنچائی، یہ لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی"۔

سورہ حشر میں اعلانیہ ہے:

"للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم و أموالهم

يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله أولٰئك هم الصادقون، والذين تبوء وا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم ولايجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤثرون على أنفسهم ولوكان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون، والذين جاءوا من بعدهم يقولون ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذين سبقونا بالايمان ولاتجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا انك رؤف رحيم" (الحشر:۸-۱۰)

"(فئی کا مال) ان مہاجرین مسکینوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیے گئے، وہ اللہ کے فضل اور رضامندی کے طلب گار ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی راست باز لوگ ہیں اور ان کے لیے جنھوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی، وہ اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے بلکہ خود اپنے اوپر انھیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو، اور جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب اور بامراد ہے، اور ان کے لیے جو ان کے بعد آئے اور کہا کہ اے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان برادران اسلام کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں کو مومنین کے لیے کینہ سے پاک رکھ، اے رب! بیشک تو شفقت و مہربانی والا ہے"

سورۂ فتح میں ایک دوسرے موقع پر ہے:

"لقد رضي الله عن المؤمنين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما في قلوبهم فأنزل السكنية عليهم و أثابهم فتحا قريبا" (الفتح:۱۸)

"یقیناً اللہ ان مومنین سے راضی ہو گیا جب وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا، چنانچہ ان پر سکون کی فضا قائم کر دی اور جلدی انھیں فتح سے نوازا"

ان آیات کریمہ سے تمام صحابہ کی فضیلت و منزلت کا جو حضور اکرمؐ کے ساتھ اول دعوت سے

جنگ حدیبیہ تک رہے پتہ چلتا ہے۔ یہاں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن سے ان صحابہ کی قدر و منزلت کا مختلف مواقع غزوات، ہجرت اور جہاد میں اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ادلہ قطعیہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ حضورؐ کے صحابہؓ کی منزلت و مقدرت عنداللہ کیا ہے؟ شارح مسلم الثبوت اور ابن حزم نے جو کچھ اس سلسلے میں لکھا ہے اس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، ان سے عدالت صحابہ کا بین ثبوت ملتا ہے۔ لقد رضي الله عنهم و رضوا عنه کے بعد بھی کسی شہادت کی ضرورت رہ جاتی ہے اب خدا کے اعلان تعدیل ورضا کے بعد انسانی تعدیل دنیاوی رضا جوئی کا کیا مقام باقی رہ جاتا ہے؟ اب اس کے بعد بھی کسی کو صحابہ پر طعن کرنے کی کوئی گنجائش ہے؟ جب کہ بعض نص صریح ان کی عدالت پر شاہد ہے۔ صحابہ نے بھی خود کو ایسا ہی ثابت کر دکھایا کہ کسی جرح و قدح کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اور حیرت ناک حادثہ تو یہ ہے کہ جو مسلمانوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں ان میں اخوت اسلامی کے مظاہر کے دعویدار ہیں، وہ صحابۂ کرام پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ تاریخ اسلام لکھنے والوں کا یہ افسوس ناک حادثہ ہے۔ پھر اپنوں پر اگر ماتم کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا، جو لوگ بعض صحابہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہوئے شرماتے نہیں کہ بعض صحابہ مثلاً ابو ہریرہؓ کی احادیث جو صحیحین کے معیار پر موجود ہیں وہ کذب وافترا کا پلندہ ہے جبکہ جمہور علمائے اسلام نے ان احادیث کو پورے اعتماد اور رسوخ کے ساتھ عدالت صحابہ کے پیش نظر قبول کیا ہے۔ یہ بے شرم عبدالحسین شرف الدین یہ کہتے ہوئے نہیں جھجکتا:

"ولا عجب منهم (الجمهور) في ذلك بعد بنائهم على أصالة العدالة في الصحابة أجمعين حيث لا دليل على هذا الأصل"

"اور جمہور کا یہ طرز کوئی حیرت انگیز بات نہیں اس لیے کہ انھوں نے عدالت صحابہ کو اصل تسلیم کرلیا ہے حالانکہ اس اصل پر کوئی دلیل نہیں ہے"۔ (ابو ہریرہ تالیف عبدالحسین شرف الدین، صفحہ ۱)

اب ان قرآنی آیات ونصوص کے ہوتے ہوئے بھی عدالت صحابہؓ میں شک کی گنجائش ہے جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے ان کی عدالت پر نصوص قرآنی موجود ہیں جو اس کا کھلے لفظوں اعلان کر رہی ہیں، جن آیات میں کسی تاویل اور ظن آفرینی کی گنجائش نہیں، لیکن جو

لوگ خواہشات نفسانی کے پابند ہیں وہ حق کے انکار پر اصرار کرتے ہیں۔ اب سورج کا دن کی روشنی میں انکار بجز بے عقلوں کے کون کر سکتا ہے۔

"يريدون أن يطفؤا نورالله بأفواههم و يأبى الله إلا أن يتم نوره و لو كره الكافرون" (التوبہ:۳۲)

"پھونک سے خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، جب کہ خدا اپنے نور کو مکمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے، منکرین خدا اور رسول کو برا لگتا ہے"

آگے ہم احادیث نبوی سے عدالت صحابہ پر روشنی ڈالیں گے:

(۲) عدالت صحابہؓ سنت کی روشنی میں

صحاح ستہ میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں جو صحابہؓ کے اجتماعی وانفرادی فضیلتوں کا واضح بیان ہیں، اکثر کتابوں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن اربعہ وغیرہ میں صحابہ کے فضائل پر مستقل ابواب کا ذکر ہے۔

چنانچہ ابو سعید خدری کی یہ روایت کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو برا نہ کہو، اس لیے کہ تم میں کا کوئی اگر احد پہاڑ کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرے تو میرے ان صحابہ کے ایک مُد (ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل عراق کے نزدیک دو رطل اور اہل حجاز کے نزدیک ایک اور تہائی رطل ہے) یا نصف مد سونا راہ خدا میں خرچ کرنے کے برابر ثواب نہ پا سکے گا (صحیح مسلم ص ۱۹۶۸ ج:۴)۔

دوسری حدیث جسے عبداللہ بن مغفل نے روایت کیا اور اس کی تخریج ترمذی نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، میرے صحابہ کے سلسلے میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، میرے بعد ان کو ہدف ملامت نہ بنانا، جس نے بھی ان سے محبت کی تو میری محبت کی قدر کی، جس نے ان سے بغض وعناد کا اظہار کیا تو اس نے میرے بغض و عناد کو چیلنج کیا، جس نے ان کو اذیت دی مجھے اذیت پہنچائی، جس نے مجھے اذیت دی خدا کو

اذیت پہنچائی اور جس نے خدا کو ستایا تو بہت ممکن ہے وہ گرفت میں آ جائے۔ (الکفایہ ص ۴۸ جامع صغیر ص ۵۴)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ستارے آسمان کے امانت دار ہیں، جب ستارے نہ ہوں گے تو آسمان کو جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے سامنے آئے گا۔ میں اپنے صحابہ کا امین ہوں، میں جب نہ رہوں گا تو صحابہ کو جو وعدے کئے گئے ہیں سامنے لائے جائیں گے۔ میرے صحابہ امت کے معتمد علیہ ہیں جب وہ نہ ہوں گے تو امت کو کیے گئے وعدے پورے کئے جائیں گے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ دلائل انہی صحابہ کے ساتھ مخصوص ہیں جو آپ کے ہمنوا فتح مکہ سے پہلے تھے، مگر فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کی عدالت پر کوئی واضح دلیل نہیں۔ اور اپنی بات کے جواب میں ڈاکٹر محمد سباعی کے قول کا سرقہ کیا:

"مسلمة الفتح والأعراب الوافدون على رسول الله صلى الله عليه وسلم فهؤلاء لم يتحملوا من السنة مثل ما تحمل الصحابة الملازمون لرسول الله صلى الله عليه وسلم ومن تعرض منهم للرواية كحكيم بن حزام و عتاب و غيرهم عرفوا بالصدق والديانة وغاية الأمانة على أنه ورد ما يجعلهم أفضل ممن سواهم من القرون بعدهم كقوله صلى الله عليه وسلم "خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم يفشو الكذب" وهو حديث صحيح مروى فى الصحيحين وغيرهما بألفاظ مختلفة"

"فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والے اور وفد کی صورت میں آنے والے بدو ان لوگوں نے سنت کا وہ حصہ نہیں پایا جو ان صحابہ نے پایا جو رسول خدا کے ساتھ ساتھ رہے اور ان میں سے جو روایت کے راوی ہیں جیسے حکیم بن حزام اور عتاب وغیرہ ان کی سچائی، دیانت اور امانت مشہور

زمانہ ہے، اس بنا پر وہ اپنے معاصرین میں افضل ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو بعد کے قرون میں آئے خود اس پر حضورؐ کی شہادت موجود ہے کہ بہترین زمانہ میرا قرن پھر اس کے بعد والا پھر اس کے بعد والا کہ اس کے بعد جھوٹ عام ہو جائے گا، یہ حدیث صحیحین اور دوسری کتابوں میں مروی ہے الفاظ ضرور مختلف ہیں"

اور خیریت کی ضمانت انہی کا حصہ ہے جنہوں نے عدالت کے ساتھ دین کا التزام کیا اور اس پر عمل کے پابند رہے، خود قرآن نے بھی کھلے لفظوں میں اعلان فرمایا:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تؤمنون بالله"

"تم بہترین امت ہو کہ لوگوں کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کیے گئے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور خدا پر یقین رکھتے ہو"

آیت مذکورہ میں براہ راست خطاب صحابۂ رسول سے ہے اور ان لوگوں سے جو نزول وحی کے وقت موجود تھے اور یہ خطاب سب کو شامل ہے۔ اس قبیل سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

"وكذلك جعلناكم أمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيداً" (وسطاً، أي عدولاً)

"اسی طرح ہم نے تم کو میانہ رو امت بنایا کہ تم لوگوں پر شاہد کی حیثیت سے رہو اور رسول تم پر مشاہد ہو (وسطا کا ترجمہ عدولا)

اسلام آغاز امر میں نوخیز تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا جو اس کے تابع فرمان ہو گئے تھے، اور جنہوں نے اسلام کی ہدایت پر عمل کیا اس کے اصول و مبادی کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھا اور خود کو اسلام کے رنگ میں رنگ لیا۔ ان میں عدالت سب سے زیادہ مضبوط رہی، ان کے ہر ہر فرد میں اسلام جا گزیں ہو گیا، حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سے کبائر کا ارتکاب ہوا تو ان کا دل بغیر اعتراف کے راضی نہ ہوا۔ انھوں نے خود کو مستحق سزا جانا اور سزا پر راضی ہی نہیں مصر رہے کہ اس گندگی سے خود کو پاک

صاف کرلیں اور توبہ میں پوری تندہی سے متوجہ ہوئے کہ خدا نے بھی ان کی توبہ قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔ اس لیے صحابہ عدول ہیں سے صرف ہماری مراد یہ ہے کہ وہ بظاہر صاحب عدالت ہیں، اس لیے ان کے بارے میں جب تک کہ طعن ثابت نہ ہو جائے گفتگو نہ کی جائے۔ پھر جرح کے بھی باریک بیں علماء ہیں، ہر ایک کے بوتے کی بات نہیں کہ وہ صحابی پر جرح کرگزرے، جہاں چاہا جس انداز سے چاہا گفتگو کرنے لگے۔ بلکہ جرح و تعدیل کے لیے معیاری تقوی کے حاملین کو یہ حق دیا گیا ہے جو کہ خدا سے ڈرتے ہوں اور ہوائے نفسانی کا شائبہ ان میں نہ ہو۔ بعض صحابہ کے بارے میں بحث و تمحیص ہم مان لیں اور ان پر جو تہمتیں لگائی گئی ہیں ان کو کسی قدر جان دار مان لیں تب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس جرح کی علت بیان کی گئی ہے یا نہیں، اور یہ کہ یہ بات کرنے والے خود غرضی اور خواہش نفسانی کے بندے تو نہیں ہیں، ان کو ان کی خواہشات نفسانی نے بہکایا تو نہیں ہے؟ بلکہ اس کے لیے صدر اسلام کے ان ائمۂ دین جن کو عدول امت کہا جاتا ہے شہادت میں لایا جائے گا، اس لیے کہ ان کے صحابہ سے روابط رہے، ان کے ساتھ زندگی بسر کی، ان کے دن ورات دیکھے، جانچا پرکھا، ان کا ہر انداز زندگی ان کے سامنے تھا۔ اس لیے کہ بسا اوقات صاحب عدالت ناقد کے نزدیک ایک چیز خوبی و فضیلت ہوتی ہے، جسے اہل غرض رذیلہ اور نقص شمار کرنے لگتے ہیں، انسان کی ہر کمی یا ہر غیر ضروری گفتگو اس کی عدالت میں حارج نہیں ہوتی۔

فاروق اعظمؓ کا یہ قول عدالت صحابہؓ پر نص کی حیثیت رکھتا ہے کہ صحابہ بھی عدول ہیں، ہاں جس نے خود ہی کوئی ایسا کام کرلیا یا لوگوں پر اس کی خرابی پھیل گئی جس سے اس نے عدالت کو خود مجروح کردیا۔ آپ نے فرمایا:

''ان أناسا كانوا يؤخذون بالوحي في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و إن الوحي قدانقطع وانما آخذكم الآن بما ظهر من أعمالكم فمن أظهرلنا خيراً أمناه وقربناه وليس إلينا

من سريرته شئ، الله يحاسبه في سريرته ومن أظهر لنا سوء لم نأمنه ولم نصدقه وان قال ان سريرتي حسنة" (الکفایہ:۷۸)

"عہد نبوی میں مواخذہ وگرفت حضور علیہ السلام وحی کے ذریعہ فرماتے تھے، آج وحی کا سلسلہ نہیں رہا اس لیے ہم جو تمھارے اعمال سامنے آئیں گے ان پر گرفت کریں گے، جس سے بھلائی سامنے آئے گی اسے امین سمجھیں گے اور اسے قریب کریں گے، ہم اس کے دل کی بات کو نہیں جانتے، خدا دل کی کھوٹ پر محاسبہ فرمائیں گے، جس نے ہمارے سامنے کوئی برائی پیش کی ہم نہ اس کو امین مانیں گے نہ تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ زبان سے اپنے اندرون کے اچھے ہونے کی بات کہے"

پوری امت تمام صحابہؓ کی عدالت پر اجماع کر چکی ہے۔ چند افراد ہیں جن کی عدالت زیر بحث رہی جو حضورؐ کی وفات کے بعد اپنے انداز زندگی میں درست رخ پر نہیں رہے، ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اس لیے کسی کو اس کا حق نہیں کہ ان کے حق میں قرآن وسنت کی شہادت کے ہوتے ہوئے کچھ کہے۔ خدا اور رسول کے اعلان عدالت کے بعد اب کیا رہ جاتا ہے؟ اب کون ہے جس کی تعدیل ان دونوں کی تعدیل سے بالاتر ہوگی؟ اگر خدا اور رسول کی شہادت عدالت ان کے حق میں نہ ہوتی تب بھی ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان کی عدالت میں حرف گیری کرتے، اس لیے کہ انھوں نے دین کا دفاع کیا، رسول خدا کی نصرت واعانت میں جان دی، ان کے ہمراہ ترک وطن کیا، غزوات میں آپ کے ساتھ شریک رہے، جان ومال نثار کیا، دین کی چوکیداری میں لگے رہے، حدود اسلام اور اس کے مراسم کو قائم کرنے میں انتھک کوششیں کیں، خدا کے حکم پر پوری طرح کاربند رہے، اس کے نواہی سے رکنے کا ریکارڈ قائم کیا، اسلام کا ستون بنے رہے۔ یہ ساری چیزیں ان کے اسلام کی نمایاں دلیل ہیں، ان کی امانت واخلاص کی سند ہیں۔ اس لیے صحابہ میں اگر کوئی چپقلش نظر آئے تو اس کا عمدہ محل نکالنا چاہیے، اس لیے کہ ان میں جو کچھ ہوا وہ ان کے اجتہاد کی بنیاد پر ہوا، جس کا انھیں پوری طرح حق حاصل تھا۔ یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو ہوا درست ہوا، اسی میں دین کی بھلائی، مسلمانوں کی عافیت کا سامان تھا۔ ظاہر ہے کہ دو مجتہد میں ایک ہی درست ہوگا، دوسرا غلطی پر ہوگا مگر خطا کار سرزنش کے لائق نہیں، اس لیے کہ اس نے کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی

عقل سے کام لیا۔ اور اس اجتہاد میں جو درست رائے تک پہنچا، اسے دوہرا اجر اور جو درست رائے تک نہ پہنچ سکا اسے بھی ایک اجر ملے گا۔ ان دونوں صورتوں میں شہادت و روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر درست فکر رہی تو فبہا اور اگر فکر غلط انداز پر رہی تو اس کے غلط نہ ہونے پر علمائے امت کا اجماع ہے۔ اس لیے صحابہ میں سے جو بھی مبتلائے فتنہ رہے وہ سارے کے سارے عدول ہیں، اس لیے کہ اس راہ میں وہ مجتہد تھے جس کو ہدف ملامت نہیں بنایا جا سکتا۔

جماعت مسلمین فتنہ کے بعد اس وقت متفق ہو گئی جب حسن بن علیؓ نے معاویہ بن سفیانؓ کے حق میں دست برداری کا معاملہ فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے اپنے نواسے حسن بن علی سے برسر منبر فرمایا کہ یہ میرا بچہ سید ہے ممکن ہے خدا مسلمانوں کی دو جماعت کے مابین اس کے ذریعہ صلح کرا دیں۔ اس حدیث میں سبھی کو حضورؐ نے مسلمان فرمایا اور خود خدائے پاک نے بھی اسے استعمال کیا ''وان طائفتان من المسلمین اقتتلوا فأصلحوا بینهما۔'' اس میں دونوں متحارب گروہ کو خدا نے مومنین میں شمار فرمایا، اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں متحارب جماعت مسلمین میں صحابہ کے سو (۱۰۰) سے زیادہ افراد شریک نہ تھے۔ ان سب کی عدالت کا اعلان فرمایا گیا، حالانکہ یہ دونوں جماعتوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ شریک تھے، اس شرکت کے باوجود ان کی عدالت پر کوئی آنچ نہیں آئی اس لیے کہ یہ مجتہدین تھے۔ (الباعث الحثیث: ص ۳۰۶)

اب اخیر میں ہم ابوزرعہ رازی کے کلمات ذکر کر کے عدالت صحابہ کا باب ختم کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تم کسی کو اصحاب رسول میں سے کسی صحابی کی تنقیص کرتے دیکھو تو جان لو کے وہ شخص زندیق ہے، اس لیے کہ رسول حق، قرآن حق اور جو آپ کی باتیں ہم تک لائی گئیں وہ سب کی سب حق، اور یہ سارے حق ہم کو صحابۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پہنچے ہیں۔ یہ زندیق چاہتے ہیں کہ یہی اصل شاہد ہی مجروح ہو جائیں تاکہ کتاب و سنت ہی باطل ہو کر رہ جائے، اس لیے انہی کو مجروح کر دینا بجائے ان شہود اولین کے بہتر ہے۔ (الکفایہ: ص ۴۹)

تعداد صحابہ:

صحابہ کی تعداد شمار و گنتی کے ذریعہ متعین کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ صحابہ مختلف شہروں، علاقوں، دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور اس کثرت سے تھے کہ ان کا شمار دشوار امر ہے۔ علماء میں سے جن لوگوں نے ان کی تعداد کا تعین کیا ہے وہ تخمین و تقریب کے طریق پر ہے۔ بخاری نے اپنی کتاب میں حضرت کعب بن مالک کے غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے کے واقعہ کے ساتھ لکھا ہے کہ صحابی نبی کریم تعداد میں بے شمار تھے، انھیں کوئی رجسٹر جمع نہ کر سکا۔

ہم اگر ان کی تعداد لکھیں گے تو وہ بھی تخمین سے حقیقت کے قریب ہوگی، اور اس کا تعلق ان روایات سے ہوگا جو صحابہ و تابعین نے صحابہ کی تعداد کے بارے میں بیان کی ہیں، (فتح المغیث، ج ۴ ص ۳۹)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گیارہویں رمضان کو خروج کیا۔ آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی آپ کے ہمراہ روزہ رکھا۔ جب آپ کدید کے چشمہ پر پہنچے تو آپ نے افطار فرمایا اور پھر آپ نے یہ سفر آگے دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ کیا تا آنکہ آپ نے جرار کی گزرگاہ پر (جو مدینہ سے تین میل کی دوری پر عراق کی جانب ہے) قیام فرمایا، یہ فتح مکہ کے سال کی بات ہے۔

اور حضورؐ کے ہمراہ حجۃ الوداع میں شریک ہونے والوں کی تعداد نوے ہزار تھی۔ ایک شخص نے ابوزرعہ رازی سے کہا کہ میاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد ۴ ہزار ہے۔ آپ نے فرمایا جس نے یہ بات کہی خدا اس کے دانت اکھاڑ دے، یہ زنادقہ کا قول ہے۔ کون ہے جو آپ کی احادیث کی گنتی متعین کر سکتا ہے؟ حضور نے وفات فرمائی اور آپ کے اصحاب کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی جنہوں نے آپ سے سنا اور آپ سے روایت حدیث کی۔ پھر ابوزرعہ سے سوال کیا گیا کہ یہ صحابہ کہاں اور آپؐ سے کیسے سماع حدیث کیا؟ فرمایا اہل مدینہ و اہل مکہ اور ان دونوں کے مابین اور عرب کے دیہاتی اور شرکاء حجۃ الوداع۔

اس روایت سے اندازہ ہوا کہ حضورؐ سے روایت کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے، اور یہ سب کے سب صحابی رسول تھے، آپ سے خیر عظیم کو نقل کرنے والے تھے، البتہ روایات اپنے سماع کے مطابق روایت کیں، جن کے جو حالات تھے یا جو انداز سماع تھا وہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔

علم صحابی:

حضور کی سنت کا علم تمام صحابہ کو یکساں نہ تھا، اور ہر ایک آپ کے احوال واقوال سے یکساں طور پر واقف نہ تھا، بلکہ ان میں تفاوت درجات تھا۔ بعض ہمہ وقت حاضر باش تھے، آپؐ کی خدمت میں اکثر موجود رہتے جیسے حضرت انس وابو ہریرۃؓ۔ اور صحابہ کی ایک ٹولی جن کے چوپائے دیہات میں رہتے تھے یا مختلف شہروں میں تجارتی اسفار سے سابقہ رہتا تھا وہ حسب موقع مختلف اوقات میں آپؐ کے پاس آتے تھے۔ آپؐ کے صحابہ میں شہری اور دیہات کے رہنے والے اور اقامت پذیر اور مسافر بھی طرح کے لوگ تھے۔

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ صحابہ آپ سے علوم کی تحصیل کس انداز سے کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ علوم نبوت کے حصول میں مختلف انداز کے ہیں، اس سلسلے میں مسروق کی بات بڑے کانٹے کی ہے:

جالست أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم فوجدتهم كالاخاذ فالاخاذ يروى الرجل والاخاذ يروى الرجلين والاخاذ يروى المأة والاخاذ لونزل به أهل الارض لأصدرهم
(طبقات ابن سعد: ج۲ قسم۲ ص۱۰۴)

''میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی صحبت میں نشست و برخاست کی، ان کو میں نے تالاب کی طرح پایا، بعض ایسے تالاب تھے کہ صرف ایک آدمی کو سیر کر سکے بعض دو کو بعض سیکڑوں کو بعض ایسے تھے کہ اگر روئے زمین کے لوگ آ جائیں تو اس کو سیراب کر دیں''

ہمارے لیے صحابی کے علم کا تعارف ابن حزم کے ذریعہ مناسب ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں، کوئی تیسری شکل نہیں۔ پہلی صورت کثرت روایت کثرت فتاوی دوسرے حضورؐ کا اپنے اصحاب کو بکثرت عامل بنانا۔ یہ بات ناممکن ہے کہ رسول خدا کسی ایسے کو عامل بنائیں جس کے پاس علم نہ ہو۔ یہ صحابہ کے علم اور وسعت علم کی سب سے بڑی شہادت ہے۔
(الملل والنحل ابن حزم ج ۴ ص ۱۳۹)

مگر یہ بات جو ابن حزم نے کہی ہے صحابی کے علم و روایت کے لیے شافی بیان نہیں ہے، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض صحابہ اسلام میں بھی سابق ہیں اور بلا اختلاف ان کی صحبت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی مشہور زمانہ ہے، جیسے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کہ ان کو حضور کے بارے میں جو واقفیت ہے، سنت کا جو علم ان کے پاس ہے، وہ کسی کو کم نصیب ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے علم کا بڑا حصہ ہمارے سامنے نہیں ہے، خصوصیت سے حضرت ابوبکرؓ جو حضورؐ کے وصال کے بعد تھوڑے ہی دنوں زندہ رہے اس لیے ان سے دوسرے لوگوں کا سابقہ کم پڑا، ان کے علوم ان کے ساتھ ہی رہ گئے۔ اور صحابی کی عمر کا طول ابن حزم کی کہی ہوئی بات کے انداز میں ان کی مرویات اور علم دونوں ہی کو اجاگر کر دیتا ہے، اس لیے کہ نئے نئے معاملات ان کے سامنے آتے گئے اور لوگ ان کے علم سے مستفیض ہوتے گئے۔ اسی کو ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ جیسے جیسے ضرورتیں بڑھتی گئیں صحابہ کی طرف رجوع بڑھتا گیا، اور لوگ ان سے علم لیتے رہے، چنانچہ احادیث عائشہ پر مشتمل مسانید جن کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہیں، اسی ضرورت کی دین ہیں۔ اسی طرح احادیث ابو ہریرہؓ بھی وقت کی ضرورت کے تقاضے کے ساتھ سامنے آتی گئیں۔

ہم نے اپنی اس بحث میں ان صحابہ کو جنہوں نے حضور اکرم سے احادیث روایت کی ہیں، اور ہمارے سامنے شریعت حقہ کو پیش کیا اور آنے والے لوگوں کے سامنے رسول خدا کے افعال، ان کے تصرفات جن کا تعلق ادنیٰ معاملات سے ہو یا اہم ترین معاملات سے، آپؐ کے سفر و حضر، غرض آپ کے خواب و بیداری، آپ کے اشارات و تصریحات، آپ کی

گفتگو وخموشی کے سارے مواقع ہمارے سامنے رکھے، ان کو اہمیت دینا اور ان کا خصوصی ذکر کرنا ہم نے نہایت ضروری سمجھا۔

صحابہ کے بارے میں کثرت سے تصانیف لکھی گئیں۔ ان مؤلفات میں ان صحابہ کے حالات، ان کا مبلغ علم ساری چیزیں زیر بحث آچکی ہیں۔ ہم یہاں مختصر طور سے ان لوگوں کا ذکر کریں گے جنھوں نے حضورؐ سے روایت حدیث کی ہے، جن کی مرویات کی تعداد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے سات صحابی ایسے ہیں جن کی مرویات ایک ہزار سے زیادہ ہیں، اور گیارہ صحابی ایسے ہیں جن کی روایت دو سو سے متجاوز ہیں، اور اکیس صحابی ایسے ہیں جن کی روایت سو حدیثوں سے زیادہ پر مشتمل ہیں، اور دس حدیثوں کے راویوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سو سے متجاوز ہیں، اور دس حدیثوں کے راوی تو سو سے کہیں زیادہ ہیں، اور تین سو صحابی ایسے ہیں جنھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایک حدیث روایت کی ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو صحابہ کی روایت کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا، یہاں ہم صرف انہی صحابہ کا ذکر کریں گے جو حدیث کی روایت میں نمایاں ومشہور مقام رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی قدر ومنزلت کے مالک ہیں، ان کو خدا نے اپنی بڑی نعمت وفضل سے نوازا ہے۔ ان میں سے کسی کو آگے کرنا اور کسی کو پیچھے ڈال دینا ہمارے بس کی بات نہیں، ممکن ہے کوئی تصحیف وہوائے نفسانی کا شکار ہو جائے اور ان کی عظمت کو کوئی ٹھیس پہنچ جائے، اس لیے اس سے ہم نے اجتناب کیا۔ پھر صحابی کی اپنی فضیلت اپنا مقام ہے، مثلاً جو سابقین اسلام ہیں اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں نثار کیا یہ بھی خیر مجسم ہیں۔ رسول خدا کی صحبت کا شرف ان کو حاصل رہا، یہ شریعت غراء کے مخلص محافظین ہیں جنھوں نے شریعت کو تابعین کی طرف منتقل کیا، پھر تابعین نے آنے والے طبقہ میں منتقل کیا، پھر درجہ بہ درجہ گروہ در گروہ دین کو نقل کرتے رہے، حتیٰ کہ ہم تک بلا کم وکاست کے شریعت غراء کو پہنچایا، یہ خدا کا فضل اور ان کی کرم فرمائی ہے۔

مکثرین صحابہ:

اس عنوان کے تحت ہم ان رواۃ حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کی سوانح لکھیں گے جن کی مرویات کی تعداد بہت زیادہ ہیں۔ اور جہاں کہیں ضرورت ہوگی، مختصر طور سے حدیث کے بعض گوشوں کو واضح کریں گے اور صحابی کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے لیکن بحث کے درمیان کبھی کسی ضروری تفصیل کی ضرورت ہوگی تو اس سے بھی ہم گریز نہ کریں گے، اور اس صحابی کی اجتماعی وعلمی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی شخصیت وعدالت کو اجاگر کرنے کی سعی کریں گے، اگر وقت وفرصت اجازت دیتے تو کبھی صحابی سے متعلق یہ مباحث سامنے لائے جاتے تاکہ ان اہم شخصیات کی پوری زندگی آئینہ بن کر ہمارے سامنے آجائے جنہوں نے سنت مطہرہ کی خدمت کی اور مفسدین کی زد سے اس کو بچا کر نکال لیا، ہم یہاں صرف ان مشاہیر کا ذکر کریں گے جو آپ سے کثرت روایات کے لیے مشہور ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے اس ارادے کو کامیاب بنائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ (۱۹ ق م....۵۹ھ)

تعارف

ابو ہریرہ جو عبدالرحمان بن صخر الدوسی یمانی ہیں جن کا نام جاہلیت میں عبد شمس تھا، آنحضرتؐ نے اسلام لانے کے بعد عبدالرحمان رکھا۔ ابو ہریرہؓ کی کنیت اس طرح مشہور عالم ہوئی کہ کسی کو آپ کے نام کا پتہ نہیں، جیسے زمانے نے آپ کا نام بھلا دیا ہو۔ ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی یہ کنیت کس بنیاد پر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میری کنیت ابو ہریرہ بایں وجہ ہوئی کہ میں نے ایک بلی پالی تھی، اسے اپنی آستین میں چھپائے رہتا، لوگوں نے اس بنیاد پر ابو ہریرہ کہنا شروع کر دیا۔ آپ کمسنی ہی سے گھر کی بھیڑوں کی رکھوالی اور چرانے کا کام کرتے تھے، اس وقت اس بلی سے کھیلتے۔ آپ فرماتے کہ مجھے ابو ہریرہ نہ کہو کہ حضور نے میرا نام ابو ہر رکھا تھا، ظاہر ہے نر مادہ سے بہتر ہوتا ہے۔

ابو ہریرہ کا رنگ گندم گوں تھا، آپ کے مونڈھے چوڑے تھے، دونوں طرف گیسو لٹکے ہوئے تھے، دانتوں کے درمیان فرج تھے، آپ مہندی کا خضاب کرتے، آپ کے بال مائل بہ سفیدی تھے، ڈاڑھی سرخ تھی۔ خباب بن عروہ نے آپ کو جب دیکھا تو آپ سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ جب خوش حالی کا دور آیا تو ریشم کی چادر اوڑھتے۔

آپ کا اسلام

فتح خیبر کے زمانہ میں آپ یمن سے مدینہ تشریف لائے، یہ ہجرت کا ساتواں سال تھا۔ نماز فجر سباع بن عرفطہ کے پیچھے ادا کی، جن کو حضورؐ نے جنگ خیبر کے موقع پر مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔ ابو ہریرہ حضور کے ملازم زندگی بن گئے، جب تک حضور اس دنیا میں زندہ رہے آپ کی خدمت میں گزارنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ حضور سے علم نبوت حاصل کیا۔ آپ کے ساتھ آتے جاتے، آپ کے گھر میں بھی آمد ورفت تھی، حج وغیرہ میں ساتھ ساتھ رہے، سفر وحضر کے رفیق رہے، دن ورات آپ کے ساتھ بسر کیے، اس طرح علم نبوت کا پاکیزہ حصہ آپ سے حاصل کیا۔ آپ کی یہ صحبت چار سال تک رہی، صفہ آپ کی قیام گاہ تھی، اللہ کے رسول کی جی بھر کے خدمت کی اور خدمت رسول میں رہے۔ آپ کو اہل صفہ کا نگراں حضور نے مقرر فرمایا اس لیے کہ یہ ان کے حالات و مرتبے سے سب سے زیادہ واقف بھی تھے۔

حضور سے آپ کو غیر معمولی محبت تھی۔ ایک دن حضور نے آپ کو مارنے کے لیے درہ اٹھایا تو ابو ہریرہ نے کہا کہ اگر آپ مجھے مارتے تو مجھے یہ مار سرخ اونٹوں سے زیادہ قابل قدر ہوتی۔

ابو ہریرہ نہایت درجہ پارسا تھے، حضور کی سنت پر دل وجان سے فدا تھے، لوگوں سے آپ دور رہتے کہ کہیں دنیا کی لذت میں نہ پھنس جاؤں۔ آپ معروف کا حکم کرتے، منکرات سے روکتے، اس میں مالدار و فقیر کی تمیز نہ کرتے اور معمولی غیر معمولی کا سوال نہ اٹھاتے۔ آپ کے حالات اس سلسلے میں بہت زیادہ ہیں۔ آپ خدا سے ظاہر و باطن دونوں میں ڈرتے، لوگوں کو نصیحت کرتے اور خدا کی بندگی پر ابھارتے۔

آپ عبادت گزار تھے، دن روزے سے گزرتا، رات عبادت میں۔ رات کی عبادت میں خود ہوتے، آپ کی اہلیہ ہوتیں اور صاحبزادی بھی شریک عبادت رہتی۔ آپ نماز کثرت سے پڑھتے۔ آپ کے گھر میں بھی مسجد تھی حجرہ بھی مسجد تھا اور گھر کے دروازے پر بھی، مسجد میں نماز گزارتے جب باہر آتے تو ان ساری مسجدوں میں نماز ادا کرتے اور اندر جاتے تو پھر بھی جگہ سجدہ میں گزارتے۔

فقر واستغناء اور پاکیزگی:

ابو ہریرہؓ مشہور زمانہ فقیر ومحتاج تھے، آپ کی مسکنت زبان زد عوام تھی۔ آپ نے فقر و محتاجی کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ بھوک سے آپ شکم پر پتھر باندھے ہوتے، آپ کے دن ورات گزر جاتے مگر آپ کے منھ میں کھیل بھی نہ پڑتی۔ خود ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ بخدا میں حضورؐ کی خدمت میں ہمہ وقت رہتا، بس پیٹ بھر کھانا مل جائے اور کچھ نہیں، کبھی خمیر کھالیتا، معمولی کپڑے پہنتا، نہ کوئی میرا خادم تھا نہ کوئی نوکرانی، میں کسی کو کتاب کی آیت اپنے ساتھ رکھ کر سکھلاتا اور خواہش ہوتی کہ وہ مجھے پیٹ بھر کھانا کھلا دے۔ میں اصحاب صفہ کے ستر افراد میں سے ایک تھا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس دو کپڑے ہوں، ایک ہی چادر ہوتی یا لنگی جو اپنی گردن میں باندھے ہوتے۔

امام التابعین سعید بن میتبؒ (۱۵۔۹۴ھ) کہتے ہیں کہ میں نے ابو ہریرہؓ کو بازار میں پھرتے دیکھا، پھر گھر میں آتے اور گھر والوں سے دریافت کرتے، کچھ ہے؟ اگر گھر والوں نے کہہ دیا کہ نہیں، کچھ تو فرماتے میں روزے سے ہوں۔ آپ قانع تھے، خدا کی نعمت پر خوش رہتے۔ اگر آپ کے پاس پندرہ دانے کھجور کے ہوتے تو پانچ دانہ کھا کر افطار کرتے، اور سحر کے لیے پانچ دانہ اور اس دن کی افطار کے لیے پانچ دانہ رکھتے۔ خدائے پاک کے بڑے شکر گزار بندوں میں تھے، رات دن حمد وثنا وتکبیر میں گزارتے اور جو خدا نے دے دیا اس کا شکر ادا کرتے۔

کرم:

ابو ہریرہ باوجود فقر کے عفیف النفس تھے، کھلے ہاتھ رکھتے، داتا تھے، بھلائی پسند کرتے، اپنے مہمانوں کی تکریم کرتے اور جو ہاتھ میں ہوتا اس کے خرچ پر ذرا اہل انگاری نہ کرتے، گو وہ چیز کم ہی ہو۔ فقر کی وجہ سے بخل کو کبھی پھٹکنے نہ دیا، کبھی غربت وفقر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ لوگوں کی خبر گیری کرتے، بھوکا رہنا پسند نہ تھا مگر پسماندخوری نہ کرتے۔

اپنی تنگدستی کے پورے دور میں وہ اسلام کے مہمان رسولؐ خدا اوران کے رفقاء کے مہمان رہے۔ جب آپ کو آسودگی نصیب ہوئی تو آپ نے اس کشادگی کو کٹھور پن اور سختی کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ ہمیشہ جودو کرم کا نشان رہے۔ طفاوی کا خود اپنا بیان ہے کہ ابو ہریرہ کے پاس مدینہ میں چھ ماہ رہا، اصحاب رسول میں ان سے زیادہ مستعد اور مہمان نواز کسی کو نہیں دیکھا۔

بحرین کی گورنری:

رسولؐ خدا نے علاء حضرمی کی معیت میں ابو ہریرہؓ کو بحرین روانہ فرمایا کہ اسلام کی اشاعت کریں، لوگوں کو دین سمجھائیں، مسائل بتائیں، چنانچہ آپ نے حضور علیہ السلام سے حدیثیں بیان کیں، مسائل ضروری کے فتوے صادر کیے۔

عہد فاروقی میں آپ بحرین کے عامل رہے، آپ وہاں سے دس ہزار کی رقم کے ساتھ آئے، اس پر فاروق اعظم نے فرمایا تمھارے دل میں مال کی زیادہ وقعت ہوگئی، یہ تو خدا اور رسول کی دشمنی ہے۔ اس پر ابو ہریرہ نے کہا کہ نہ میں خدا کا دشمن، نہ اس کی کتاب کا مخالف ہوں بلکہ ان کا دشمن ہوں جس نے ان دونوں کو دشمن جانا۔ فاروق اعظم نے کہا کہ پھر یہ رقم تمھارے پاس کہاں سے آئی؟ آپ نے کہا کہ گھوڑے کی نسل افزائی، دوست کی مہربانیاں اور عطیات جو میرے پاس لوگ لائے، جانچ کرنے پر یہی ثابت ہوا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مجھے گھوڑوں کی خرید و فروخت سے نفع ہوا اور کچھ منافع دوسرے ذریعہ سے کمائے اس سے بارہ ہزار حاصل ہوئے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ

حضرت عمر نے ابو ہریرہ سے کہا کہ تم نے اس عہدۂ امارت کو کیسا پایا؟ فرمایا کہ جب تم نے مجھے اس پر مقرر کیا تھا تو مجھے پسند نہ تھا، اور جب مجھ سے لے لیا تو مجھے پسند تھا۔ آپ چار لاکھ کی رقم بحرین سے لائے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ کسی پر ظلم کر کے تم نے یہ رقم وصول کی، آپ نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ نے کہا کیسے اور اپنے لیے کتنا لائے؟ ابو ہریرہ نے کہا بیس ہزار۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ رقم کیسے حاصل ہوئی؟ ابو ہریرہ نے جواب دیا تجارت سے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی پونجی دیکھ لو اور اپنا روزینہ بھی دیکھو، اسے لے لو باقی رقم بیت المال میں جمع کر دو۔

حضرت عمر نے دوسرے عمال جیسا معاملہ آپ کے ساتھ بھی کیا، اسی پر ابو ہریرہ کہنے لگے اے خدا امیر المومنین کو بخش دیجیے۔

اس کے بعد حضرت عمر نے انھیں امارت کی پیشکش کی، ابو ہریرہ نے انکار کیا، اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ تم اس کام کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ تم سے بہتر حضرت یوسفؑ نے اسے طلب کیا تھا۔ جس پر ابو ہریرہ نے کہا کہ یوسف نبی بن نبی تھے، میں ابو ہریرہ بن امیمہ ہوں اور میں تمھارے زیر نگرانی عامل بننے سے ۲۳ بار توبہ کرتا ہوں۔ فاروق اعظم نے کہا کہ تم نے پانچ دفعہ نہیں کیا۔ ابو ہریرہ نے کہا کہ نہیں میں بلا علم کے گفتگو کرنے اور بلا تدبر و تدبیر کے فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہوں، اس سے بھی ڈرتا ہوں کہ میری پشت پر کوڑے لگائے جائیں، میرا مال مجھ سے لے لیا جائے، اور میری آبرو لوٹ لی جائے۔

فتنہ سے دوری:

حضرت عثمانؓ اپنے مکان میں جب مخالفین کے نرغے میں تھے اس وقت شورش پسندوں سے آپ کی دفاع کے لیے آپ کے صاحبزادگان، ابو ہریرہؓ اور ان کے ہمراہ کچھ صحابہ مکان میں موجود تھے۔ حضرت عثمان کے صاحبزادوں نے ابو ہریرہؓ کے اس احسان کو یاد رکھا، ان کا احترام کرتے رہے تا آنکہ ابو ہریرہ کا انتقال ہوا تو جنازہ لے کر بقیع کے گورستان میں پہنچے۔

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جو فتنوں نے سر اٹھایا، ان سے آپ الگ تھلگ رہے۔ آپ کی شرکت تاریخ سے ثابت نہیں۔ اور ان فتنوں سے دور رہنے میں حضور کی یہ حدیث بہت زیادہ معاون ہوئی کہ فتنے ابھریں گے جس میں اپنی جگہ پر بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا، جو بھی قریب ہوا فتنہ کی لپیٹ میں آجائے گا، ایسے موقع پر جسے جہاں جگہ ملے، جہاں پناہ نظر آئے ٹھیر جائے۔

معاویہؓ نے اپنے دور خلافت میں انھیں مدینہ کا گورنر بنایا، پھر ناراض ہوکر مروان کو گورنر بنادیا، اور آپ کو معزول کردیا۔ مروان نے آپ کو اپنا نائب بنایا جب وہ خود حج کے سفر پر روانہ ہوا۔

مزاح و بذلہ سنجی

ابوہریرہ اپنے روزمرہ میں نہایت عمدہ تھے، پاکیزہ طبیعت۔ پاک باطن محتاجی اور صبر نے آپ میں آسودہ خاطری پیدا کردی تھی، پھر بھی آپ نے ہر جز کا حق ادا کیا، دنیا کو راہ گیر کی طرح دیکھا۔ آپ کو امارت ناز ونخرہ کی راہ میں نہ ڈال سکی بلکہ اس سے آپ کی تواضع حسن اخلاق میں اور اضافہ ہوگیا۔ مروان نے آپ کو خلیفۂ مدینہ بھی بنایا، اس وقت آپ گدھے پر سوار ہوتے، سر پر کھجور کے پتوں کی ٹوپی ہوتی اور عجیب طرح کی کاٹھی گدھے پر ہوتی، اس شان سے آپ مدینہ کے بازار سے گزرتے کہ جب کوئی راستہ میں ملتا تو کہتے کہ راستہ دو امیر آگئے۔

ابوہریرہ مدینہ کے بازار سے لکڑیوں کا گٹھا لیے گزرتے حالانکہ وہ مدینہ کے گورنر ہوتے، ثعلبہ بن ابی مالک سے کہتے کہ راستہ چھوڑ دو کہ امیر المومنین آرہے ہیں، اے ابن مالک پھر وہ جواب دیتے اللہ آپ پر رحمت نازل کرے یہ کافی ہے، پھر ابوہریرہ فرماتے اور راستہ دو امیر کے لیے کیونکہ اس کے اوپر گٹھر ہے۔

بچوں کو خوش رکھنا آپ کا خاص مزاج تھا۔ رات میں بچوں کو آنکھ مندول کھیلتے دیکھتے تو

ان میں شامل ہو جاتے، بچوں کو اندازہ بھی نہ ہوتا، پھر پاگلوں کی طرح اپنے پیر سے زمین پیٹتے تاکہ بچوں میں ہنسی کی لہر دوڑ جائے یہ دیکھ کر بچے ادھر ادھر ہنستے ہوئے بھاگتے۔

ابو رافع کا بیان ہے کہ مجھے ابو ہریرہ کبھی رات کے کھانے پر بلاتے اور فرماتے بغیر گوشت کی ہڈیاں امیر کے لیے چھوڑ دو، میں دیکھتا تو زیتون میں بنی ثرید ہوتی۔

وفات:

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ و حضرت عائشہ دونوں کی موت ۵۷ھ میں ہوئی، علی بن مدینی اور مدائنی کا بھی یہی خیال ہے، البتہ ابو معشر آپ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی، کہتے ہیں۔

واقدی اور ابو عبید نے ۵۹ھ بہ عمر ۷۸ سال کہا ہے۔ حضرت عائشہ کی نماز جنازہ رمضان ۵۸ھ میں پڑھائی، اور ام سلمہ کی ۵۹ھ میں نماز جنازہ پڑھائی، آپ اسی سال ام سلمہ کے بعد انتقال کر گئے۔ ابن حجر نے واقدی کی روایت کا ذکر کرنے کے بعد آپ کی وفات ۵۹ھ میں تحریر کی ہے، یہ واقدی کی کھلی غلطی ہے، اس لیے کہ ام سلمہ کا انتقال ۶۱ھ میں ہوا، اسلم کی روایت اس پر شاہد عدل ہے۔ آپ نے ام المومنین عائشہ کی نماز جنازہ ادا کی اور اسی سال آپ کا وصال ہوا۔ ہشام بن عروہ کی روایت یہی ہے کہ دونوں کی وفات ایک ہی سال میں ہوئی۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۶۶۔ اصابہ ج ۷ ص ۲۰۷)

وفات ام سلمہ میں جو غلطی واقدی سے ہوگئی ہے وہ ابو ہریرہ کی وفات میں غلطی کو مستلزم نہیں، ابن کثیر کا بھی قول ہے کہ ام سلمہ کی وفات ابو ہریرہ کے بعد ہوئی۔ اور کافی سے زیادہ شہادت اس بات کی ہے کہ آپ کی وفات ۵۹ھ میں ہوئی۔

آپ کے جنازہ میں صحابہ میں سے عبداللہ بن عمر اور ابو سعید خدری شامل تھے، اور مروان بھی آپ کے جنازہ میں شریک تھا۔ ابن عمر آگے چل رہے تھے اور آپ کے لیے رحمت کی دعا کر رہے تھے اور حضرت عثمان کے صاحبزادے آپ کا جنازہ اٹھائے ہوئے بقیع پہنچے، اس کا لحاظ کر کے کہ وہ حضرت عثمان کے بارے میں عمدہ رائے رکھتے تھے۔

علمی زندگی:

ابو ہریرہؓ حضورؐ کے ساتھ چار سال رہے، آپ سے بہت سی حدیثیں سنیں اور سنت نبوی کے دقائق پر واقف ہوئے اور شریعت کو سنت کے مطابق دکھانے کی کوشش کی۔ حضور نے آپ کے مقام کو پہچانا اور علاء حضرمی کے ساتھ عامل بنا کر بحرین روانہ کیا، آپ وہاں موذن اور امام رہے۔ حضور علیہ السلام آپ کی کسی مانگ کے پورا کرنے میں ذرا تامل نہ فرماتے، اس واسطے کہ آپ کے حریص علم ہونے سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ نے ایک دن سوال کر لیا کہ رسول خدا قیامت کے دن شفاعت کی سعادت کس کو نصیب ہوگی؟ حضور نے فرمایا کہ اب تک یہ سوال میرے خیال میں سوائے تمھارے کسی اور نے نہیں کیا، مجھے تمھارے حرص علم پر واقفیت ہے، میری شفاعت قیامت کے دن اسے نصیب ہوگی جو اپنی زبان و دل سے لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگا۔

آپ کا مقصد زندگی جستجوئے علم اور آپ کی امیدگاہ دین کی سمجھ تھی۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت کے پاس ایک شخص آیا اور کچھ سوال کیے، آپ نے اس سے کہا کہ ابو ہریرہ کے پاس جاؤ اس لیے کہ ایک موقعہ پر میں و فلاں اور ابو ہریرہ مسجد میں موجود تھے، خدا سے ہم عرض کر رہے تھے اور اس کا ذکر کر رہے تھے، اتنے میں حضور نکل آئے اور ہم میں تشریف فرما ہوئے، ہم لوگ چپ ہو گئے، آپؐ نے فرمایا کہ جو کر رہے تھے اس میں لگ جاؤ۔ زید نے بیان کیا کہ میں اور میرا ساتھی ابو ہریرہ سے پہلے دعا کر رہے تھے، اور حضور اس پر آمین فرما رہے تھے۔ ہم دونوں کے بعد ابو ہریرہ نے دعا کی کہ "اے خدا میں وہ ساری چیزیں طلب کرتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے طلب کی ہیں اور ایسا علم طلب کرتا ہوں جو حافظہ سے غائب نہ ہو۔ رسول خدا نے فرمایا آمین۔ ہم لوگوں نے کہا حضور ہم بھی ایسا علم خدا سے مانگ رہے ہیں جو یادداشت سے نہ جائے، آپ نے فرمایا کہ یہ دوسی خاندان کا غلام بازی لے جا چکا۔

ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم ان غنیمتوں میں سے کچھ

مانگتے ہو جو تمھارے دوسرے رفقا مانگ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے تو آپ وہ سکھا دیجیے جو خدا نے آپ کو سکھایا ہے۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے میری پیٹھ پر پڑی کامی سفید رنگ کی چادر اتاری اور اپنے اور میرے بیچ بچھا دیا، میں نے دیکھا اس پر جوں رینگ رہے تھے۔ آپ نے اس کے بعد مجھ سے حدیث بیان کی جو میرے حافظہ نے پوری طرح اپنے قابو میں کرلیا۔ آپ نے فرمایا اسے سمیٹ لو اور اپنے ساتھ باندھ لو۔ اس کے بعد سے میں کبھی حدیث کا ایک لفظ بھی نہیں بھولا۔

یہ واقعات اور اس طرح کے سیکڑوں واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ کو طلب علم کی شیفتگی غیر معمولی تھی اور خدا کے رسول نے آپ کے لیے جو دعا فرمادی وہ آپ کی مراد کی تکمیل میں اور بھی ممد و معاون ہوئی۔

صحابہ نے حضور کے بعد آپ کی پوری طرح پذیرائی کی، چنانچہ آپ مسجد نبوی میں بیٹھ کر درس حدیث دیتے اور صحابۂ کبار کی موجودگی میں فتویٰ صادر فرماتے۔ بعض کبار علماء و صحابہ جیسے زید بن ثابت وعبداللہ بن عباس تو لوگوں کو آپ سے رجوع کرنے کی ہدایت کرتے۔ چنانچہ معاویہ بن ابی عیاش الانصاری کی روایت میں ہے کہ آپ ابن زبیر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، محمد بن ایاس بن بکر اتنے میں آئے اور آپ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص نے قبل دخول اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تو اس کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے ابو ہریرہ وابن عباس کی جانب رجوع کرنے کے لیے کہا۔ دونوں صحابی اس وقت حضرت عائشہ کے پاس تھے، وہاں جا کر انھوں نے مسئلہ دریافت کیا۔ ابن عباس نے ابو ہریرہ سے فتویٰ دینے کی بات کہی اور کہا کہ ایک مشکل مسئلہ سامنے ہے۔ ابو ہریرہ نے کہا ایک سے بائن ہو جاتی ہے اور تین سے حرام۔ غالباً ابو ہریرہ کا فتویٰ اس سے پہلے کا ہے ورنہ بعد میں حضرت عمر نے تین طلاق کا حکم لوگوں کی تنبیہ کے لیے جاری کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ سائل نے مختلف مجلسوں میں تین طلاقیں دی ہوں۔

محمد بن عمارہ بن عمرو بن حزم ابو ہریرہ کی ایک مجلس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ میں ایک ایسی

مجلس میں جس میں ابو ہریرہ تھے شریک ہوا۔اس مجلس میں کبار صحابہ میں سے تقریباً دس اکابر بھی شریک تھے،ان کو ابو ہریرہ حدیث کی تعلیم دیتے،ان میں سے بعض احادیث سن کر یاد نہ کر پاتے،پھر آپ کی طرف رجوع کرتے،اسے دہراتے،پھر ان سے آپ حدیث بیان کرتے،بعضوں کی یاد میں نہ آتی۔اس طرح آپ کئی بار کی تکرار کے بعد ان کے ذہن نشین کرادیتے۔اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ حدیث رسول کے سب سے بڑے حافظ ہیں۔

آپ سے لوگ وقت لیتے کہ ہم حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث رسول اکرم سنیں گے۔چنانچہ مکحول روایت کرتے ہیں کہ معاویہ کے نصب کردہ خیموں میں سے ایک خیمہ میں ایک رات جہاں حضرت ابو ہریرہ مقیم تھے،لوگوں نے وقت لے لیا تھا،چنانچہ اس میں لوگ اکٹھا ہوئے،ابو ہریرہ اس مجمع میں بیٹھے اور صبح تک حدیثیں بیان کرتے رہے۔

محمد بن سیرین کا بیان ہے کہ ابو ہریرہ جمعرات کو حدیث بیان کرنے کے لیے مقرر کرتے۔ابو ہریرہ احادیث بیان کرنے میں امین تھے،اگر اس میں کوئی اضافہ اپنی طرف سے کرتے تو اس کا اظہار کر دیتے کہ یہ میری اپنی رائے ہے۔اور ان کی یہ بات مختلف ذرائع سے مصدق ہے،اس پر بکیر بن الاشج کی روایت سے روشنی پڑتی ہے کہ بشر بن سعید نے بیان کیا کہ خدا سے ڈرو،حدیثیں جوں کی توں یاد رکھو اس لیے کہ ہم نے ابو ہریرہ کی مجلس میں دیکھا کہ حدیث نبوی بیان کرتے اور کعب احبار سے حدیثیں بیان کرتے،بس ہم دیکھتے کہ اس حدیث کو لوگ کعب احبار سے روایت کرتے،کعب کی حدیث رسول خدا سے بیان کرتے اس لیے خدا سے ڈرو اور حفظ حدیث کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے بہت زیادہ حدیثیں بیان کیں،اور آپ خود فرماتے کہ حدیث رسول کی کثرت میں مجھ سے آگے کوئی نہ تھا،ہاں عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

بعض صحابہ کا مزاج کم سے کم روایت کرنا تھا کہ کہیں قرآن و حدیث مخلط نہ ہو جائیں یا غیر قرآن سے انکا تعلق نہ بڑھ جائے۔ابو ہریرہ کو کثرت حدیث کا الزام دیتے۔ان سے

ابو ہریرہ نے کہا کہ تم مجھے کثرت روایت کا الزام لگاتے ہو، خدا کے سامنے حاضری ہوگی اور تم یہ کہتے ہو کہ مہاجرین ان احادیث کو حضور سے روایت نہیں کرتے؟ ہمارے رفقا جو مہاجر تھے ان کی اپنی کاشت تھی ان کی نگرانی میں رہتے۔ میں ایک محتاج آدمی تھا، میں صرف نان شبینہ پر حضور کی خدمت میں رہا کرتا، میں حضور کے ساتھ زیادہ نشست و برخاست کرتا، جب یہ لوگ نہ ہوتے میں اس وقت موجود ہوتا اور یہ بھول جاتے اور مجھے یاد رہتا۔ پھر قصۂ نمرہ ذکر کیا اور رسول خدا کی دعا کا ذکر کیا کہ بخدا اس کے بعد میں نے کبھی کوئی بات فراموش نہ کی، جو آپ نے سنایا یاد رہا۔

اور فرماتے، بخدا اگر قرآن کی اس آیت کا پاس نہ ہوتا تو میں تم سے کبھی حدیثیں بیان نہ کرتا:

"ان الذین یکتمون ما أنزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بینٰہ للناس فی الکتاب أولئك یلعنھم اللہ و یلعنھم اللاعنون" (البقرہ:۱۵۹)

"جو لوگ، ہم نے جو بینات وہدیٰ نازل کی ہیں انہیں لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرنے کے بعد بھی چھپاتے ہیں تو ان پر خدا کی لعنت اور لوگوں کی پھٹکار"

ولید بن عبدالرحمان کی روایت ہے کہ ابو ہریرہ نے رسول خدا سے روایت کیا کہ جس نے جنازہ کی نماز میں شرکت کی، ایک قیراط سونا صدقہ کرنے کا ثواب حاصل کیا، اور جس نے نماز کے بعد تدفین میں بھی شرکت کی دو قیراط سونے کے صدقے کے ثواب کا مستحق ہوا۔ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ ابو ہریرہ کیا کہہ رہے ہو؟ سوچ کر کہو، تم بہت حدیثیں بیان کرتے ہو، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور خدمت عائشہ میں حاضر ہوئے، اور ان سے دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ ابو ہریرہ نے سچ بیان کیا۔ پھر فرمایا ابو عبدالرحمان مجھے بازار اور اس کے کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا، میں تو حضور اکرم کی خدمت میں حدیثیں سیکھنے کے لیے تھا، اگر روٹی کا ٹکڑا مل جاتا تو اس سے شکم سیر ہو جاتا۔ ایک روایت میں ہے کہ تجارت نہ زراعت میرے لیے کوئی چیز محبت رسول اکرم سے مانع نہ تھی۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا ابو ہریرہ تمھارا علم ہم سے کہیں زیادہ ہے، اور تم حدیث رسول کے حافظ بھی ہم سے زیادہ ہو۔

آپ کے معاصرین صحابہ نے آپ کی کثرت روایت کی شہادت دی، اور آپ سے احادیث حاصل کرنے اور لوگوں تک پہنچانے کے دستاویزی ثبوت بہم پہنچائے۔ ان شہادتوں سے وہ سارے الزامات جو آپ کی کثرت حدیث پر ہیں، ایک ایک کرکے ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض صحابہ نے اس کی شہادت دی کہ ہم نے ایسی احادیث آپ سے سنیں جو دوسروں سے نہیں سنی تھیں۔ چنانچہ حضرت طلحہ بن عبداللہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ دیکھتے نہیں کہ یہ یمانی ابو ہریرہ کیا اعلم بحدیث الرسول ہے، ہم اس سے ایسی روایت سنتے ہیں جو تم لوگوں سے سننے میں نہیں آئی۔ کیا وہ واقعی رسول خدا سے یہ چیزیں بیان کرتا ہے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ جو وہ بیان کرتا ہے اگر ہم نے اسے نہیں سنا تو بلاشبہ وہ صحیح بیان کرتا ہے، اس لیے کہ ہمارے گھریلو بکھیڑے بھیڑ، بکریوں کی رکھوالی اور دوسرے دھندے سے ہم تو صبح شام ہی کو حاضری دیتے تھے، اور ابو ہریرہ تو حضور کی ڈیوڑھی پکڑے ہوتے تھے، آپؐ کے ہاتھ پر ان کا ہاتھ تھا، اس لیے اگر ہم نے وہ باتیں نہیں سنیں جو انھوں نے سنیں تو مجھے کوئی شک نہیں اور آپ ایسے آدمی میں کیا خیر دیکھ سکیں گے جس نے آپ سے سنا نہیں اور اپنی جانب سے بیان کر دیا۔

اشعث بن سلیم اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوایوب انصاری کو ابو ہریرہ سے حدیث بیان کرتے سنا تو دریافت کیا کہ آپ تو حضورؐ کے خاص اصحاب میں ہیں اور ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ابو ہریرہ نے حضور سے جو باتیں سنیں وہ ہم نہیں سن سکے، ہم لوگ ابو ہریرہ سے کوئی بات سن کر بیان کرتے ہیں تو اس سے تو بہتر ہے کہ ہم بلا سنے ہوئے کسی بات کی نسبت حضور کی طرف کریں۔

سوال کرنے میں ابو ہریرہ بے جھجک تھے، وہ حضور سے ایسی بات دریافت کرتے جو ان کے سوا کوئی دوسرا دریافت نہ کر پاتا، جس طرح سابقین اسلام آپ سے سوال کرنے پر جری تھے۔ ابو ہریرہ کا علم کافی تھا، آپ کی معرفت حدیث بہت وسیع تھی۔ معاصرین اور طلبہ بھی سے حدیث بیان کرتے اور ان سے کہتے کہ ابھی بہت سے پلندے ہیں جو ابو ہریرہ نے

کھولے نہیں ہیں، میں نے حضور علیہ السلام سے دو تھیلے علم کے حاصل کیے، ایک کھول کر نشر کر دیا، دوسرا اگر نشر کر دوں تو لوگ میری گردن ناپ لیں گے۔

بہر حال ابو ہریرہ طلبہ کے ظرف کو دیکھ کر حدیثیں بیان کرتے اور اس کا پورا لحاظ رکھتے کے کوئی ایسی بات نہ بیان کر دوں جو ان کے لیے نفع رسانی کے بجائے ضرر کا سامان کر دے، اس لیے ہر بات وہ لوگوں کے سامنے بیان نہ کرتے۔

ابو ہریرہ کی یادداشت:

ابو ہریرہ حفظ کے ساتھ باہوش بھی تھے، جو روایت کرتے یاد رکھتے، جو چیزیں بیان کرتے ان کی تہ تک رسائی کرتے۔ ان میں دو عظیم صفتیں اکٹھا ہو گئی تھیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑواں تھیں، ایک آپ کے علم کا پھیلاؤ اور روایات کی کثرت، دوسرے قوت ذاکرہ اور عمدہ یادداشت۔ یہی دو چیزیں اہل علم کا سرمایۂ افتخار ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ حضور نے آپ کی یادداشت کے لیے دعا فرمائی تھی کہ وہ جو بات سنیں بھولیں نہ۔

اس کے ساتھ ساتھ ابو ہریرہ کا علم سے غیر معمولی تعلق بھی اس کا سبب بنا، اسی سلسلے میں ان کا قول ہے:

"صحبت النبي صلى الله عليه وسلم ثلاث سنين ما كنت سمعت قط أعقل مني ولا أحب إلى أن أعي ما يقول رسول الله صلى الله عليه وسلم فيهن" (طبقات ابن سعد، ج ۴ قسم ۲ ص ۵۴)

"میں نے صحبت رسول علیہ الصلاۃ والسلام میں تین سال گزارا جو سنتا یاد رکھتا، مجھے پسند نہ تھا کہ آپ کی کسی بات کو یاد نہ رکھوں جو آپ فرماتے انھیں محفوظ کر لیتا"

آپ جو کچھ حضور سے سنتے اس کا مذاکرہ فرماتے، رات کا ایک حصہ اسی میں گزارتے خود ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک تہائی سونا، ایک تہائی نماز میں، ایک تہائی احادیث نبوی کے مذاکرہ میں۔

مروان کے میر منشی ابوزعیزعہ کے الفاظ یادگار رہیں گے، اس سے ابوہریرہ کے حافظہ اور دانائی پر جو روشنی پڑتی ہے اسے سنئے۔ ابوزعیزعہ کہتے ہیں کہ مروان نے ابوہریرہ کو طلب کیا، مجھے اپنے تخت کے پشت پر بیٹھایا، اور ان سے حدیثیں دریافت کرنے لگا۔ میں انھیں لکھتا جاتا تھا۔ ایک سال گزر جانے پر وہ ابوہریرہؓ کو لایا اور ان احادیث کے بارے میں دریافت کرنے لگا جو سال گذشتہ ابوہریرہ نے بیان کی تھیں۔ میں پردے کے پیچھے ان احادیث کو املاشدہ بیاض سے ملاتا جاتا۔ آخر میں اندازہ ہوا کہ ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں آیا، نہ عبارت آگے پیچھے ہوئی۔ اس کی شہادت معاصرین صحابہ تابعین اور بعد میں آنے والے محدثین سبھی نے دی۔

ابوہریرہ اور فتویٰ

ابوہریرہ صرف راوی حدیث ہی نہ تھے بلکہ اپنے دور کے علماء میں سرفہرست تھے، قرآن وسنت واجتہاد بھی چیزوں پر قابو یاب تھے۔ صحبت نبی کریم سے ان میں وہ جلا پیدا ہوئی تھی جو دین کی باتوں کو سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں، اور حضور کی عملی سنت کے شاہد بن کر سامنے آئیں۔ آپ نے چھوٹی بڑی ساری باتیں حضور سے حاصل کیں، آپ کے پاس احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، آپ مسائل شرعیہ کے حل کی بھی صلاحیت کے مالک تھے، اس لیے کہ حضور کے زمانے میں پیش آنے والے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔

یہ وہ صلاحیت تھی جس نے ابوہریرہ کو کار فتویٰ میں بیس سال سے زیادہ دنوں تک مشغول رکھا، حالانکہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد اس وقت موجود تھی۔ زیاد بن مینا کے بیان کے مطابق ابن عباس، ابن عمر، ابوسعید، ابوہریرہ، جابر اور ان جیسے دوسرے مدینہ میں افتاء کے عہدہ پر تھے اور حضور کی حدیثیں بھی بیان کرتے۔ حضرت عثمان کی وفات کے بعد سے اس وقت تک یہ فتویٰ دیتے رہے جب تک کہ زندگی کا آخری سانس باقی رہا۔ مشہور تھا کہ انہی پانچ کو فتویٰ راس آتا۔

حضرت عمر کے زمانے میں والی بحرین مقرر ہوئے، وہاں بھی کارفتوی آپ سے متعلق تھا اور عمر بن خطاب کے فتوے بھی مروج تھے۔ ابن عباس کی موجودگی میں فتوی دیتے، ان کے فتوے کے سلسلہ میں یہ ذکر کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں آپ مکثرین حدیث میں تھے مکثرین فتوی میں بھی تھے۔ بہر حال متوسطین فتاوی میں تو ان کو سبھی نے تسلیم کیا ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ متوسطین فتاوی میں حضرت ابوبکر، ام سلمہ، انس بن مالک، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، عثمان بن عفان کا شمار ہے۔ تقریباً ۱۳ اشخاص پر مشتمل یہ گروہ ان میں سے ہر ایک کا فتوی اگر جمع کیا جائے تو ہر ایک کی ایک تالیف ہوگی۔

ان کے شیوخ جن سے روایت حدیث کی:

حضور علیہ السلام سے ابوہریرہ نے بہت زیادہ نکھری حدیثیں بیان کیں اور بعض صحابہ سے بھی حدیثیں لیں، مثلاً ابوبکر و عمر بن الخطاب، فضل بن عباس، ابی بن کعب، اسامہ بن زید، ام المومنین عائشہ، بصرہ بن ابی بصرہ اور کعب احبار تابعی سے بھی آپ نے حدیثیں روایت کیں۔

آپ سے بھی جن صحابہ نے حدیث روایت کی ان میں ابن عباس، ابن عمر، انس بن مالک واثلہ بن الاسقع، ابوایوب انصاری، جابر بن عبداللہ الانصاری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

آپ سے تابعین کے ایک بڑے گروہ نے حدیث روایت کی۔ آپ سے تقریباً آٹھ سو افراد صحابہ تابعین وغیرہ نے روایت کی، ان میں ائمہ تابعین، اعلام حدیث وفقہ ہیں مثلاً بشیر بن نہیک، حسن بصری، زید بن اسلم، زید بن ابی عتاب، سعید المقبر ی، سعید بن یسار، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، شفی بن ماتع، شہر بن حوشب، عامر الشعبی، عبداللہ بن سعد مولی عائشہ، عبداللہ بن عتبہ الھذ لی، عبدالرحمان بن ہرمز الاعرج، عبدالعزیز بن مروان، عروہ بن الزبیر، عطا بن ابی رباح، عطا بن یسار، عمرو بن خلدہ قاضی مدینہ، عمرو بن دینار، قاسم بن محمد، قبیصہ بن ذویب، کثیر بن مرہ، محمد بن سیرین، محمد بن مسلم الزہری، حالانکہ ملاقات نہیں ہوئی محمد بن المنکد ر، مروان بن الحکم، میمون بن مہران، ہمام بن منبہ آپ کا صحیفہ جو ابوہریرہ سے آپ نے لکھا ہے، مشہور زمانہ ہے، ابوادریس خولانی، ابوبکر بن عبدالرحمان، ابوسعید المقبر ی، ابوصالح سمان وغیرہ۔

مرویات کی تعداد:

ابو ہریرہؓ نے تمام صحابہؓ سے زیادہ حضورؐ سے حدیثیں روایت کی ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، اس لیے کہ آپ کی دن رات کی معیت کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ دوسرے سابقین اسلام کی طرح آپ حضور سے ہر بات دریافت کرنے کے شائق تھے، مزید براں شیفتۂ علم و ہنر تھے، اور موقع پا کر حضور کی احادیث کا مذاکرہ و تکرار آپ کا شیوہ تھا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ۳۸۴۸ حدیثیں آپ سے روایت کی ہیں، ان میں لفظاً و معناً مکررات بہت ہیں، لیکن مکررات کے حذف کے بعد بھی بہت خیر باقی رہ جاتا ہے۔

امام تقی بن مخلد نے اپنی مسند میں ۵۳۷۴ احادیث آپ سے روایت کی ہیں، اور بخاری و مسلم میں آپ کی مرویات کی تعداد ۳۲۵ ہے۔ بخاری میں الگ سے ۹۳ احادیث ہیں اور مسلم میں ۱۸۹ حدیثیں مکتوب ہیں۔

ابو ہریرہؓ کی تعریف و توصیف:

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مجھے خیال آتا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں تم سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا، میں تمہاری شیفتگی علم سے واقف ہوں۔

حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا کہ حضور نے فرمایا ابو ہریرہ علم کا برتن ہیں۔

ابو ہریرہ کی خود اپنی گواہی کہ اصحاب رسول میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے زیادہ حدیثوں سے واقف ہو، بجز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کہ وہ حدیثیں لکھ لیتے، میں صرف یادداشت پر رکھتا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے ابو ہریرہ کو کثرت روایت حدیث سے روک دیا تھا، جیسا کہ بہتوں کو روکا۔ اس کی وجہ تدبر عمر اور بعض صحابہ کا اقلال حدیث کو پسند کرنا تھا، اس لیے کہ کثرت حدیث میں غلطیوں کا اندیشہ تھا، دوسرے قرآن سے توجہ ہٹ جانے کا خطرہ بھی تھا۔ اس کے باوجود حضرت عمر نے جب ابو ہریرہ کی احتیاط تقویٰ اور دوسری خوبیوں پر نظر ڈالی تو

خود ابو ہریرہ سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کی۔ ابو ہریرہ کا اپنا بیان ہے کہ حضرت عمر کو میری حدیث کسی نے پہنچائی، انھوں نے مجھے بلایا، آپ نے فرمایا کہ تمھیں یاد ہوگا کہ ہم رسول خدا کے ساتھ فلاں کے مکان پر تھے۔ میں نے کہا ہاں مجھے یاد ہے اور میں یہ بھی جان گیا کہ تم نے مجھے کس لیے بلایا ہے۔ حضرت عمر نے کہا بتلاؤ کس لیے بلایا؟ میں نے کہا کہ حضور نے اس دن فرمایا کہ جس نے میرے اوپر غلط بات کی تہمت دھری اپنا ٹھکانا جہنم میں کرلے۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا بیشک جاؤ پھر حدیثیں بیان کرو، میں روکتا نہیں۔ یہ اجازت فاروقی ابو ہریرہ کی اعلیٰ درجہ کی توثیق ہے۔

عبداللہ بن عمر نے ابو ہریرہ سے فرمایا کہ تم نے ہم میں سب سے زیادہ حضورؐ کی جناب میں زندگی بسر کی، اور آپ کی حدیثوں سے زیادہ واقف ہوئے۔ ابن عمر سے پوچھا گیا کہ ابو ہریرہ کی بیان کردہ حدیثوں سے انکار ہے؟ انھوں نے کہا نہیں، مگر انھوں نے روایت بیان کرنے پر بڑی سیر چشمی سے کام لیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ ابن عمر نے فرمایا ابو ہریرہ ہم سے بہتر ہیں، یہ حدیث کی روایت میں اعلم ہیں۔ حضرت ابن عمر ابو ہریرہ پر رحمت الٰہی کی درخواست اکثر کرتے اور فرماتے کہ وہ حدیث کو مسلمانوں میں زندہ کرنے والی شخصیت ہے۔ ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ رسول خدا سے بے تکلف تھے جو چاہتے دریافت کرلیتے، جسے ہم دریافت نہ کرسکتے تھے۔ ابن عمر نے حدیث جنازہ سمجھنے کے لیے حضرت عائشہ کے پاس آدمی بھیجا تو سیدہ عائشہ نے فرمایا کہ ابو ہریرہ اپنی روایت میں سچے ہیں۔ حضرت طلحہ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس میں شک نہیں کہ آپ نے حضور سے بہت کچھ سنا جو ہم نے نہیں سنا۔ زید بن ثابت نے ایک شخص سے جو مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا فرمایا کہ ابو ہریرہ سے رجوع کرو۔ ابن عباس کے پاس ایک شخص آیا اور مسئلہ دریافت کیا، ابن عباس نے خود ابو ہریرہ سے کہا کہ اسے مسئلہ بتلادو اس لیے کہ مسئلہ مشکل ہے۔ کعب احبار نے فرمایا کہ توریت نہ پڑھنے والوں میں توریت کے سب سے بڑے عالم ابو ہریرہؓ تھے۔ محمد بن عمار بن عمرو بن حزم نے

کہا کہ اس دن مجھے اس کا علم ہوا کہ ابو ہریرہ کی یادداشت سب سے زیادہ بہتر ہے جب میں نے دیکھا کہ اصحاب رسول اکرم میں بڑے بڑے لوگ موجود ہوتے اور حضرت ابو ہریرہ حدیثوں کا تکرار کراتے اور نا معلوم حدیثوں کو بیان کر کے یاد کراتے۔ ابو صالح سمان نے فرمایا کہ ابو ہریرہ اصحاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ یادداشت کے مالک تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ اپنے دور کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

بخاری نے لکھا ہے کہ آپ سے آٹھ سو اہل علم نے اکتساب حدیث کیا، آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ ذہبی نے تحریر کیا کہ ابو ہریرہ پر حفظ حدیث ختم ہوگئی، حضورؐ سے جو سنا حافظہ میں موجود رہا، اور حرفاً حرفاً بیان کیا۔ ایک دوسرے مقام پر لکھا کہ ابو ہریرہؓ کا حافظہ سند تھا، کسی حدیث میں ان کے بارے میں غلطی کا پتا نہیں چلا۔

ابن کثیر نے لکھا کہ ابو ہریرہ صداقت، یادداشت، دیانت، عبادت، پارسائی اور عمل صالح میں یکتائے روزگار تھے۔ ابن حجر نے لکھا کہ ابو ہریرہ تمام رواۃ حدیث سے اپنے زمانے میں بڑے حافظ تھے، اور جو ابو ہریرہ نے بیان کیا، کسی دوسرے صحابی نے اسے بیان نہیں کیا۔

یہ تھوڑا سا نمونہ ہے۔ بہتات سے تمام بڑے بڑے اہل علم نے ابو ہریرہ کی توثیق کی۔ آپ کی وسعت علم اور کثرت حدیث کسی سے چھپی نہیں ہے۔ یہ ساری تعریف راہ چلتے آگئیں ہیں، ورنہ اس راوی حدیث کی تعریفات کا احاطہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ابو ہریرہ سے حدیث کا صحیح ترین طریق

ابن المدینی نے ذکر کیا کہ سب سے صحیح سند علی الاطلاق حماد بن زید عن ایوب عن محمد بن سیرین عن ابی ہریرہ ہے۔ سلیمان بن داؤد نے أصح الاسانید یحییٰ بن کثیر عن أبی سلمہ عن ابی ہریرہ بتلایا۔

ابو ہریرہ کی وہ حدیث جو زہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرہ ہے، وہ بھی صحیح ترین ہے اسی طرح ابو الزناد عن الأعرج یعنی (عبدالرحمان بن ہرمز) عن ابی ہریرہؓ، اسی طرح

ابن عون وایوب عن محمد بن سیرین عن ابی ہریرۃؓ، اسی طرح مالک عن الزہری عن سعید بن المسیب، عن ابی ہریرہ، اسی طرح سفیان بن عیینہ عن الزہری عن ابن المسیب عن ابی ہریرہؓ، اسی طرح معمر عن الزہری عن ابن المسیب عن ابی ہریرہؓ، اسی طرح اسماعیل بن ابی حکیم عن عبیدہ بن سفیان الحضرمی عن ابی ہریرہؓ، اسی طرح معمر بن ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہ، یہ ساری سندیں اصح الاسانید ہیں۔

شبہات کی دیوار اور اس کا ازالہ:

یہ ابو ہریرہ کی شخصیت جسے ہم نے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ہجرت کی زندگی ہو کہ حضور کی معیت کے دن سبھی دیکھ لیے ہیں۔ ابو ہریرہ ایک امین صحابی تھے اور انتھک کوشش کرنے والے طالب علم تھے، سنت نبوی کا التزام ان کی زندگی رہی۔ جوانی ہو کہ بڑھاپا محتاجی ہو کہ آسودگی ہر حال میں پاکباز رہے، تقوی شعار رہے، بلند حوصلہ خاکسار رہے۔ آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑا اہتمام پایا، آپ فتنوں سے دور رہے، اہل سنت و الجماعت کے محبین میں تھے، خیر کی طرف تیز گام تھے۔ ہم نے ان کی ہر زندگی آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ ان کے صفائے باطن، اخلاق کریمانہ، دنیا سے بے رغبتی، حق کے لیے جان سپاری، یہ ساری چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا علمی مقام، کثرت حدیث قوت حافظہ، معاصرین میں برومندی، علما کی ثنا خوانی ساری چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔

مگر بعض ایسے بھی مخالفین ہیں جو ابو ہریرہؓ کو ان کی گرامی منزلت نہیں دینا چاہتے، ان کے بلند مرتبہ کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش نفسانی ان کی طبعی دنائت انھیں اس پر مجبور کر رہی ہے کہ ابو ہریرہ کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کریں اور اس حقیقت کا چہرہ مسخ کر دیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

چنانچہ وہ ابو ہریرہؓ کی صحبت رسول کریم کو محض شکم پروری اور تن آسانی پر محمول کرتے ہیں۔ ان کی امانت کو خیانت، ان کے کرم کو دکھاوا بتلاتے ہیں، اور ان کی یادداشت کو فریب محض

اوران کی پاکیزہ بے غبار حدیثوں کو دروغ محض و بہتان عظیم گردانتے ہیں۔ ان کے فقر کو محض شو اور ذلت ان کی تواضع کو خود سپردگی ان کے مزاح کو بکواس، ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عوام کو دھوکہ دہی کا ایک نیا روپ، ان کی الگ تھلگ زندگی میں انھیں گروہ سازی کے جراثیم دکھائی پڑتے ہیں، اوران کی سچی اور ستھری بات پارٹی بازی معلوم ہوتی ہے، اور اموی حکومت کے لیے ایک آڑ تھے جنھوں نے اپنے بازوؤں کے نیچے چھپا رکھا تھا، اس لیے آپ ان کے سیاسی مقاصد کے لیے آلۂ کار تھے، چنانچہ ابو ہریرہ ان کی نگاہ میں دروغ گو واضعین حدیث میں شمار تھے، اب اس فریب اور افترا کی بھی کوئی بات ہے۔

اسی طرح بعض خواہش نفسانی کے غلاموں نے قدیم دور میں جیسے نظام، مریسی اور بلخی اور موجودہ دور میں بعض مستشرقین جیسے جولڈ تسیہر اور شبرنجر وغیرہ نے بھی وہی انداز اختیار کیا، اور سب سے زیادہ حیرت انگیز تو یہ بات ہے کہ سنت اور حامل سنت ابو ہریرہ پر اپنوں نے بھی قلم اٹھایا اور طعن و تشنیع کی جنھیں لوگ فہرست علماء میں شمار کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے سامنے ابو ہریرہ نامی کتاب مؤلفہ عبدالحسین شرف الدین عاملی ہے، جس میں اس نے ابو ہریرہ پر ایسے بہتان تراشے کہ اہل علم کی پیشانی مارے شرم کے عرق آلود ہو گئی ہے، اور باہوش لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، سچائی کی قیمت کو گھٹا دیا۔ یہیں تک بات نہیں رہ گئی، بلکہ ابو ہریرہ کی تکفیر پر جا کر بات ختم ہوتی ہے۔ اس کو ان حماقتوں پر دو چیزوں نے ابھارا، ایک ہوائے نفسانی دوسرے دور از کار تاویلات، جن کا سچائی سے کوئی جوڑ نہیں، نہ تاریخ ہی اس کو گوارا کر سکتی ہے۔

اسی کتاب کے نہج پر ایک اور کتاب ''اضواء علی السنة المحمدیه'' کے نام سے محمود ابوریہ نے تحریر کی۔ یہ شخص اپنے پیشرو سے بھی دس قدم آگے ہے اور سچائی سے اکثر جگہ کوسوں دور ہے۔ اسی طرح احمد امین نے ابو ہریرہ کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا اور تاریخی حقائق سے صرف نظر کر کے دوسرے پہلو سے بحث ہی نہیں کی ہے۔

اس مختصر کتاب میں ابو ہریرہ پر لکھی ہوئی کتاب کے سارے تار و پود بکھیرنا مشکل ہے، اس کے لیے ایک مستقل کتاب تصنیف کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے یہاں بالاختصار ہم

محض اہم شبہات واعتراضات کا جواب دیں گے۔ اگر ابو ہریرہ کی شخصیت اشاعت سنت کے سلسلے میں کوئی معمولی درجہ کی شخصیت ہوتی تو پھر ہم اس پر قلم بھی نہ اٹھاتے، مگر ان حالات میں ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان تمام طعنوں کے تارو پود بکھیر کر سامنے رکھ دیں، اس لیے کہ اس سے ابو ہریرہ کی ساری مرویات پر حرف آتا ہے، اور اس کے ان حصوں سے بالکل بحث نہ کریں گے جو سنت پر حرف آنے نہیں دیتے۔

حضرت عمرؓ و ابو ہریرہؓ:

عبدالحسین شرف الدین اور ابوریہ دونوں نے دروغ بیانی اور افترا پردازی سے کام لے کر کہہ دیا کہ ابو ہریرہ نے دس ہزار دینار ولایت بحرین کے زمانے میں بیت المال سے اڑا لیے، جس کی بنا پر حضرت عمر نے ان کو معزول کر دیا اور اتنے کوڑے لگائے کہ ابو ہریرہ لہولہان ہو گئے۔

ہم اس سے پہلے اس کی وضاحت میں تمام روایات کا ذکر کر چکے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ کو بھی مال میں حصہ دیا جس طرح دوسرے ولاۃ کو آپ نے حصہ دیا۔ کسی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو کوڑے لگائے اور لہولہان کر دیا۔ ابو ہریرہ حضرت عمر کی اس روش کو غلط سمجھتے تھے، اسی وجہ سے اللھم اغفر لامیر المؤمنین فرماتے رہتے، ان کو کوئی عداوت دشمنی حضرت عمر سے نہ تھی اور یہ جانتے ہوئے کہ جو حصے میں آیا ہے وہ منافع کی رقم ہے یا عطیات تھے، اگر فاروق اعظم کو ان پر شک ہوتا تو وہ شرعی عقوبت وسزا کا مستوجب بناتے، مگر آپ کو ابو ہریرہ کی امانت واخلاص پر یقین تھا، اسی وجہ سے دوبارہ ولایت پر بھیجنے کی خواہش کی، مگر ابو ہریرہ نے انکار کیا، ہم اس کی تفصیل پہلے لکھ چکے ہیں۔

عبدالحسین وابوریہ نے واقعات کے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا، چنانچہ عبدالحسین نے ابن عبدربہ سے صرف ایک روایت نقل کی جو اس کے خواہش نفسانی کو راس آئی اور بس۔ اور حقیقت سے پردہ اٹھانے والی دوسری روایات کا ذکر تک نہیں کیا، اور ابوریہ نے تو عبدالحسین ہی سے بات نقل کر دی، اور اصل مصدر کی جانب اشارہ تک نہیں کیا، نہ کوئی بحث، نہ تحقیق، بس اندھی تقلید۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اموی پرستی:

دوسری تہمت ابو ہریرہ پر امویوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ اور ان کے ساتھ گروہ بندی کی ہے، اور یہ کہ ابو ہریرہ نے رسول خدا سے ایسی جھوٹی حدیثیں روایت کردیں جو ان کے دشمنوں کے حق میں مضر اور ان کی سیاست کے لیے مفید تھیں۔

یہ تہمت بھی بے سرو پا ہے، اس لیے کہ ابو ہریرہؓ کے امویوں کی طرف داری کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ ان کی مخالفت کا علم ہمارے سامنے ہے۔ ان کے مختلف تصرفات کو آپ نے خلاف سنت سمجھا۔ معاویہ سے ان کے تعلقات ہمیشہ درست رہے ہوں ایسا بھی نہیں ہے۔ اگر معاویہ نے انھیں مدینہ پر گورنر بنا دیا تو خفا ہو کر ان سے ولایت لے بھی لی اور ان کی جگہ پر مروان بن الحکم کو گورنری عطا کردی۔ ابو ہریرہ کو نہ حضرت علی سے کوئی بغض تھا نہ ان کے خویش و اقارب سے ہی عناد تھا کہ اس سے امویوں کو راضی کرنے کے داعیے کی تائید ہوتی، آپ تو محب اہل بیت تھے۔ ابن کثیر نے تو وہ ساری کہانی لکھ ہی دی ہے جو مروان بن الحکم اور ابو ہریرہ کے مابین پیش آئی، جب کہ حضرت حسن کی تدفین قبر نبی کریمؐ میں مسلمانوں نے کرنی چاہی تھی، آپ نے مروان سے جو کہا اسے سنیے، "تم کچھ والی نہیں والی تو غیر ہے، غیر ضروری معاملے میں تم پڑنا چاہتے ہو، اس سے مقصد تمھارا صرف اس شخص کو راضی کرنا ہے جو یہاں موجود نہیں، یعنی معاویہ"۔

اسی طرح اور بھی روایات ہیں جن میں ابو ہریرہ کی وارننگ مروان کو مذکور ہیں، اسے آپ نے منکرات پر بار بار ٹوکا۔ ایک مرتبہ اس کے گھر پر تصویر دیکھ کر سخت تنبیہ فرمائی اور یہ حدیث بیان کی کہ میں نے رسول خدا کو کہتے سنا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو خدا کی طرح مخلوق بناتا ہے؟ ذرا ایک ذرہ ہی تخلیق کر کے میرے سامنے لائے۔ اسی طرح تاخیر جمعہ کے موقع پر بھی سخت تنبیہ کی اور یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"أتظل عند ابنة فلان تروحك بالمرواح و تسقيك الماء البارد وأبناء المهاجرين والأنصار يصهرون من الحر؟ لقد هممت أن

أفعل أفعل ثم قال اسمعوا من أميركم" (العقد الفرید ج۱ص۴۲)

"تم تو نوخیز لڑکیوں کی صحبت کا مزا لیتے ہو وہ پھولوں کی پنکھیوں سے ہوا دیتی ہیں اور ٹھنڈا پانی پلاتی ہیں اور مہاجرین وانصار صحابہ کی اولاد چلچلاتی دھوپ میں بلبلاتی رہتی ہیں، میں نے تو بہت کچھ پلاننگ کرنی چاہی، یہ کہہ کر آپ نے کہا کہ امیر کا خطبہ سنو"

کیا یہی بنوامیہ کی طرف داری ہے؟ ان کے شاہ کے خلاف گفتگو کرنے اور ان کو خیر کے لیے بلانے والا یہ تو کسی حق پرست ہی کا انداز زندگی ہو سکتا ہے۔

آپ نے مروان امیر مدینہ کے دیر سے جمعہ میں آنے پر سخت نوٹس لیا مگر اس کے حق کی بھی رعایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو خطبہ سننے کی ہدایت کی۔ اس سے ابوہریرہ کا مقام مسلمانوں کے مابین معلوم ہوا۔ اگر وہ معمولی درجہ رکھتے، سوسائٹی کے گرے لوگوں میں ہوتے جیسا کہ مخالفین نے ان کی تصویر پیش کی ہے تو نہ تو مسلمان ہی ان کی سنتے نہ امیر مدینہ ہی اس کو برداشت کرتا۔

بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ امویوں کی طرف داری کے بجائے اہل بیت کی طرف داری کا الزام لگاتے، اس لیے کہ ابوہریرہ نے اہل بیت کے مناقب اور ان کی مدح میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتیں نقل کی ہیں، جو صحاح ستہ میں مذکور ہیں۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ضعیف اور موضوع حدیثیں امویوں کی مدح میں موجود ہوں اس کی جستجو کرتے اہل بیت کی مدح کی احادیث جو صحاح ستہ میں ہیں پڑھتے سمجھتے، جب کہ ان احادیث کا موضوع اور دروغ ہونا واضح ہو چکا ہے، مگر "ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبی است" کے ترجمان عبدالحسین وابوریہ کو یہ کیسے نظر آ سکتا۔

اور عبدالحسین کی ابوہریرہ کے سلسلے میں یہ غلط بیانی کہ بنوامیہ نے ابوہریرہ پر عنایات کی بارش کر کے اپنا زرخرید غلام بنالیا تھا، چنانچہ وہ ابوہریرہؓ کے جسم و جان دل وزبان نگاہ وگوش سبھی پر حکمراں تھے، اپنی سیاسی اغراض کے لیے ان کی زبان سے جو چاہتے کہلواتے، اور اپنی خواہشات کے احترام میں احادیث گھڑنے کا کام لیتے، کبھی ابوہریرہ ان کے فضائل

میں حدیثیں بناتے، کبھی فضائل شیخین میں ایسی کتر بیونت کرتے کہ اس سے معاویہ کے گروپ اور ان کی خواہشات اور باغیان علی کی ہمت افزائی ہوتی۔

عبدالحسین کی ان احمقانہ باتوں کی تردید میں ہم اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں، ان سے ان تمام اکاذیب وافتراءات کی قلعی کھل جاتی ہے۔

کیا ابو ہریرہ نے غلط احادیث حضور کی جانب منسوب کیں؟

عبدالحسین اور ابوریہ نے ابو ہریرہ پر رسول خدا کے خلاف غلط احادیث گھڑنے کی نسبت کی ہے اور یہ کہ ابو ہریرہ نے محض امویوں کو خوش کرنے اور علویوں کو ذلیل کرنے کے لیے یہ حرکت کی ہے، حالانکہ ان دونوں تہمتوں سے ابو ہریرہ کا دامن پاک ہے۔ ان دونوں نے خود غلط خبریں، موضوع احادیث گھڑے ہوئے افسانے اپنی بات کی تائید کے لیے فراہم کیے ہیں، چنانچہ عبدالحسین کہتا ہے:

"قال الامام أبوجعفر الاسكافي ان معاوية حمل قوماً من الصحابة و قوما من التابعين على رواية أخبار قبيحة في علي، تقتضي الطعن فيه والبراءة منه و جعل لهم على ذلك جعلا يرغب في مثله فاختلقوا له ما أرضاه منهم أبوهريرة و عمرو بن العاص والمغيرة بن شعبة ومن التابعين عروة بن الزبير إلى آخر كلامه" (ابو ہریرہ ص ۳۵، اضواء علی السنۃ المحمدیہ ص ۱۹)

"امام ابوجعفر اسکافی کا کہنا ہے کہ معاویہ نے صحابہ و تابعین میں ایک قوم تیار کی جو حضرت علی کے بارے میں بری باتیں بیان کریں جن میں ان کو ہدف ملامت بنایا جائے اور ان سے صحابہ و معاویہ کے گروپ کی براءت ظاہر کی جائے، اس کے لیے سارے کرتب کیے۔ چنانچہ ان لوگوں نے معاویہ کے لوگوں کو راضی رکھنے کا ہر جتن کیا، ان صحابہ میں ابو ہریرہ عمرو بن العاص مغیرہ بن شعبہ اور تابعین میں عروۃ بن الزبیر سرفہرست تھے"۔

ان لوگوں نے ایک دوسری کہانی بنائی جو اس طرح ہے:

"لما قدم أبوهريرة العراق مع معاوية عام الجماعة جاء إلى مسجد الكوفة فلما رأى كثرة من استقبله من الناس، جثا على ركبتيه ثم ضرب صلعته مرارا وقال يا أهل العراق أتزعمون أني أكذب على الله ورسوله و أحرق نفسي بالنار والله لقد سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول إن لكل نبي حرما و إن المدينة حرمي فمن أحدث فيها حدثا فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين قال: وأشهد بالله أن عليا أحدث فيها فلما بلغ معاوية قوله أجازه و أكرمه و ولاه امارة المدينة" (ابوہریرہ،عبدالحسین ص ۳۸۔۳۹)

''معاویہ کے ساتھ جماعت کے سال میں جب ابو ہریرہ عراق آئے مسجد کوفہ میں حاضری دی، لوگوں کو دیکھا کہ جوق در جوق استقبال کر رہے ہیں اور جھک کر کورنش بجالاتے ہیں، آپ نے کئی بار اس پر خوشی کا اظہار فرمایا، اور کہا عراق والو تم گمان کرتے ہو کہ میں رسول خدا کے خلاف جھوٹی حدیث بیان کر کے خود کو جہنم میں جلنے دوں گا؟ بخدا میں نے حضور سے یہ بات سنی کہ ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے، میرا حرم مدینہ ہے، جو کوئی اس مدینہ میں نئی بات پیدا کرے گا اس پر خدا، رسول، ملائکہ سب کی لعنت اور یہ کہ علی نے نئی بات پیدا کی۔ جب معاویہ کو اس کا علم ہوا تو ابو ہریرہ کو انعام دیا، ان کا اعزاز بجالائے، اور مدینہ کی امارت سپرد کی''

یہ روایت عبدالحسین نے اپنی کتاب میں جمع کر کے اپنے خیالات کی تائید میں بہت کچھ لکھا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابو ہریرہ امویوں کے خوش کرنے کے لیے غلط حدیثیں گھڑتے تھے، مگر اہل تاریخ نے ان اباطیل کی سند و متن دونوں ہی کو مردود قرار دیا ہے۔

سند کے اعتبار سے یوں ہے: ابن ابی الحدید صاحب شرح نہج البلاغۃ نے ان روایات کو اپنے شیخ محمد بن عبداللہ ابو جعفر اسکافی متوفی ۲۴۰ھ سے نقل کی ہیں۔ اسکافی مفتری اور سخت قسم کا شیعہ ہے۔ محدثین اور معتزلہ میں جو اختلافات پہلی صدی کے اواخر سے آج تک ہیں،

وہ دنیا پر پوشیدہ نہیں۔اور جب کوئی مبتدع متشدد ہو تو اس کی روایت اصولاً قابل قبول نہیں ہوتی۔ابو جعفر کے حالات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، اس نے خود ہی اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ میرے شیخ ہیں، یہ حضرت علی کی فضیلت کے قائلین اور ان کی تفضیل میں نہایت درجہ متشدد تھے۔اگر چہ تفضیل علی کا مسئلہ عراق و بغداد میں عام تھا پھر بھی ابو جعفر کو اس میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، اور اس نے تفضیل علی کو عقیدہ بنالیا تھا۔یہ شہادت اسکافی کے حق میں ابن ابوالحدید کی ہے جو ان کا شاگرد رشید ہے لہٰذا اس میں کسی تاویل اور تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔استاذ خود اہل ہوا ہے جو لوگوں کو بھی اسی رخ پر ڈالنے کی سعی کی بلکہ اسکافی تعصب کی حد تک اس میں آگے آگے ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کی تکذیب حدیث کی، قرآن کے نقل کرنے میں غلط کار بتلایا۔انھوں نے اگر ابو ہریرہ کی تکذیب کی تو کیا تعجب ہے، انھوں نے تو جماعت صحابہ و تابعین سبھی کو ہدف ملامت بنایا۔ابن ابی الحدید کی روایت دو وجہوں سے مردود ہے۔

(۱) اسکافی ضعیف ہے اس کے دو عوامل ہیں:

ایک یہ کہ وہ مفتری ہے، قائل وصیت، دشمن اہل حدیث ہے۔

دوسرے اسکافی بدبودار شعیہ ہے، یہ دو عوامل اس کی روایت کے مردود کرنے کے لیے کافی ہیں،

(۲) دوسرے اسکافی نے کہیں بھی ان مصادر کی طرف رہنمائی نہیں کی جو کسی صحیح سند سے ثابت ہوں، بلکہ اس نے سرے سے سند ہی غائب کردی۔اس سے اس کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

متن کے اعتبار سے بھی غلط ہے،اس لیے کہ تاریخی روایات سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ معاویہ نے امیر المومنین حضرت علی پر طعن کرنے میں دلچسپی لی ہے، نہ کسی صحابی کے اس غلط بات کے ماننے کا ثبوت فراہم ہو سکا۔اسی طرح حدیث گھڑنے کے لیے کوئی معاوضہ قبول کرنے کی بات بھی فرضی ثابت ہوئی، صحابہ تمام کے تمام ان لغویات سے وراء الوراء تھے۔اس

قسم کے گھٹیا اور رکیک کاروبار کا کوئی ثبوت تاریخ آج تک صحابہ کے سلسلے میں فراہم نہ کرسکی۔
پھر ایسا صحابیٔ رسول جس نے آپ سے وہ حدیث بھی سنی ہو اور دروغ بیانی کی سزا کی حدیث خود ہی بیان کی ہو، اس سے اس قسم کی بات صادر ہو، حاشا وکلا، یہ ساری روایتیں دشمنان، نفس پرست، متعصبین، حق کے خلاف جرأت دکھانے والے، بے باک معاندین ہی کی ہوسکتی ہیں۔
ان کی نگاہ میں صحبت رسول کا کوئی مقام نہیں ہے، اسی وجہ سے انھوں نے خیار صحابہ پر اپنی زبان طعن دراز کردی اور ایسے گرامی صحابہ کو گمراہی وفسق میں مبتلا قرار دیا، بلکہ بعض کو کافر تک کہنے میں نہ ہچکچائے، اور ابوبکر وعمر وعثمان پر بھی زبان درازی سے کام لیا۔
محدثین نے ان کے پرخچے اڑا دیے ہیں، اس لیے یہ محدثین کے جانی دشمن بن گئے اور ان کے حالات میں کمزوریوں کی چھان بین کی اور اباطیل وخرافات کی ایک فہرست تیار کی تاکہ امت کا اعتماد ان صحابہ سے اٹھادیں۔ ان کی پشت پر معتزلہ روافض اور شیعوں کے بعض فرقے بھی موجود۔ ہیں جو ان تفصیلات کو جاننا چاہتا ہے وہ ابوالقاسم بلخی کی کتاب قبول الاخبار کا مطالعہ کرے۔ مگر قدرت نے خود ہی ان فرقوں کے دجل وفریب سے پردہ اٹھادیا اور پردہ کے پیچھے سے حملہ کرنے والوں کے منھ کالے کردیئے، محدثین خدا کے سپاہی بن کر ان کے مقابل آکھڑے ہوئے اور ان کی حقیقت کھول کر رکھ دی، ان کی نیتوں اور سازشوں سے لوگوں کو واقف کرادیا۔ چنانچہ انھوں نے جو حدیث، جو خبر بھی جس میں کسی صحابی پر حملہ تھا، جس سے عقیدہ میں فرق آتا، یا دین حنیف کے مبادی کے مخالفت ہوتی، ان سب کو محدثین نے اپنی علم ودانش کی کسوٹی پر چڑھا کر بے قوت، و بے وزن کردیا۔
اس لیے ان کے سارے دعاوی مردود ہیں ان کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہم معاویہ کے بارے میں یہ تسلیم کرلیں کہ انھوں نے امیر المومنین حضرت علی پر طعن کیا جب کہ ابن عباس نے معاویہ کے فضل وعقل اور دین کی سمجھ کی شہادت دے دی ہو، اس کا بخاری نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ پھر اب ابوہریرہ کے خلاف ان دروغ بیانیوں کی کیا قیمت رہ جاتی ہے، یا معاویہ کی طرف داری کی کہانی کیسے سچ ہوجائے گی؟ ابن عباس ترجمان

قرآن کی شہادت کے ہوتے ہوئے عبدالحسین جیسے بے عقل نامراد کی باتیں کیسے مان لیں۔

اسکافی نے صرف ابو ہریرہ ہی پر نہیں دوسرے صحابہ پر بھی بہتان طرازی کی ہے۔ابن العربی نے اپنی کتاب "العواصم من القواصم" میں اس پر مختصر تبصرہ کیا ہے، پھر تراجم صحابہ کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔ان فتنہ گروں کی روایات ضرور تاریخ اسلامی میں گھن کی طرح پھیل گئی ہیں، بالخصوص اموی تاریخ کے قصے، اس لیے کہ دور اموی تک تصنیف کا سلسلہ نہ تھا۔بعد میں ترتیب تاریخ عمل میں آئی، اس لیے ان کی تصویر بگاڑ کر پیش کی گئی، لیکن تاریخ سچے واقعات نگاروں دیانت پیشہ لوگوں سے خالی نہیں جنہوں نے سند و ثبوت کے ساتھ واقعات کو لکھا کہ تمیز حق و باطل ہوسکے۔اس لیے کتاب میں ساری باتیں نہ قابل قبول ہوتیں نہ قابل تردید، خوب سمجھ لو کہ ان چیزوں کو لینا چاہیے جو محدثین کے انداز تحریر کے مطابق سند و متن دونوں حیثیت سے معتبر ہوں۔

رہ گئی عروہ بن زبیر کی بات تو تاریخی حیثیت سے وہ بھی نا قابل قبول ہے، اس لیے کہ شہادت عثمان کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی، اور شہادت علی کے وقت کل ۱۸ سال کے تھے۔پھر معاویہ جیسے آدمی نے ان کو حضرت علی کے خلاف طعن کے لیے کب تیار کیا؟ عروہ اپنی علمی ساکھ میں ابھی پوری طرح پختہ نہ ہوئے تھے، اس لیے وہ معاویہ سے کس طرح راضی ہوجاتے؟ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ وہ کبار صحابہ و تابعین میں مشتہر تھے اور یہ کہ معاویہ نے خلافت خلیفۂ رابع کے بعد ان سے مدد چاہی، تو یہ بھی غلط ہے، اس لیے کہ مسلمانوں نے ۴۰ھ میں عام الجماعۃ کے موقع پر جب امام حسن نے معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور پورے طور سے اموی حکومت تسلیم کرلی گئی پھر ایسے موقع پر عروۃ بن الزبیر سے مدد طلب کرنے کا کیا معنی۔

بالفرض عبدالحسین کی بات مان بھی لی جائے تو صحابۂ رسول خدا کو جو اس دور کے جری بہادر ہیرو تھے، ان کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ خاموش رہے؟ امت اسلامیہ تو اس دور میں پوری طرح باخبر تھی، اس کے افراد حوادث عصری سے پوری طرح واقف تھے، کسی سے حق پوشیدہ نہ تھا، مسلمان اپنے رہنما صحابہ سے پوری طرح واقف تھے، پھر یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ صحابہ و تابعین کی ایک ٹولی حق کا چہرہ مسخ کرڈالے، جیسا کہ عبدالحسین کا کہنا ہے کہ انھوں نے خلیفہ کی خوشنودی

ان کی خواہشات کی رعایت میں یہ سب کچھ کیا۔ جو اس قسم کی احمقانہ باتوں کے قائل ہیں، وہ پوری امت مسلمہ کے سامنے مجرم ہیں۔ گویا صحابہ نہایت درجہ بے سمجھ تھے کہ ان کو پس و پیش کی بالکل خبر نہ تھی، اور وہ بلا کسی جد و جہد کے ان افتراءات و اکاذیب کے حامی ہو گئے۔

ابو ہریرہ کا صلح حسن و معاویہ کے موقع پر عراق آنا بھی تاریخ سے ثابت نہیں، اس لیے اسکافی کی یہ روایت سرے سے جھوٹ ہے اور اس کا راوی ضعیف ہے۔ بفرض محال مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ امویوں کے دشمنوں نے ابو ہریرہ کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، ان کا انھوں نے دفاع کیا ہے۔ حدیث ابو ہریرہ میں حضرت علی کی مذمت کے الفاظ موجود نہیں ہیں، اس لیے معاویہ کا اس کے بدلہ میں امارت مدینہ دینا بھی فرضی کہانی ہے۔

کثرت حدیث

ابو ہریرہ کی کثرت روایات پر سب سے پہلے نظام معتزلی نے اعتراض کیا۔ اسی کی راہ پر قدیم دور کے معتزلہ میں بشر مریسی ابو القاسم بلخی نے بھی ابو ہریرہ کی مرویات پر نقد کیا جس کی تردید ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث میں کر دی ہے۔ پھر آنے والے دور میں عبد الحسین شرف الدین نے اس شبہ کو ہوا دی اور اپنی کتاب ابو ھریرہ میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے جن میں ابو ہریرہ کی مرویات مشکوک بنانے کی سعی کی اور پڑھنے والوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ابو ہریرہ نے جو روایتیں کی ہیں ان میں سے اکثر کا جوڑ ان صحابہ کی مرویات سے ہے جنھوں نے حکومت وقت اور سیاست کی ہوا خواہی میں اپنا وقت صرف کیا۔ اس پر مزید رنگ آمیزی کا کام محمود ابوریہ نے اپنی کتاب اضواء علی السنة المحمدیہ میں کیا۔ ان دونوں مصنفین نے اپنی رائے کو باوزن کرنے کے لیے غلط روایات کا سہارا لیا، یا موضوع احادیث کو اپنی سپر بنایا، کہیں دور از کار تاویلات کا دامن پکڑا، کبھی ان مستشرقین کی گود میں جا بیٹھے جنھوں نے ابو ہریرہ کی کثرت روایات پر اعتراض کیے تھے۔

مگر مدافعت کرنے والے بھی اتنے ہی چابک دست تھے، انھوں نے ان کی قدیم و جدید مسائی اور فتنہ پردازیوں کو ایک ایک کر کے اجاگر کیا اور حق و باطل کو الگ کر دکھایا، اچھے برے کو متمایز کیا۔

غرض ان سارے اعتراضوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو ہریرہ اسلام میں متاخر ہوتے ہوئے بھی ۵۳۷۴ حدیثوں کے راوی ہیں جو خلفائے اربعہ کی مجموعی روایات سے بھی زیادہ ہے حالانکہ وہ لوگ سابقین اسلام میں تھے۔ چنانچہ عبدالحسین تحریر کرتا ہے کہ ذرا عقل کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھو ابو ہریرہ متاخر الاسلام ہیں اور ان کے بارے میں پہلے سے کوئی تاریخ نہیں، ساتھ ہی تعلیم سے بھی کورے ہیں، اس کا تقاضا اقلال حدیث تھا۔ دوسری طرف خلفائے راشدین ہیں ان کا اسلام قدیم، ان کو حضور کے ساتھ خصوصی روابط و محبت تھی، تشریعی احکام ان کی موجودگی میں سامنے آئے، تقریباً ۵۲ سال تک اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا رہا، ۲۳ سال خدمت رسول میں گزارے اور ۲۹ سال ان کے بعد رہے، امت کی سیاست اور سیادت ان کے حصے میں رہی، پھر یہ صورت حال ہوتے ہوئے ابو ہریرہ کس طرح قابل قبول ہو سکتے ہیں کہ ابو ہریرہ کی حدیثیں خلفائے اربعہ کی حدیثوں کی چار گنا زیادہ ہوں عقل و ہوش والو تم ہی بتاؤ؟ ابو ہریرہ سے حضرت عائشہ کی حدیثیں کثیر ہوں تو حضورؐ نے ابو ہریرہ کے اسلام لانے سے دس سال پہلے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا تھا، دوسرے آپ مہبط وحی کے ہمراہ رہیں، آپ کے دور زوجیت میں چودہ سال جبرئیل آتے رہے اور ابو ہریرہ سے چند دنوں پہلے ہی وصال ہوا، پھر ذکاوہوش میں بھی دونوں میں کوئی توازن نہیں۔ یہ ساری باتیں لکھنے کے بعد اس نے تحریر کیا، حالانکہ وہ حدیث کی اشاعت میں لگی رہیں، اس لیے کہ آپ کے دعاۃ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے، بصرہ تک آپ نے عظیم لشکر کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے اس کے باوجود آپ کی مرویات دو ہزار دو سو دس مسند پر مشتمل ہے۔ غرض حضرت عائشہ کی حدیث ابو ہریرہ کی حدیث کے مقابل نصف کے قریب ہے، چنانچہ خود ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ

صحابی رسول میں سب سے زیادہ حدیثیں میری ہیں، بجز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کہ وہ لکھ لیتے تھے، میں لکھ نہیں پاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی احادیث حضرت ابو ہریرہ سے زیادہ ہیں اور ان کی حدیث کی تعداد ۷۰۰ ہے۔

پھر اپنے خیال کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچا کہ ابو ہریرہؓ کے سلسلے میں علمائے حدیث حیرت زدہ ہیں اور کوئی صورت فرار کی نظر نہیں آتی بس ابن حجر عسقلانی اور شیخ زکریا انصاری نے اس کی جو علت بیان کی کہ عبداللہ بن عمرو مصر میں رہے اور ابو ہریرہ مدینہ میں رہے جو مسلمانوں کی غایت و منتہی ہے، پھر بھی ابو ہریرہ کی اپنی بات ہے اس کی تائید نہیں ہوتی، بایں ہمہ وہ ابو ہریرہ کو متہم کرتا ہے کہ جو لوگ مدینہ آتے ان میں سے اکثر ابو ہریرہ کی کثرت روایت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے اور کہہ گزرتے کہ ابو ہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں، جب کہ مہاجرین و انصار اتنی حدیثیں نہیں بیان کرتے، ان سب چیزوں کے بعد خود ہی نتیجہ نکالتا ہے کہ ابو ہریرہ عبداللہ بن عمرو کی حدیثوں کی زیادتی کو رسول خدا کے فوراً بعد تسلیم کر لیا تھا اور اس قدر حدیثوں کی ڈھیری نہیں لگائی تھی مگر یہ حدیثوں کی زیادتی اور اس میں بے پناہ کثرت عہد معاویہ میں دیکھنے میں آئی جب کہ نہ ابوبکر تھے، نہ عمر، نہ علی، نہ دوسرے اکابر صحابہ جن سے ابو ہریرہ کانپتے تھے۔

قابل تعجب یہ ہے کہ مصنف کو ابو ہریرہ کی احادیث کی کثرت پر تعجب ہوتا ہے اور وہ بھی اسے بیسوی صدی میں یہ کثرت نظر آئی۔ کیا اسے ابو ہریرہ کے حافظہ پر شبہ ہے کہ انھوں نے ۵۳۷۴ حدیثیں جمع کر لیں یا اسے اس بات پر تعجب ہے کہ تین سال کی قلیل مدت میں اتنی حدیثیں کیسے یاد کر لیں۔

اگر حافظہ کی بات ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، اس لیے کہ اس دور میں دوسرے صحابہ بھی ہیں جو ابو ہریرہ کی طرح دو چند سہ چند چیزوں کو یاد کر لیتے تھے۔ بہت سے صحابہ نے قرآن کریم یاد کیا اور احادیث و اشعار بھی، ان کے بارے میں مصنف کیا کہے گا؟ مصنف حضرت ابوبکر کے انساب عرب کے حفظ کے سلسلے میں کیا سوچتا ہے اور حضرت عائشہ جو اشعار عرب کی حافظ تھیں ان کے بارے میں کیا کہے گا؟ حماد کے بارے میں ان کی کیا رائے

ہے جو ایام عرب، اشعار عرب، اخبار وانساب عرب، لغات عرب کے حافظ تھے؟ وہ ان کے اس حافظہ کو کہاں لے جائے گا، جس میں انھوں نے ہر حرف تہجی کے سو سو قصیدے بلا مقطعات کے یاد کر رکھے تھے، جن میں صرف جاہلیت کے اشعار ہوتے، دور اسلامی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا؟ وہ عبداللہ بن عباس کے حافظہ، عامر شعبی، قتادہ بن دعامۃ السدوسی کے حافظہ کے بارے میں کیا کہے گا؟ پھر ابو ہریرہ کے حافظہ پر اسے کیوں تعجب ہوتا ہے، جب کہ ہم نے ابو ہریرہؓ کی ساری مرویات کو جان لیا، اس کے طرق سے بھی واقفیت حاصل کر لی، پھر ابو ہریرہ کے حافظہ اور کثرت حدیث پر کیسے تعجب کیا جا سکتا ہے؟

مصنف کو ابو ہریرہ کی کثرت روایت پر تعجب ہوتا ہے۔ غالباً اس کے سامنے یہ حقیقت نہیں ہوتی کہ رسول خدا کے یہ تین سال جس میں ابو ہریرہ ان کے مصاحب رہے، وہ بڑی اہمیت کے سال تھے۔ ان سالوں میں بہت سے اجتماعی سیاسی تشریعی معاملات سامنے آئے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان تین سالوں میں حضور کو فراغت کے دن نصیب ہوئے اور اطمینان سے دعوت وتبلیغ کا موقع ملا اس لیے کہ قریش سرینڈر کر چکے تھے۔ ساتویں سال ہجرت میں آپ کا پیام دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچ چکا تھا اور انہی برسوں میں عرب قبائل کے وفود حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان تمام مواقع پر ابو ہریرہ حضور کے ساتھ ہوتے، اپنی آنکھوں سے ساری جدوجہد دیکھتے، حضور کے فرامین سنتے اور دل سے اسے تسلیم کرتے۔

پھر ابو ہریرہ کی ساری مرویات حضور سے نہیں ہیں بلکہ صحابہ سے بھی ہیں اور ایک صحابی دوسرے صحابی سے روایت کرنے کا شائق اور عادی تھا، اس کو سبھی مانتے اور تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اس حقیقت کے واشگاف ہونے کے بعد مؤلف کی ساری حیرت وتعجب جو اس نے اپنی کتاب ابوھریرہؓ میں لکھی ہے ختم ہو جانا چاہیے۔

اور یہ تو بڑی غلطی ہے کہ خلفائے راشدین اور ابو ہریرہ کو حفظ کے اعتبار سے اور کثرت روایت کے اعتبار سے ایک ہی پلڑے میں رکھا جائے، اس کے چند وجوہ ہیں۔

یہ بات حقیقت ہے کہ چاروں خلفائے راشدین ابو ہریرہ سے اسلام وصحبت دونوں ہی

میں بڑھے ہوئے تھے، پھر بھی انھوں نے ابو ہریرہ کی طرح روایتیں نہیں کیں۔ اس لیے کہ وہ حکومت کے کاموں میں مشغول رہے، ان کو سیاسی امور سے فرصت کم ملی، انھوں نے اشاعت اسلام کے لیے علماء، قاریان کتاب اللہ، معاملات کا فیصلہ کرنے والے قضاۃ کا انتخاب کر کے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجنے میں لگے رہے۔ انھوں نے ان ذمہ داریوں کو پورا کیا جوان کے سپرد کی گئی تھیں۔ ہم خالد بن ولید کی قلت روایت پر تعجب نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہ فتوحات اسلامیہ کے امیر تھے، ان کو اس کام سے فرصت کہاں تھی؟ بالکل اسی طرح ابو ہریرہ کی کثرت روایت بھی قابل مذمت نہیں ہے۔ کیا کوئی اس بات پر کہ حضرت عثمان بن عفان و عبداللہ بن عباس نے فتوحات اسلامیہ میں شرقاً وغرباً حصہ نہیں لیا، ان کو کڑی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟ ہر ایک کا ایک منصب تھا، ذمہ داری تھی، وہ اس کے ادا کرنے میں مشغول تھا۔

ابو ہریرہ صرف علم و تعلیم کے آدمی تھے، ان کو سیاسیات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لوگ ان کے ضرورت مند تھے اس لیے کہ ان کی عمر کے دن کافی آچکے تھے، پھر صحابہ سابقین اور خلفائے راشدین سے ابو ہریرہ کا جوڑ ملانا نادانی ہے۔

پھر عبدالحسین و ابوریہ دونوں نے ان کے حسب و نسب کی کھوج شروع کی۔ کیا حسب و نسب کا کوئی تعلق کثرت و قلت روایت سے ہے؟ اگر ہو تو بتلایئے۔

مصنف تو کثرت روایت سے ایسا جلا ہوا ہے کہ اس نے حضرت عائشہ ام المومنین کو بھی نہیں بخشا اور اپنی عاقبت و دنیا دونوں ہی خراب کی۔ ابو ہریرہ کا تقابل حضرت عائشہ سے بھی مناسب نہیں، اس لیے کہ حضرت عائشہ لوگوں کو فتویٰ دیتیں اور چونکہ وہ عورت تھیں اس لیے ان کا حلقہ تعلیم عورتوں تک محدود تھا۔ مردوں میں سے جو لوگ اکتساب فیض کرتے وہ پردہ کے ساتھ ہی کرتے تھے مگر ابو ہریرہ مسجد نبوی میں اپنا حلقہ قائم رکھتے، لوگ صبح و شام بلا روک ٹوک آتے جاتے۔

ہم اس سے پہلے مصنف کی اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا تعجب کہ عائشہ و ام سلمہ اور دیگر امہات المومنین، حسنین، ان کی والدہ اور خلفاء اربعہ سے بھی ابو ہریرہ کی حدیث زیادہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ام سلمہ حضرت عائشہ کی طرح مرجع انام نہ تھیں،

حسنین کمسن تھے، پھر سیاسی جھگڑوں میں پھنس گئے، اس لیے قدرتی طور سے ان کی مرویات کم ہونی چاہئیں۔ یہی بات حضرت فاطمہؓ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو حضورؐ کے وصال کے بعد صرف چھ مہینہ زندہ رہیں۔ اس لیے یہ اہل دانش کی نظر میں کوئی بڑی بات نہیں اور نظام وحافظ اگر ذی عقل ودانش مند ہوتے تو ایسی بات نہ کرتے۔

جو لوگ خالی الذہن ہو کر ابو ہریرہ کی روایت حدیث کو دیکھیں ان کو نہ تعجب ہوگا، نہ دہشت اور نہ اس شور وشر کی ضرورت جس کو اہل ہوا نے اور دشمنان سنت نے اٹھا رکھا ہے۔ ابو ہریرہ کی وہ روایت جو انھوں نے خود نبی کریم سے یا صحابہ سے سن کر روایت کی ہے، صحبت کی مدت کم ہونے سے متاثر نہیں ہو سکتی، بلکہ ان کی اس مختصر صحبت کا تقاضا اس سے زیادہ مرویات کو چاہتا ہے، اس لیے کہ یہ صحبت ابو ہریرہ کو ان اہم ترین ایام میں حاصل ہوئی جب دعوت اسلام عروج پر تھی، اس کی تعلیمات وتوجیہات کا چرچا ہمہ رخ تھا، یہ چند سال حضور کی حیات مبارکہ کے سنہرے سال تھے۔

اور ابو ہریرہؓ کی حدیث کہ "میرے پاس دو ظروف ہیں، ان میں سے ایک کی احادیث کو میں نے بیان کیا اور دوسری جوں کی توں مہر بند ہے" کا مذاق اڑانا خود ان مذاق اڑانے والوں کا استہزاء ہے واللہ یستھزئ بہم۔ اور لوگوں کا دریافت کرنا کہ وہ کیا علوم ہیں جو دوسرے ظروف میں رہ گئے، اس کی قلعی علماء نے کھول دی ہے کہ ابو ہریرہ نے جو حصہ لوگوں کے سامنے نہیں بیان کیا وہ احکام وآداب سے متعلق نہ تھا بلکہ وہ علامات قیامت وفتنہ امت سے متعلق تھا، اس کا اصول دین سے کوئی ربط نہ تھا کہ ابو ہریرہ انھیں نہ بیان کر کے مجرم گردانے جائیں۔ اس کی دلیل ابو ہریرہ کی وہ حدیث ہے جس کا کچھ حصہ مولف "ابو ہریرہ" نے نقل کیا ہے، البتہ راوی حدیث کا وہ حاشیہ جس سے ابو ہریرہ کا مقصد واضح ہوتا ہے تحریر نہیں کیا ہے۔ "ابو ہریرہ نے کہا کہ جو میرے پاس محفوظ ہے اگر تم سے بیان کردوں تو مجھ پر کیچڑ پھینکو گے" حسن نے کہا کہ حدیث کے راوی نے سچ بیان کیا، اگر وہ کہتے کہ کعبہ منہدم ہو جائے گا یا اسے نذر آتش کر دیا جائے گا تو بھلا اس کی کون تصدیق کرتا۔

یہ کچھ ابوہریرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے صحابہ کو بعض ایسی باتیں بتلائیں جو دوسروں کے علم میں نہیں آئیں۔ انہی میں سے حدیث معاذ ہے جس میں آپؐ نے معاذ سے فرمایا کہ جس نے دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا وہ جہنم سے دور رکھا جائے گا، معاذؓ نے کہا کہ اس کی اطلاع دوسروں کو بھی کر دوں کہ لوگ خوش ہو جائیں، آپؐ نے فرمایا پھر تو لوگ عمل سے رہ جائیں گے۔ حضرت معاذ نے اپنی موت کے وقت اس کو افشاء کر دیا کہ کہیں کتمان علم کا گناہ کھاتے میں نہ آ جائے حالانکہ معاذ ولی عہد نہ تھے، نہ آپ کے خلیفہ ہی تھے کہ اس کو پہنچانے اور وصیت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ پھر ابوہریرہ سے مصنف کو کیا پرخاش ہے کہ وہ ان کے حق میں اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں؟ بلکہ ابوہریرہ کو بھر پیٹ برا بھلا کہنے سے تھکتا نہیں اور یہ کہتا ہے کہ ابوہریرہ کا کتمان محض اس وجہ سے تھا کہ کوئی ایسی لغویات سنتا ہی نہیں بلکہ لوگ اس پر کیچڑ اچھالتے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ابوہریرہ مخاطب کے عقل و تمیز کے مطابق باتیں کرتے تھے، اور حدیث کے وہی حصے بیان کرتے جو ان کی سمجھ کے مطابق ہوتے۔ حضرت علی نے بھی اس کی ہدایت فرمائی۔

ابوہریرہ کا یہ قول کہ وہ نہ تو چھپاتا ہے نہ لکھتا ہے یعنی ضروری اور مفید باتیں چھپانا پسند نہیں کرتا اور اس نے جو چھپالیا وہ ضروری و مفید نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق فتن و ملاحم سے تھا، اس کا دین سے یا اصول دین سے وہ ربط نہیں، اس قسم کی باتوں کو چھپا ہی لینا بہتر ہے۔

مدعیان ابوہریرہ نے خواہ مخواہ ان کے اس قول کو کہ حضور کے صحابہ میں کوئی ایسا نہیں جو مجھ سے زیادہ حدیثوں کا راوی ہو بجز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں اور یہ کہ ان کی مرویات سات سو سے متجاوز نہیں، اس لیے ان سے زیادہ جو حدیثیں ابوہریرہ نے بیان کی ہیں وہ سب گھڑنت ہیں، ہم ان کا واضح جواب اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ پختگی کے اعتبار سے عبداللہ بن عمرو کی احادیث بڑھی ہوتی ہیں، اس لیے کہ وہ مکتوب ہیں۔ اس سے کثرت حدیث عبداللہ کا کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ دوسرے بہت ممکن ہے یہ اس وقت کی بات ہو جب حضور نے آپ کے حافظہ کے لیے دعا نہ

فرمائی تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثیں ابو ہریرہ سے زیادہ ہوں مگر ان کے نشر کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ تلف ہوگیا ہو، اور جو رہ گیا ہو وہ ابو ہریرہ کی مرویات سے کم ہو۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ عبداللہ بن عمرو نماز اور دوسری عبادت میں اپنا زیادہ وقت لگاتے، برخلاف ابو ہریرہ کے کہ ان کا دن رات مشغلہ صحبت رسول اکرم ہی تھا۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص ممالک اسلامیہ میں فتح بلدان کے بعد طائف و مصر وغیرہ میں مقیم رہے، ابو ہریرہ صرف مدینہ میں رہے اور طالبین علم کا جمگھٹ اکثر مدینہ ہی میں رہا، اس لیے کہ اسلام کی راجدھانی اور حضور کا مقام ہجرت مدینہ ہی تھا۔ پھر عبداللہ بن عمرو اہل کتاب کی کتابوں کے مطالعہ میں لگ گئے، اس کی وجہ سے تابعین آپ سے روایت حدیث کے شائق نہیں ہوئے۔ پھر عبداللہ بن عمرو بن العاص، معاویہ اور ان کے صاحبزادے یزید کے ہمنواؤں میں نہ تھے اس لیے ان کا حلقۂ تعلیم و تدریس زیادہ پھیل نہیں سکا۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ان کی مرویات ابو ہریرہ کی مرویات سے کم ہیں۔ اس لیے ابو ہریرہ کی کثرت روایت پر کسی قسم کا شک کرنا نادانی وحماقت ہے۔

صحابہ کی تکذیب ابو ہریرہ کی کہانی:

ابراہیم بن سیار نظام نے بیان کیا کہ عمر و عثمان و علی و عائشہ بھی نے ابو ہریرہ کی تکذیب کی۔ بشر مریسی نے عمر بن الخطاب سے یہ روایت بیان کی کہ ابو ہریرہ اکذب المحدثین ہے۔

احمد امین نے لکھا کہ ابو ہریرہ کے کثرت حدیث پر اکثر صحابہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے اثبات میں مسلم کی یہ روایت جس میں خود ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ تم لوگ ابو ہریرہ کو بکثرت حدیث جانتے ہو یا ابو ہریرہ کو کثرت سے حدیث بیان کرنے والا گردانتے ہو.....

عبدالحسین شرف الدین نے لکھا کہ لوگوں نے ابو ہریرہ کا انکار کیا، ان کی حدیثوں کو بے درجہ خود انہی کے زمانے میں جانا اور ان کی تکذیب کرنے والوں میں صحابہ کبار ہیں۔ غرض یہی رائے معتزلہ کی بھی ہے۔ ابو ہریرہ کے بارے میں ابو جعفر اسکافی جو ان مرویات وخرافات کا

سرغنہ ہے اس نے لکھ دیا کہ ہمارے مشائخ نے ابو ہریرہ کو ناپسندیدہ احادیث بیان کرنے والا شمار کیا ہے، حضرت عمر نے آپ کو درے لگائے اور فرمایا کہ تم نے حضور کی روایات کی اتنی کثرت کر رکھی ہے کہ مجھے جنگ کرنی پڑے گی، کہ کہیں تم حضور پر غلط بیانی کے شکار تو نہیں۔
ابوریہ نے انہی باتوں کو دہرایا، دوسرے مخالفین کے الفاظ نقل کیے اور کوشش کی کہ اسلام کے سب سے بڑے راوی کو مجروح کر دیں۔
اس لیے ضرورت ہے کہ ہم آپ کے سامنے صحابہ کا موقف ابو ہریرہ کی احادیث کے بارے میں رکھ دیں کہ کن احادیث میں یہ اختلافات رونما ہوئے، تاکہ اسلام کے اس راوی کا دامن پوری طرح پاک ہو کر آپ کے سامنے آجائے۔ اس لیے مختصراً یہ گزارش ہے کہ صحابہ نے ابو ہریرہ کے بارے میں کوئی خاص موقف اختیار نہیں کیا نہ انھیں کسی قسم کی بد اعتمادی سے دیکھا یا شک وشبہ کی نگاہ ڈالی۔ اس لیے اس بحث کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔

حضرت عمر کا ابو ہریرہ کو کوڑے مارنا:

یہ چیز تاریخ سے ثابت نہیں کہ حضرت عمر نے ابو ہریرہ کو ان کی کثرت حدیث کی وجہ سے سزا دی۔ عبدالحسین اور ابوریہ کی روایات، مشکوک، ضعیف نا قابل اعتماد ہیں اس لیے کہ ان کی روایت کا مدار اسکافی ہے جو اس فتنہ کا سرغنہ ہے۔
حضرت عمر کی ابو ہریرہ کو جلاوطن کرنے کی دھمکی جس کا تعلق کعب احبار سے ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ لألحقنك بأرض دوس أو بأرض القردة (میں تمھیں دوس کی پہاڑی یا بندروں کی زمین میں بھیج دوں گا) اسے ابو ہریرہ کے کھاتے میں ڈال دیا، بدایہ ونہایہ میں یہ واقعہ مذکور نہیں ہے، ابوریہ نے اس کا غلط حوالہ دیا۔
کسی روایت سے ابو ہریرہ کی تکذیب یا آپ کی سزا کا علم نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہے وہ یہ کہ کثرت روایت سے آپ نے روکا۔ اور ابن کثیر نے اس کے ذکر کے بعد خود ہی لکھ دیا کہ حکم فاروقی خطرات کی پیش بندی کے طور پر تھا اس کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ پھر آپ

نے ابو ہریرہ کو حقیقت حال واضح ہونے کے بعد اجازت روایت بھی عنایت کردی تھی۔ اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کہ حضرت عمر نے ابو ہریرہ کو وہ حدیث یاد دلائی جس کے بیان کے وقت عمر و ابو ہریرہ دونوں ہی موجود تھے۔ جب حضرت عمر نے ابو ہریرہ کے احتیاط و تقویٰ کو دیکھا تو اجازت تحدیث دے دی، چنانچہ اجازت کے الفاظ یہ ہیں، أما اذن فاذهب فحدث (اب جاؤ اور حدیثیں بیان کرو)۔

فاروق اعظم خود تقلیل حدیث کے قائل تھے اور سنت صحیحہ کو پہنچانا چاہتے تھے، چنانچہ ابو ہریرہ بھی اپنے مجالسین سے اس کا ذکر کیا کرتے اور تہدید عمر بن الخطاب کو یاد دلا کر لوگوں کی بے جا روی پر تنبیہ کرتے رہتے، اور ابو ہریرہ کی تکذیب عمر، عقیل کی کہانی اور ان کو جبال دوس میں جلاوطنی کی دھمکی یہ ساری باتیں بے سر پیر کی ہیں۔ چنانچہ ابو ہریرہ کی یہ حدیث امام احمد بن حنبل نے روایت کی ہے اس پر شاہد عدل ہے کہ عمر بن الخطاب حج کے لیے جا رہے تھے، اتنے میں مکہ کی راہ میں تیز آندھیوں کا سلسلہ شروع ہوا لوگوں کی بے چینی بڑھتی گئی، حضرت عمر نے ہمراہیوں سے کہا کہ آندھی کے بارے میں کوئی حدیث معلوم ہو تو بیان کرو۔ مگر ان میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کہی۔ حضرت ابو ہریرہ پیچھے تھے، انھیں جب یہ خبر ملی کہ حضرت عمر کو اس سلسلے میں تشویش ہے تو تیزی سے سواری بڑھا کر آگے آئے اور کہا امیر المومنین! آپ نے اس تیز ہوا کے بارے میں دریافت فرمایا، اس سلسلے میں حدیث رسول ہے کہ تیز ہوا جہاں مصیبت لاتی ہے وہیں رحمت بھی لاتی ہے اور عذاب کا گہوارہ بھی ہوتی ہے، جن کو اس سے سابقہ پڑے وہ اسے برا بھلا نہ کہیں، اور خدا سے خیر طلب کریں، اور اس سے اس کے شر سے نجات مانگیں۔ حضرت عمر کو اس سوال کا جواب حضرت ابو ہریرہ کے سوا کسی نے نہیں دیا۔ اب اس کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ابو ہریرہ کو جھوٹا تسلیم کرتے تھے؟ اعاذنا اللہ۔

مریسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ فریب محض ہے اور جو روایت کی ہے اس کی سند اس کے پاس نہیں ہے۔ عثمان بن سعید راوی نے بشر مریسی کی تردید و تکذیب کی ہے۔ (دیکھیے رد الداری علی بشر المریسی ص ۱۳۲)

حضرت ابو ہریرہؓ اور عثمان بن عفانؓ:

نظام کا یہ دعویٰ کہ حضرت عثمان نے حضرت ابو ہریرہ کی تکذیب کی اس کا بھی کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔ اسی طرح آپ کا ابو ہریرہ کو مطعون بنانا اور حدیث بیان کرنے سے روکنا یہ بھی ثابت نہیں ہوسکا۔ لے دے کے ایک روایت جس کے بیان کرنے والے راہبرمزی ہیں کہ سائب بن یزید نے بیان کیا کہ مجھے عثمان بن عفان نے ابو ہریرہ کے پاس بھیجا کہ ابو ہریرہ سے جا کر کہو کہ امیرالمومنین نے کہا ہے کہ یہ حدیثوں کی ڈھیری کیسی ہے؟ اس کے بیان سے رک جاؤ ورنہ جبال دوس میں جلا وطن کردیئے جاؤ گے۔ دیکھا آپ نے عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان کی ممانعت کی روایت میں کتنی مطابقت ہے۔ یہاں یہی روایت حضرت عثمان سے مروی ہے۔ اگر یہ روایت کسی طرح ثابت بھی ہوجائے تو اس سے بجز اکثار کے کچھ نہیں ثابت ہوتا کہ آپ نے اس سے روکا تھا اور ابو ہریرہ کو اس میں کوئی تنبیہ نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت عثمان کے محصور ہونے کے زمانے میں ان کی جانب سے مداخلت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

حضرتؓ ابو ہریرہ و علیؓ بن ابی طالب:

تاریخ میں کسی موثق ذریعہ سے یہ بات نہیں ملی کہ حضرت علی نے حضرت ابو ہریرہ کی تکذیب کی یا ان کو حدیث بیان کرنے سے روک دیا، مگر اسی کا فر پھارو منکر سنت اسکافی کی روایت پر اس کا بھی مدار ہے کہ آپ کو جب ابو ہریرہ کی روایت پہنچی تو آپ نے کہا کہ سب سے بڑا جھوٹا یا زندوں میں سب سے بڑا کذاب ابو ہریرہ دوسی ہے۔ ہم اس سے پہلے اسکافی کا کچا چٹھا آپ کے سامنے کھول چکے ہیں۔

ابن قتیبہ نے اس کی ایک ایک کرکے تردید کی ہے جو ان لوگوں نے حضرت علی وابو ہریرہ کے سلسلے میں لکھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ و عائشہ ام المومنینؓ

حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ تقریباً ساتھ ہی ساتھ جیا کیے اس لیے ان کی عمر کے ساتھ لوگوں کی ضرورتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی گئیں، اس لیے کہ ان دونوں اکابر سے حدیث کا وہ حصہ سامنے آیا جو کسی دوسرے راوی حدیث نے بیان نہیں کیا۔ ابو ہریرہ حدیث بیان کرتے حضرت عائشہ اس پر گرفت فرماتیں اور کبھی موافقت میں کلام کرتیں جیسا کہ ان کا طریقہ دوسرے صحابہ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے ابوبکر، عمر، عثمان، علی ابن عمر اور ابو ہریرہ سب کی گرفت فرمائی مگر یہ استدراک وفہمائش کے درجہ کی گرفت ہوتی، انکار کے درجہ کی نہ ہوتی، یا کسی فتویٰ کی دلیل کو معلوم کرنے کی حد تک ہوتی بہتوں نے حضرت عائشہ پر بھی اس قسم کی گرفت کی ہے جس میں صرف تفاہم وتسائل کا معاملہ تھا کبھی آپ مسئول عنہ کے سلسلہ میں علم کی گہرائی معلوم کرتے ہوئے بھی مسائل کو دوسرے کے پاس بھیج دیتیں، جیسا کہ آپ نے مسئلہ مسح علی الخفین کے سلسلے میں سوال کرنے والے کو حضرت علی کے پاس بھیج دیا۔ صحابہ اس قسم کی باتوں میں نہ تو اس کا نقصان سمجھتے نہ مسئول عنہ کا کوئی حرج متصور ہوتا۔ بلکہ ہر ایک کا ایک ہی مطمح نظر تھا، وہ تھا شریعت کی تطبیق۔ صحابہ ایک دوسرے کی تکذیب نہ کرتے۔ ہاں بعد کے لوگوں نے اپنی نفسانیت کی وجہ سے صحابہ کی سادہ زندگی میں رنگ آمیزی کر کے صورت بگاڑنے کی کوشش کی تا کہ وہ اپنی مقصد برآری کر سکیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ اپنی ان کوششوں میں بری طرح ناکام رہے۔ اس لیے کہ امت میں علماء مخلصین کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہی جنہوں نے پوری بیداری کا ثبوت دیا، اور حق و باطل کو الگ الگ کر دکھایا۔

ابو ہریرہ و عائشہ کے پاس چھوٹی سے چھوٹی بات علماء نے بیان کر کے اس کی وضاحت کر دی ہے اور ابو ہریرہ کے بارے میں تکذیب عائشہ کی کوئی بات تاریخ میں موجود نہیں، اور یہ کہ عائشہ و ابو ہریرہ کے پاس جو معاملات رہے اسے کسی نے ابو ہریرہ کی صداقت و علم کی قیمت پر نہیں بیان کیا بلکہ حقیقت جان کر بیان کیا۔ صرف نفسانی خواہشات کے پیرو کار سنت

نبوی کے دشمن اس سے محفوظ نہیں رہے۔

بڑا افسوس اس پر ہے کہ یہ احادیث کو اپنے رخ پر ڈھالتے ہیں اور اس کی من مانی گھڑ جانی تشریح کرتے ہیں اور صحابہ کو کانی آنکھ سے دیکھتے ہیں جس سے وہ ابوہریرہ کو مطعون کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ساری باتیں علمی مباحث کی حد تک صحابہ کے مابین رہیں۔ مگر مخالفین اسے بیان کر کے سمجھتے ہیں کہ بس ہم نے خزانۂ عامرہ پالیا اور یہی روایات جن سے ابوہریرہ کی صداقت وامانت پر روشنی پڑتی ہے اسے ذکر نہیں کرتے ہیں، بس ان کی اپنی رٹ ہے جو انھیں لیے پھرتی ہے۔

یہ مخالفین کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کی اجازت کا انکار کیا۔ کہاں کیا؟ کب کیا؟ اسے بھی تو بتائیں۔

ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ عروہ بن زبیر نے یہ حدیث بیان کی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ابوہریرہ پر تمھیں تعجب نہیں ہوتا کہ وہ میرے حجرے کے پاس بیٹھے حضور کی حدیث بیان کی جو میں سنتی رہی، میں اس وقت تسبیح خوانی کر رہی تھی، میری تسبیح پوری ہونے سے پہلے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اگر ان سے میری ملاقات ہوتی تو میں ان سے کہتی کہ حضور کلام کرنے میں تمھاری طرح سرسراتے نہ تھے۔ حضرت عائشہ نے تیز بیانی پر تنقید فرمائی اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ حضور سے حدیث بیان کرنے پر انھیں تعجب تھا تو محض اس پر کہ حدیث کو بڑی تیز رفتاری سے بیان کیا، اس لیے کہ حضور کی گفتگو کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی الفاظ شمار کرنا چاہے تو کر سکتا تھا، یاد کرنا چاہتا تو یاد کر لیتا دہرالیتا۔ اب اس کے علاوہ بیان کرنا بڑی دیدہ دلیری ہے اس لیے کہ حضرت ابوہریرہ نے حضور پر جھوٹ نہیں باندھا۔ ہاں حدیث کو جلدی جلدی بیان کرتے تھے تاکہ ایک ہی مجلس میں زیادہ سے زیادہ حدیثیں بیان کر جائیں۔ آپ خود انصاف کیجئے کہ ان کی حدیث میں کیا خرابی ہے جب کہ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ حدیث کے اچھے برے کے عارف ہیں، جو بیان کرتے ہیں اسے جانتے ہیں۔

ابن حجر نے خود لکھا ہے کہ ابوہریرہ واسع الروایۃ تھے، بہت سی حدیثیں محفوظ تھیں، جب

حدیث بیان کرنے لگتے تو دوسروں کو موقع کم دیتے۔ جیسے بعض شعراء کہتے ہیں کہ جب شعر کہنے لگتا ہوں تو قوافی ہاتھ جوڑے سامنے کھڑے ہوتے ہیں کہ مجھے لے لو مجھے لے لو۔

حضرت عائشہ نے ابو ہریرہ کی تعریف کی، ان کی تصدیق کی۔ چنانچہ نماز جنازہ کی اور تدفین پر دو قیراط سونا صدقہ کرنے والی حدیث حضرت عائشہ کو لوگوں نے پہنچائی تو صدیقہ نے اس کی تصدیق کی۔، اس کو سن کر حضرت ابن عمر بول پڑے کہ پھر تو میں نے بہت سارے قیراطوں کو کھو دیا، وہ اپنے ہاتھ میں کنکری لئے ہوئے تھے یہ کہتے جاتے اور اسے پھینکتے جاتے۔ اس کے علاوہ دوسری روایت میں ہے کہ ابن عمر نے فرمایا ابو ہریرہ تم ہم میں اعلم ہو حدیث رسول کے اور اس کے سب سے بڑے حافظ بھی ہو۔

یہ دشمنان سنت نبوی ان احادیث کے بیان کرنے سے کتراتے ہیں اس لیے کہ ان کی کہی ہوئی بات کی اس سے تردید ہوتی ہے، ان کے مفروضہ کی عمارت ہی زمین پر آجاتی ہے۔ نہ صحابہ نے ابو ہریرہ کی تکذیب کی نہ ان کو متہم کیا۔ ابن عمر، ابن عباس و زبیر و مروان بن الحکم وغیرہ کا موقف معاندین کی ایک بات کو بھی ثابت نہیں کرتا۔ ہم اس سے پہلے صحابہ اور محدثین کے مدحیے ابو ہریرہ کے حق میں تحریر کر چکے ہیں۔ دنیا کا کوئی عاقل یہ نہیں مان سکتا کہ ایک شخص کی کوئی تعریف بھی کرے اور وہی شخص پھر مذمت بھی کرے۔

ان ساری باتوں کے ہوتے ہوئے عبدالحسین اور ابوریہ جیسے لوگوں نے ان باتوں کو نہیں مانا بلکہ ان علمی مناقشات کو ابو ہریرہ کی دروغ بیانی کا ثبوت بنایا۔ چنانچہ عبدالحسین نے صحابہ کے بعض مناقشات کا ذکر کر کے ابو ہریرہ کو کنڈم کرنے کی پوری طرح کوشش کی درانحالیکہ یہ مناقشات علمی قسم کے تھے۔ اس لیے کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ ابو ہریرہ کی ہر طرح تعظیم و اجلال کے قائل تھے۔ ان دلائل صحیحہ کے ہوتے ہوئے ہم کس طرح مان لیں کہ صحابہ نے ابو ہریرہ کو کوئی مقام نہیں دیا۔

البتہ دشمنان ابو ہریرہ کی شورہ پشتی ہمارے سامنے ہے اور شورہ پشتی کے نتیجے میں انھوں نے ابو ہریرہ پر کعب احبار کی شاگردی کا الزام لگایا صرف اس لیے کہ کچھ روایات میں

ابو ہریرہ کی موافقت کی، اوران کی روایات کا شدید انکار کیا۔ ابو ہریرہ ان روایات کے سلسلے میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ صحابہ نے بھی ابو ہریرہ جیسی ہزاروں روایتیں کیں جن سے ابو ہریرہ کی روایات کی تکذیب کے بجائے تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔

ابوریہ اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لیے امام احمد سے وہ روایت نقل کرتا ہے جس کو از قسم اسرائیلیات ثابت کرتا ہے کہ ابو ہریرہ نے فرمایا کہ حضور نے فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ تلے سوار سو سال تک چلتا رہے گا اور سایہ ختم نہ ہوگا اور ظل ممدود سے مراد بھی ہے۔ ابو ہریرہ یہ روایت بیان کر ہی رہے تھے کہ کعب وہاں پہنچا اور کہا کہ سچ کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ پر توریت اور محمدؐ پر فرقان اتارا۔

اس حدیث کے انکار کی کس کو مجال ہے؟ اس کو ابو ہریرہ ہی نے نہیں بلکہ دوسرے صحابہ سہل بن سعد وابوسعید خدری نے بھی روایت کیا ہے۔ کیا ابی بن کعب نے ان دونوں صحابہ کو دھوکہ دیا؟ غرض ان لوگوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ سنت رسول اور اس کے رواۃ سے اعتماد اٹھا کر دین کا بخیہ ادھیڑ دیں۔ قرآن نے تو خود جنت کا عرض آسمان وزمین کے برابر بتلایا، پھر اگر اس کے ایک درخت کا سایہ ایسا ہو تو کیا مجال انکار ہے۔

غرض وہ سنت ہی نہیں بلکہ کتاب پر بھی حملہ آور ہیں اور لغت و بیان کا نام لے کر وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم نے ابو ہریرہ کو ان معاند معاصرین کے زد سے نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور ان کے خلاف جو طوفان ان مخالفین کتاب وسنت نے کھڑا کیا اس سے ہم نے ان کو پوری طرح محفوظ کر دیا ہے اور ان کے ان سارے تیروں کو جو ابو ہریرہ کے صدق، امانت واستقامت کے خلاف چلائے گئے تھے بیکار کر دیا۔

آخر میں ہم ابن خزیمہ امام نیساپوری کی شہادت پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ کی آبرو سے کھیلنے والے اور ان کے خلاف غلط خبریں گھڑنے والے کی خدا نے آنکھیں لے لی ہیں، اسی وجہ سے وہ احادیث وشہادت تاریخی کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی مخالفت کرنے والے یا تو فرقۂ جہمیہ سے ہیں جو جبریہ کی شاخ ہے، جو ان

احادیث کو سن کر جن میں ان کے مذہب کی بیخ کنی کی گئی ہے، برافروختہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت کی سطح سے گر کر ابو ہریرہ کے خلاف باتیں کرنے لگتے ہیں۔

یا خارجی فرقے کے لوگ ہیں جو امت محمدیہ کو اپنی تلوار کا نشانہ بناتے ہیں اور خلیفہ وامام کی طاعت کو بے حقیقت جانتے ہیں۔ جب وہ ایسی احادیث جو ان کی جڑ کاٹتی ہے ابو ہریرہ سے سنتے ہیں تو جل کر مخالفت کرنے لگتے ہیں۔

یا قدری لوگ ہیں جنھوں نے اسلام ہی سے کنارہ کشی کر رکھی ہے اور ان مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں جو اقدار ماضیہ کو تسلیم کرتے ہیں، جو خدا نے مقدر کی ہے اور اس کی قضا بندوں کے کسب سے متعلق مانتے ہیں۔ جب یہ لوگ ابو ہریرہ کی حدیثیں سنتے ہیں جن میں اثبات قدر ہے اور کوئی اور راہ فرار انھیں نظر نہیں آتی تو وہ یہ کہہ پڑتے ہیں کہ ابو ہریرہ کی حدیثیں سند نہیں، ان کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

یا کوئی ایسا جاہل جس کو دین کی سمجھ سے کوئی حصہ نہیں ملا، جب وہ ابو ہریرہ کی احادیث سنتا ہے اور اسے پسندیدہ مذہب کے خلاف پاتا ہے تو وہ ابو ہریرہ کی مخالفت پر اتر آتا ہے۔

عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما
(۱۰ ق ھ ... ۷۳ھ)

عبداللہ بن عمر ابھی گیارہ سال کے تھے کہ اسلام کی حالت میں والد کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ بدر و احد کے غزوات میں شرکت کی اجازت چاہی مگر کمسنی کے باعث حضورؐ نے انہیں شرکت سے روک دیا۔ مگر یوم خندق میں جب آپ ۱۵ سال کے تھے حضور نے اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ اس جنگ میں شریک رہے اور بعد کی تمام لڑائیوں میں حضور کے ساتھ شریک رہے اور آپ کے وصال کے بعد جنگ یرموک و مصر و شمالی افریقہ کی فتح میں بھی شریک تھے۔

ابن عمر اتباع سنت کے شائقین میں تھے۔ آپ کو سنت نبوی سے عشق کے درجہ کا تعلق تھا حضور کی مجلسوں میں خود آتے، اتفاق سے نہ آتے تو جو اس دن یا اس وقت ہوتا اس سے

گذشتہ دن کی رپورٹ لیتے۔ اسی وجہ سے ابن الحنفیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا ابن عمر امت کے عالم ہیں۔

حضور سے بھی حدیثیں روایت کیں اور ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ، ابو ذرؓ، معاذؓ و عائشہؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی روایتیں نقل کیں۔ آپ سے ایک جم غفیر نے روایت احادیث، کی ان میں جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عباس، ان کے صاحبزادگاں سالم وعبداللہ ضمرہ و بلال آپ کے غلام نافع اسلم مولی عمر اور بھتیجے حفص بن عامر ہیں۔

پھر آپ سے کبار تابعین نے حدیثیں روایت کیں، جیسے سعید بن میسب، علقمہ بن وقاص، ابو عبدالرحمان النھدی، مسروق و جبیر بن نفیر، عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ اور ان کبار تابعین کے بعد کے لوگوں میں عبداللہ بن دینار، اسلم کے بیٹے زید و خالد، عروہ بن الزبیر، بشر بن سعید، عطا، مجاہد، محمد بن سیرین وغیرہ ہیں۔

آپ کے بارے میں عبداللہ بن مسعود کی رائے ہے کہ آپ قریش کے جوانوں میں سب سے زیادہ خود کو دنیا کے معاملہ میں قابو میں رکھنے والوں میں تھے، آپ حق گوئی میں جرأت خاص کے مالک تھے، کسی کی ملامت کی پروانہ کرتے۔ ان کے سلسلے میں بہت سے واقعات ہیں۔ سالم بن ابی الجعد نے حضرت جابر سے روایت کیا کہ ہم میں کوئی ایسا نہیں کہ دنیا اس کے سامنے آئی ہو اور اس نے اعراض کیا ہو، بجز عبداللہ بن عمر کے۔ آپ کی نظیر اس زمانے میں نہیں ہے۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمان نے بیان کیا کہ عمر جس دور میں تھے ان کی مثال بہت سے لوگ تھے، مگر جس زمانے میں ابن عمر تھے کوئی آپ کا ثانی نہ تھا۔

پارسائی، تقویٰ اور عبادت میں آپ اپنی نظیر تھے۔ جب ألم يأن للذين آمنوا أن تخشع قلوبهم لذكر الله (کیا اہل ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ذکر الٰہی سے ان کے دلوں میں خشیت پیدا ہو جائے) پڑھتے تو چیخ پڑتے، آنکھوں سے آنسو جاری اور زبان پر گریہ طاری ہوتا۔ سفر میں روزہ نہ رکھتے اور حضر میں اکثر روزے ہی سے رہتے۔

آپ غیر معمولی تواضع، خاکساری، سرمبلو رحمت کا مظہر تھے۔ جو کھانا مرغوب ہوتا اسے صدقہ

کردیتے اور جو دوسروں کو بھاتا اسے تقرب الی اللہ کے طور پر خرچ کر ڈالتے۔ آپ کے پاس ایک شام کو دس ہزار درہم آئے جب تک اسے لوگوں میں تقسیم نہیں کر دیا نچلا نہ بیٹھے۔ ایک دن مجلس میں تھے کہ بیس ہزار سے کچھ زیادہ کی رقم آئی اسی مجلس میں تقسیم کر کے دم لیا، بلکہ کچھ زیادہ ہی تقسیم کر دیا۔ کبھی جو ہوتا تقسیم کرتے اور قرض لینا پڑتا کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کر دیں۔ جب تک دستر خوان پر کوئی یتیم نہ ہوتا کھانا نہ کھاتے۔ موت تک آپ نے ایک ہزار انسانوں کو آزاد کیا۔

بعض صحابہ کا خیال تھا کہ ممکن ہے خلافت حضرت عمر کے بعد آپ کے حصہ میں آئے، مگر حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کرتے ہوئے مسئلہ چھ افراد شوریٰ کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح عبداللہ بن عمر تمام فتنوں میں الگ تھلگ رہے، صرف علم و عبادت مشغلہ رہ گیا، اسی وجہ سے آپ مکثرین رواۃ میں ہیں۔ کثرت روایت کی وجہ آپ کا قدیم الاسلام ہونا بھی ہے اور طول عمر بھی اور حضور کے ہمراہ اکثر چلنا پھرنا بھی۔ چونکہ آپ کی بہن حضرت حفصہؓ ازواج مطہرات میں سے تھیں اس لیے اندرون خانہ آمد و رفت کی سہولت موجود تھی۔ آپ سے ۲۶۳۰ روایتیں مروی ہیں۔ ان میں سے ۲۸۰ بخاری و مسلم نے بیان کیں، دونوں نے ۱۶۸ پر اتفاق کیا، بخاری نے ۸۱ حدیثیں ایسی روایت کیں جن میں وہ منفرد ہیں اور مسلم نے ۳۱۔ آپ کی احادیث کتب ستہ، مسانید اور دیگر سنن میں موجود ہیں۔ آپ کی وفات مکہ معظمہ میں ۷۳ھ عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے تین ماہ بعد ہوئی، بعضوں نے ۷۴ھ لکھا ہے۔ آپ کی عمر ۸۴ سال تھی۔

انس بن مالک
(۱۰ ق ھ .... ۹۳ھ)

آپ انس بن مالک بن نضر بن ضمضم الانصاری خزرجی النجاری ہیں۔ آپ کی والدہ ام سلیم بنت ملحان آپ کو حضورؐ کی خدمت میں لائیں جب آپ مدینہ تشریف لائے کہ حضور یہ خادم زادہ آپ کی خدمت میں رہے گا۔ حضور نے انھیں خدمت کے لیے قبول کیا، آپ کی خدمت میں پروان چڑھے۔ رسول خدا آپ کو پسند فرماتے تھے۔

اس سلسلے میں خود حضرت انس کا اپنا مقولہ ہے کہ میں نے حضور کی دس سال خدمت کی، مگر آپ نے اس دس سال میں خود سے مجھ کو حکم خدمت آوری نہ فرمایا یا کوئی بات ناگوار خاطر گزری ہو تو اس پر تنبیہ نہ فرمائی۔ اگر گھر کا کوئی مجھے کچھ کہہ دیتا تو فرماتے کہ چھوڑ و ایسا ہی ہونا تھا ہو گیا۔ اس طرح انس نے وہ باتیں آپ سے مطالعہ کیں جو کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئیں۔

آپ نے خود رسول اکرم سے روایت حدیث فرمائی اور ابوبکر و عمر و عثمان، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن رواحہ، فاطمۃ الزہراء، عبدالرحمان بن عوف اور دیگر صحابۂ رسول سے بھی۔

آپ سے حسن، سلیمان تیمی، ابوقلابہ، ابومجلز، عبدالعزیز بن صہیب، اسحاق بن ابی طلحہ، ابوبکر بن عبداللہ المزنی، قتادہ، ثابت البنانی، محمد بن سیرین، انس بن سیرین، ابن شہاب زہری، ربیعہ بن عبدالرحمان، یحییٰ بن سعید الانصاری، سعید بن جبیر، اور ان کے سوا بہت بڑی جماعت نے حدیث کی روایت کی۔

بڑے ہی عبادت گزار اور کم گو تھے۔ آپ کے بارے میں ابوہریرہ نے فرمایا کہ میں نے حضورؐ کی طرح نماز ادا کرنے والا بجز ابن ام سلیم (یعنی انس بن مالک) کے کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت ابوبکر نے آپ کو عامل صدقات کی خدمت بحرین میں سپرد فرمائی، مگر آپ مدینہ کے بعد بصرہ کے ہو کے رہے۔ آپ کی طرف اہل علم کی نگاہ لگی رہتی۔ حضور سے ۲۲۸۶ حدیثیں روایت کیں ۳۱۸ بخاری و مسلم نے لیں دونوں ۱۶۸ پر متفق ہوئے، بخاری ۸۰ حدیثوں میں منفرد ہیں، اور مسلم ۷۰ حدیثوں میں۔

آپ کی وفات بصرہ میں ۹۳ھ میں ہوئی، بصرہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آپ کی شخصیت آخری تھی۔

آپ کی موت کے بعد مورق نے کہا کہ نصف علم ختم ہو گیا۔ ان سے سوال کیا گیا یہ کیسے؟ مورق نے کہا کہ جب ہوا پرست لوگوں میں سے کوئی ہم سے حدیث میں مخالفت کرتا تو ہم کہتے آؤ چلو اس ذات گرامی کے پاس تصدیق کر لیں جس نے براہ راست نبیؐ سے سنا ہے۔

حضرت عائشہ ام المومنینؓ (۹ ق ھ — ۵۸ ھ)

آپ عائشہ بنت ابی بکر صدیق ہیں، امہات المومنین میں گرامی ترین شخصیت۔ آپ سے جناب نبی کریمؐ نے غزوۂ بدر کے بعد شوال میں نکاح فرمایا۔ اس طرح آپ کے ساتھ آٹھ سال پانچ مہینے کی ازدواجی زندگی گزاری۔ آپ تمام ازواج میں حضور کو سب سے زیادہ پسندیدہ تھیں۔ آپ ہی کی ذات گرامی ہے جس کی براءت قرآن کریم میں نازل ہوئی جب کہ اہل افک نے آپ پر بہتان باندھا۔

آپ کی شخصیت عبقری تھی، آپ کا رسا ذہن، علم جو طبیعت تھیں۔ حضورؐ کے ساتھ ازدواجی تعلقات اور بہت زیادہ گھلے ملے رہنے کی وجہ سے احکام اسلامی کے بہت سے مسائل کا علم محض آپ کی ذات سے مسلمانوں کو ہوا۔ عورتوں کے مسائل کے سلسلے میں جو کچھ آپ سے معلوم ہوا اس کی بنا پر آپ کو بڑا مرتبہ اہل علم میں دیا گیا۔ ازواج مطہرات میں اکثر نے آپ سے ہی ان مسائل کو اخذ کیا۔ صحابہ میں سب سے زیادہ دین کی سمجھ کی مالک تھیں۔ آپ کے مقام علم اور فقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صحابہؓ تابعین تقریباً متفق ہیں۔ آپ کو علم طب سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا، چنانچہ عروہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے زیادہ علم طب کا ماہر کسی کو نہیں پایا۔ ہشام بن عروہ نے بیان کیا کہ کسی شخص کو میں نے قرآن اور فرض، حلال وحرام، ادب عربی، شعر ونسب میں حضرت عائشہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

اس لیے صحابہ وتابعین کا جمگھٹ آپ کے گرد نظر آتا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آپ سے لوگ فقہ پڑھتے رہتے، معاملات میں مشورہ لیتے۔ قبیصہ بن ذویب کہتے ہیں کہ عائشہ اعلم الناس تھیں، اکابر کو ان سے علم حاصل کرتے میں نے دیکھا۔

حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ صحابۂ رسول اکرم کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو وہ حضرت عائشہ کی طرف رجوع کرتے اور ان سے اس کا بھرپور جواب پاتے۔

آپ دانا تھیں، پیکر وقار تھیں، جو بھی آپ سے ملتا آپ کا احترام کرتا۔ صحابہ وتابعین نے

احترام کا حق ادا کر دیا۔ حضرت عائشہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی پاکیزہ حدیثیں روایت فرمائیں اور اپنے والد سے، عمرؓ سے، حضرت فاطمہ، سعد بن ابی وقاص، اسید بن حضیر، جذامہ بنت وہب اور حمزہ بن عمرو سے روایتیں کیں۔ آپ سے صحابہ میں سے حضرت عمر، آپ کے صاحبزادے، ابو ہریرہ، ابو موسیٰ، زید بن خالد، ابن عباس، ربیعہ بن عمرو الجرشی اور سائب بن یزید نے احادیث روایت کیں۔

اور کبار تابعین میں قاسم، عبداللہ، محمد بن ابوبکر کے صاحبزادگاں، عروہ بن زبیر، عمرہ بنت عبدالرحمان اور آپ کے موالی، ابوبکر، ذکوان، ابو یونس، سعید بن مسیب، عمرو بن میمون، علقمہ بن قیس، مسروق، عبداللہ بن الحکیم، اسود بن یزید وغیرہ بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ آپ کی احادیث تعداد میں ۲۲۱۰ ہیں جن میں ۳۱۶ صحیحین میں ہیں، ۱۹۴ پر شیخین متفق ہیں، بخاری ۵۴ حدیثوں میں منفرد ہیں اور مسلم ۶۸ حدیثوں میں۔ آپ کی مرویات کتب ستہ اور تمام سنن میں موجود ہیں۔ آپ کی وفات ۵۸ھ شب سہ شنبہ ۱۷ رمضان کو ہوئی، بعض نے ۵۷ھ بتلایا ہے۔

عبداللہ بن عباس
(۳ق ھ — ۶۸ھ)

آپ ابو العباس عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف قرشی ہاشمی ہیں۔ آپ حضورؐ کے حقیقی چچا کے صاحبزادے ہیں۔ میمونہ بنت الحارث الھلالیہ زوجۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین کی بہن کے بیٹے ہیں۔ جب قریش نے بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کر رکھا تھا، اسی زمانہ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ حضور کے وصال کے وقت ۱۳ سال کے تھے۔ حضور نے آپ کو سینہ سے لگایا اور دعا فرمائی اللھم علمہ الحکمۃ (اے اللہ ابن عباس کو دین کی حکمت عطا فرما)۔

آپ جویائے علم تھے حضورؐ کے ساتھ رشتہ، کثرت آمد و رفت، سن و سال یہ ساری

چیزیں حدیث طیب کا ایک بڑا حصہ امت تک منتقل کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ آپ ترجمان القرآن تھے، آپ کو کثرت علم کی بنا پر جزرو بحر علم کہا جاتا تھا۔ آپ کا علم عطیۂ خداوندی تھا، اس میں کوشش کا زیادہ دخل نہ تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد آپ نے طلب علم میں کوئی کسر نہ چھوڑی، چنانچہ صحابۂ کرام سے دریافت کرتے رہتے۔ اگر صحابی قیلولہ میں ہوتے تو ان کے دروازے پر چادر لپیٹ کر بیٹھ جاتے، ہوا کی تیزی سے آپ کے چہرے گرد سے اٹ جاتے، جب صحابی نکلتے تو آپ ان سے اپنا ارادہ ظاہر کرتے۔ صحابی فرماتے اتنی زحمت کیوں فرمائی؟ مجھے بلا بھیجا ہوتا، آپ فرماتے کہ نہیں، مجھے آنا چاہیے، یہی درست طریقہ ہے۔ عمرو بن دینار فرماتے کہ میں نے ابن عباس کی مجلس سے زیادہ کوئی مجلس خیر نہیں دیکھی جس میں حلال و حرام، ادب، عربیت، انساب و شعر بھی قسم کے ذائقے ملتے تھے۔

حضرت عمر کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ابن عباس کو طلب فرماتے کہ مشکل مسائل کے لیے تو آپ ہی کی ذات ہے۔ حضرت عمر ابن عباس کی بات پر عمل کرتے۔ آپ کا حافظہ بے پناہ قوی تھا بہت جلد باتوں کو گرفت میں لے لیتا۔

آپ نے حضورؐ سے اپنے والد، اپنی والدہ، ام الفضل، اپنے بھائی فضل، اپنی خالہ حضرت میمونہ، ابوبکر و عمر، عثمان و علی، عبدالرحمان بن عوف، معاذ بن جبل، ابوذر غفاری، ابی بن کعب، تمیم الداری، خالد بن الولید جو آپ کی خالہ کے لڑکے تھے، اسامہ بن زید، ابوسعید الخدری، ابو ہریرہؓ اور معاویہ بن ابی سفیان وغیرہ صحابہ سے روایت حدیث کی۔

آپ سے دنیا جہان کے لوگوں نے روایت حدیث کی، ان میں شہرت یاب عبداللہ بن عمرو بن ثعلبہ بن الحکم اللیثی، مسور بن مخرمہ، ابوالطفیل وغیرہ تھے اور کبار تابعین میں سعید بن المسیب، عبداللہ بن الحارث بن نوفل، ابوسلمہ بن عبدالرحمان، القاسم بن محمد، عکرمہ، عطاء، طاؤس، کریب، سعید بن جبیر، مجاہد اور عمرو بن دینار نے آپ سے روایتیں کی۔ حضرت ابن عمر آپ کے بارے میں فرماتے کہ حضور کے اوپر جو کچھ نازل کیا گیا اس کے سب سے

بڑے عالم تھے۔ آپ سے ۱۶۶۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۲۳۴ مسلم و بخاری نے روایت کی ہیں، ۷۵ حدیثوں پر دونوں کا اتفاق ہے، بخاری نے ۱۱۰ کی روایت الگ سے کی اور مسلم ۴۹ میں منفرد ہیں۔ آپ کی احادیث کتب ستہ اور سنن کی کتابوں میں موجود ہیں۔

ابن عباس کو حضرت علی نے بصرہ کا امیر بنایا۔ آپ اس عہدہ کو حضرت علی کی شہادت سے پہلے ہی چھوڑ کر مکہ معظمہ آگئے اور لوگوں کی تعلیم میں لگ گئے۔ آپ کی بصارت آخر عمر میں جاتی رہی تھی۔ آپ کا انتقال طائف میں ۶۸ھ میں ہوا۔ محمد بن حنفیہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور فرمایا اس امت کا عالم ربانی آج دنیا سے اٹھ گیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ الانصاریؓ
(۱۶ ق ھ — ۷۸ھ)

آپ ابوعبداللہ جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری سلمی اپنے زمانے کے مفتی مدینہ منورہ ہیں۔ آپ ان ستر صحابہ میں شامل ہیں جنھوں نے بیعت عقبہ میں شرکت کی۔ آپ کے والد کا انتقال غزوۂ احد میں ہوا، انھوں نے اپنے پیچھے ذمہ داریاں، اہل وعیال اور قرض چھوڑا۔ حضور کو معلوم ہوا تو آپ پر اپنی عنایات وکرم کی بارش فرمائی تا آنکہ آپ کا قرض ادا ہوگیا۔ آپؓ کو حضورؐ سے دلی تعلق تھا۔ آپؐ کے ہمراہ ہر جنگ میں شریک ہوئے صرف غزوۂ بدر واحد میں شریک نہ ہوسکے، کیونکہ ان کے والد نے انھیں ان کے بھائیوں کا ذمہ دار بنایا تھا۔

تنگی معاش آپ کے حصول علم رسول میں مانع نہ ہوسکی، اس لیے حضور سے کثرت سے حدیثیں روایت کیں۔ آپ کی وفات کے بعد طلب علم میں مختلف اسفار کیے اور کبار صحابہ سے حدیثیں حاصل کیں۔ اس طرح آپ نے خود نبی کریم اور ابوبکر وعمر وعلی، ابوعبیدہ، طلحہ، معاذ بن جبل، عمار بن یاسر، خالد بن الولید، ابوہریرہ، ابوسعید اور عبداللہ بن انیس وغیرہ صحابہ سے احادیث روایت کیں۔

آپ سے آپ کی اولاد عبدالرحمان، عقیل، محمد اور سعید بن المسیب، محمود بن ولید،

عمرو بن دینار، ابوجعفر الباقر، آپ کے چچازاد بھائی محمد بن عمرو بن الحسن، محمد بن منکدر اور عامر شعبی وغیرہ کبار تابعین نے روایت حدیث کی۔ مسجد نبوی میں آپ کا حلقۂ درس ہوتا تھا، طالبان علم نبوی آتے اور علم حاصل کرتے۔

آپ نے ۱۵۴۰ حدیثیں روایت کیں، ان میں سے ۲۱۲ شیخین نے اپنی کتاب میں روایت کیا، ۶۰ پر دونوں متفق رہے، بخاری ۲۶ میں منفرد رہے اور مسلم ۱۲۶ میں۔ مناسک حج میں آپ کی روایات الگ ہیں جنھیں مسلم نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

حضرت جابر نے ۹۴ رسال کی عمر پائی، زندگی کے آخری دنوں میں آپ کی نگاہ جاتی رہی تھی۔ درست قول کے مطابق آپ کا وصال ۷۸ھ ہوا۔ مدینہ میں انتقال فرمانے والے صحابہ میں آپ آخری صحابی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے مدینہ میں وفات پانے والے صحابہ میں آخری سہل بن سعد ساعدی ہیں جنھوں نے ۸۸ھ میں وفات پائی، ان کی عمر سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ
(۱۲ ق ھ — ۷۴ھ)

آپ سعد بن مالک بن سنان بن عبید بن ثعلبہ الخدری الانصاری خزرجی مدنی ہیں۔ ان کے والد غزوۂ احد میں شریک ہوئے ابوسعید نے زندگی بڑی تنگ حالی سے گزاری۔ آپ اہل صفہ میں سے تھے، حضورؐ نے احد میں شرکت سے ان کی کمسنی کی وجہ سے روک دیا تھا، مگر بعد کی تمام بڑی جنگوں میں شریک رہے، بیعت رضوان کے موقع پر بھی موجود تھے۔ آپ حضور کی مجلس علم کے شرکاء میں تھے، آپ سے بہت سی عمدہ پاکیزہ حدیثیں روایت کیں اور مکثرین صحابہ میں شمار ہوئے۔

حضورؐ سے اور ابوبکر، عمر، عثمان وعلی اور زید بن ثابت وغیرہ صحابہ سے حدیثیں روایت کی۔ آپ سے صحابہ میں سے ابن عباس، عبداللہ بن عمر، جابر، محمود بن لبید، ابوامامہ بن سہل اور ابوالطفیل نے حدیثیں لیں۔ تابعین کبار میں سے سعید بن المسیب، ابوعثمان النہدی، طارق بن شہاب اور دیگر تابعین میں عطا، عیاض بن ابی سرح اور مجاہد وغیرہ نے حدیث روایت کی۔ آپ کی کل مرویات ۱۱۷۰

ہیں، جن میں سے ۱۱۱ شیخین نے لیں، ۴۳ میں دونوں کا اتفاق ہے۔ بخاری نے ۱۶ حدیثیں اور مسلم نے ۵۲ حدیثیں منفرد طور پر لیں۔ تمام اصحاب مسانید وسنن نے آپ سے روایت کی۔

آپ اپنی پامردی واستقلال کے لیے مشہور زمانہ تھے۔ آپ حق پرستی وحق گوئی میں طاق تھے اور اس کے لیے تکلیفیں برداشت کیں۔ آپ کھلم کھلا اعلان حق کرتے، اس میں کسی قسم کی رعایت ملحوظ نہ ہوتی۔ آپ کا مدینہ طیبہ میں ۷۴ھ میں وصال ہوا آپ کی عمر اس وقت ۸۶ سال تھی۔

فصل ثانی

تابعی کون ہے؟:

خطیب بغدادی نے تابعی کی تعریف کی ہے:

التابعی من صحب صحابیا، "تابعی وہ ہے جو صحابی کی صحبت میں رہا ہو"

اس کے لیے محض ملاقات کافی نہیں ہے، بخلاف صحابی کے، کہ وہاں صرف ملاقات وشرف رویت ہی کافی ہے۔ حضور کی ملاقات کے اعلیٰ ترین مرتبہ ہونے کی وجہ سے کسی ایک مجلس میں اکٹھا ہونا یا صرف آنکھوں سے دیکھ لینا کہ اتنے ہی سے دلوں کی اصلاح اور نفوس میں پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن صحابی کی صحبت اور اس سے علم حاصل کرنا تابعیت کے شؤن میں سے ہے۔

اکثر محدثین صرف ایک صحابی سے ملاقات کو کافی جانتے ہیں، زائد سے ہو تو اور بہتر ہے، اس کی صحبت لازم نہیں۔ اسی وجہ سے مسلم اور ابن حبان نے سلیمان بن مہران اعمش کو طبقۂ تابعین میں شمار کیا ہے۔ ابن حبان نے خود لکھا ہے کہ ہم نے انھیں تابعین میں اس لیے شمار کیا کہ انھوں نے ملاقات کی اور ان کی حدیثیں یاد رکھیں، انس بن مالک کو دیکھا، گو کسی حدیث کا سننا ثابت نہیں، جس طرح کہ حافظ عبدالغنی بن سعید نے یحییٰ بن ابی کثیر کو تابعین میں شمار کیا ہے کیونکہ ان کی انسؓ سے ملاقات ہوئی ہے۔ موسیٰ بن ابی عائشہ کو بھی عمرو بن حریث صحابی سے ملاقات کی بنیاد پر تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح جریر بن ابی حازم

کو حضرت انس کی رویت کی وجہ سے تابعی کہتے ہیں۔اس طرح محدثین نے صحابی کی رویت بلا صحبت کے تابعی ہونے کے لیے کافی سمجھا۔

ابن حبان نے یہ بھی لکھا کہ اس کے لیے سن تمیز و حفظ ہونا ضروری ہے کہ وہ باتیں سن کر تمیز کی صلاحیت اور تحمل کی قابلیت رکھتا ہو۔اگر اس قدر کمسن ہو کہ تمیز کی صلاحیت نہ ہو تو اس رویت کا کوئی اعتبار نہیں۔جیسے خلف بن خلیفہ کو تبع تابعین میں شمار کرتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ عمرو بن حریث صحابی کو انھوں نے اس وقت دیکھا کہ ابھی سن تمیز نہ تھا۔

عراقی نے رویت ممیزہ پر حدیث نبوی سے استدلال کیا کہ حضور نے فرمایا طوبی لمن رآنی و آمن بی وطوبی لمن رأی من رآنی (اس کی سعادت مندی ہے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا، اور سعادتمند ہے وہ شخص جس نے میرے صحابہ کو دیکھا) اس میں رویت محض ہی کو سب کچھ سمجھا گیا ہے اس لیے صحابی کی رویت ممیزہ تابعیت کے لیے کافی ہے۔

تابعین کی تعداد شمار سے باہر ہے، اس لیے کہ جس نے بھی صحابی کو سن وسال کے ساتھ دیکھا وہ تابعی ہے۔حضور کی وفات کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔اسی طرح تابعین کے بے شمار ہونے کو معلوم کریں، اس لیے کہ صحابہ دنیا کے ہر حصے میں پھیلے اور ہر جگہ ان کو لوگوں نے دیکھا۔

محدثین کے یہاں صحابہ و تابعین کی معرفت کا معیار بلند ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعہ ہی مرسل اور متصل احادیث کا جاننا ممکن ہے۔تابعین کو بھی صحابہ کی طرح لوگوں نے کئی طبقہ میں منقسم کیا ہے۔حاکم نے پندرہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔تابعین کا آخری طبقہ وہ ہے جو حضرت انس سے بصرہ میں ملا اور عبداللہ بن اوفی سے کوفہ میں اور سائب بن یزید سے مدینہ میں اور عبداللہ بن الحارث بن جزع سے بصرہ میں ملاقات کی اور شام میں ابوامامہ الباہلی سے ملاقات کی۔حاکم نے اور بھی صحابہ کے نام لیے ہیں جو ملک کے دوسرے حصوں میں موجود تھے۔افضل تابعین کے سلسلہ میں علماء کی لمبی بحثیں ہیں۔

ہم یہاں بعض اعلام رواۃ تابعین کا ذکر کریں گے۔

سعید بن المسیب (۱۵ھ — ۹۴ھ)

آپ ابو محمد سعید بن المسیب بن حزن بن وہب القرشی المخزومی المدنی ہیں۔ دنیا کے ممتاز ترین علماء میں اور تابعین کے سرگروہ جانے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۵ھ میں ہوئی۔ حضرت عمر کی خلافت کے دو سال ہوئے تھے آپ نے عمر سے حدیث سنی اسی طرح عثمان بن عفان، علی، زید بن ثابت، عائشہ، سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، ابن عباس اور ابن عمر سے بھی حدیثیں سنیں حضرت ابو ہریرہ سے آپ کی بیشتر روایات ہیں، کیونکہ ابو ہریرہ کی صاحبزادی سے شادی کر لی تھی۔

آپ کا علم بے پایاں تھا۔ ابن عمر کا آپ کے بارے میں یہ مقولہ ہے کہ اگر حضور سے ان کی ملاقات ہوئی ہوتی تو حضور مسرور ہوتے۔ قتادہ، زہری اور مکحول نے بیان کیا کہ سعید سے زیادہ صاحب علم ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا، ابن المدینی کہتے ہیں کہ تابعین میں ان سے زیادہ وسیع العلم کوئی نہیں، میرے نزدیک وہ تابعین کے سرگروہ ہیں۔

رسول خدا اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ صحابۂ کرام کی موجودگی میں آپ فتویٰ دیتے تھے، اپنے زمانے کے فقہاء کے پیشوا تھے۔ عمر بن عبدالعزیز آپ کا اکرام و احترام فرماتے۔ آپ کی عبادت و پارسائی مشہور زمانہ تھی۔ حق گوئی میں آپ اپنی مثال تھے۔ بعض امراء زمانہ کی بیعت سے انکار کرنے پر آپ کو کوڑے لگائے گئے، مگر آپ کی عزیمت و ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۸۸۔۱۰۶)

آپ سے جن لوگوں نے روایت کی ان میں کبار تابعین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے ان میں زہری، عمرو بن دینار، عطاء بن ابی رباح الباقر، قتادہ بن دعامہ السدوسی، بکیر بن الاشج اور یحییٰ بن سعید الانصاری شامل ہیں۔

آپ کی امامت متفق علیہ تھی۔ دنیائے علم نے آپ کا لوہا مانا۔ آپ فقہائے مدینہ کے سربراہ تھے اسی وجہ سے آپ کو فقیہ الفقہاء کہا جاتا ہے۔

محدثین نے بھی آپ کے ثقہ، پاکباز اور حافظ پر اتفاق کیا اور آپ کے عمل بالسنۃ کو سراہا ہے۔

آپ عبادت کے ساتھ علم کے رسیا تھے، یہاں تک کہ آپ مسجد میں ایک شام سے دوسری شام تک رہا کرتے۔ مسلمانوں سے عطیات نہ لیتے، آپ کے پاس چار سو دینار تھے، ان سے تیل کی تجارت کرتے اور اس کے نفع پر زندگی گزارتے۔ آپ کا وصال ۹۳ھ بقول بعض ۹۴ھ میں ہوا۔

حضرت عروہ بن الزبیرؓ
(۲۲ھ — ۹۴ھ)

آپ کا نام ابو عبداللہ عروہ بن الزبیر بن العوام الاسدی المدنی ہے، بڑے پایہ کے تابعی، فقیہہ، حافظ حدیث تھے۔ آپ کی ولادت ۲۲ھ خلافت عمر کے آخری دنوں میں ہوئی، بعض نے خلافت عثمان میں ۲۹ھ بتلایا۔

قرآن کی تعلیم اپنے والد والدہ اور خالہ حضرت عائشہ سے حاصل کی اور روایت حدیث علی، محمد بن مسلمہ، ابو ہریرہ، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، عبداللہ بن ارقم، ابو ایوب، نعمان بن بشیر، معاویہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، مسور بن مخرمہ، زینب بنت ابی سلمہ اور بشیر بن ابی مسعود انصاری سے کی۔

عروہ علم کے بڑے شائق تھے، اپنی خالہ کے پاس تحصیل علم کے لیے بہت حاضر ہوتے اور ان سے دین کی باریک باتیں معلوم کرتے۔ یادداشت بے پناہ تھی آپ ثقہ لوگوں میں تھے، آپ کے دور کے بڑے بڑے لوگوں نے اسے تسلیم کیا۔ آپ فقہاء سبعہ مدینہ میں سے ایک تھے۔ آپ کا انتخاب حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ذریعہ جو اس وقت امیر المومنین تھے، مدینہ کی مجلس شوریٰ کے لیے عمل میں آیا تھا۔

آپ کے بارے میں زہری کا قول ہے کہ اتھاہ سمندر تھے جسے گندگی گدلا نہ کر سکی۔ سفیان بن عیینہ کے نزدیک حدیث عائشہ کے سب سے بڑے عالم القاسم، عروہ اور عمرہ تھے۔ ان کے بیٹے ہشام نے کہا کہ ان کے پاس حدیث کا جو ذخیرہ تھا اس کے دو ہزارویں حصہ کو بھی ہم ان سے حاصل نہ کر سکے۔

محمد بن سعد نے فرمایا کہ آپ کثیر الحدیث ہوتے ہوئے ثقہ تھے اور فقیہہ ہوتے ہوئے مامون تھے۔ عالم کے عالم تھے، حدیث شریف کے حافظ تھے، خصوصیت سے سیرت نبوی کے عالم تھے۔ آپ حافظ قرآن تھے، عابد تھے، شب زندہ دار، سدا روزہ دار تھے، بحالت روزہ وفات بھی ہوئی۔

آپ علم کے پھیلانے کے بھی ویسے ہی شائق تھے، لوگوں کی حدیث سننے کے لیے دلجوئی فرماتے اور اپنے صاحبزادوں کو حدیث کا تکرار کراتے۔

آپ سے روایت کرنے والے بہت ہیں، ان میں سے مشہور آپ کے صاحبزادگان عثمان، عبداللہ، ہشام، یحیٰی، محمد اور آپ کے پوتے عمر بن عبداللہ ہیں۔ اسی طرح زہری، سلیمان بن یسار، ابوالزناد، ابن ابی ملیکہ ابن المنکدر وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

آپ علم سیادت وعبادت کے مظہر تھے۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی اور ۹۴ھ میں وصال فرمایا۔

محمد بن مسلم بن شہاب الزہری

(۵۰ھ — ۱۲۴ھ)

آپ ابوبکر محمد بن مسلم بن عبداللہ بن شہاب بن عبداللہ بن الحارث ابن زہرہ بن کلاب بن مرہ القرشی الزہری المدنی ہیں۔

زہری کی ولادت ۵۰ھ میں معاویہ بن ابی سفیان کے دور خلافت میں ہوئی اور مروان بن حکم کے پاس اس کے دور خلافت میں ۶۴ھ میں آئے، اس وقت جوان، بالغ ہو چکے تھے، اور آپ کے والد ابھی حیات تھے۔ اس لیے کہ وہ عبداللہ بن زبیر کے مستحق خلافت ہونے کے حق میں عبدالملک بن مروان کے مقابلہ میں برسر پیکار تھے۔ پھر اپنے والد کے بعد عبدالملک کے پاس آئے، یہ ۸۲ھ کا واقعہ ہے۔

طالب علمی

آپ نے قرآن کریم ۸۰ دن میں یاد کرلیا اور صحابہ کے آخری دور میں حدیث کے جویا بن گئے، حالانکہ آپ کی عمر ابھی بیس سے کسی قدر متجاوز تھی۔ آپ نے بعض صحابہ سے حدیث سنی اور ان سے روایت کی، ان میں سے انس بن مالک، عبداللہ بن عمرہ، جابر بن عبداللہ، سہل بن سعد، ابوالطفیل اور مسور بن مخرمہ وغیرہ صحابی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

آپ نے کبار تابعین سے بھی روایت حدیث کی، جن میں سے ابوادریس خولانی، عبداللہ بن حارث بن نوفل، حسن وعبداللہ صاحبزادگان محمد بن الحنفیہ، حرملہ مولی اسامہ بن زید، عبداللہ وعبیداللہ وسالم صاحبزادگان ابن عمر، عبدالعزیز بن مروان، خارجہ بن زید بن ثابت، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، عروہ بن الزبیر، اعرج بن عبدالرحمان بن ہرمز، عطاء بن ابی رباح، قاسم بن محمد بن ابی بکر، محرر بن ابی ہریرہ، محمد ونافع صاحبزادگان جبیر بن مطعم اور عمرۃ بنت عبدالرحمان وغیرہ ہیں۔

زہری نے اپنی روایات کا بڑا حصہ سعید بن المسیب سے لیا۔ اس سلسلے میں ان کا اپنا قول ہے کہ میں نے زانوے تلمذ سعید بن میتب کے سامنے آٹھ سال تک تہ کیا۔ ایک دوسرے موقعہ پر کہا کہ تین دن تک سعید بن میتب کے پیچھے پھرتا رہا کہ حدیث سنوں۔ اسی طرح عبیداللہ بن عتبہ کی خدمت میں عرصہ تک رہے، آپ کا پانی بھرتے تاکہ حدیثیں سن سکیں، اور رات آپ کے ساتھ گزارتے۔ زہری کا خود کا بیان ہے کہ ان کا خادم گھر سے نکلتا اور پوچھتا دروازہ پر کون ہے، خادمہ کہتی آپ کا غلام زہری، وہ مجھے آپ کا غلام جانتی۔ میں ان کی خدمت کرتا، وضو کے لیے پانی لاتا۔

جس طرح وہ ابن المسیب وعبیداللہ سے چمٹے رہے، عروہ بن الزبیر سے بھی اسی طرح لگے رہے۔ چنانچہ عروہ کے بارے میں فرماتے، عروہ بہتا دریا یا عروہ نہ گدلانے والا سمندر ہیں۔

جستجوئے علم میں بے باک تھے، ہر قسم کا سوال بے کھٹک کرتے۔ عبدالملک بن مروان نے آپ کو علم کے حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔ جب آپ پہلی بار عبدالملک کے پاس آئے،

آپ سے عبدالملک نے کہا کہ علم کی تحصیل میں لگ جاؤ اور کسی مشغلہ کی وجہ سے اس سے بے پروانہ ہونا، اس لیے کہ میں تم کو ایک ابلتا چشمہ دیکھ رہا ہوں، اور انصار کو ان کا مقام دو۔

صالح بن کیسان کہتے ہیں میں اور زہری دونوں ہی تحصیل علم میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے احادیث نقل کی اور حضور سے جو روایات ملیں اسے لکھا۔ پھر زہری نے کہا کہ صحابہ نے بھی جو بیان کیا اسے ہم کو لکھنا چاہیے کہ وہ بھی سنت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ سنت نہیں اس لیے میں نہ لکھوں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھ لیا اور کامیاب رہے اور میں نے نہ لکھ کر کھو دیا۔

زہری کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ احادیث کو لکھتے، پھر اس کو یاد کر لیتے، جب یاد ہو جاتی لکھا مٹا دیتے۔ وہ طلب حدیث میں سب سے زیادہ محنتی تھے، ہر صاحب علم کے حلقے میں حاضری دیتے۔ جس کسی کے بارے میں معلوم ہوتا کہ ان کے پاس حدیث کا کوئی حصہ ہے وہاں پہنچ جاتے۔ ابراہیم بن سعد بن ابراہیم اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ ابن شہاب کا امتیاز کیا تھا؟ فرمایا کہ مجلس میں آگے بڑھتے، کسی سن رسیدہ و کمسن سے مجلس میں ملتے تو اس سے حدیث دریافت کرتے پھر انصار کے گھروں پر چکر لگاتے۔ وہاں کوئی جوان ملتا تو اس سے دریافت کرتے۔ کوئی بزرگ ملتا، کوئی بوڑھا، بوڑھی، سن رسیدہ ایسا نہ تھا جس سے وہ سوال نہ کرتے، نئی نویلی دلہنوں سے بھی پوچھتے۔

ابوالزناد کہتے ہیں کہ ہم حلال و حرام لکھتے اور زہری جو سنتے لکھ لیتے۔ جب لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنا پڑا تو سمجھ میں آیا کہ وہ اعلم الناس ہیں۔

یادداشت

زہری کا امتیاز ان کا قوی حافظہ اور بسرعت یاد کر لینا تھا۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے جب کوئی بات یاد رکھنی چاہی بھول گیا، مگر حدیث ایک بار میں یاد ہو جاتی، چنانچہ جب بھی پوچھا گیا یاد رہی۔ اس سلسلے میں یہ روایت کہ ہشام نے اپنے صاحبزادگان میں سے کسی کے لیے حدیث املا کرانے کے لیے آپ سے درخواست کی اور کاتب بلایا۔ چنانچہ زہری

نے چار سو حدیثیں لکھوادی۔ زہری ہشام کے یہاں سے نکلے تو محدثین کی طرف مخاطب ہوئے اور وہی چار سو حدیثیں لکھوادی۔ پھر مہینہ بھر گزر جانے کے بعد ہشام سے زہری کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے زہری سے کہا کہ وہ تحریر کھوگئی۔ زہری نے کہا کوئی بات نہیں، پھر کاتب بلایا اور اسے املا کرادیا۔ پھر ہشام نے پہلی تحریر اور اس تحریر کا مقابلہ کیا تو ایک حرف کا فرق نہیں ملا۔

مالک بن انس فرماتے ہیں کہ زہری نے مجھ سے سو حدیثیں بیان کیں۔ دریافت کیا کہ مالک! کتنی یاد کرلی؟ میں نے کہا چالیس، یہ سن کر سر پیٹ لیا اور فرمایا، انا للہ کس قدر حافظہ پر زوال آگیا۔

اکثر وہ حدیث یاد کرتے رہتے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ ایک رات زہری مذاکرۂ حدیث کرتے رہے تا آنکہ صبح ہوگئی۔ کبھی عروہ بن زبیر وغیرہ سے علم حاصل کرنے کے بعد آتے اور اپنی سوئی خادمہ کو جگاتے اور کہتے کہ فلاں نے مجھ سے ایسے ایسے حدیث بیان کی۔ وہ کہتی کہ مجھے اس سے کیا ربط؟ فرماتے میں جانتا ہوں کہ تم کو اس سے کوئی سروکار نہیں، مگر میں نے ابھی ابھی یہ حدیثیں سنی ہیں اور یادداشت میں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔

آپ کے آثار علم

زہری وفور علم کے لیے مشہور تھے، چار دانگ عالم میں آپ کا علمی شہرہ تھا۔ اہل شام وحجاز کے اہل علم کی نگاہ کا مرکز آپ ہی تھے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جب زہری مدینہ آجاتے پھر کوئی دوسرا ان کے رہتے حدیث نہ بیان کرتا۔ میں نے مدینہ میں ستر واسی سال کے بزرگوں کو دیکھا مگر لوگ ابن شہاب زہری کے ہوتے ان کی جانب رخ نہ کرتے اور زہری پر لوگ پلے پڑتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ ابن شہاب رہ گئے، ان کا ثانی کوئی دنیا میں نہیں رہا۔

عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ہم نشینوں سے کہا کہ تم لوگ زہری کے پاس جاتے ہو، سبھوں نے کہا ہاں جاتے ہیں۔ آپ نے کہا جاتے رہو کیونکہ کوئی آپ سے زیادہ سنت نبوی کا عالم نہیں رہ گیا۔ راوی نے کہا حسن اور ان جیسے لوگ اس وقت زندہ تھے۔ مکحول

فرماتے ہیں کہ میں نے حضور کی سنت کا زہری سے بڑا کسی کو عالم نہیں پایا۔

عمرو بن دینار فرماتے کہ میں نے جابر، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کی خدمت میں حاضری دی، مگر حدیث میں زہری سے زیادہ عالم کسی کو نہیں پایا۔ ایک روایت میں ہے کہ زہری سے زیادہ ٹھوس اور حدیث پر نگاہ رکھنے والا نہیں پایا۔ ایوب سختیانی فرماتے ہیں کہ زہری سے زیادہ اعلم میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔

علوم اسلامیہ میں بہت سے علوم پر کامل دست رس کے مالک تھے۔ اس سلسلے میں لیث بن سعد کی بات یادگار ہے کہ میں نے زہری سے زیادہ مجموعہ علم کسی کو نہیں پایا کہ جب احادیث ترغیب بیان کرتے تو لوگ بول اٹھتے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اگر انساب و آداب پر گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس کے سب سے بڑے عالم یہی ہیں، اور اگر قرآن و سنت پر گفتگو کرتے تو پھر آپ کے منہ سے پھول جھڑتے۔

ایک طرف سنت نبوی اور علوم اسلامیہ کے ماہر تھے تو دوسری طرف شعر، ساب و سیرت کے عالم تھے۔ یہ مشہور ہے کہ سیرت پر سب سے پہلے آپ نے تالیف کی۔ بعض نے لکھا کہ سیرت میں سب سے پہلی تصنیف زہری کی ہے۔

ان کی عظمت علمی کا لحاظ کر کے یزید بن عبدالملک نے آپ کو عہدۂ قضا سپرد فرمایا۔ پھر ہشام بن عبدالملک نے اپنے نواسوں کا معلم اور اتالیق مقرر کیا۔ آپ ان کو تعلیم دیتے، دین سمجھاتے، ان کے ہمراہ حج کرتے، موت تک یہ عمل جاری رہا۔ اسی بنا پر ابن حبیب نے انہیں اشراف معلمین اور فقہاء میں شمار کیا ہے۔ سنت محمدی کے تحت پابند تھے۔

"من الله القول وعلى الرسول البلاغ وعلينا التسليم أمّروا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم كما جاء بلا كيف"

(حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۳۶۹)

"امام اوزاعی نے آپ کا قول نقل کیا ہے کہ خدا کی بات، رسول کا ابلاغ ہم پر اسے مان لینا فرض ہے، حدیث رسول کی اسی طرح پیروی کرو جس طرح وہ حدیث میں ہو بلا کسی کمی بیشی کے"

آثار سنت

زہری پہلے شخص ہیں جنھوں نے حدیث نبوی کی تدوین کا عمر بن عبدالعزیز کے کہنے پر بیڑا اٹھایا کہ احادیث کو دفاتر میں مکمل کردیں۔ خود عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ممالک محروسہ میں ایک ایک دفتر ارسال کیا۔ علماء نے سب سے پہلے تدوین حدیث کرنے والا آپ کو تسلیم کیا ہے۔ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ باقاعدہ حکم خلیفہ کے مطابق تدوین حدیث کا کام زہری نے ہی کیا، ورنہ سنت کی اشاعت وتبلیغ وکتابت کا کام تو پہلے بھی جاری تھا۔

زہری نے اگر اہتمام سنت نہ کیا ہوتا تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔ لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ مجھ سے سعید بن عبدالرحمان نے کہا کہ اے ابو حارث! اگر ابن شہاب نہ ہوتے تو سنت کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا ہوتا۔ امام مسلم نے فرمایا کہ زہری کی نوے حدیثیں ایسی ہیں کہ انھوں نے جو روایت کی ہیں اس عمدہ سند میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ حافظ ذہبی نے بیان کیا کہ زہری بہت سی احادیث کی روایت میں منفرد ہیں۔ بہت سے ایسے لوگوں سے انھوں نے روایت کی جن سے کسی دوسرے نے بیان نہیں کیا۔ مسلم نے ان کا نام گنایا ہے، ان کی تعداد چالیس کے اوپر ہے۔

زہری اسناد کے ذکر کرنے کے شائق تھے، علماء وطالبین علم کو اس کے التزام پر ابھارتے۔ انھوںؒ نے ایک بار مدینہ میں اسحٰق بن عبداللہ کو حدیث بیان کرتے ہوئے سنا، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا "خدا تمھارا برا کرے، ابن ابی فروہ! کیسی جرأت خدا کے سامنے کر رہے ہو؟ اپنی حدیث کی سند بیان کرو، ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔" ولید بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ زہری جب عبدالملک کے قصر خضراء کے باہر آئے اور اس ستون کے پاس بیٹھے اور فرمایا "لوگو ہم نے تمھیں کچھ باتوں سے روکا تھا جسے ہم نے ان لوگوں کو دیا، تو آؤ ہم تم سے حدیثیں بیان کریں" اور کہا کہ "سنتے ہو" لوگ کہتے ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اے شام والو! میں دیکھتا ہوں کہ تمھاری حدیثوں کا نہ سر ہے نہ پیر۔ ولید نے بیان کیا کہ اس کے بعد سے ہی

لوگ حدیث بیان کرنے میں سند کا اہتمام کرنے لگے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سند کے ساتھ سب سے پہلے جس نے حدیث بیان کیا زہری ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زہری ان لوگوں کے پیش رو ہیں جنھوں نے سند کا التزام کیا، اس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

زہری لوگوں کو تدریس حدیث پر ابھارتے تھے اور بہتوں پر خرچ کرتے۔ کسی نے کہا کہ میرے پاس رقم نہیں کہ میں تحصیل علم کروں۔ آپ نے فرمایا ہمارے ساتھ رہو تمھارے اخراجات کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ آپ محدثین کی تکریم کرتے، ان کی ضیافت ثرید سے کرتے، انھیں شہد پلاتے، اگر کوئی اس سے انکار کرتا کہ ہم آپ کی ضیافت نہیں قبول کرتے تو قسم کھا جاتے کہ دس دن تک ان کو درس حدیث نہ دوں گا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ زہری دیہات کے لوگوں کو جمع کر کے ان میں حدیث کا مذاکرہ کرتے، موسم سرما میں کھجوروں کے ٹوکرے سامنے ہوتے اور مکھن گرمیوں میں، کھجوروں کے ٹوکرے گھی کے ساتھ کھلاتے۔

آپ داتا تھے، بخشش اور جود و عطا کے لیے مشہور زمانہ تھے، جو ہوتا کھلا پلا دیتے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے بہتوں کو دیکھا ان میں سب سے زیادہ سخی ابن شہاب ہی کو پایا۔ ہر آنے جانے والے کو کچھ نہ کچھ دیتے، کچھ نہ رہتا تو قرض لے کر دیتے۔ آپ کو کبھی فقر کا خطرہ نہ ہوتا، کم ہوتے ہوئے بھی بخل سے کام نہ لیتے۔ کوئی مانگنے والا آتا اور وہ اس حال میں ہوتے کہ کچھ پاس میں نہ ہوتا، فرماتے رکے رہو، خدا عنقریب فضل فرمائے گا۔

تعداد احادیث اور ان کی حیثیت

علی بن مدینی نے کہا کہ زہری نے دو ہزار حدیثیں بیان کیں۔ ابوداؤد نے دو ہزار دو سو بتلایا، ان میں سے نصف سند کے ساتھ ہیں۔ زہری کی اسانید سب سے عمدہ اسانید تسلیم کی جاتی ہیں۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ زہری حدیث میں سب سے بہتر اور سند میں سب سے عمدہ ہیں۔ نسائیؒ نے کہا کہ چار سندیں سب سے بہتر ہیں، پہلی زہری عن علی بن الحسین عن ابیہ عن جدہ، دوسری زہری عن عبید اللہ عن ابن عباس، تیسری ایوب عن محمد عن عبیدۃ عن علی، چوتھی

منصور عن ابراہیم، عن علقمہ عن عبداللہ۔ ابو حاتم نے بیان کیا کہ انس بن مالک کے لوگوں میں سب سے مضبوط زہری ہیں۔ حاکم نے بیان کیا مکثرین صحابہ میں اصح الاسانید ابو ہریرہ کے واسطے سے زہری عن سعید بن المسیب عن أبی ہریرہ، اور دوسری اصح الاسانید محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن شہاب بن زہرہ القرشی عن عروۃ بن الزبیر بن العوام بن خویلد القرشی عن عائشہ، اور انس کی اصح الاسانید مالک بن انس عن الزہری عن انس بن مالک ہیں۔ حاکم نے بھی کہا کہ "أصح الأسانید زهری عن سالم عن أبیه عن جده"۔

سیوطی نے أصح الاسانید مطلقا ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہری عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ لکھی ہے۔ یہی احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہویہ کا خیال ہے ابن فلاح کی تشریح کے مطابق۔

تلامذہ

زہری سے ایک دنیا نے روایت حدیث کی جو دنیائے اسلام کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر حجاز و شام والوں کو ان روایات میں بڑا حصہ ملا۔ جن لوگوں نے ان سے روایت کی ان میں مشہور ترین افراد عطا بن ابی رباح ابو زبیر مکی، عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، ابان بن صالح، یحییٰ بن سعید الانصاری، یزید بن ابی حبیب، ایوب سختیانی، معمر بن راشد، ابو عمرو اوزاعی، عبدالملک بن جریج، مالک بن انس، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مسلم زہری اور ان کے برادر ہیں۔

زہری اہل علم کی نگاہ میں

زہریؒ کے مرتبہ علیا کی وضاحت کے لیے ہم اس دور کے معاصر محدثین و علماء کی رائے نقل کرتے ہیں۔ ایوب سختیانی نے کہا کہ میں نے زہری سے بڑا عالم نہیں پایا، اس کو سن کر صخر بن جویریہ نے کہا کہ کیا حسن سے بھی؟ اس پر انھوں نے کہا کہ ہاں زہری سے بڑا میں نے عالم

نہیں دیکھا۔ ابن مسعود نے بیان کیا کہ زہری ثقہ، کثیر الحدیث، کثیر العلم، کثیر الروایت ہونے کے ساتھ احادیث وفقہ اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ امام اوزاعیؒ نے کہا کہ دور ہشام بن عبدالملک میں تابعین کے گروہ میں زہریؒ سے بڑا فقیہہ میں نے نہیں دیکھا۔ ابن حبان نے کہا کہ زہری یادداشت میں اپنے زمانے کے لوگوں میں اعلیٰ ترین درجہ پر تھے، اور احادیث کے متن کے سیاق وسباق سے پوری طرح واقف تھے، فقیہہ تھے، عالم تھے۔ امام ابن تیمیہؒ کی رائے ہے کہ زہری نے اسلام کی حفاظت کا فرض ستر سال تک انجام دیا۔ ذہبی نے لکھا کہ زہری حفاظ حدیث کے لیے نشان راہ تھے، ایک دوسرے موقع پر لکھا کہ وہ نمایاں محدثین میں اور زمانے کے حافظ حدیث تھے۔ ابن حجر نے لکھا کہ زہری مشہور علماء زمانہ میں تھے، حجاز وشام کے عالم تھے۔ ابن جوزی نے کہا زہری ائمہ کبار میں تھے، حجاز اور ممالک عربیہ کے عالم تابعی تھے۔ ابن عماد نے بیان کیا کہ زہری فقہاء سبعہ مدینہ میں سے ایک تھے اور مشہور علماء زمانہ میں تھے، ان کی احادیث کتب ستہ میں اور سنن بیہقی، موطا امام مالک، مسند احمد اور دیگر مسانید وسنن میں موجود ہیں۔ امام ذہلی نیساپوری مشہور زمانہ حافظ نے زہری کی احادیث دو جلدوں میں جمع کی اور ان کا نام زہریات رکھا۔ امام ذہلی نے اپنی پوری توانائی ان حدیثوں کو جمع کرنے میں صرف کی، وہ زہری کی حدیثوں کے بڑے عالم تھے۔ زہری کی احادیث پر اضافہ ذہلی کے بعد امام ابوعلی حسن بن محمد ماسرجسی نے کیا اور آپ نے نادرۂ روزگار انداز میں ان احادیث کو جمع کیا، کوئی آپ کے ٹکر کا نہیں رہا۔ آپ کی احادیث ابوبکر بن مہران نیساپوری نے بھی جمع کیا۔

وفات

زہری نے شاندار علمی خدمات انجام دیئے زہری نے عمر کی ستر سے کچھ زیادہ بہاریں دیکھیں طویل عدت تک شاندار علمی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۲۴ھ میں ماہ رمضان کے دوسرے عشرہ میں ادامی نامی موضع میں جو وادی القریٰ کے پاس ہے انتقال فرمایا۔ آپ نے لب سڑک اپنی تدفین کی وصیت کی تھی تاکہ گزرنے والے دعائے خیر کرتے رہیں۔

زہریؒ نرغۂ مخالفین میں

ابھی ہم نے زہری کا تعارف پیش کیا، آپ کی علم جو طبیعت کی داستان آپ کے سامنے رکھی، آپ کے اخلاق، عادات وفضائل ایک ایک کر کے بیان کیا، آپ کا مرتبۂ علمی تابعین کبار اور علماء کی نگاہ میں آپ کا مقام ہم نے آپ کے سامنے رکھا، آپ کی ان خدمات کی پوری تاریخ آپ کے سامنے بیان کی جو آپ نے سنت نبوی اور محدثین کے احیاء کے لیے کیا۔ آپ تاریخ میں یادگار انداز کے بانی ہیں۔ آپ کی علمی شہرت اتنی بڑھی کہ آپ کو درجۂ امامت محدثین نصیب ہوا۔ اس طرح یہ بجا ہے کہ آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ اور امام محدثین تھے۔

مگر دشمنان اسلام کو کیا کہیے جنھوں نے آپ کے روشن چہرہ کو سیاہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ بعض شیعہ علماء نے اپنی عادت کے مطابق زہری کو حلقہ بگوشان خاندان اموی میں شمار کیا اور یہ کہ وہ ان کو خوش کرنے کے لیے اور ان کی بازار کا نرخ بڑھانے کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے تاکہ ان کی ملوکیت کو کوئی آنچ نہ پہنچ سکے اور وہ اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرنے میں حق بجانب تسلیم کیے جائیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امویوں نے بعض صحابہ و تابعین سے اپنی حکومت کو دینی وشرعی حکومت کا لباس پہنانے میں تعاون لیا اور ان سے اپنی سلطنت کے برگ وبار بڑھانے میں مدد لی۔ بعض مستشرقین جو اس قسم کے مواقع کے منتظر رہتے ہیں وہ بھی ان اعدائے اسلام کے ہم زبان ہو گئے اور انھی کو بنیاد بنا کر بڑی بڑی بحثوں کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ آپ کی روایات کے بڑے حصہ کو مشکوک قرار دیا، اور بہت سی احادیث صحاح کو بناوٹی اور گھڑی ہوئی ثابت کرنے کی کوشش کی اور بعض رواۃ کو ان اتہامات سے نوازا جن کا آج تک کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ ان مستشرقین کا پیشرو (گیسیہر) جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ وہی باتیں اسلام کی بیخ کنی کے سلسلے میں پیش کرتا ہے جس سے صحابہ وتابعین رواۃ اور دین اسلام سے اعتماد اٹھ جائے۔ اس سے پہلے حضرت ابو ہریرہؓ کے سلسلے میں بھی اس کے افکار وخیالات سے تفصیلی بحث ہم کر چکے ہیں۔ اب صحابی

کے بعد تابعی کا ہی درجہ رہ جاتا ہے، ان میں بھی مشہور زمانہ تابعی زہری، ان کو بھی مشکوک قرار دے کر مرویات صحابہ و تابعین کی صحت کو مجروح کردو۔ اس لیے کہ انہی دو کے ذریعہ حضورؐ کی احادیث کا بہت بڑا حصہ امتِ محمدیہ تک پہنچا ہے۔ جب مسلمانوں میں ان عظیم راویان حدیث کی حیثیت مشکوک ہو جائے گی، پھر تمام مرویات کو مشکوک بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ اس طرح اعدائے اسلام کا وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث کو کچا کھاتا ثابت کردیں۔ پھر شریعت کے احکام کی مطابقت کی کیا صورت ہوگی، اس لیے کہ احادیث ہی قرآن کے احکام کی واضح تشریح ہیں۔ جب ان میں عیب پیدا کردیا جائے گا پھر شریعت اسلامی کی عملی تطبیق کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس طرح اس الحاد کا چلن بازار جسے دشمنان اسلام چاہتے ہیں آسان ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو دینی و دنیاوی حیثیت سے بے حیثیت کرنا آسان ہو جائے گا۔ جس طرح ہم نے اس سے پہلے ابوہریرہ کے خلاف افتراءات کا جواب دے دیا، اب زہری کے مخالفین کا جواب دیں گے، اس لیے کہ ہمارا مقصد سنت طاہرہ کی خدمت ہے اور کچھ نہیں۔

مشہور شیعہ مورخ یعقوبی (۲۹۲ھ) نے لکھا ہے کہ عبدالملک نے اہل شام کو حج سے روک دیا تھا، اس لیے کہ جب حج کو جاتے تو ابن زبیر ان سے حج کے موقع پر اپنی خلافت کی بیعت لیتے تھے۔ اب اس حج کی پابندی پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا۔ اس وقت عبدالملک نے زہری کی ایک حدیث بیان کردی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ سفر صرف تین مسجدوں کے ارادے سے کیا جاسکتا ہے، مسجد حرام، مسجد رسول، مسجد بیت المقدس جو مسجد حرام کا قائم مقام ہے۔ اور یہ صخرہ جانتے ہو حضورؐ نے معراج کے موقع پر آسمان کی جانب صعود کرتے ہوئے اس پر قدم رکھا تھا، اس لیے صخرہ کعبہ کے قائم مقام ہے۔ صخرہ پر قبہ کی تعمیر ہوئی اور اس پر ریشمی پردے لگائے گئے، اس کے لیے ایک پتھر مقرر کیا کہ وہاں سے لوگ اس کا طواف کعبہ کے طواف کی طرح کریں۔ یہ ساری باتیں بنو امیہ کے دور میں ہوئیں۔

ڈاکٹر سباعی نے اس کو رد کر کے امت اسلامیہ پر احسان فرمایا۔ انھوں نے اس روایت

کے تار و پود بکھیر دیئے، اور ثابت کردیا کہ یہ محض افتراء ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب السنة و مکانتها فی التشریع الاسلامی ملاحظہ فرمائیں، حقیقت آشکارا ہو جائے گی انھوں نے گولڈ تسیہر کا مقولہ عبدالقادر کی کتاب سے نقل کیا کہ:

"ان عبدالملك بن مروان منع الناس من الحج أيام فتنة ابن الزبير و بنى قبة الصخرة فى المسجد الأقصى، ليحج الناس إليها ويطوفون حولها بدلا من الكعبة، ثم أراد أن يحمل الناس على الحج إليها بعقيدة دينية فوجدالزهرى وهو ذائع الصيت فى الأمة الاسلامية مستعدأ لأن يضع له أحاديث فى ذلك فوضع أحاديث منها حديث لا تشد الرحال الا إلى ثلاثة مساجد مسجد هذا والمسجد الحرام و المسجدالأقصى"

"عبدالملک بن مروان نے فتنۂ ابن زبیر کے زمانے میں لوگوں کو حج سے روک دیا اور مسجد اقصیٰ صخرہ پر قبہ تعمیر کیا کہ لوگ اسی کا حج کیا کریں اور اسی کا طواف کعبہ کے بجائے کرتے رہیں۔ پھر لوگوں کو اس پر ابھارنے کا ارادہ کیا کہ عقیدۂ دینی سمجھ کر یہ کام کریں۔ اس زمانے میں زہری جن کی شہرت امت اسلامیہ میں غیر معمولی تھی ہاتھ آ گئے اور وضع احادیث کے لیے تیار ہو گئے، چنانچہ انھوں نے احادیث گھڑ دیں، ان میں سے ہی یہ حدیث ہے کہ سفر تین مسجدوں کے لیے جائز ہے، میری مسجد، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ"۔

اور یہ حدیث

"الصلاة فى المسجد الأقصى تعدل ألف صلاة فيما سواه،

(السنة ومكانتهافى التشريع الاسلامى ص ٣٦٩)

"نماز مسجد اقصیٰ میں ہزار نمازوں کا ثواب دیتی ہے اور مسجدوں کے مقابل میں"

زہریؒ کو اس حدیث کا واضع بتلایا گیا اس لیے کہ وہ عبدالملک کے دوستوں میں تھے اور بڑی دوستی اس وقت تھی، اور بیت المقدس کی تعریف میں جو روایات مروی ہیں، سب زہری کی سند سے ہیں۔

یعقوبی نے اسے اپنی تاریخ میں لکھا ہے لیکن کسی مصدق تاریخ اسلامی میں کہیں بھی نہ مل سکا۔ مورخین میں نہ طبری، نہ ابن سعد، نہ ابن اثیر، نہ ابن کثیر، نہ ذہبی، کسی نے بھی ایک حرف اس سلسلے میں نہیں لکھا جس سے یعقوبی کی بات کسی حیثیت سے صحیح سمجھ میں آتی۔ حالانکہ اگر یعقوبی کی بات کسی حیثیت سے بھی صحیح ہوتی تو تاریخ کا کوئی ورق تو اس کی موافقت کرتا۔ یعقوبی نے اپنی بات کہاں سے لی اس کے بارے میں بھی کوئی رہنمائی نہیں کی۔ غالباً یعقوبی کی اس ہفوات کے نتیجے میں شیعوں کو موقع ملا کہ وہ وضع حدیث کے فرضی واقعہ کو حقیقت بنا کر پیش کریں۔ حالانکہ وضع حدیث کے فتنہ پر ہم سابق میں اتنی طویل بحث کر چکے ہیں کہ مزید دہرانے کی ضرورت نہیں پھر بھی ہم اس گھڑنت کو تاریخی حیثیت سے آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں۔

(۱) عبدالملک کا اہل شام کو حج سے روکنا۔

(۲) عبدالملک کا قبۃ الصخرہ کا مسجد اقصیٰ میں تعمیر کرانا کہ لوگ کعبہ کی جگہ اس کی زیارت و حج کریں۔

(۳) لوگوں کا اعتراض اور اس کے بعد زہری کا جھوٹی حدیث بتانا۔

(۴) اس بات کی دلیل کہ زہری ان احادیث کے واضع ہیں اور وہ عبدالملک کے دوست تھے اور اس کے پاس آتے جاتے تھے، اور جو احادیث کہ بیت المقدس کی فضیلت میں وارد ہیں ان کا مدار زہری ہی ہیں۔

۱۔ عبدالملک کا اہل شام کو حج سے روکنا ایک بیہودہ بات ہے، اس لیے کہ حج شعائر اللہ میں سے ہے اور ہر ایسے مسلمان پر جو اس کی سکت رکھتا ہو ادا کرنا فرض ہے۔ اس مسلّم فرض کو عبدالملک کس طرح معطل کر سکتا اور اس کے اقامت کی صریح مخالفت کرتا، حالانکہ وہ خود عبادت گزار اور صالح شعار تھا۔ بعض روایت کے مطابق وہ فقہائے مدینہ میں تھا۔ چنانچہ ابوالزناد نے کہا کہ فقہائے مدینہ چار تھے، سعید بن المسیب، عروہ بن الزبیر، قبیصہ بن ذؤیب اور عبدالملک بن مروان۔ نافع کا بیان ہے کہ عبدالملک بن مروان کو میں نے مستعد

جوانوں میں پایا، وہ ہر وقت طلب علم میں لگے رہتے۔ یہ بات بھی عقل قبول نہیں کرتی کہ اہل شام کو عبدالملک حج سے روکے اور ائمہ تابعین شام میں موجود ہوں وہ اس کی اس خلاف شرع بات پر خاموش رہیں، نہ تو اس کا انکار کریں، نہ اس سے خود کو علیحدہ کرلیں۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ حج سے روکنے والی روایت صرف شیعوں کی اکاذیب میں سے ہے۔ طبری نے تو اس سال کے حج کی تفصیلی رپورٹ لکھی ہے کہ ۶۸ھ میں عرفات میں چار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ چنانچہ اس کی پوری سندیوں ہے کہ محمد بن عمر نے بیان کیا کہ شرحبیل بن أبی عون عن ابیہ نے بیان کیا کہ ۶۸ھ میں عرفات میں وقوف کرنے والے چار جھنڈوں کے تلے جمع تھے۔ ابن الحنفیہ اپنے لوگوں کے ساتھ ایک جھنڈے کے نیچے نجدہ الحروری کے پیچھے اور بنو امیہ کا جھنڈا ان کے بائیں جانب تھا۔

۲۔ کسی اسلامی تاریخ کے مصدر سے یہ پتہ نہیں لگتا کہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ کی تعمیر کی بلکہ ان کے بیٹے ولید کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سباعی نے لکھا ہے کہ کسی نے قبہ کی تعمیر کی نسبت عبدالملک کی طرف نہیں کی، ایک روایت بھی اس کے حق میں نہیں ملتی۔ رہ گئی یہ بات کہ قبۃ الصخرۃ کی تعمیر، تو یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں، اس لیے کہ بقول گولڈ ٹیسیہر اس کی تعمیر کعبہ کے مقابلہ میں عمل میں آئی۔ یہ دنیائے اسلام کا عظیم ترین حادثہ تھا۔ کیا اس حادثۂ عظیم پر تاریخ خاموش رہتی یا مسلمان اسے خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے؟ بلکہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو تاریخ کے دفتر اس سے سیاہ ہوتے، جب کہ مورخین نے معمولی واقعات کو پوری اہمیت اور صحت کے ساتھ بیان کیا، مثلاً علماء کی وفات کی تاریخیں قاضیوں کے تقرر کا واقعہ، یہ معمولی مسائل بھی تاریخ میں پوری وضاحت سے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں عبدالملک کی اس تعمیر سے تاریخ خاموش رہتی؟ نہایت درجہ تعجب کی بات ہے کہ صرف کتاب الحیوان میں دمیری نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ ابن خلکان سے اس نے روایت لے کر ذکر کیا ہے، عبدالملک وہی ہے جس نے قبہ کی تعمیر کی۔ اس کی پوری عبارت یوں ہے: بناها عبدالملك و كان الناس يقفون عندها يوم عرفة (عبدالملک نے اس کی تعمیر

کی، لوگ عرفہ کے دن یہاں وقوف کرتے) اس عبارت سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے عبدالملک نے تعمیر کیا تھا، حالانکہ تمام مورخین اس کے منکر ہیں۔ دوسرے اس کا منشا یہ کہ لوگ یہاں حج کی طرح سے وقوف کریں، یہ کسی عبارت سے واضح نہیں ہوتا، بلکہ یہ کہ حج کے دن لوگ یہاں بھی وقوف کرتے اس میں کسی تحریف کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں وقوف کا ذکر ہے۔ اس قسم کی بدعت ممالک اسلامیہ میں شائع وذائع تھی۔

مسئلہ کراہت فقہاء کے فتاویٰ میں منصوص ہے۔ رکعبہ کو چھوڑ کر اس کا حج کرنا اور عرفہ کے دن یہاں وقوف کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، بلکہ یہ وقوف ممالک اسلامیہ میں عرفہ کے دن عام تھا، لوگ شہر سے باہر نکل کر ان حجاج کعبہ کی نقل کرتے۔

پھر حج کی غرض سے اس کی تعمیر عبدالملک جیسے متورع فقیہ عالم سے ممکن نہیں، اس کا ذکر ہم سابق میں کر چکے۔

گولڈ ٹیسیہر کے دعویٰ کارد اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑا گروہ اموی حکمرانوں میں الزام کی فہرست رکھتا ہے مگر کسی نے اس فہرست میں اس مفروضہ حج کا ذکر نہیں کیا ہے۔ گویا مسلمان عیسائیوں سے کم تر غیرت رکھتے تھے۔ کہ اسے عبث شعائر الاسلام پر تاسف ہوا اور اس دور کے گرامی تابعین اور مسلمانوں کی غیرت نہ جانے کہاں سوگئی تھی، گولڈ ٹیسیہر کا امویوں پر کھلا اتہام ہے۔ اسی طرح عبدالملک بن مروان و امام زہری پر کھلا بہتان ہے کہ اس نے قبہ کی تعمیر کی۔ لوگ زیادہ سے زیادہ بنو امیہ سے ناراض تھے، ان کے بارے میں اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کی شہادت مستشرق بولیوس فلہوزان کی زبانی سنیے، کہ خلفائے بنوامیہ شام کی اہمیت بڑھانے کے لیے سیاسی اہمیت کے پہلو بہ پہلو اپنی اہمیت بھی بڑھانے کے حق میں تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مرکز شعائر دین شام میں منتقل ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن زبیر بیت الحرام مکہ میں اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے دس سال سے کوشاں تھے۔ ظاہر ہے کہ اہل شام حج کی سبیل نہ نکال پاتے، جب تک کہ

وہ اپنے ولاۃ خاندان اموی کے زیر اثر رہتے مگر بڑی مشکلوں سے وہ حج کر پاتے۔ عبدالملک نے ایک اور کھیل کھیلا کہ اس کی رعایا حج کو مکہ نہ جائے، بلکہ اس نے لوگوں کو بیت المقدس کے حج پر ابھارا بجائے مکہ میں کعبۃ اللہ کے حج کے۔ اونھوں نے یہ باتیں اپنی کتاب تاریخ میں لکھی ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ عبدالملک نے بیت المقدس کو ایک بلند مقام دینے کے لیے بڑی سعی کی کہ اہل اسلام بھی اس کے اس نظریے کے قائل ہو جائیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے قبۃ الصخرہ تعمیر کیا جو اس کے قدیم حصہ میں پائے جانے والے نقش سے واضح ہے، مگر موجودہ نقش میں خلیفہ مامون رشید کا نام موجود ہے۔ لیکن دی فوجی کی تحقیقات کے مطابق نقش اول میں ہی مامون کا نام باحسن وجوہ داخل کر دیا گیا مگر سنہ تعمیر کی تصحیح کرنے سے یہ تخمین رہ گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا نقش اصلی ختم ہو گیا ہو جس پر لکھا تھا کہ اس قبہ کی تعمیر ۷۲ھ میں عبداللہ عبدالملک امیر المومنین نے کی۔ (تاریخ الدولۃ العربیۃ إلی نھایۃ الدولۃ الامویہ ص ۲۰۶۔۲۰۷)۔

ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں کہ عبدالملک کے تعمیر قبہ کی بات اور اسے کعبۃ المسلمین بنانے کی بات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بالفرض قبہ کی تعمیر عبدالملک نے کی ہو لیکن اسلامی تاریخ اس کی شہادت سے خالی ہے اور یہ صرف ظن وتخمین کی بات ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی ہو اس لیے کہ مسلمانوں کے نزدیک اس کا ایک خاص مقام ہے اور عبدالملک کے قلمرو میں پائے جانے والے مقامات میں یہ سب سے زیادہ مقدس تھا۔ اس کا اس سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ محض احترام مسجد کے پیش نظر اس نے سب کچھ کیا، اس لیے کہ عروہ بن الزبیر کو ۷۳ھ میں قتل کر چکا تو اس نے حضورؐ کے زمانے میں موجود کعبہ کے انداز میں بناء کعبہ کرنے کا حکم دیا، اور ۶۴ھ میں جو ترمیم ابن الزبیر نے کی تھی اس کو ختم کر کے کعبہ کو اپنی اصلی صورت میں لانے کی سعی کی۔

۳۔ لوگوں کو مسجد اقصیٰ کے حج پر زہری کی وضع احادیث کی مدد سے ابھارنا بالکل جھوٹ کا

پوٹ ہے۔ اس کو ہم دو انداز سے غلط ثابت کریں گے، ایک اموی کے ساتھ زہری کے تعلقات دوسرے اس کے تاریخی طور پر محال ہونے سے۔

امویوں کے ساتھ زہری کے تعلق کا جہاں تک تعلق ہے صحیح ہے۔ وہ حجاز و شام آتے جاتے رہے اور خلفائے بنوامیہ کے پاس ان کی آمد و رفت بلا روک ٹوک تھی۔ مگر زہری ان کے دست نگر تھے یا دین کو دنیا کے بدلے بیچ دیتے ایسے بھی نہ تھے۔ زہری اعداءالاسلام کے تصور سے کہیں بالاتر تھے۔ زہری یعقوبی و گولڈ تسیہر کے آنکھ میں کھٹکتے ہوں گے اس لیے کہ وہ ایک بامروت باصلاح لوگوں میں تھے، خلفاء کے سامنے حق بات کہہ دیتے، خواہ وہ کتنی ہی کڑوی لگتی، ان کو صحیح راستہ دکھاتے رہتے، نہ کبھی مدافعت کرتے، نہ انھیں اپنی جانب مائل کرنے کی سعی کرتے۔ اس کا ثبوت ابن عساکر کا وہ قول ہے جو امام شافعی کی سند سے ہم تک پہنچا ہے۔

"دخل سليمان بن يسار على هشام فقال: يا سليمان، من الذى تولى كبره منهم؟ قال له: عبدالله بن أبى بن سلول، فقال له: كذبت، هو على بن أبى طالب قال: أميرالمومنين أعلم بما يقول فدخل ابن شهاب فقال له من الذى تولى كبره منهم فقال له: عبدالله بن أبى بن سلول فقال له: كذبت هو على بن أبى طالب فقال له أنا أكذب، لا ابالك؟ فوالله لونادانى مناد من السماء أن الله أحل الكذب. ماكذبت حدثنى عروة بن الوليد وسعيد بن المسيب و عبيدالله بن عبدالله و علقمه بن وقاص كلهم عن عائشه أن الذى تولى كبره منهم عبدالله بن أبى فلم يزل القوم يغرون به فقال له هشام ارحل فوالله ما كان ينبغى لنا أن نحمل عن مثلك فقال ابن شهاب، ولم ذاك؟ أنا اغتصبتك على نفسى أوأنت اغتصبتنى على نفسى؟ فخل عنى فقال له لا، ولكنك استدنت ألفى ألف فقال قدعلمت وأبوك قبلك أنى ما

استدنت هذا المال عليك ولا على أبيك فقال أنا نهيج الشيخ، فيهتم الشيخ ثم أمر فقضى عنه من دينه ألف ألف و أخبر بذالك فقال الحمد لله الذى هذا هو من عنده" (تاریخ دمشق ج۲۱ص۵۹۴)۔

"سلیمان بن یسار ہشام کے پاس گئے اس نے کہا، اے سلیمان! کون ہے وہ جس نے اپنا ولی کبر کو بنایا؟ سلیمان نے جواب دیا کہ وہ شخص عبداللہ بن ابی بن سلول ہے، ہشام نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا، بلکہ وہ تو علی بن ابی طالب ہے۔ سلیمان نے جواب دیا کہ امیر المومنین کو زیادہ علم ہوگا۔ پھر جب ابن شہاب اس کے پاس آئے تو ان سے ہشام نے پوچھا کہ کس نے کبر کو اپنا ولی بنایا؟ ابن شہاب نے جواب دیا کہ وہ عبداللہ ابن ابی ابن سلول ہے۔ ہشام نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا بلکہ وہ علی بن ابی طالب ہے۔ ابن شہاب نے سوالیہ انداز میں کہا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ تم ہلاک ہو، قسم خدائے پاک کی کہ اگر کوئی منادی آسمان سے ندا لگائے کہ اللہ نے جھوٹ کو حلال کر دیا ہے تب بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا، کیونکہ حضرت عائشہؓ کی روایت کئی لوگوں نے مجھ سے بیان کی ان میں عروہ بن ولید، سعید بن المسیب، عبیداللہ بن عبداللہ، علقمہ بن وقاص ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ جس نے کبر کو اپنا ولی بنایا ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس واقعہ کے بعد قوم ابن شہاب پر برابر فخر کرنے لگی۔ پھر ہشام نے ان سے کہا کہ اب یہاں سے کوچ کر جائیے کیونکہ ہم آپ جیسے لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ابن شہاب زہری نے پوچھا کیوں؟ کیا میں نے آپ کے اوپر کوئی زیادتی کی ہے، یا آپ نے مجھ پر زیادتی کی ہے جس کی وجہ سے مجھ سے دوری اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ ہشام نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ تم نے بیس (۲۰) لاکھ قرض لیے ہیں۔ ابن شہاب نے جواب دیا کہ تم اور تمھارے باپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے یہ مال تمھاری یا تمھارے باپ کی ذمہ داری پر نہیں لیا۔ ہشام نے کہا کہ ہم نے شیخ کو برانگیختہ کر دیا، چنانچہ شیخ کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد ہشام نے حکم کیا کہ ان کے قرض سے دس لاکھ ادا کر دیئے جائیں، اس کے بعد ابن شہاب کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ ادائگی من جانب اللہ ہے"

یہ ہیں زہریؒ اوران کے تعلقات امویوں کے ساتھ اس انداز کے تھے۔ پھر کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ شخص جھوٹ بولے گا، وہ بھی رسول اکرمؐ پر جب کہ اس نے خلیفۂ وقت کو کھری کھری سنادی۔ ہشام جو پورے ممالک اسلامیہ کے دروبست کا مالک ہے امیرالمومنین ہے، مگر لاأبالك فوالله لو ناداني مناد من السماء أن الله أحل الكذب ما كذبت کا سنگین جملہ بھرے دربار میں سنانے والا کون ہے؟ زہری ہے۔ اس میں صرف مخاطبت ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی گالی اورزجروتوبیخ کا انداز ہے۔ لاأبالك کے جملہ کو دیکھیے، ہے کوئی جو اس بے پایاں جرأت کا اظہار برملا کر سکے بجز زہری کے؟ اب اس روایت کے ہوتے ہوئے ان مدعیان خداورسولؐ اوراعدائے اسلام کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اوران کے بے جا بیہودہ دعویٰ کا کیا مقام رہ جاتا ہے؟

امام اوزاعی فقیہ شام کہتے ہیں کہ ابن شہاب نے کبھی کسی بادشاہ برسراقتدار کی مداہنت نہیں کی۔ ایوب سختیانی کہتے ہیں کہ اگر میں کسی کا کاتب حدیث ہوتا تو زہری کا کاتب ہونا مجھے زیادہ محبوب تھا کہ انھوں نے اس ملک میں علم کو زندہ کیا بہ نسبت کسی ایسے شخص کے کاتب ہونے سے کہ وہ کسی بادشاہ کا مصاحب رہا۔

یزید بن یحییٰ کا یہ مقولہ کہ ان کی بات اگر وہ سلاطین کی صحبت میں رہ کر بگڑ نہ گئے ہوتے تو جو بھی کہتے کم ہی تھا، یہ ایک ضعیف خبر، قابل اعتماد نہیں۔ اس لیے کہ اس کی اسناد میں مجہولین کا سایہ ہے۔ اس کی سند میں عباس بن ولید بن صبیح الخلال الدمشقی ہے جس کے بارے میں آجری نے لکھا ہے کہ میں نے ابوداؤد سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ لوگوں سے واقف اخبار پر قابو یاب تھا مگر اس کی بات میں نہیں لیتا۔ حاتم نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اس لیے زہری کا تعلق امویوں کے ساتھ ایک اصولی تعلق تھا، ایک سچا عالم جو سچ کہنے سے نہیں ڈرتا، بلکہ خوف خدا اس کا شعار ہے۔

اس سے زہری کی شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے اور یزید بن عبدالملک نے انھیں قضا پر مقرر کیا تھا، اس لیے کہ کسی کے بچوں کو تعلیم دینا کوئی عیب نہیں۔ ان کو مہذب بنانا، راہ صواب سکھانا زہری جیسے نڈر عالم کو کیا ضرر پہنچا

سکتا ہے؟ بلکہ ان کو اسلامی تعلیم سے مزین کر کے انھوں نے بہت بڑی خدمت اسلام انجام دی۔ کیا زہری نے انھیں مناہی ومناکیر، شہوات ولغویات سے روکا نہیں، اس لیے کہ آئندہ کے سلاطین وحکمراں یہی تھے۔ اگر وہ بے راہ رہے تو اور بھی مشکلات کا سامنا مسلمانوں کو کرنا پڑتا۔ زہری نے قضا لے کر کوئی گھناؤنا کام نہیں کیا، اس لیے کہ اس شخص کی پامردی، استقلال، درست روی، پاکیزگی پارسائی ہمارے سامنے ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ زہری کے امویوں کے ساتھ جو تعلقات تھے کیا وہ تابناک تھے؟ ان کی بخشش، جودوکرم سے ان کی کسی دیانت میں آنچ آئی؟

اس لیے ان حقائق کے ہوتے ہوئے وضع حدیث کا بہتان محض افترا ہے، اور کچھ نہیں۔ پھر اس سے پہلے ہم یہ کہہ آئے ہیں کہ وضع حدیث کو امویوں نے کبھی ہوا نہیں دی، اس لیے گولڈ ٹیسیہر ویعقوبی کا یہ دعویٰ کہ زہری اس کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ وہ امویوں کے لیے حدیثیں گھڑیں، تاریخی حیثیت سے بھی یہ بے حقیقت بات ہے۔ اس لیے کہ زہری کی ولادت ۵۰ھ میں ہوئی اور زبیر وعبدالملک بن مروان کے درمیان ۶۵ھ سے ۷۳ھ تک فتنہ عداوت رہا۔ اسی زمانے میں عبدالملک نے قبۂ صخرہ تعمیر کرایا، یہ ۷۲ھ کی بات ہے۔ مستشرقین ہی کے قول کے مطابق گویا زہری کی عمر محض ۲۲ سال تھی، اس وقت وہ طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے، ان کی تشہیر بھی اس درجہ میں نہ تھی، بلکہ اس سے زیادہ شہرت سعید بن مسیب، قبیصہ بن ذویب اور قاسم بن محمد وغیرہ کی تھی۔ عبدالملک نے ان کو خریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ادھر زہری عبدالملک کے پاس ۸۰ھ کے بعد آئے۔ چنانچہ لیث بن سعد کا کہنا ہے کہ ابن شہاب عبدالملک کے پاس ۸۲ھ میں آئے۔ خود زہری کا اپنا قول ہے کہ میں ابن الاشعث کی تحریکات کے زمانے میں آیا تھا۔ گویا ابن زبیر کی شہادت کو ۹ سال گزارنے کے بعد زہری کو وضع حدیث کی ضرورت پیش آئی۔ ایسے تاریخی دروغ کی دنیا میں کوئی تصدیق کر سکتا ہے؟ اس لیے وضع حدیث کا اتہام افتراء محض اور سفید جھوٹ ہے۔ اس وقت کبار تابعین علمائے محدثین کا ایک بڑا گروہ موجود تھا جو اس وضع حدیث پر خاموش نہیں رہ سکتا، اس لیے اس حدیث کی وضع یعقوبی

کے گھر اور اس کے شہر میں ہوئی ہوگی۔ اگر اس دروغ کا کوئی حصہ سچ ہوتا، ناقدین حدیث اور مورخین موجود تھے، زہری کی حدیث کو بیان کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔

چوتھا دروغ وہ ہے جو یعقوبی نے بیان کیا کہ چونکہ زہری عبدالملک کے دوستوں میں تھا اس لیے بیت المقدس والی حدیث گھڑی اور بیت المقدس کی تقدیس کی ساری روایات کا مدار زہری پر ہے۔ یہ بھی غلط گوئی و دروغ بیانی کی آخری مثال ہے، تاریخ و آثار اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ آثار تاریخ سے اس کی تکذیب ہوتی ہے، اس لیے کہ زہری جب دمشق آئے تو قبیصہ بن ذؤیب نے عبدالملک سے ملاقات کرائی، تاکہ عبدالملک کی "قضاء عمر في أمهات الأولاد" کے سلسلے میں حدیث بیان کریں۔ عبدالملک نے اس وقت زہری کا نسب دریافت کیا، اور یہ بھی کہا کہ آپ کے والدین زبیر کے انقلابی کونسل میں تھے پھر ان سے درخواست روایت حدیث کی۔ اگر وہ عبدالملک کے دوست ہوتے تو انھیں عبدالملک تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کی ضرورت نہ پڑتی۔ اسی طرح ان کے نسب اور دوسری باتوں کے دریافت کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ طلب میں مشغول ہونے کی ہدایت کی ضرورت تھی۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے ہم کیسے ان دونوں کے دوستانہ تعلقات کا یقین کرلیں؟ عبدالملک ۲۶ھ میں پیدا ہوا اور زہری اپنی والدہ کے ہمراہ ۶۴ھ میں شام گئے، اس وقت زہری ۱۴ سال کے تھے، ایسی صورت میں کوئی عقلمند یہ سوچ سکتا ہے کہ ایک شخص جس کی عمر ۱۴ سال کی ہو ۳۸ سال کے بڈھے سے اس کے دوستانہ تعلقات ہوں گے؟ اس لیے تاریخ و دیانت دونوں ہی اس دوستی کا انکار کرتے ہیں۔

پھر حدیث لاتشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد زہری کے سوا اور بھی دوسرے طریقوں سے مروی ہے۔ بخاریؒ نے اسے ابوسعید خدریؓ کے واسطے سے روایت کیا ہے اور مسلم نے تین طریقوں سے جس میں صرف ایک روایت زہری کے واسطے سے ہے اور دو کا مدار ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ ہیں۔ اس روایت کی تخریج احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے کی ہے۔

اس لیے زہری کے سر پر الزام لگانا کہ وہی اس روایت کے سب کچھ ہیں، یعقوبی کا

خیال محض فریب ہے۔ اس روایت میں کبار صحابہ و تابعین، تبع تابعین شریک ہیں، اس لیے بلا کسی شبہ و شک کے حدیث صحیح ہے اور یعقوبی و گولڈ ٹیسیہر وغیرہ کے خیالات کسراب بقیعة یحسبه الظمآن ماء ہے۔

ان تمام مباحث سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ سارے افتراءات واتہامات ریت کا تودہ ہیں جسے ہوا ادھر ادھر اڑاتی پھرتی ہے۔ اس فاضل جلیل نے ستر سال تک سنت کی حفاظت میں جان کھپائی اور اس کی تدوین ونشر و تعلیم میں دن رات صرف کیے۔ خدا آپ کی مساعی کو کامیاب و باعث خیر بنائے۔ (آمین)

نافع مولی ابن عمر (—۱۱۷ھ)

آپ ابوعبداللہ العدوی المدنی مولیٰ عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں، تابعین کبار کے سرگروہ۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ مغرب اقصیٰ کے رہنے والے تھے، بعض نے شمالی عراق دیلم کا رہنے والا بتلایا ہے۔ ایران وعرب کے مابین ہونے والی کسی جنگ میں ہاتھ آئے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ان کی قسمت جڑی ہوئی تھی، تقریباً تیس سال آپ کے ساتھ گزارے اور کتاب وسنت کی تعلیم اس دوران میں حاصل کی۔

آپ نے ابن عمرؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، رافع بن خدیجؓ، حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ، عبداللہؓ، عبیداللہؓ، سالم وزید پسران عبداللہ بن عمرؓ، قاسم بن محمدؒ، اسلم مولیٰ عمرؓ اور عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الصدیقؓ سے حدیث کی روایت فرمائی۔

آپ سے تابعین کبار میں ابو اسحٰق سبیعی، حکم بن عیینہ، یحییٰ الانصاری، محمد بن عجلان، زہری، صالح بن کیسان، ایوب، حمید الطویل، میمون بن مہران، موسیٰ بن عقبہ، ابن عون اور اعمش وغیرہ نے روایت کی۔ اور تابعین کے علاوہ ابن جریج، اوزاعی، مالک، لیث، یونس بن عبید، آپ کے صاحبزادے عبداللہ، عمر، ابوبکر اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ نے حدیث اخذ کی۔

آپ کثیر الحدیث تھے، علم حدیث میں قابل اعتماد، ضابط حدیث اور صحیح الروایت بزرگوں میں

تھے۔آپ کی کسی روایت میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔خود عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نافع کو عطا کر کے مجھ پر بڑا کرم فرمایا۔امام مالک فرماتے کہ جب حدیث نافع بہ طریق عبداللہ بن عمر سامنے ہوتی تو پھر مجھے کسی دوسرے کی حدیث کی طرف توجہ کی ضرورت نہ پڑتی۔آپ کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ عمر بن عبدالعزیز نے تعلیم حدیث نبوی کے لیے آپ کو مصر روانہ فرمایا۔

آپ کا وصال مدینہ پاک میں ۱۱۷ھ میں ہوا۔امام بخاری نے فرمایا کہ اصح الاسانید مالک عن نافع عن ابن عمر ہے، محدثین اسے زنجیر طلائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ (.....۔۹۸ھ)

آپ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود الہذلی المدنی تابعی جلیل ہیں، آپ فقہاء سبعہ مدینہ میں سے ایک ہیں۔اپنے عہد میں امام مدینہ تھے، آپ کی امامت و جلالت علم پر علمائے اسلام کا اتفاق ہے۔آپ کے اتقان حدیثی کے بھی قائل ہیں، آپ کی یادداشت مشہور زمانہ تھی۔ابن عباس آپ کی تکریم فرماتے۔آپ ہی کے سلسلے میں زہری کا مقولہ ہے کہ "میں نے جس کسی عالم کی خدمت میں حاضری دی اور اس سے علم حاصل کرنا چاہا تو مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نے جو بیان کیا وہ مجھے پہلے سے ہی معلوم ہے، مگر صرف عبیداللہ بن عبداللہ کے پاس جب بھی حاضری ہوتی تازہ علم، نئی معلومات سامنے آتی"۔آپ کے وفور علم اور جلالت علم کی بنا پر عبدالعزیز بن مروان نے اپنے صاحبزادہ عمر بن عبدالعزیز کا اتالیق مقرر کیا۔

ابن سعد کا کہنا ہے کہ آپ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے، ساتھ ہی ادب و شعر کا چسکا بھی آپ میں تھا۔اغانی میں آپ کے اشعار ابوالفرج نے لکھے ہیں۔

آپ نے بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا جن میں عبداللہ بن عباسؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوواقد اللیثیؓ، زید بن خالدؓ، عائشہؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، ام قیس بنت محصنؓ وغیرہ جلیل القدر صحابہ کی فہرست ہمارے سامنے ہے۔

آپ سے تابعین نے بھی روایت کی، ان میں زہری، صالح بن کیسان ابوالزناد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔آپ کی بصارت آخر عمر میں جاتی رہی تھی۔آپ کا وصال مدینہ میں ۹۸ھ میں ہوا۔

سالم بن عبداللہ بن عمر (.....۔۱۰۶ھ)

آپ جلیل القدر تابعی ابوعبداللہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب القرشی العدوی ہیں۔ آپ بڑے عالم، قابل قدر امام۔قابل ذکر زاہد تھے۔آپ کے جسم پر صرف دو درہم کا کپڑا ہوتا تھا۔آپ کے والد عبداللہ آپ کو بوسہ دے کر فرماتے ایک شیخ دوسرے شیخ کو بوسہ دے رہا ہے۔آپ نے مدینہ پاک میں علم حاصل کیا، صحابہ سے آپ کا سماع حدیث مشہور ہے۔ آپ نے ابوایوب انصاری، ابوہریرہ اور عائشہ ام المومنین سے حدیث کا درس لیا۔

آپ کے تلامذہ میں تابعین میں سے عمرو بن دینار، نافع مولی بن عمر، زہری، موسیٰ بن عقبہ، حمید الطویل اور صالح بن کیسان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت نے آپ سے روایت کی۔آپ کی جلالت علم اور فقہ حدیث کی وجہ سے آپ کو فقہاء سبعہ مدینہ میں شمار کیا جاتا ہے۔آپ بڑے پایہ کے لوگوں میں تھے۔سلیمان بن عبدالملک نے آپ کا اعزاز کیا اور اپنے تخت پر بیٹھایا۔محمد بن سعد کا کہنا ہے کہ سالم کثیر الحدیث، عالی پارسا تھے۔الحق بن راہویہ نے اصح الاسانید زہری عن سالم عن ابیہ لکھی ہے۔آپ کا وصال مدینہ میں ۱۰۶ھ میں ہوا۔ابراہیم بن یزید النخعی

ابراہیم بن یزید بن النخعی (۴۶۔۔۔۹۶ھ)

آپ ابوعمران ابراہیم بن یزید بن قیس بن الاسود النخعی الکوفی اعلام تابعین میں سے ہیں۔حافظ حدیث ہوتے ہوئے کثیر الحدیث بھی تھے۔آپ فقیہہ، صالح بے تکلف بزرگوں میں تھے، آپ کو شہرت سے نفرت تھی۔حضرت عائشہ کی خدمت میں حج کے موقع پر حاضر ہوئے تھے، آپ اس وقت نابالغ تھے۔اپنے ماموں علقمہ اور چچا اسود کے ہمراہ حج کرنے گئے۔آپ نے علقمہ اور اپنے دونوں ماموں اسود و عبدالرحمان اولاد یزید سے حدیث سنی۔اسی طرح مسروق، ابومعمر، ہمام بن الحارث شریح القاضی وغیرہ سے حدیثیں سنی۔آپ کا سماع حضرت عائشہ سے ثابت نہیں۔آپ سے تابعین کی ایک بڑی جماعت نے حدیث سنی، ان میں اعمش، منصور بن المعتمر، عبداللہ بن عون، حماد بن ابی

سلیمان، مغیرہ بن مقسم الضبی، حبیب بن ابی ثابت اور سماک بن حرب وغیرہ ہیں۔

ابرہیم کے زمانے میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت موجود تھی، مگر کسی صحابی سے حدیث روایت کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ آپ کی علمی حیثیت بہت زیادہ بلند تھی۔ آپ کے زمانے کے کبار علماء نے آپ کے علم کی شہادت دی۔ شعبی نے ابراہیم کی موت کے موقعہ پر فرمایا۔ اپنے بعد انھوں نے اپنے سے بڑا عالم اور اپنے سے زیادہ فقیہہ کسی کو نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کہ ابن سیرین وحسن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا کہ حسن وابن سیرین آپ کے سامنے گرد تھے۔ نہ کوفہ میں نہ بصرہ میں، نہ حجاز میں، نہ شام میں، غرض کہیں بھی ان سے بڑا عالم نہیں رہا۔ حدیث میں آپ کو امتیاز حاصل تھا۔ اعمش نے کہا کہ آپ حدیث کی کسوٹی تھے۔ ابوزرعہ نے کہا نخعی اسلام کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

آپ صحابہ کے مقتدی تھے۔ صحابہ کی عظمت میں فرماتے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر صرف ناخن پر ہاتھ پھیر دیتے تو اس مسح کی عظمت وفضیلت کی وجہ سے میں اسے دھلتا نہیں۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہ کس قوم کی بدنصیبی ہوگی کہ وہ صحابہ کے فقہ دین کے بارے میں تو سوال کرے پھر ان کی مخالفت کرے۔

حجاج کے خوف سے کوفہ میں روپوش تھے، اسی حالت میں ۹۶ھ میں آپ کی موت ہوئی۔ آپ نے عمر کی ۴۹ بہاریں دیکھی تھیں،

عامر بن شراحیل شعبی (۱۹ھ — ۱۰۳ھ)

آپ جلیل القدر تابعی عامر بن شراحیل حمیری شعبی کوفی ابوعمرو ہیں۔ آپ امام امت، نشانِ علم نبوت تھے۔ تابعین میں علامہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپ عہد فاروقی میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے چھ سال گزرنے کے بعد پیدا ہوئے۔ آپ اہل سنت و الجماعت میں تھے، فرقہ پرستوں سے دور۔ بہت سے ممالک کا سفر کیا۔ حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، زید بن ثابت، قیس بن سعید بن عبادہ، قرظ بن کعب، عبادہ بن

الصامت، ابوموسیٰ اشعری، ابومسعود انصاری، ابوہریرہ، مغیرہ بن شعبہ، ابوسعید خدری، ام المومنین عائشہ، وام سلمہ جیسے جلیل القدر صحابہ سے روایت حدیث کی۔ آپ نے صحابہ کی پانچ سو جماعت سے ملاقات کی۔

آپ سے ابواسحٰق سبیعی، سعد بن عمرو، اسماعیل بن ابی خالد، سعید بن مسروق الثوری، اعمش، منصور، سماک بن حرب، عبداللہ بن عون اور شعبہ بن الحجاج نے حدیثیں روایت کیں۔ امام ابوحنیفہ کے شیوخ حدیث میں سب سے عالی مرتبہ شعبی ہی ہیں۔

حافظہ ایسا قوی تھا کہ کبھی کوئی چیز قید تحریر میں نہیں لائے۔ فخریہ فرماتے میں نے قلم اور کاغذ کا استعمال نہیں کیا۔ آپ اذکیا وفقہائے امت میں تھے۔ آپ علم کے اس مقام پر تھے کہ صحابہ کے ہوتے ہوئے فتویٰ دیتے تھے۔ علماء نے آپ کی امامت اور ثقہ ہونے پر اتفاق فرمایا۔ ابومجلز کہتے ہیں کہ میں نے شعبی سے زیادہ ثقہ کسی کو نہیں پایا۔ ابن عیینہ لوگوں کا مقولہ نقل کرتے کہ ابن عباس اپنے دور میں، شعبی اپنے زمانے میں، ثوری اپنے عہد میں یکتائے زمانہ تھے۔ ابن سیرین، ابوبکر ہذلی سے کہتے کہ شعبی کا دامن پکڑلو کہ میں نے ملاحظہ کیا کہ صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد کے موجود ہونے کے باوجود آپ سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ معاصرین نے آپ کے علم، تواضع، فضل وحسن اخلاق کی ایک طویل داستان چھوڑی۔ عمر بن عبدالعزیز نے آپ کو اپنے زمانے میں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ کوفہ میں ۱۰۳ھ میں وصال ہوا۔

علقمہ بن قیس النخعی (۲۸ ق ھ — ۶۲ھ)

آپ جلیل القدر تابعی ابوشبل علقمہ بن قیس عبداللہ النخعی الکوفی ہیں۔ آپ اسود بن یزید بن قیس کے چچا ہیں۔ آپ اسلام اور جاہلیت کے اعلام علماء میں ہیں۔ آپ نے عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ، سلمان فارسی،

حضرت عائشہ، ابو مسعود، ابودرداء وغیرہ صحابہ سے روایت حدیث کی۔ آپ سے ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین اور آپ کے بھتیجے عبدالرحمان بن یزید نے روایت حدیث کی۔

آپ ابن مسعود کے اصحاب میں تھے، اور علوم ابن مسعود کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ ان کے معاصرین نے آپ کی جلالت علم وقار اور وفور علم کا بھرپور اعتراف کیا۔ ابراہیم بن علقمہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود حضور کے علم، چال ڈھال ہر چیز سے مشابہ تھے، اور علقمہ عبداللہ بن مسعود سے علم چال ڈھال میں مشابہ تھے۔ آپ متواضع اور شہرت گریز تھے۔ آپ فرماتے کہ میں مسجد میں نماز ادا کروں، تم بھی بیٹھو میں بھی بیٹھوں اور تم سوال کرو تو مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگ کہیں کہ یہ علقمہ ہیں۔ آپ فرماتے کہ اگر میں کسی امیر کے یہاں جا کر اسے خیر کا حکم کروں تو ان کی دنیا کو تو کوئی نقصان نہ ہوگا البتہ میرے دین کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ آپ ثقہ تھے، کثیر الحدیث تھے۔ اپنے طلبا کو مذاکرہ علمی پر ابھارتے اور فرماتے کہ مذاکرۂ علم کرو، علم کی زندگی مذاکرہ ہی ہے۔ مرہ نے کہا کہ علقمہ علمائے ربانیین میں تھے۔

کوفہ میں آپ کا وصال ۶۲ھ میں ہوا، آپ نے نوے سال کی عمر پائی۔

محمد بن سیرین (۳۳ھ — ۱۱۰ھ)

آپ جلیل القدر تابعی ہیں، آپ کا پورا نام ابوبکر بن ابی عمرہ محمد بن سیرین البصری۔ آپ انصاری الولاء تھے۔ آپ کے والد حضرت انس کے غلام تھے۔ حضرت عثمان کی خلافت ختم ہونے سے دو سال پہلے آپ کی ولادت ہوئی، حضرت انس کی تربیت میں پروان چڑھے۔ آپ بزاز تھے۔ آپ نے قرآن حفظ کیا، فقہ حاصل کی اور حدیث کا ایک بڑا حصہ یاد کر لیا۔ آپ متقی بھی تھے اور ضابط بھی، حدیث کو حرف بحرف بیان کرتے، آپ پارسا فقیہ تھے۔ آپ نے تیس صحابی کی زیارت کی، اور انس بن مالک، زید بن ثابت، حسن بن علی بن ابوطالب، ابوہریرہ، ابن عباس اور ابن عمر سے حدیث روایت کی۔ آپ سے عامر شعبی،

ثابت البنانی، خالد الحذاء، داؤد بن ابی ہند، عبداللہ بن عون، یونس بن عبید، اوزاعی، مالک بن دینار، ہشام بن حسان اور بہت سے لوگوں نے حدیث بیان کی۔

آپ کے دور کے بڑے بڑے ائمہ نے آپ کی عبادت، تقویٰ، دین کی سمجھ اور عدالت کی توثیق کی۔ ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے دنیا میں تین لوگوں کی مثال نہیں پائی، محمد بن سیرین عراق میں، قاسم بن محمد حجاز میں، رجاء بن حیوہ شام میں، ان میں محمد جیسا کوئی نہ تھا۔ مورق عجلی نے بیان کیا کہ آپ سے بڑا فقیہ و پارسا میں نے نہیں دیکھا، آپ بڑے عبادت گزار اور روزہ دار تھے، ایک دن افطار کرتے اور ایک دن روزہ رکھتے۔ اپنے دین کے معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ انس بن سیرین کا بیان ہے کہ اگر دو حدیثیں ان کو ملتیں ان میں جو عمل میں سخت ہوتی اسے اختیار کرتے، اور دوسرے کے بارے میں کہتے کہ اس پر عمل کچھ برا نہیں۔ ابوقلابہ کہتے ہیں کہ محمد بن سیرین جیسا کون ہوگا، وہ تو تلوار کی دھار پر چلتے تھے۔ شعبی نے کہا ''اے لوگو! اس گونگے کا دامن تھام لو۔ (اس سے مراد محمد بن سیرین وہ مرد حلیم و باوقار تھے)۔ رسول اور خلفائے راشدین وصحابہ کی اتباع کرتے تھے۔ اپنے تلامذہ کو سختی سے حدیث پر عمل کرنے کی تعلیم دیتے، فرماتے یہ علم دین کا علم ہے، غور سے دیکھو کس سے تم لے رہے ہو؟ آپ میں طنز و مزاح بھی تھا، خوش معاملہ بھی تھے۔ اہل علم اور تلامذہ کے دلوں پر اپنا نقش چھوڑ گئے۔ اپنے زمانے کے امام تھے۔ محمد بن سعد کا جملہ یاد رکھیے'' ثقہ تھے عالم تھے مامون تھے بلند و بالا شخصیت کے مالک تھے، فقیہ تھے، امام تھے، کثیر العلم تھے۔''

آپ نے ۱۱۰ھ میں بصرہ میں انتقال فرمایا۔

ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جنھوں نے سنت کی حفاظت میں جان کھپا دی، ان مشہور و معروف لوگوں میں حسن بصری، سلیمان اعمش، قتادہ، عبدالرحمان بن ہرمز الاعرج وغیرہ ہیں۔

اللہ رب العزت ان خادمان علوم نبوت کو جزائے خیر دے اور وسیع و عریض جنتوں میں جگہ عطا کرے۔

خاتمہ:

تدوین حدیث سے پہلے اس کی تاریخ پر اس عرضداشت کے ذریعہ ہم نے باب اول میں عہد رسول میں سنت کی حقیقت کو پہچانا اور رسول کریمؐ کی شخصیت کو بحیثیت معلم و مربی اور علم کے بارے میں آپؐ کے موقف، اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے احکام کی بجا آوری کے سلسلہ میں آپؐ کے نرالے انداز، اسی طرح طلب علم کے لیے آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی اور آپ کے اپنے اصحاب کے ساتھ حسن معاملہ کو جانا۔ صحابہ کرام کے سنت کے حصول کے طریقہ کو جانا، اور دین حنیفی کی حفاظت میں ان کے اخلاص اور اس کی راہ میں اپنی جان و مال کو لٹانے کو ملاحظہ کیا۔ ساتھ ہی سنت کے قرآن کے پہلو بہ پہلو پھلنے پھولنے کے اسباب پر بھی روشنی پڑی۔

اسی طرح باب دوم میں ہم نے یہ دیکھا کہ صحابہ کرام کے اندر اتباع رسول اور سنت رسول کو مضبوطی سے پکڑنے کا کس قدر جذبہ تھا۔ روایت حدیث میں ان کی احتیاط و تقویٰ اور قبول احادیث میں ان کی چھان بین کا اندازہ ہوا، اور یہ کہ بعض احادیث کو قبول کرنے میں ان کا تشدد صرف سنت کی حفاظت، اس کی چھان بین، اس سے وارفتگی کے باب سے تھا نہ کہ ترک سنت کے باب سے۔ اور اگر بعض صحابہ نے بعض خاص حالات میں قبول حدیث کے لیے ایک سے زیادہ راوی کی تصدیق چاہی تو ان ہی حضرات نے دوسرے موقعوں پر ایک صاحب عدل کی روایت کو لے لیا، جب کہ ان کے اندر قبول و روایت حدیث کی شرطیں پائی گئیں۔

قبول احادیث میں صحابہ کرام کے تشدد سے کسی کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ بھی سنت میں احتیاط کا دکھاوا کرتے ہوئے صحابہ کرام کی قبول کردہ احادیث کو پیروں تلے روندے، یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ صحابہ کرام کے تشدد برائے قبول حدیث کو ترک سنت کا ذریعہ بنایا جائے۔

اس باب میں ہم نے یہ بھی جانا کہ صحابہ، تابعین، اتباع تابعین سنی ہوئی احادیث کو بعینہٖ اسی لفظ میں نقل کرنے کے کس قدر حریص تھے، اور اگر حدیث میں درک رکھنے والے

کسی عالم کو لفظ کا استحضار نہ ہو تو اسے روایت بالمعنی کی اجازت ہے، لیکن یہ اجازت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو فقہ حدیث سے نابلد ہو، اس خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کہیں تحریف نہ ہو جائے اور احکام میں تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ ہم نے یہ بھی جانا کہ کبھی کبھی حدیث کی بالمعنیٰ روایت اس کے مفہوم اور احکام کو بدلتی نہیں ہے جیسا کہ بعض اسکالر اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم نے صحابہ و تابعین کے زمانہ میں وسیع علمی سرگرمیوں کو ملموس طور پر محسوس کیا اور امت کے اپنے رسول کے قول و فعل کے سلسلہ میں اہتمام کو جانا، حدیث رسول کے لیے پُر مشقت اسفار کا ذکر پڑھا، گویا اس زمانہ کی علمی سرگرمیوں کی سچی تصویر ہمارے سامنے آگئی۔

تیسرے باب میں ہم نے وضع حدیث اور اس کے اسباب اور اس میدان میں سیاسی سرگرمیوں کے اثرات کو معلوم کیا۔ ہم نے خلاصہ کیا کہ شیعہ جنھوں نے اپنے دعوے اور مسلک کی تائید کے لیے حدیثیں گھڑیں، انھوں نے سنت مطہرہ کے ساتھ برا سلوک کیا اور اپنے مقصد کے لیے اہل بیت رسول کے ناموں کا ناجائز استعمال کیا۔ جبکہ ہم نے یہ بھی جانا کہ اہلِ بیت ان تمام باتوں سے پاک وصاف اور مبرا ہیں، نیز ہم نے یہ بھی جانا کہ خوارج نے حدیثوں کو نہیں گھڑا کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق کذب گناہ کبیرہ ہے۔

اسی طرح ہم نے وضع حدیث کے سلسلہ میں اسلام دشمن عناصر کے اثرات، نسلی تفریق، قبائلی، مسلکی، علاقائی عصبیت اور قصہ گو جہلاء کے اثرات اور حکام سے تقرب و چاپلوسی کے اثرات کو وضع حدیث کے سلسلہ میں اہم محرکات پائے۔ لیکن ساتھ ہی ہم نے یہ بھی جانا کہ اس وباء کے سامنے علمائے امت کس طرح سینہ سپر ہوئے اور کس باریک بینی سے حدیث کی چھان بین کے لیے ٹھوس علمی بنیادوں پر قائم قواعد و اسناد کا التزام کیا، اور علمی سرگرمیوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جھوٹ کی چھان پھٹک کی، راویوں کے حالات کو جانا، پرکھا اور ایسی علامتیں ایجاد کیں جن سے صحیح، کمزور اور گھڑی ہوئی احادیث میں امتیاز ہو سکے۔ اس طرح یہ سنت مطہرہ دشمنوں کے الاعیب سے پاک رہی۔

اسی روشنی میں ہم نے گولڈ تسیہر، غاستون اور احمد امین کی خام خیالیوں پر نقد و تبصرہ کیا، اور علمائے امت کے متن و سندِ حدیث کے ساتھ اہتمام و دلچسپی کو ظاہر کیا اور ہم نے یہ واضح کیا کہ حدیث اسلام کی پختگی یا اس کے اقبال کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آئی اور نہ ہی بعد کی نسلوں کی وضع کردہ ہے، جیسا کہ گولڈ تسیہر کا گمان ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ سنت اسلام کی عملی تطبیق ہے جو رسول اللہؐ کے ذریعہ سامنے آئی اور گولڈ تسیہر فقہی مسالک کے ائمہ پر اپنے اپنے مسلک کی تائید میں حدیثیں گھڑنے کا جو الزام لگاتا ہے ہم نے اس الزام کا سختی سے انکار کرتے ہوئے مضبوط دلائل کے ذریعہ اس مستشرق کو مع اپنے دعوائے باطل اس کے گھر پہونچادیا۔

جب ہم نے مشہور تالیفات رجال و موضوعات کی بحث چھیڑی تو اس ضمن میں یہ معلوم کیا کہ صحابہ و تابعین و اتباع تابعین نے سنت کی حفاظت کے سلسلہ میں کس قدر عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اور وہیں یہ بھی پتہ چلا کہ پوری انسانی تاریخ میں مسلمان ہی وہ سب سے عظیم قوم ہیں جنھوں نے اپنی شریعت کے ورثوں کا رسول اللہ کے دور ہی سے کس قدر اہتمام کیا۔

باب چہارم میں تدوین حدیث اور رسول اللہؐ سے کتابت حدیث کے سلسلہ میں ممانعت واجازت کی تفصیل بیان کی اور یہ خلاصہ کیا کہ اللہ کے رسولؐ نے کتابت حدیث کی ممانعت کے بعد پھر اس کی اجازت فرمادی تھی۔ اسی طرح صحابہ و تابعین سے کتابت حدیث کے سلسلہ میں جو روایتیں ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے کہ تدوین حدیث کی ممانعت واجازت کے سلسلہ میں جو کچھ ان سے مروی ہے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن وسنت کی حفاظت کی راہ میں باہم دیگر مربوط ہیں۔ کیونکہ جب انھیں قرآن و سنت میں التباس اور لوگوں کے قرآن کی طرف سے بے التفاتی کا خدشہ ہوا تو کتابت حدیث کی ممانعت فرمادی لیکن جب یہ خدشات زائل ہوگئے تو اس کی اجازت فرمادی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز نے حدیث کی کس قدر خدمت کی اور اس کی جمع وتدوین کے لیے ابن شہاب زہری و دیگر حضرات کو مکلّف کیا اور تدوین شدہ

احادیث کو اپنے قلمرو میں تقسیم کرایا، اور سلطنت اسلامیہ کے تمام علاقوں کے ذمہ داروں کو حکم فرمایا کہ وہ حدیث نبویؐ کا خاص اہتمام کریں اور مساجد میں حلقۂ درس قائم کرنے کے لیے علماء کی حوصلہ افزائی کریں۔

ہم نے یہ بھی جانا کہ دوسری صدی ہجری کی ابتداء حدیث کی تصنیف وتبویب کے سلسلہ میں ایک عجیب علمی بیداری کی ابتداء تھی اور یہ مصنفات قریبی اوقات میں مملکت اسلامیہ کے مختلف شعاع ریز علمی مراکز سے ظاہر ہوئیں اور ساتھ ہی حدیث میں اولین مصنفین کے بارے میں جانکاری حاصل ہوئی۔

باب چہارم کی دوسری فصل میں تدوین کی سرگرمیوں کا پتہ لگایا اور رسول اللہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں حدیث کے مشہور صحیفوں کا ذکر کیا، اور اس کی باریک تاریخی حقیقت بھی واضح کی، اور اس سلسلہ میں صحابی رسول حضرت عمرو بن العاص کے صحیفہ اور اس کی قدر و قیمت کا ذکر کیا جو رسول اللہ کی زندگی میں لکھے گئے صحیفوں میں سب سے قدیم تر ہے۔ اسی طرح ہمام بن منبہ کے صحیفہ صادقہ کی قدر و قیمت ہم نے جانی جو صحابہ کرام کے زمانہ میں پہلی صدی کے نصف اول کی قدیم تر تدوین ہے، جو ہم تک صحیح سند کے ساتھ پہونچی اور جس کا ذکر مسند احمد اور سنن ومسانید کی دیگر کتابوں میں ہے۔

اسی طرح ہم احادیث صحیحہ کے جمع کرنے اور اس کی تدوین کے مراحل سے مطلع ہوئے اور مشہور ومعروف کتب حدیث کا بھی تعارف حاصل کیا، ساتھ ہی مباحثہ کے ذریعہ یہ چیز واضح ہوگئی کہ دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں بکثرت کتابیں اور تدوینات موجود تھیں۔

اور اسی باب کی تیسری فصل میں تدوین حدیث سے متعلق بعض آراء پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد رشید رضا کی رائے سے مخالفت کی جن کا کہنا تھا کہ قرن اول میں تابعین میں سب سے پہلا مجموعۂ حدیث خالد بن معدان الحمصی کا تصنیف شدہ ہے، اور ہم نے یہ ثابت کیا کہ ان سے پہلے بھی لوگوں کی تصنیفات حدیث ہیں، مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ہمام بن منبہ، اگرچہ خالد بن معدان کا صحیفہ قرن اول کے اولین صحیفوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

نام سیدحسن الصدر کی رائے جس کا مقصد جمع احادیث میں شیعوں کی سبقت اور تقدم کو ثابت کرنا ہے، اور جو تدوین حدیث کے سلسلہ میں جمہور محدثین کی رائے کے خلاف ہے، پر بھی تبصرہ کیا، اور دلائل کے ذریعہ اس کا منھ توڑ جواب دے کر اس کی رائے کو بے وزن کر دیا اور جمہور محدثین کی رائے کو صحیح ثابت کیا، اور یہ کہ ان کی رائے اور امام علی واصحابہ کی تدوین میں کوئی تعارض نہیں ہے، اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ احادیث کی تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں رسولؐ اللہ کے غلام رافع کو سبقت حاصل ہے، اگر حدیث میں ان کی تصنیف کی خبر صحیح ہے اور اس خبر کے صحیح ہونے کے باوجود حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں تدوین حدیث سے متعلق جو تاریخی حقائق ہیں ان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ہم نے امام زید بن علی کے مقام ومرتبہ اور ان کے مجموعہ حدیث کو جانا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ مجموعہ امام زید دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں تصنیف پر ایک ظاہری دلیل ہے اور اس مجموعہ کی حقیقت سے واقفیت کے لیے ہم نے اسی کی بعض مثالوں کے ذریعہ اس کا جائزہ لیا۔ پھر ہم نے حکومتی سطح پر تدوین خدمت سے متعلق اپنی رائے پیش کی اور دوران تحقیق یہ واضح کیا کہ والی مصر عبدالعزیز بن مروان نے جلیل القدر تابعی کثیر بن مرہ الحضرمی کو مکلف کیا کہ جو کچھ انھوں نے صحابہ سے احادیث رسول سنی ہیں، انھیں لکھ کر ان کے پاس بھیجیں، اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر کثیر بن مرہ نے والی مصر کے مطالبہ پر لبیک کہا تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ بعض احادیث معروف رسمی تدوین (بزمانۂ عمر بن عبدالعزیز) سے چوتھائی صدی قبل ہی رسمی طور مدون پر ہو چکی ہیں، اور والی مصر کا اہتمام بسلسلہ تدوین احادیث رسول ہمارے یقین اور پختہ کرتا ہے کہ تدوین حدیث حفظ حدیث کے پہلو بہ پہلو آگے بڑھی ہے۔

پھر ہم نے تدوین حدیث کے سلسلہ میں مستشرقین کی آراء کا جائزہ لیا اور ان کا آپریشن کر کے یہ ظاہر کیا کہ ان کی کاوشیں غلطیوں سے پُر ہیں، اور گولڈ تسیہر کتابت حدیث کی ممانعت واجازت کے باب میں اپنے استنباط میں راہ صواب سے ہٹے ہوتے ہیں، اور ان کا یہ تصور کہ دو متضاد ومعاند گروہوں کا پایا جانا ایک اہل الرای اور دوسرا اہلِ حدیث جو اپنی اپنی خواہشات اور

مقاصد واغراض کے تحت احادیث وضع کرتے تھے یہ خام خیالی ہے۔اور ہم نے یہ ثابت کیا کہ علمائے امت مسلمہ گولڈ تسیہر جیسے لوگوں کی کج خیالیوں سے بہت بلند و بالا ہیں، بلکہ علمائے امت نے شریعت مطہرہ کی حفاظت کے سلسلہ میں بہت دقیق علمی راہ اختیار کی ہے۔

باب پنجم میں ہم نے ان زندہ و بیدار دلوں کو پہچانا جنھوں نے سنت نبوی کی بھرپور حفاظت کی اور ہم تک پہونچایا، اور حضرت ابو ہریرہ اور ابن شہاب زہری کے بارے میں جو شکوک وشبہات پیدا کئے گئے تھے انھیں ہم نے دلائل کے ذریعہ باطل کیا، اور مستشرقین نیز بعض مسلم اسکالروں نے جو شبہات ان دونوں حضرات کے گرد پیدا کئے تھے اس کا منھ توڑ جواب دیا، جس سے ان دونوں کی قیمت و وقعت ہم پر ظاہر ہوگئی، اور ان کے خلاف شبہات پیدا کرنے والوں کی بدنیتی طشت از بام ہوگئی۔

گزشتہ ابحاث کی روشنی میں ہم پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سنت مطہرہ کی حفاظت محفوظ و مضبوط علمی بنیادوں پر ہوئی ہے، اور مسلمانوں نے قرآن کریم کی طرح حدیث کی حفاظت کا بھی اہتمام کیا، چنانچہ قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث بھی اسلامی شریعت سازی میں ایک مصدر کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی عظمت واحترام مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں ہے اور وہ اس کی اقتداء میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

موضوع کے اختتام سے پہلے چند عرضداشت کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

ا۔ مختلف تعلیمی مراحل میں طلبا کی تعلیمی لیاقت کے لحاظ سے حدیث اور رجال حدیث خصوصاً صحابہ کرامؓ کے بارے میں اپنی توجہ بڑھائیں، تاکہ مسلم نسلوں کی نشو ونما اللہ کے رسول کی سیرت کے اوپر ہو اور انھیں ناقلین شریعت کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوں۔ حدیث کی تعلیم صرف ابتدائی مرحلوں میں اسلامی تربیت کے درجات تک منحصر نہ ہو بلکہ اسے دوسرے درجات مثلاً اخلاقی وسماجی تربیت، مطالعہ، تاریخ، طب وصحت میں بھی پڑھائی جانی چاہیے، اور ہر موضوع کے ساتھ اس کے مناسب حال احادیث پڑھائی جائیں اور یہ چیز مدرسین ومؤلفین کے آپسی تعاون سے بآسانی ممکن ہے۔

۲۔ سنت کی تاریخ وسیع پیمانہ پر پڑھائی جانی چاہیے جیسا کہ تاریخ فقہ مختلف کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے، مثلاً شریعت کالج، اصول الدین کالج، قانون کالج، اور صرف احکام سے متعلق احادیث کی تعلیم پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ تربیت، مکارم اخلاق اور آداب کے باب میں بھی احادیث مقرر کی جانی چاہیے، اور سنت اور اس کی تاریخ پر ایسی کتاب کی تالیف سامنے آنی چاہیے جو دلائل سے سنت کی تاریخی حقیقت، اس کی حفاظت اور نقل و روایت کو ثابت کرے۔ علمائے کرام سے میری گزارش ہے کہ وہ اس طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ کوئی ذمہ دار اسلامی ادارہ، جیسے اسلامی اعلیٰ کمیٹی برائے امور اسلامی اس کا اہتمام کرتی اور اس فن کے ماہر علماء کو تالیف کتاب پر مامور کرتی، اور پھر اس کتاب کی نشر و اشاعت کا ذمہ لیتی۔ اس طرح ان غلطیوں کا ازالہ ہو جاتا جن میں بعض مسلم اسکالر اور مستشرقین گر پڑے ہیں۔

۳۔ نفع علمی کی تکمیل کے لیے جہاں ہم اپنی اس ریسرچ کے ذریعہ پہونچے میری یہ رائے ہے کہ:

(الف) صحابہ، تابعین، اتباع تابعین کے بعض جلیل القدر راویوں جیسے عبداللہ بن عمر، ابن شہاب زہری، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ وغیرہم کی ایسی علمی اسٹڈی کی جائے جس سے حفاظت سنت کے سلسلہ میں ان حضرات کی کاوشیں، شوق و لگن اور نشر و اشاعت کی کوششیں کھل کر سامنے آجائیں۔

(ب) بہت سارے علماء و شیوخ حدیث کے مخطوطے جن کی حیثیت امہات الکتب کی ہے، جن پر ابھی تک عالم مجہول کی چادر پڑی ہے اسے تحقیق و تعلیق سے مزین کر کے ان کی اشاعت کا نظم کیا جائے۔ ساتھ ہی ان کتابوں کے نقل و حفاظت حدیث میں واضح فضل و اثر کو ظاہر کیا جائے، جیسے جامع عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری اور احمد بن حنبل و یحیی بن معین کی کتب علل، اور رامہرمزی کی المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، اور خطیب بغدادی کی الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع۔ اللہ سے میری التجا ہے کہ آخر الذکر دو کتابوں کی تحقیق و تعلیق کی مجھے توفیق دے۔

(ج) علم مصطلح الحدیث کی نشو ونما کو مستقل بحث وتحقیق سے آراستہ کیا جائے، جس سے قواعدو اصول کی مصطلحات سامنے آ جائیں، جن کا سنت کی حفاظت میں بڑا اہم کردار رہا ہے اور جس سے صحیح اور مریض حدیث کی تمیز میں بڑی مدد ملی ہے، اور یہ تحقیق موجودہ زمانہ کی تحقیق سے میل رکھتی ہو جس تک بآسانی رسائی ہو سکے۔ اللہ سے میری التجا ہے کہ ریسرچ کے مرحلہ میں اس تحقیق کے لئے میری مدد فرمائے۔

ان معروضات پر میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں کامیاب رہا، اور میری نیک بختی کے لیے یہ کافی ہے کہ اس موضوع کی تحقیق کے لیے میں نے کئی سال مربی عظیم و معلم امین جناب رسولؐ اللہ کے جلو میں گزارے اور اپنے خیالات و جذبات کے ہمراہ اس وسیع و عریض عالم کی سیر کی جس میں بھائی چارگی، جانثاری، فی سبیل اللہ قربانی کی حکمرانی تھی اور اس پر بالا اعلی وارفع روح عظیم نفوس، بلند حوصلے، کرگزرنے کے عزائم کی چھاپ مزید تھی۔

اسی وجہ سے میں اپنی زندگی کو خدمت حدیث کے لیے وقف کرتا ہوں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ امت عربیہ و اسلامیہ کو قرآن کریم اور سنت صحیحہ پر جمع فرمادے اور ہمیں محسن انسانیت کی اقتداء اور ان کی سیرت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اسی میں ہماری فلاح ونجاح ہے۔ والحمد لله رب العالمين وصلى الله على نبينا محمد۔

ہماری دیگر کتابیں

سیرت رحمتِ عالم ﷺ	ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری
دروسِ سیرت ﷺ	ڈاکٹر سعید رمضان البوطی
حیاتِ سرور کائنات ﷺ	ملا واحدی دھلوی
قرآن ناطق ﷺ	سرجیت سنگھ لامبا
سیرتِ رسول ﷺ قرآن کے آئینے میں	ڈاکٹر عبدالغفور راشد
رسول اکرم ﷺ اور خواتین	ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی
اسوۂ کامل ﷺ	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
بلغ العلی بکمالہ (منظوم سیرت النبی ﷺ)	خورشید ناظر
علوم الحدیث	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
سائنس قرآن کے حضور میں	طارق اقبال سوہدروی
صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوال نبی رحمت ﷺ کے جواب	ڈاکٹر نصیف سلمان
علوم اسلامیہ اور مستشرقین	ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی
تذکار آزاد	عبدالرشید عراقی
مولانا امین احسن اصلاحی، حیات و افکار	ڈاکٹر اختر حسین عزمی

ہماری دیگر کتابیں

کتاب	مصنف
سیرتِ رحمتِ عالم ﷺ	ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری
درُوسِ سیرت	ڈاکٹر سعید رمضان البوطی
حیاتِ سرورِ کائنات ﷺ	ملا واحدی دھلوی
بلغ العلیٰ بکمالہٖ منظوم سیرت النبیؐ	خورشید ناظر
سیرت رسول ﷺ قرآن کے آئینے میں	ڈاکٹر عبدالغفور راشد
علوم الحدیث فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
اُسوہ کامل ﷺ	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
سیرۃ البخاری	مولانا عبدالسلام مبارک پوری